اوراقِ ہستی

رضوان اللہ

جملہ حقوق بہ حقِ مصنف محفوظ

کتاب کا نام : اوراقِ ہستی
مصنف کا نام : رضوان اللہ
سن اشاعت : 2020ء
قیمت : -/500روپے
کمپوزنگ : خالد فیصل
ٹائٹل : ساجد خلیل
ناشر : رضوان اللہ
D-178، ابوالفضل انکلیو-1، جامعہ نگر، نئی دہلی-110025
فون:9971283786
Email:ruilmi@rediffmail.com
Web: www.Rizwanullah.com
مطبع :

ملنے کے پتے:
1- ڈاکٹر زہرہ خاتون، شعبۂ فارسی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی-۲۵
2- S.K. Print House، D-105، ابوالفضل انکلیو-1، جامعہ نگر، نئی دہلی-۲۵
3- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی-۲۵

چو سیرِ گلستاں بہ پایاں رسید
ثمر ہائے کِشتم بہ داماں رسید
بتوفیقِ و تائیدِ پروردگار
بہ اوراق احوالِ رضواںؔ رسید

رضوان اللہ

انتساب

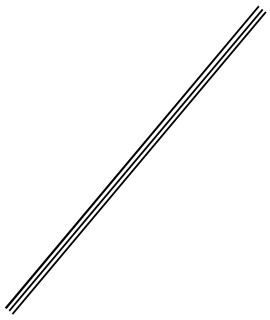

والد محترم مولوی سبحان اللہ صاحب مرحوم ومغفور
اوران بزرگوں کے نام جنھوں نے زندگی کے
مشکل مرحلوں میں میری دست گیری فرمائی۔

فہرست

عنوانات	صفحہ
انتساب	4
دیباچہ	7
پہلا ورق	
ابتدائی حالات	19
سمبھی	26
کوئریاپار	45
محمد آباد گوہنہ	54
دبستان کانپور	75
مدرسہ فیض عام	78
پروفیسر شبیر احمد	87
مولوی حفیظ الرحمٰن ایمنؔ شہابی	106
قیامِ جونپور	108
کلکتہ میں ورود	110
قیام دیوریا	117
قیامِ بنارس	126
وہائٹ کالر	135
شاہ صاحب	139
دوسرا ورق	
میری اخبار نویسی	153
صحافت کی تعریف	153
اردو صحافت آزادی کے بعد	156
آغاز داستان	161

عنوانات	صفحہ
صحافت کا ایک نیا باب	196
سفارتی صحافت	240
آزاد ہند سے وابستگی	244
آسام کی سیر	262
صدر کینڈی کا قتل	268
اخباروں میں ہڑتال	270
ملک میں ایمرجنسی	275
ایڈیٹرس کانفرنس	282
کلکتہ کو الوداع	283
تیسرا ورق	
نئی دنیا	286
نیا شہر	292
نیا آفس	308
ایک بزرگ کی نمود	318
آفس میں مستقلی	322
صدر کارٹر کا دورہ	324
رہائش کی تبدیلی	329
افغانستان اور ایران	330
ہند افغان تعلقات	334
ملازمت کے لوازمات	335
اردو کی اہمیت	336
پاکستانی ادیب	345

عنوانات	صفحہ
کچھ دفتر کے بارے میں	349
ٹریول سیکشن	355
کلچرل سکشن	357
پہلی ٹیلی پریس کانفرنس	358
سنجیدہ تنقید کی ضرورت	360
صحافیوں سے متعلق پروگرام	364
اردو پریس	367
دفتری دورے کی ابتدا	373
امریکہ کے لیے روانگی	384
لندن میں ورود	386
امریکہ سے واپسی	392
دہلی واپسی	397
امریکی طرزِ حیات	397
کشمیر یونیورسٹی میں سیمینار	400
اردو ایڈیٹروں کی نامزدگی	401
افغان رفیوجی کیمپ کا دورہ	407
تعمیر مکان	411
ریٹائرمنٹ کا سوال	412
میرا ٹی وی پروگرام	413
جنگ عراق	414
بے مقصد جنگ	416
سوویٹ یونین کا خاتمہ	417
میری علالت	418
دفتر واپسی	421
اختتامیہ	425

عنوانات	صفحہ
چوتھا ورق	
سفر و سیاحت	428
یادوں کے جھروکے سے	428
جنگِ افغانستان	446
پاکستان میں	448
پشاور میں	450
نئی دنیا سے آشنائی	458
لندن میں ورود	459
واشنگٹن میں ورود	462
مصروفیات کا آغاز	464
وہائٹ ہاؤس میں	466
ایک مشاہدہ	467
واشنگٹن سے اورلینڈو	468
اورلینڈو سے ہوسٹن	471
ہوسٹن سے سان فرانسسکو	473
سان فرانسسکو سے شکاگو کے لیے	478
مسلم کمیونٹی سینٹر	479
شکاگو سے نیویارک	480
ڈاکٹر قیصر بخت	480
اقوام متحدہ میں	484
نیویارک سے واپسی	485
امریکہ کو الوداع	486
گھر واپسی	487
مشورے	488

دیباچہ

ادب میں سوانح نگاری نسبتاً کم ہوئی ہے، خودنوشت تو اور بھی کم۔ سوانح عمری تو دراصل انہی لوگوں کی درخور اعتنا ہوتی ہے جن کی زندگی کا ہر روز تاریخ کا ایک نیا ورق یا جن کا فرمایا ہوا ہر لفظ زندگی کا ایک فلسفہ ہوتا ہے۔ لیکن دلدادگان گلگشت کے لیے سبزے کی روئیدگی بھی فردوس نظر ہوتی ہے اور اہلِ بصیرت کے نزدیک اس بے بساط کی کہانی بھی سارے باغ کی کہانی کا ایک حصہ ہوتی ہے جہاں گل و بلبل کی داستانوں کے ساتھ ہی صیاد و گلچیں کی چیرہ دستیوں اور بہار و خزاں کے مناظر بھی دوہرائے جاتے ہیں۔ شاید وہی بے بساط سبزہ باغ کی کہانی کا پھولوں اور کانٹوں سے زیادہ معتبر راوی ہے۔

ہر تصنیف کے متعلق سوال پیدا ہوتا ہے کہ کس نے لکھی اور کب لکھی گئی۔ کسی مصنف کی شخصیت اپنے عہد کی پیداوار ہوتی ہے اور تصنیف اس کی تخلیق۔ بہ الفاظِ دیگر ہر تصنیف اپنے عہد اور زمانے کی پیداوار اور اس کی آئینہ دار ہوتی ہے چنانچہ خودنوشت سوانح عمری کا مصنف اپنے عہد کی تاریخ کا ایک حصہ، خواہ وہ کتنا ہی مختصر کیوں نہ ہو، ہوا کرتا ہے۔ وہ تاریخ جس کے ارتقا یا ترتیب و تشکیل میں وہ خود شریک تھا یا جیسا کہ اس کے مشاہدے میں آیا۔ گویا سوانح نگاری ایک تذکرہ ہے اور تبصرہ بھی با اینہمہ اسے تاریخ کے استناد کا درجہ نہیں حاصل ہوتا، شاید اس کے لیے دیگر شواہد کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔

ضمناً ایک وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ یہاں مجھے اس سوانح نگاری سے بحث نہیں ہے جسے کوئی صاحب قلم اپنے ممدوح، محسن یا ہیرو کی زندگی اور کارناموں کو اجاگر کرنے کے لیے لکھتا ہے یا ان کے دوام کی غرض سے قرطاس وقلم کے حوالے کرتا ہے۔ ایسی تصنیفات کی ادبی اور تاریخی حیثیت خواہ کتنی ہی ارفع واعلیٰ کیوں نہ ہو ان میں وہ بات ہرگز نہیں پیدا ہوسکتی جو کسی لکھنے والے کے اپنے محسوسات کے خود اظہار میں ہوتی ہے اور یہ بات بھی ہے کہ ممدوح کے حالات و واقعات وصفات کے بیان میں مبالغے کا امکان بہرحال باقی رہتا ہے۔

دوسری بات یہ بھی ہے کہ عظیم شخصیات سے بطور سوانح جو کچھ دستیاب ہوتا ہے وہ بالعموم ان کی یادداشتیں یا ڈائریاں ہوتی ہیں۔ ان کی اہمیت مسلم ہے لیکن وہ ان کی دیگر تصانیف سے مختلف ہوں گی۔ یادداشتیں بروقت محرکات ومحسوسات کے تحت لکھی جاتی ہیں ان میں وقتی جذبات اور وقتی مصالح کارفرما ہوں تو کچھ بعید نہیں۔ وہ کوئی مسلسل اور مربوط تحریر بھی نہیں ہوتیں جبکہ دیگر تصانیف ان سے بہت مختلف اور مرتب ہوتی ہیں۔ ان دونوں مختلف اقسام کی تحریروں میں اور بھی بہتیری مماثلتیں اور عدم مماثلتیں ہوتی ہیں یہاں مجھے اس سے بھی بحث نہیں ہے۔

بات خودنوشت سوانح عمری کی ہے جو بالعموم عمر کے اس حصے میں لکھی جاتی ہے جب سوانح نگار کو یقین اور اطمینان ہوتا ہے کہ اس کی عملی زندگی امکانی حدود میں کامیابی کی منزلوں سے ہمکنار ہوئی ہے۔ تشنگی کا باقی رہنا اور بات ہے۔ یہ تو زندگی کی ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے اور زندہ رہنے کے لیے ایک ضرورت بھی۔ لیکن صاحبِ تصنیف کا زندگی کے اس مرحلہ یا منزل تک پہنچ جانا ہی کافی نہیں، لازم ہے کہ وہ اپنی زندگی کے تجربات و مشاہدات میں دوسروں کو شریک کرنے کا جذبہ اور حوصلہ بھی رکھتا ہو اور اس کے ذہنی اور جسمانی قویٰ بھی اس کے اس عزم میں اس کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہوں۔

عمر کی اس منزل میں پہنچ جانے کے بعد بچپن ایک حسین خواب اور جوانی ایک لذت

آفریں سراب نظر آنے لگتے ہیں اور شاعر یہ کہنے میں حق بجانب معلوم ہوتا ہے کہ ''جو کچھ کہ دیکھا خواب تھا اور جو سنا افسانہ تھا۔'' عمر کی اس منزل میں ہم عموماً تنقید و تبصرہ سے بھی بڑی حد تک بے پروا اور بے نیاز ہو جاتے ہیں اس لیے گزرے ہوئے زمانوں کی افسانوی حقیقت جتنی بھی اور جیسی بھی یادداشت میں محفوظ رہ جاتی ہے یا اتنی دور سے جیسی بھی نظر آتی ہے اس کے اظہار و بیان میں کوئی قباحت نہیں محسوس کرتے اس لیے لکھنے والے کے بیان کی صحت یا عدم صحت سے قطع نظر اس کی نیت پر شک کرنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

میں جو کچھ لکھنے کی جسارت کر رہا ہوں اس کے متعلق مجھے کوئی خوش فہمی نہیں ہے۔ یہ نہ صحافت نہ سوانح نہ تاریخ کا کوئی ناقابل فراموش باب ہے۔ سوال یہ ہے کہ آخر میں نے یہ زحمت کیوں گوارہ کی؟ اس کا بنیادی سبب میرا یہ یقین ہے کہ یہ دنیا جب اور جس لمحہ وجود میں آئی اسی وقت سے اس کی تکمیل اور تشکیل کا ارتقائی عمل جاری ہے اور جب تک کرۂ ارض پر کوئی نفس باقی ہو یہ عمل جاری رہے گا اس میں ہر ذی روح کا حصہ ہے، کتنا حصہ ہے یہ اس کی قوتِ عمل، صلاحیت کار، صلابتِ رائے وغیرہ جیسی صلاحیتوں اور حالات کی سازگاری پر بھی منحصر ہے۔

کسی نے پہاڑ سے پتھر کی سلیں تراشنے کا کام اپنے ذمہ لیا، کسی نے ان سلوں کو نقوش و نگار سے مزین کیا، کسی نے ان کو یکجا کر کے ایک طرزِ حسن عطا کیا، کسی نے ایک خواب کو تاج محل کی صورت میں ٹھوس حقیقت میں مبدل کر دیا لیکن کیا اس تمام عمل میں اس اولیں سنگ تراش کا حصہ کسی طرح کم اہم تھا؟

کسی نے انسان کو جینے کا سلیقہ سکھایا، کسی نے زندگی کا بہتر رنگ ڈھنگ بتایا، کسی نے لکڑی کے کندے میں پہیے کی ایجاد کر کے انسان کو رفتار آشنا کیا، کسی نے پھول اور سبزے کی آبیاری اور تراش وخراش سے باغ و بہار کا رنگ تیز کیا، کسی نے صرف باغ کی پہریداری کی کہ خیابانوں کو نقصان سے محفوظ رکھے تو کیا اس دربان کی کارگزاری کسی طرح کم اہم ہے؟

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ میں اس ترقی پذیر دنیا میں نہ ایٹم دریافت کرسکا، نہ چاند گاڑی بناسکا، نہ چاند پر جاسکا، نہ تاریخ انسانی پر چودہ جلدیں تصنیف کرسکا، نہ اخلاقیات پر دراسات کے انبار لگاسکا، ایسا کچھ بھی نہیں کرسکا نہ سہی لیکن جو کچھ اور جتنا کچھ کرسکتا ہوں اس کو کرنے سے کیوں باز رہوں؟ قدرت نے کسی کو اس کی صلاحیت سے زیادہ کا کفیل نہیں بنایا۔

لیکن میری یہ کاوش، میری یہ جسارت اپنی تمام کم مائیگی اور کمزوریوں کے باوجود بے مقصد نہیں۔ قدرت نے دنیا میں کسی چیز کی تخلیق بلا مقصد نہیں کی۔ انسان تلاش و تکمیل مقاصد سے اپنی زندگی کو بہتر اور مکمل تر بناتا جائے گا ایسے میں اس کی مخلوق بلا مقصد کوئی تخلیق کیوں کرے! یہ ضرور ہے کہ مجھے جو کچھ کہنا ہے وہ شروع سے آخر تک بات میری نظر آئے گی لیکن اس کا بیشتر حصہ مجھ جیسے کمتر انسانوں کے دکھ سکھ، ان کی راہوں کے روڑے، ان کی تمناؤں اور شادمانیوں اور ان کی مایوسیوں اور محرومیوں کی عکاسی کی ایک حقیر کوشش ہے۔ خود میری زندگی ایسی سپاٹ اور بے آہنگ ہے کہ اس میں شاید ہی کوئی منظر ایسا ہو جس پر لمحہ بھر بھی نظر ٹک سکے۔ یہ ایک بے برگ و گیاہ سطح مرتفع ہے اس لیے میں دراصل بات اپنے معاشرے کی کرنا چاہوں گا لیکن کسی حوالے سے اور وہ حوالہ خود میری ذات ہے۔ جب ''سرِّ دلبراں'' ہی نہیں تو ''حدیثِ دیگراں'' کی ضرورت بھی کہاں باقی رہتی ہے۔

تاہم ہر خودنوشت سوانح عمری میں دیگر بہتیری سوانحات کا کچھ نہ کچھ حصہ شامل ہوتا ہی ہے کیونکہ صاحبِ تصنیف کی زندگی، اس کی مصروفیاتِ شب و روز، اس کی کامیابیوں اور ناکامیوں میں دوسری بہتیری شخصیات کا عمل دخل ہوا کرتا ہے ان میں سے بیشتر کا تذکرہ کسی نہ کسی طور لکھنے والے کی سوانح عمری میں شامل ہونا عین ممکن ہے۔ مزید برآں اس کی پسندیدہ یا ناپسندیدہ شخصیات ایسی ہوسکتی ہیں جن کا تذکرہ صاحبِ تصنیف ضروری سمجھتا ہو۔ اس طرح ایک سوانح عمری ان گنت حلقوں کا ایک سلسلہ یا زنجیرہ ہوسکتی ہے۔ یہی حقیقت سوانح نگار کو اپنے عہد کا شاہد بناتی ہے۔

میں اس تہذیب کے چل چلاؤ کا شاہد ہوں جس کی سانس ایک صدی پہلے اکھڑ

چکی تھی اور جس کے ماتم گساروں کی قطار لگی ہوئی تھی۔ جب اس مریض کو بچانے کی سب تدبیریں ناکام ہوگئیں، اس کی نبض ڈوبنے لگی اور اس کی پیشانی ٹھنڈے پسینے سے تر ہوگئی تب میں نے اس کے بچے کھچے آثار دیکھے۔ ڈوبتی نبض کے وقت اس کی شائستگی دیکھی، روایات کا پاس دیکھا۔ چاہتا ہوں کہ میری اس تحریر کو پڑھنے والے جنھوں نے ناولوں اور افسانوں میں اس تہذیب کی جھلکیاں دیکھی ہوں گی اسے دوٹوک الفاظ میں بھی پڑھ لیں۔

میں نے وہ عہد نہ صرف دیکھا بلکہ خوب خوب بھگتا ہے جب برصغیر کی اردو صحافت اس بری طرح کٹ چھنٹ گئی تھی کہ اس کی شکل وصورت مسخ ہوگئی تھی۔ تاحد نظر گھپ اندھیرا تھا، نہ نشانِ منزل تھا نہ کوئی رہنما۔ اربابِ نظر میری اس تحریر میں ان مناظر کی جھلکیاں دیکھ سکیں تو دیکھ لیں۔ میں ان بے نام ونشان اردو صحافیوں کو سلام کرتا ہوں، ان کی یاد میں سر جھکاتا ہوں جنھوں نے اپنے فن اور پیشے کی لاج رکھی، نامعلوم اور ناہموار راہوں پر بڑھتے رہے اور بالآخر وہ زمین ہموار کی جس پر آج اردو صحافت کے اجارہ داروں کے عالیشان محل تعمیر ہورہے ہیں۔

میں بعض غیر صحافتی رویوں کے بارے میں بھی کچھ کہنا چاہوں گا جس نے قوم اور ملت کو بے قیاس نقصان پہنچایا۔ ہر کسی کو میری رائے سے اتفاق یا اختلاف کا حق ہے اور جیسا کہ عرض کرچکا ہوں اب میں زندگی کی اس منزل میں ہوں کہ مجھے جو کچھ کہنا ہے بے لاگ لپٹ کہہ سکتا ہوں اس سے میرے ذاتی سود وزیاں کی وابستگی کا زمانہ چلا گیا اس کا گمان بدگمانی کے سوا اور کچھ نہ ہوگا۔

آخر میں اپنے بعض مشاہدات بیان کرنا چاہوں گا۔ سیر وسیاحت کرنے والوں نے اتنا کچھ لکھا ہے کہ شاید زیادہ لکھنے کی گنجائش نہیں چھوڑی ہے، تاہم لوگ لکھتے رہیں گے کیونکہ ہر کسی کا اپنا زاویہ نگاہ ہوتا ہے۔ ہر کوئی قطب مینار کو اپنے قدوقامت، اپنی قوتِ مشاہدہ اور اپنی بصارت کے اعتبار سے ہی دیکھ سکتا ہے اور جیسا اس کو نظر آئے گا اپنی قدرتِ کلام کے مطابق ویسا ہی بیان کرے گا۔ جسے سیاحت کہتے ہیں میرے حصے میں

تقریباً نہیں آئی۔ اشتیاق بے حد تھا لیکن دفتری مصروفیات اور کام کے تئیں شاید حدِ اعتدال سے متجاوز خلوص نے سیر وسیاحت کے مواقع ہوتے ہوئے بھی اس سے دور ہی رکھا۔ میں اسے اپنی کم نگہی پر بھی محمول کرتا ہوں۔ اس میں اس نفسیات کو بھی بڑا دخل ہے جس کے تانے بانے میری پرورش کے سخت ترین ماحول میں بنے جارہے تھے، وہ ماحول جس نے مجھے بدترین حالات میں سر اٹھا کر چلنے کا سلیقہ سکھایا، وہ میری بڑی توانائی تھا اور بڑی کمزوری بھی ثابت ہوا۔

میں نے اس تصنیف کو ''اوراقِ ہستی'' کا نام دیا ہے اور اسے چار ''ورقوں'' میں تقسیم کیا ہے۔ دراصل یہ کتاب آپ بیتی کی ورق گردانی کا استعارہ ہے۔ زندگی ایک تسلسل ہوتی ہے اور کئی سلسلوں کا مرکب بھی۔ ان کی ترتیب میں آسانی کی غرض سے میں نے ''اوراق'' میں تقسیم کی تدبیر اختیار کی ہے۔

پہلا ''ورق'' خاندانی پس منظر، ابتدائی حالات، تعلیم و تربیت اور تلاشِ معاش کے ابتدائی مراحل سے متعلق ہے۔ یہی عرصہ گزشتہ صدی میں برصغیر کا انتہائی انقلاب انگیز دور بھی تھا۔ بادِ مخالف کے جھکڑوں میں اپنی جگہ پاؤں جمائے رکھنا بڑے حوصلے کی بات تھی وہ حوصلہ مجھے کیسے ملا یہ کہنا مشکل ہے، وہ ایک لاشعوری عمل تھا لیکن وطنیت کے شدید احساس نے اس میں مرکزی کردار ادا کیا۔ اس باطنی قوت نے مجھے مخالفوں کے سامنے بھی سر اٹھا کر اور آنکھ ملا کر بات کرنے کا حوصلہ بخشا۔

دوسرا ''ورق'' میری پیشہ ورانہ زندگی سے متعلق ہے جب میں نے اردو صحافت کا طوق اپنے گلے میں ڈال لیا تھا اور اسے ڈھوئے پھر رہا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ برصغیر میں اردو صحافت پر وہ عرصہ انتہائی حوصلہ شکن تھا لیکن کئی سرکاری ملازمتوں میں تاک جھانک کے بعد میں نے اس پیشے کو بہ رضا ورغبت قبول کیا تھا شاید آزادی پسند مزاج اور فطری انانیت سے وہ میل کھا رہا تھا۔ رفتہ رفتہ وہ میری مجبوری بن گیا، میری ذاتی زندگی کے نشیب وفراز اس میں شامل ہوکر اس ''ورق'' کو اور اگلے ''اوراق'' کو بھی پیچ در پیچ کرتے

گئے۔ جیسا کہ عرض کر چکا ہوں ایک زندگی کئی زندگیوں کا تسلسل ہوتی ہے اس لیے یہ پیچیدگیاں ناگزیر تھیں۔

تیسرا ''ورق'' دراصل اسی پیشہ ورانہ زندگی کا تسلسل ہے اور ذاتی زندگی کی پیچیدگیوں کے ساتھ رواں ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ سفارت خانوں سے وابستہ صحافیوں کو روایتی صحافت سے مختلف قسم کی صحافت سے سابقہ ہوتا ہے جس میں سرکاری ملازمت کے آداب اور سفارتی نزاکتوں کے تقاضے سموئے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہ سفارت کار صحافی باہر سے خواہ کیسے ہی نظر آئیں یا انھیں کیسے ہی رنگ میں پیش کیا جائے انھیں مفید کام انجام دینے کے بڑے مواقع حاصل ہوتے ہیں۔ صحافتی برادری کو ان سے تعاون کی راہ اختیار کرنی چاہیے۔ یہ بات میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں جس میں اپنے ہم پیشہ افراد پر اس اعتماد کا عنصر بھی شامل ہے کہ وہ معتبر اور غیر معتبر افراد اور افعال میں تمیز کرنے کی خوب صلاحیت رکھتے ہیں۔

چوتھا ''ورق'' ان مقامات کے بارے میں میرے مشاہدات سے متعلق ہے جہاں مجھے جانے کا اتفاق ہوا۔ مجھے اعتراف ہے کہ ان مشاہدات اور ان کے تذکروں میں کوئی گہرائی نہیں ہے لیکن میرے لیے وہ بھی زندگی کے تجربات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ شخصیات سے متعلق ایک ''ورق'' ہونا چاہیے تھا لیکن موقع محل کی مناسبت سے جابجا ان کا تذکرہ کرتا گیا ہوں اس لیے مزید کسی ''ورق'' کے اضافے سے صرفِ نظر کرتا ہوں۔

جہاں تک زبان و بیان کا تعلق ہے اردو زبان عربی کی ثقالت، فارسی کی لطافت اور دیسی بولیوں کی چاشنی کا ایک ایسا مرکب ہے جس میں شدید ترین اور لطیف ترین احساسات کے اظہار کی غیر معمولی صلاحیت موجود ہے، جس پر اس زبان کی ادبی بلکہ شعری روایات نے صیقل کر کے اسے دو آتشہ بنا دیا ہے۔ بحیثیت ایک صحافی میری زبان کو سادہ اور بیان کو سیدھا اور صاف ہونا چاہیے۔ صحافت ایک ترسیلی عمل ہے، عبارت جتنی ہی سیدھی اور صاف ہوگی افکار کی ترسیل اور اثر انگیزی اتنی ہی بہتر ہوگی۔ لیکن صرف خبر نگاری

یا ترجمہ ہی تو صحافت نہیں ہے، اداریہ اور سرخیاں بھی تو اس فن کا جزوِ اعظم ہیں۔ اداریہ کبھی دوٹوک عبارت کا طالب ہوتا ہے تو کبھی سیاست کے تمام داؤں پیچ کو مضمون میں سمونے کا فن چاہتا ہے۔ دوسری طرف سرخیاں ہمیشہ پرزور الفاظ و عبارات اور پرکشش اظہار کا مطالبہ کرتی ہیں یہ الگ الگ تقاضے ہیں جن سے صحافیوں کو اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں دوچار ہونا پڑتا ہے وہی ان کی زبان کو تخلیقی ادب کی زبان سے مختلف بنا سکتے ہیں۔

موجودہ تصنیف میں میں نے حتی الوسع صاف گوئی اور بے لاگ بیانیہ زبان سے کام لینے کی کوشش کی ہے۔ ترجمہ، وہ بھی اخباری ترجمہ، کی کثرت تحریر میں اوریجنلٹی کا لطف زائل کر دیتی ہے۔ اس سُقم سے بھی حتی الوسع بچنے کی کوشش کی ہے۔ میں ان کوششوں میں کس حد تک کامیاب ہوسکا ہوں یہ فیصلہ کرنا اہلِ نظر کا کام ہے۔

زندگی کی بساط پر ایک ہی بازی کھیلی جاسکتی ہے جس کے دوران مشکل اور آسان، غور طلب اور سکوت بہ لب مراحل آتے جاتے رہتے ہیں۔ کھیلنے والا اگر دلچسپی لے تو ان کوائف سے اصل کھیل کے لطف میں فرق نہیں آتا۔ مہرے گرتے جاتے ہیں، بچے کھچے مہرے مضمحل اور سست گام ہوتے جاتے ہیں۔ جب کھیل کا اصول یہی ٹھہرا تو پھر کسی شکوے کی گنجائش کہاں رہی۔ ابھی بازی جاری ہے یہی کیا کم ہے۔

۱۹۹۲ء کے بعد کسی وقت بازدید حیات کا سلسلہ موقوف کر کے اس کو طاق نسیاں کے حوالے کر دیا تھا پھر دوسرے کاموں میں لگ گیا۔ چار کتابوں کا انگریزی سے اردو میں چار کا اردو سے انگریزی میں ترجمہ کر ڈالا۔ اخبارات و رسالوں میں مضامین لکھنے لگا کہ یہ مرض کافی پرانا تھا، کوئی پونے تین سو مضامین لکھ ڈالے،۔ انگریزی رسالہ ملی گزٹ نکلا تو ایک کالم کے ساتھ اس میں شریک ہوگیا اور اگلے تین چار برسوں میں تقریباً ایک سو مضامین لکھ ڈالے، اللہ رزاق ہے اس نے میرے قلم کے لیے ایک نئی غذا فراہم کی۔ امریکی سفارت خانے کا مایہ ناز مجلّہ اسپین کا اردو ایڈیشن جاری ہوا تو اس کے لیے کوئی چار برسوں میں گن کر 272 مضامین کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کر ڈالا۔ پھر تصنیفات کا

عارضہ لاحق ہوگیا اور 'بے ادبیات' (۲۰۰۰ء)، 'اوراق مصور' (۲۰۰۲ء)، 'کلکتہ کی اردو صحافت اور میں' (۲۰۰۶ء)، 'متاع سحر' (۲۰۰۸ء)، 'ہمارے گاؤں ہمارے لوگ' (۲۰۱۱ء)، My Reflection (۲۰۱۳ء) اور کافی وقفے کے بعد اب اس پوتھی کو اٹھایا ہے لیکن اس دوران خاموش نہیں بیٹھا۔ خلا میں جست لگائی اور ایک Blog کھول دیا اس میں اناپ شناپ کچھ بھی بھرتا گیا اس سے بھی آسودگی نہیں ہوئی تو www.Rizwanullah.com کے عنوان سے ایک سائٹ ۲۰۱۵ء میں کھول دی جو بحمداللہ اب تک کھلی ہوئی ہے۔ میری ساری کتابیں اس سائٹ پر موجود ہیں۔ زہرہ کی تصنیفات بھی اس سائٹ پر موجود ہیں۔

کلکتہ میں چوبیس سال کی صحافت کا اعمالنامہ یہاں نہیں ہے۔ اس قدر بتانا کافی ہے کہ ۱۹۷۵ء میں کلکتہ کو الوداع کہنے سے پہلے Urdu Selftought لکھ آیا تھا جسے داس گپتا پرکاشن نے شائع کیا تھا، اس سے پہلے Janson Primer ۱۹۶۲ء میں اور اس کے بعد Janson Reader لکھی تھی جسے دارالاشاعت اسلامیہ نے شائع کیا جس کے نہ معلوم کتنے ایڈیشن اب تک شائع ہو چکے ہیں۔

اس تمام عرصے میں خارجی دنیا میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات اور وقوعات کا مشاہدہ کرتا رہا۔ رائے سینا ہلز پر سیاست کی بساطوں پر بازیاں جاری رہیں، پارٹیوں اور افراد کی قسمتوں کے فیصلے ہوتے رہے۔ ذاتی محاذ پر میری سب سے چھوٹی بیٹی زہرہ کی شادی ہوگئی وہ اپنے گھر میں شاداں وفرحاں ہے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبہ فارسی میں پروفیسر ہے۔ گزشتہ سال کے اواخر میں اہلیہ کی طویل علالت کے بعد وفات ہوگئی۔ اناللہ وانا الیہ راجعون! ابھی یہ زخم تازہ ہی تھا کہ چند ماہ قبل میرے چھوٹے بھائی پروفیسر فیضان اللہ فاروقی کی مختصر علالت کے بعد وفات ہوگئی۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ ان محرومیوں کو لفظوں میں نہیں بیان کرسکتا۔ اب اپنی تمام کمزوریوں کے ساتھ ایک قید تنہائی ہے۔ دیکھئے اب اس تھکے ہارے مسافر کی شکستہ کشتی کو بادِ حوادث کے تھپیڑے کب اور کہاں کنارے لگاتے ہیں۔ **واللہ اعلم بالصواب.**

شاہین باغ

ابھی ابھی ہماری آنکھوں کے سامنے بجلی کا ایک کڑکا ہوا جسے شاہین باغ کا نام دیا گیا۔ یہیں اس کا مختصراً تذکرہ بطور حوالہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ سارا عالم اس کی تفصیلات سے آگاہ اور باخبر ہے شہری حقوق سے متعلق حکومت کے ایک قانون اور اس کے دور رس مہلک اثرات کے اندیشوں نے ہندوستانی مسلمانوں کو لرزہ براندام کر دیا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اس کے خلاف احتجاج کا علم مسلم خواتین نے بلند کیا، اس تحریک کی ابتدا ہمارے پڑوس میں شاہین باغ میں ہوئی اس لیے اس کو یہی نام مل گیا اور اسی نام سے ملک کے گوشے گوشے میں اس تحریک کے علم بلند ہو گئے اور حیرت کی بات یہ ہے کہ اسی نام سے یہ تحریک دنیا بھر میں پھیل گئی۔ یورپ اور براعظم امریکہ کے شہروں میں شاہین باغ ابھر آئے۔ اس کوندے نے ساری دنیا کی آنکھیں چکا چوند کر دیں۔ ہندوستان میں جابجا جبر و استبداد کی داستانیں لکھی جانے لگیں۔ حیرت اور سخت حیرت ہے کہ حقوق نسواں کی عالمگیر تحریکیں عشروں اور قرنوں میں جو نہیں کر سکیں ناخواندہ اور خانہ نشین کہی اور سمجھی جانے والی مسلم خواتین نے وہ سب کچھ کر دکھایا۔

شاہین باغ آزاد ہندوستان کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہے۔ موسم کی چیرہ دستیوں کے باوجود کھلے آسمان کے نیچے مہینوں نہایت صبر و استقامت اور نظم و ضبط کے ساتھ بیٹھے رہنا ایک لاثانی مثال ہے۔ مہلک حملے، عقوبت کی دھمکیاں، برقع پہن کر گھس آنے والے تخریب کاروں کی حرکتیں، ضمیر فروش نامہ نگاروں کی بداخلاقیاں یہ سب کچھ ان خواتین کے پائے استقامت کو متزلزل نہیں کر سکیں تا آنکہ کرونا وائرس نام کا عذاب نازل ہو گیا اور شاہین باغ اجڑ گیا۔ بطنِ گیتی سے جو نیا آفتاب طلوع ہو رہا تھا وہ گہنا گیا۔

سوشل میڈیا

گزشتہ صدی کے آخری عشروں کے دوران الکٹرانک میڈیا میں جو انقلابات برپا

ہوئے ان کے نتیجے میں ٹوٹتی بکھرتی اقدار والی جمہوریت کے چوتھے ستون کے جسم پر ایک نئی پود اگ آئی جسے سوشل میڈیا کا نام دیا گیا۔ یہ رائے عامہ کے اجارہ دار نیشنل میڈیا کے لیے ایک بڑا چیلنج نظر آ رہا ہے۔ اس کا ایک بڑا حصہ یرقان زدہ ہونے کے باوجود امید کرنی چاہیے کہ یہ بے زبان عوام کی صوت وصدا بنا رہے گا، گو اس کے لیے وسائلِ حیات تنگ اور کشمکشِ حیات سخت ہے لیکن قدرت کے لیے کچھ بڑی بات نہیں کہ پرِ کاہ کو قُلّۂ کوہ بنا دے اور ''مورِ بے مایہ کو ہمدوش سلیماں کر دے''۔

آخری بات

اس تحریر کے کچھ حصے لکھے ہوئے پڑے تھے، اور کچھ نوٹس بھی، لیکن ان کو مرتب کر کے ایک کتاب کی شکل دینا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ موجودہ حالات میں تنہائی شریک حال ہے زہرہ نے مجھے مصروف رکھنے کی حکمت کے طور پر بہ اصرار اس کام سے لگا دیا۔ اس کے بعد خالد فیصل حوصلہ افزائی کرنے لگے اور کمپوزنگ کا کام بڑی چابکدستی اور خوش اسلوبی سے انجام دے ڈالا۔ ان کے برادر عزیز ساجد خلیل نے ٹائٹل بنانے کی ذمہ داری لے لی، میری سابقہ تصنیفات کے ٹائٹل بھی انہی کے بنائے ہوئے ہیں۔ اس ٹائٹل کے لیے فوٹو میری بیٹی زبیدہ نے فراہم کیا۔ یہ مقفل ویرانہ کبھی ہمارا آشیانہ تھا۔ اس کارگراں میں تعاون کے لیے اللہ ان سب کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ آمین!

☆☆☆

پہلا ورق

ابتدائی حالات

''نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم'' لیکن 'حکایتِ ہستی' جو درمیاں سے سنی، وہ کچھ اس طرح ہے کہ ضلع اعظم گڑھ (یوپی) کے ایک دور افتادہ گاؤں سمبھی میں جہاں میرا نانیہال تھا، میں نے حیرت کدۂ عالم پر پہلی نظر ڈالی۔ وہ ۱۹۳۰ء کے آس پاس کوئی تاریخ تھی، لیکن جب اسکول میں داخلہ ہوا تو میری تاریخ پیدائش ۱۵/جولائی ۱۹۳۱ء درج کرائی گئی چنانچہ مستند تاریخ وہی ہے۔ میری کنیت فاروقی بھی نہیں درج کی گئی۔ میری عمر کے پہلے سال کے بارہ مہینے بھی نہیں پورے ہوئے تھے کہ میری ماں نے اس شیر خوار کو اپنی ماں کے آنچل میں ڈال کر رحلت فرمائی۔ ایک ناعاقبت اندیش سانپ اس کا موجب ہوا۔ شعور کی آنکھیں آج تک لاشعور کے ناپیدا کنار بیابانوں میں اس خلد آشیاں کی صورت تلاش کرتی رہتی ہیں۔

قرآن اور اردو کی ابتدائی تعلیم گھر ہی میں ہوئی لیکن اس کی ابتدا سے پہلے ہی میں دیگر مشاغل شروع کر چکا تھا، جہاں تک مجھے یاد ہے گاؤں کے باہر کچے راستے پر بیل گاڑیوں کے پہیوں کی بنائی ہوئی گہری لیکھ میں بھری ہوئی دھول کو ٹھوکروں سے اڑانا اور اس میں دوڑتے پھرنا بچپن کا پہلا دلچسپ مشغلہ تھا۔ جب حوصلے اور بڑھے تو گاؤں کے تالاب اور پوکھرے کے گدلے ٹیالے پانی میں کھیلنے سے شغف بڑھا۔ بڑوں کی ساری

توجہات کے باوجود میں اپنے پسندیدہ مشاغل کے لیے راہیں تلاش کر لیتا اور اس میں نہ گرمیوں کی تپش نہ جاڑوں کی ٹھار حائل ہوتی۔ رفتہ رفتہ پیڑ پر چڑھنے کا فن بھی سیکھ ہی نہیں لیا بلکہ اس میں خاصی مہارت حاصل کر لی۔ تاڑ کے علاوہ کوئی درخت خواہ کتنا ہی دشوار گزار کیوں نہ ہو میری دسترس سے نہیں بچ سکتا تھا۔ آگے چل کر مچھلی اور چڑیوں کا شکار لڑکپن کے مشاغل میں شامل ہوگیا۔ غلیل، کمپا، مچھلی پکڑنے کے لگے کانٹے وغیرہ میری دلچسپیوں کے سامان ہوگئے۔ اپنی ان مصروفیات کو جاری رکھنے کے لیے مجھے چھری، چاقو، ہولڈر کی نب جیسی چیزوں کی ضرورت ہوا کرتی۔ جب باورچی خانے سے چھری یا قلمدان کے ہولڈر سے نب غائب ہوتی تو سب سے پہلے اس کی پرسش مجھ سے ہی ہوا کرتی۔

تین ہم جولیوں یعنی میرے سمیت چار کی ایک ٹولی تھی، جو دھول، کیچڑ، پانی، کھیت کھلیان، باغ اور ویرانے میں بیک جان چہار قالب موجود رہتی۔ ان میں سے ایک سمیع اللہ کوئی ۱۴-۱۵ برس کی عمر میں سانپ کے ڈسنے سے جاں بحق ہوا۔ دوسرا غلام ربانی تقسیمِ وطن کے نذر ہوا اور مرحوم مشرقی پاکستان میں کہیں کھو گیا۔ تیسرا جس کا نام صرف محمد تھا، سمجھی میں ۲۰۰۶ء میں دنیا سے رخصت ہوا۔ سنا ہے اس کے بیٹوں کی معرفت براہ عرب اس کے حصہ میں بڑی خوشحالی آئی، ورنہ اس کے بڑے بھائی نے جو محکمہ پولیس میں تھے اس کو زندہ درگور رکھنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی۔

کھانے پینے کے معاملے میں ہم بے حد بے نیاز واقع ہوئے تھے۔ اس عمر میں تو یونہی یہ سب دوسروں کا دردِ سر ہوا کرتا ہے۔ دروازے پر تین جوڑی بیلوں کے علاوہ بھینس اور گائے بھی ہودیوں سے لگی ہوتیں، چنانچہ گھر میں ایک کوٹھری دودھ کے بندوبست کے لیے وقف تھی، جہاں دودھ گرم ہوتا، بالائی اتاری جاتی، دہی جمایا جاتا، گھی نکالا جاتا۔ اس کاروبار میں ہمارے لیے کسی مرحلہ پر کوئی رکاوٹ نہیں تھی، جہاں سے چاہیں جب چاہیں دودھ لے کر پی لیں یا بالائی دہی وغیرہ کھالیں۔ لیکن نہ معلوم کیوں ان چیزوں سے ہمیں کوئی خاص رغبت نہیں تھی۔

کسب ہماری جبلت تھی اس لیے فصل کے مطابق آم، جامن، امرود، انار، بیر گولر وغیرہ پھل جب اور جہاں دستیاب ہوتے حسبِ توفیق بدست خود دہان خود کے اصول پر عمل کرتے۔ اگر گھر میں آم کی پال پڑی ہے تو بھی حسب خواہ استفادہ کرتے۔ کوئی گنتی شمار ممکن بھی نہ تھا کہ ایک کوٹھڑی میں آموں کی پال کی وجہ سے قبرستان کا منظر ہوا کرتا تھا۔ بڑوں کو پتہ رہتا ہوگا کہ کس قبر میں کس پیڑ کا آم دفن ہے ہمیں نہ اس کی تمیز تھی نہ اس سے سروکار۔ کھیت کھلیان میں مٹر، چنے، گنے وغیرہ سے براہِ راست شغل فرماتے۔ بشرط دستیابی خربوزے، ککڑی، پھوٹ، بھٹے بھی حسبِ خواہ کھا لیتے۔ دن ڈوبتے ڈوبتے گھر میں ضرور آجاتے بالکل اسی وقت کہ جب بگلے کھیت کی مینڈوں اور تالاب کے کناروں سے اڑ اڑ کر پیڑ کی ٹہنیوں پر آجاتے اور فضا میں حل گرد کے نفیس ذرات سے چھنی ہوئی سنہری چھاؤں میں مویشیوں کے ریوڑ اپنے مرکز کی طرف واپس آتے۔

ہم گھر میں آتے ہی کھانے کے لیے آفت مچاتے کہ اس کے بعد فوراً بے خبر ہونا تھا۔ باورچی خانے کی ذمہ دار خاتون کے لیے اور دیگر خواتین کے لیے بھی ہمارے شور و غوغا کی وجہ سے مغرب کی نماز پڑھنا مشکل ہوجاتا۔ نہ معلوم کیسی کیسی کہاوتوں سے ہمیں بہلایا جاتا کہ اس وقت دن رات ملتے ہیں اس وقت کھانے سے گدھے کی عقل ہوجاتی ہے۔ اس وقت کس گدھے کو عقل کے فلسفہ میں پڑنے کا دماغ تھا۔ جوں توں کر کے مغرب بعد ہوا جو کچھ کھا سکے یا کھلایا جاسکا کھایا پیا اور بے خبر ہوگئے۔ تب کیا معلوم تھا کہ اس کا خمیازہ یہ بھگتنا ہوگا کہ ساری جوانی راتوں کی نیند حرام رہے گی!

یاد نہیں کہ پڑھنے لکھنے کی ابتدا کب اور کیسے ہوئی لیکن اتنی بات یقینی ہے کہ فروری ۱۹۳۴ء کا زبردست اور تباہ کن زلزلہ میری یادداشت کی بالکل ابتدائی جھلکیوں میں سے ہے اس وقت تک کسی کتاب سے میری شناسائی نہیں ہوئی تھی۔ میں باہر کھیل رہا تھا جب چلنے کی کوشش کرتا گر پڑتا، اتنے میں میرے نانا مرحوم کے چھوٹے بھائی نے جنھیں ہم چچا کہتے تھے، (شیخ سعیداللہ صاحب کا ذکر آئندہ آئے گا) دوڑ کر مجھے اٹھایا اور گنے کے

پھوکے کے ڈھیر پر پھینک دیا اور چیخ کر کہا کہ یہیں پڑے رہنا۔ میں خوف اور دہشت کے عالم میں ساکت پڑا رہا اور سب کو بدحواس اِدھر اُدھر بھاگتے دیکھتا رہا کچھ دیر بعد وہ آئے اور مجھے گود میں اٹھا کر اندر لے گئے جہاں ایک مکان کے نسبتاً بڑے صحن میں محلے کی ساری عورتیں اکٹھا ہوگئی تھیں، وہاں نانی نے مجھے گود میں لے لیا اور دیر تک ٹہلاتی رہیں۔

بہرحال پڑھنے لکھنے کی ابتدا جب اور جیسے بھی ہوئی ہو اتنی بات ضرور ہے کہ اس سلسلہ میں کوئی رسمی کارروائی نہیں ہوئی اور قرآن میری والدہ نے مجھے پڑھایا۔ میں اپنی والدہ کو خالہ جان کہتا تھا کیونکہ دراصل وہ میری خالہ جان تھیں۔

بات یوں ہوئی کہ اس دنیا میں مجھے آنکھ کھولے ہوئے صرف گیارہ مہینے گزرے ہوں گے کہ ایک اندھیری رات میں زینے پر کنڈلی مارے ہوئے ایک مارِ سیاہ کی ناعاقبت اندیشی نے میری ماں اور میرے درمیان ہمیشگی کا فاصلہ قائم کردیا۔ میں نانی کے گلے کا تعویذ قرار پایا۔ کچھ عرصے بعد میری خالہ جان کو میری ماں بن جانے کا رتبہ حاصل ہوا۔ انھوں نے ہی مجھے ابجد سے روشناس کرایا اور قرآن پڑھایا اور میرے مشاغل طفلی میں ان کا عمل دخل رفتہ رفتہ بڑھتا گیا یعنی اگر دن بھر کی غیر حاضری کے بعد بھی میں گھر میں داخل ہوتا تو وہ کھانا جس کے لیے میں قیامت برپا کیا کرتا تھا اس وقت تک دسترس میں نہیں آتا جب تک کم سے کم آموختہ نہ دوہرالوں۔

کچھ عرصہ اسی طور گزرا۔ کچھ اور شعور آیا تو اپنے گھر یعنی اعظم گڑھ ضلع کے ہی ایک اور دور افتادہ گاؤں اپنے دادیہال کوئریاپار اور اپنے نانیہال سمبھی کے درمیان میری آمدورفت شروع ہوئی۔ اس اثناء میں نہ معلوم کن کن بزرگوں نے مجھے بنظرِ شفقت دیکھا، اپنی شفقتیں اور محبتیں مجھ پر نچھاور کیں۔ میں ان لوگوں کی شفقتوں اور محبتوں کے بوجھ کو اب بھی اپنی روح پر مسلط پاتا ہوں، میں کیا اور میری بساط کیا۔ میں اس کا بدلہ ان لوگوں کو نہ تب دے سکا نہ اب دے سکتا ہوں نہ کبھی اس بار سے سبکدوش ہوسکوں گا۔ ربِ ذوالجلال سے دست بدعا ہوں کہ ان سب کو ان کے خلوص اور بے لاگ محبتوں کا وہ تمام

اجر عطا فرمائے جو اس کی عنایاتِ بے پایاں کے لیے ممکنات سے ہیں۔

میری نانی نے جو بیوہ تھیں میری ماں کے آخری لمحات میں اس سے یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ جس شیر خوار کو چھوڑے جا رہی ہیں اسے وہ اپنے گلے کا تعویذ بنا کر رکھیں گی اسی تعویذ کی برکت تھی کہ میں بالکل آزاد تھا جو جی میں آتا کرتا نہ کوئی انگلی اٹھا سکتا تھا نہ آنکھ دکھا سکتا تھا۔ جبلت آزاد پائی تھی اس لیے گلے کا تعویذ ہوتے ہوئے بھی مجھے قطعی نہیں یاد کہ کبھی آنچل کے زیرِ سایہ بھی تھا۔ پاؤں نکالے تو گھر کی چہار دیواری کے باہر کھیت کھلیان، پیڑ پودے، باغات میدان اور پوکھرے تالاب میری جولانگاہ تھے۔

میرے شعور نے ابھی پوری طرح آنکھ بھی نہیں کھولی تھی کہ ایک دن اُن بزرگہ کو نہ معلوم کیا سوجھی کہ وہ اپنے وعدے سے پھر گئیں اور اس تعویذ کو نوچ پھینکا۔ ایک دور افتادہ گاؤں میں ایک ایسی ضعیفہ جن کی تعلیم صرف مذہبی فرائض کی انجام دہی کے لیے کافی تھی ایسی بصیرت کی حامل کس طرح ہوسکتی تھیں یہ سوچ کر میں آج تک حیران ہوں خدا ان کی تربت کو تا ابد نورانی رکھے اور میرے تمام گناہوں سے صرفِ نظر کر کے اتنی دعا قبول فرمالے کہ حشر میں اس کی قدم بوسی کا شرف عطا فرمائے۔

جولائی کی ابتدائی تاریخیں رہی ہوں گی، سال ۱۹۳۷ء رہا ہوگا میرے ماموں مولوی حفیظ الرحمٰن صاحب ایمنؔ شہابی گرمی کی چھٹیاں گزار کر کانپور واپس جا رہے تھے۔ وہ میری نانی کے اکلوتے بیٹے تھے کانپور میں اسکول ٹیچر تھے، نانی نے مجھے ان کی تحویل میں دے دیا۔ جب میں پہلی بار کانپور کے لیے روانہ ہوا تو وہ منظر دھواں دھواں سے نظروں میں ہے۔ میری نانی جنھیں میں اماں کہتا تھا اور سمجھتا بھی تھا رو رو کر آپے سے باہر ہوئی جا رہی تھیں میری بلائیں لیتی ہوئی بڑھتی جا رہی تھیں اور ان کے جلو میں سارے گھرانے کی عورتیں تھیں اسی عالم میں وہ لمبی گلیاری سے گزرتی ہوئی بڑے دروازے تک آئیں۔ گھر کی عورتیں عام طور سے وہاں تک نہیں آیا کرتی تھیں بلکہ ڈولی یا پالکی اندرونی دروازے تک جایا کرتی تھی۔

اس وقت گاؤں اور شہر کے درمیان آمدورفت کے لیے سواری کا کوئی باضابطہ انتظام نہ تھا محض ایک دو یکے تھے جو کسی کو مل جائیں وہ بھی عموماً کچہری کے اوقات کی مناسبت سے چلا کرتے تھے۔ چنانچہ ماموں جان کے ساتھ میں بھی گاؤں سے پیدل اعظم گڑھ اسٹیشن کے لیے چل پڑا اور جب تک گاؤں نظر آتا رہا پلٹ پلٹ کر پیچھے دیکھتا رہا۔ راستے کے مکمل سناٹے میں صرف فاختوں کی قوں قوں سنائی دیتی۔ اس کی یہ آواز اسی وقت سے جیسے میرے دل کو چھوتی ہے۔

اعظم گڑھ سے کانپور کا فاصلہ تب بھی دس گھنٹے کا تھا اب بھی دس گھنٹے کا ہے۔ وہی ریل کی ڈگر ہے۔ اعظم گڑھ سے شاہ گنج تک چھوٹی لائن (جو اب بڑی لائن ہوچکی ہے) پھر شاہ گنج میں طویل انتظار کے بعد لکھنؤ اور وہاں سے کانپور۔ صبح ۱۰ر بجے سے رات ۸ر بجے تک کا سفر۔ اب بھی شاہ گنج اور لکھنؤ کے درمیان دہرادون ایکسپریس کی اہم ترین کڑی موجود ہے جس نے ہمیں ۱۹۳۷ء میں کانپور سے جوڑا تھا۔ یہ ضرور ہے کہ اب وہی گاڑی پلیٹ فارم سے بھی زیادہ لمبی ہوتی ہے، تب بہت چھوٹی ہوتی تھی اور خود پلیٹ فارم بھی بہت چھوٹا تھا جہاں دھوپ اور بارش سے مسافروں کے بچاؤ کا کوئی بندوبست نہ تھا۔ اب متبادل کے طور پر بسیں بھی چلنے لگی ہیں، تب ایسا چلن نہیں تھا۔ تھوڑے فاصلوں کے لیے کہیں کہیں ایک آدھ بسیں چلتی تھیں وہ بھی منی بسوں سے زیادہ بڑی نہیں ہوتی تھیں۔ میں نے کانپور پہنچ کر پہلی بار بجلی کے قمقموں میں کسی شہر کا چہرہ دیکھا۔

اعظم گڑھ اور شاہ گنج کے درمیان تو خیر چھوٹی لائن تھی۔ شاہ گنج میں جب ہم لوگ دہرہ دون ایکسپریس میں سوار ہوئے تو وہ چند بوگیوں پر مشتمل نفیس ٹرین تھی اور مسافروں کا یہ عالم تھا کہ ٹرین چھوٹنے کے بعد ماموں جان نے اپنی شیروانی کو سیٹ پر بچھایا اور مجھے یہ ہدایت کر کے تم نہ سونا خود سو گئے۔ ہم سوتے بھی کیسے ہمارے لیے تو سب کچھ نیا تھا، ان کو دیکھنا بھی تھا۔ تیز رفتار ریل گاڑی کے قریب کی زمین کو اتنی ہی تیز رفتاری سے پیچھے بھاگتے اور دور کی آبادیوں، پیڑ پودوں کو نسبتاً کم رفتار سے ٹرین کی سمت میں چلتے رہنے کا

حیرت انگیز مشاہدہ پہلی بار ہوا تھا۔ دائرے کے اندر دائرے مختلف رفتاروں سے مختلف سمتوں میں چلتے ہوئے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے جب تک دیکھ سکتا تھا دیکھتا رہا۔ ہاں سمبھی چھوٹنے کا صدمہ کبھی کبھی چٹکیاں لے کر اس حیرانی سے چونکا دیتا۔

شام کو لکھنؤ پہنچے اور فوراً ہی کوئی ٹرین کانپور جانے والی مل گئی۔ اگلے دو گھنٹوں میں کانپور تھے۔ ٹرینوں میں نہ بھیڑ بھاڑ نہ ہنگامہ حشرات۔ اگلے دن کانپور میں میری زندگی کی نئی صبح تھی۔

☆☆☆

سمبھی

لیکن ابھی سمبھی کو نظر بھر دیکھنا ضروری ہے گو آج کا سمبھی وہ سمبھی نہ رہا جہاں صبح وشام کی سنہری کرنوں کے تانے بانے سے چھنی ہوئی لطیف گرد کا غلاف اب بھی میرے ذہن پر سایہ فگن ہے۔ میں اس کے سحر سے کبھی آزاد نہ ہوسکوں گا۔ وہ ایک ایسا حسین خواب ہے جسے میں ہمیشہ دیکھتے رہنا چاہتا ہوں، لیکن خواب تو خواب ہی ہوتا ہے جس کا طلسم ہوش ربا اپنی سحر کاریاں چھوڑ گیا ہے۔

میرے اس سمبھی کے آثار میں سے یادوں کے سوا کچھ بھی باقی نہ رہا پھر بھی کہنے کو بہت کچھ باقی ہے۔ سمبھی میں جو کچھ تھا، جو خوشحالی اور فراوانی تھی وہ میرے نانا احمد اللہ صاحب مرحوم و مغفور کے چھوٹے بھائی شیخ سعیداللہ صاحب کی ہمہ جہت شخصیت کی کارفرمائیوں کی رہینِ منت تھی۔ وہ میری والدہ کے چچا تھے لیکن صرف وہی ان کو چچا نہیں کہتی تھیں بلکہ سارا گاؤں بلکہ گاؤں سے لے کر شہر تک سارے راہگیر اُن کو چاچا کہتے تھے اور سلامی لیتے ان کا راستہ کٹتا۔ میں بھی ان کو چچا کہتا۔ یوں وہ اطراف و دیار میں دور دور تک سداً میاں کے نام سے مشہور تھے۔ میری تعلیم و تربیت میں ان کا کوئی عمل دخل نہ تھا لیکن میری ابتدائی پرورش انہی کی چھتر چھایا میں ہوئی۔ باہر وہ اور گھر کے اندر میری نانی، بس ہماری حکمرانی کا راز انہی دونوں کے وجود میں مضمر تھا۔

چچا میری زندگی کے بیشتر عوامل پر لاشعوری طور پر چھائے رہے۔ اگر میں یہ کہوں کہ وہ میرے لیے ایک آدرش کی حیثیت رکھتے تھے تو یہ کہنا بڑی حد تک درست ہوگا۔ ہر روز ان کی مصروفیات کا آغاز اس وقت ہوتا جب آسمان تاروں سے بھرا ہوتا اور غروب آفتاب تک ان کی مصروفیتیں جاری رہتیں۔ اس میں کھیت کھلیان کے انتظامات، گاؤں سے شہر تک کے معاملے، مقدمے کا بندوبست اور پیروی، ہر کسی کی سماجی ضرورتیں پوری کرنے کی فکر اور ان کا اہتمام، مخالف کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے کی تدبیریں، ہر طرح کے شکار کا شوق، طرح طرح کے مہمانوں کی میزبانی، گاؤں کی تمام تقریبات میں بھرپور شرکت، مختصر یہ کہ ان کے عمل دخل کے بغیر گاؤں میں ایک تنکا نہیں ہل سکتا تھا۔

وہ جاڑے کے ٹھٹھرتی ہوئی اندھیری راتوں میں جھیل میں ڈبکی لگا کر مرغابیوں کا شکار کرتے، ہرن کا شکار کرتے۔ ایک بار تو انھوں نے ایک ہرن کو دیکھا کہ دوپہر میں ایک پیڑ کے سائے میں ایک نالے میں کھڑا ہے۔ اس چلچلاتی دھوپ میں وہ نہ معلوم کہاں سے اس طرف جا نکلے، ہرن کو دیکھتے ہی ایک جست لگائی اور اس کے دونوں سینگ دونوں ہاتھ سے پکڑ لیے اور اس کو پیچھے ڈھکیلتے ہوئے کچھ دور تک لے گئے جہاں ایک اینٹ پڑی ہوئی تھی، بس ایک ہاتھ سے سینگ چھوڑ کر اینٹ اٹھالی اسی سے ہرن کے سر پر مار مار کر اس کو گرادیا۔ ان کی صحت خداداد تھی۔ ۱۹۸۲ء میں تقریباً سو برس کی عمر میں ان کا انتقال ہوا۔ اس وقت تک ان کے سارے دانت سلامت تھے۔ عینک کے بغیر پڑھ لکھ لیتے تھے۔ ان کے سر کے بال ابلقی تو ہوگئے تھے لیکن اتنے ہی گھنے تھے جتنے کہ میں دیکھتا آیا تھا۔ ۱۹۷۶ء میں یعنی انتقال سے صرف چھ برس پہلے کسی مقدمے کے سلسلے میں تنہا لکھنؤ آئے تھے تو وہاں سے دہلی بھی آگئے۔ اسٹیشن سے سیدھے ہمارے دفتر پہنچے، وہاں میں موجود نہ تھا، ایک ساتھی نے ان کو اوکھلا کی بس پر بٹھا دیا اور وہ میرے گھر پہنچ گئے۔ دو ہفتے قیام کے بعد تنہا واپس گئے۔ آخری ایام میں ان کی ٹانگیں کمزور ہوگئی تھیں لیکن ان کی زندہ دلی میں فرق نہیں آیا تھا۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائیں اور ان کے مدارج بلند فرمائیں۔

اس کا سامان بھی انھوں نے کافی اکھٹا کیا تھا۔ گاؤں کی جن لڑکیوں کے میکے والے نہیں رہے تھے وہ بلاتکلف اپنے بال بچوں سمیت آجاتیں اور انہی کے گھر قیام کرتیں، اسی کو میکہ سمجھتیں اوران کی خوشیوں کی انتہا نہ ہوتی۔اب ایسا کون باقی ہے۔

ان کے مکان کے پچھّم طرف ایک وسیع علاقے میں کھلیان تھا جہاں اب دکانیں تعمیر ہوگئی ہیں اور بازار قائم ہوگیا ہے۔اس کھلیان کے ایک سرے پر منگرو کا گھر تھا۔ وہ ملایا میں کام کرتے تھے چار پانچ سال پر آیا کرتے تھے۔پچھلی جنگ عظیم کے زمانے میں وہ وہاں پھنس گئے، ان کے ساتھ ان کی نو بیاہتا بیٹی کا شوہر بھی تھا۔آٹھ دس برس تک سسر داماد دونوں میں سے کسی کا کچھ پتہ نہ چلا، گھر والوں نے ان کو خیر باد کہہ دیا۔نو بیاہتا لڑکی انتظار کی تاب نہ لاسکی اور تپ دق میں مبتلا ہوکر اللہ کو پیاری ہوئی۔منگرو کے تین بیٹوں میں سے چھوٹے دو جو بارہ چودہ برس کے رہے ہوں گے کسی وبائی مرض میں ایک ہفتہ کے اندر ہی ختم ہوگئے۔منگرو کو بھی اپنے گھر کی کچھ خبر نہ تھی۔ایک دن اچانک سسر داماد دونوں بہت سارے سامانوں سے لدے پھندے وارد ہوئے تو گھر میں صرف ان کی بیوی اور ایک بیٹا رہ گئے تھے۔ یہ تو ان کے گھر کا نقشہ تھا،لیکن دوسری طرف صورت یہ تھی کہ ان کی عدم موجودگی کی ساری مدت کے دوران ان کے گھر کا اور کھیتی باڑی کا سارا کام چچا (یعنی شیخ سعیداللہ صاحب) اپنے آدمیوں سے کرواتے۔

ان کے ایک بیٹے امتیاز احمد صاحب تھے جو داروغہ کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے اور ایک بیٹی تھی جو بنارس میں قاضی محمد اختر صاحب سے منسوب تھیں۔ یہ دونوں بھائی بہن لاولد تھے۔ پکڑ کے ایک پیڑ کا آگے قدرے تفصیل سے ذکر آیا ہے اسی کے سائے میں زمینداروں کا وہ قبیلہ پھل پھول رہا تھا، جس میں میرا ننہال تھا۔اس قبیلے میں جو افراد باہر جاکر نوکری چاکری کرتے وہ بھی پنشن لے کر گاؤں واپس آتے اور اسی پکڑ کے سائے میں خوش گپیاں کرتے بقیہ زندگی گزار دیتے۔اس قبیلے کے کوئی نصف درجن افراد محکمہ پولیس میں داروغہ ہوئے جو اس زمانے میں بڑے رعب داب کا عہدہ سمجھا جاتا تھا۔

اعظم گڑھ صدر تحصیل میں شہر سے کوئی تین کوس یعنی چھ میل دکھن میں سمبھی واقع ہے۔ اس زمانے میں ایک چوڑا کچا راستہ شہر اور گاؤں کے درمیان واحد رشتہ تھا جس پر بیل گاڑی کے پہیوں کے گہرے نقوش بنتے بگڑتے رہتے تھے۔ یہی شاہراہ ضروریات زندگی کی فراہمی کے لیے شہِ رگ کی حیثیت رکھتی تھی۔ اطراف کے بنئے اونٹ اور ٹٹوؤں پر بھی اپنا مال لاد کر لاتے لے جاتے۔ اتفاقاً کوئی یکہ بھی دھول اڑاتا چرچوں کرتا گزر جاتا جس پر کچہری آنے جانے والے آٹھ آٹھ آدمی چپکے ہوتے۔ گاؤں سے قریب ترین ندی ٹونس تھی جو برسات میں شہر اعظم گڑھ کا جغرافیہ کچھ سے کچھ کر دیا کرتی تھی لیکن گاؤں میں گڑھی پوکھرے تھے جن کا پانی آبپاشی کے لیے استعمال کیا جاتا۔

باہر سے سمبھی آتے ہوئے دور ہی سے گاؤں کے آثار نظر آنے لگتے یعنی تاڑ کے اونچے اونچے درختوں کی قطاریں۔ شاید اس خطے کی آب و ہوا تاڑ اور کھجور کے درختوں کے لیے موافق تھی یا دیگر درختوں کے لیے زیادہ موافق نہ تھی کیونکہ آم وغیرہ کے باغات بہت کم تھے، جو درخت تھے بھی وہ تخمی تھے لیکن ان پر مبالغے کی حد تک کثرت سے پھل آتے یعنی ہزاروں میں۔ زیر کاشت زمینوں کے علاوہ بہت زمینیں اوسر اور بنجر تھیں جہاں گھاس بھی کافی نہیں اگتی۔ ریہہ کی پرتیں زمین پر جم جایا کرتیں، جسے کھرچ کر دھوبی گدھوں پر لاد کر لے جایا کرتے اور کپڑوں پر مل کر رکھ دیتے جنھیں اگلے دن تالابوں کے کنارے پتھر یا لکڑی کے پاٹوں پر پٹک کر صاف کرتے۔

شاید زمینوں کے کم اُپجاؤ ہونے کی وجہ سے زیر کاشت اراضیوں پر کاشتکاروں کو بڑی محنت کرنی پڑتی تھی۔ مویشیوں کی کھاد سال بھر اکھٹا کی جاتی تھی اور بوقت ضرورت کھیتوں میں ڈالی جاتی تھی، کیمیاوی کھادوں کا کوئی تصور نہ تھا۔ زمینوں کو بارآور بنانے کے لیے ایک دلچسپ طریقہ بھیڑوں کو کھیت میں بٹھانے کا تھا۔ گڈریے اپنی بھیڑوں کا پورا ریوڑ لے کر اس کھیت میں رات بسر کرتے جس میں کھاد کی ضرورت ہوتی اس کے لیے فی بیگہ فی رات کے حساب سے کوئی معاوضہ مقرر ہوتا۔ گڈریے رات میں بار بار ساری

بھیڑوں کو اٹھاتے تا کہ وہ ہر بار حرکت پر مینگنیاں کرتی رہیں۔

اس زمانے میں لوگ ٹیوب ویل کے نام سے آشنا نہ تھے اس لیے کنوئیں اور تالابوں کے پانی سے حسبِ ضرورت آبپاشی کیا کرتے تھے آج اس عمل کی محنتِ شاقہ کا اندازہ مشکل ہے۔ بیلوں کے ذریعے چلنے والی ریہٹ کا بھی رواج تھا۔ پانی کی یہی کھینچ تان کبھی کبھی آپس کے جھگڑوں بلکہ مار پیٹ اور معاملے مقدمے تک کا سبب بن جاتی۔

سمبھی کا ڈاک خانہ تقریباً دو میل کے فاصلے پر واقع ایک قصبہ چنڈیسر میں تھا جو اعظم گڑھ سے غازی پور جانے والی سڑک کے کنارے واقع تھا۔ اطراف کے مواضعات میں آنے والی ڈاک اعظم گڑھ سے چنڈیسر آتی وہاں سے کسی اور ڈاک خانے کا تھیلا لے جانے والا ہرکارہ سمبھی کے راستے سے گزرتا، یہ اس کا شارٹ کٹ تھا۔ وہ ایک لاٹھی میں ڈاک کا تھیلا اٹکائے ہوئے لاٹھی کندھے پر رکھے دلکی چال سے ایک پگڈنڈی پکڑے ہر روز ایک معین وقت پر بھاگا چلا جاتا۔ اس کی لاٹھی کے اوپری سرے پر بلم کی نوک جیسا لوہے کا ایک پتر لگا ہوتا اور اس پتر کی جڑ میں دو تین گھنگھرو جڑے ہوتے اس کی وجہ سے ہم لوگوں کو ہمیشہ اس کے اس طرف سے گزرنے کی خبر ہو جاتی۔ ہم لوگ اس کے گھنگھرو کی مخصوص آواز اور اس کی دلکی چال کو دیر تک سنا اور دیکھا کرتے، لیکن وہ ڈاک تقسیم نہیں کرتا تھا یہ کام ڈاک منشی کا تھا۔

منشی جی ہفتہ میں دو بار گاؤں میں آتے ان کے کندھے پر چمڑے کا ایک تھیلا ہوتا تھا، اسی میں لفافہ، پوسٹ کارڈ، منی آرڈر سب کچھ ہوتا تھا اور ہاں ایک عدد ہولڈر کے علاوہ الٹے منہ والی شیشے کی ایک دوات بھی ہوتی جس میں روشنائی سے تر کپڑا پڑا ہوتا۔ الٹے منہ کی دوات میں تر کپڑا رہنے کی وجہ سے ہولڈر کے نب میں روشنائی تو لگتی لیکن منشی جی کے تھیلے میں روشنائی گرنے کا سوال نہیں تھا۔ زندگی کا ہر پہلو سادہ اور آسان تھا۔

ڈاک کا ہرکارہ جو تھیلا لے کر بھاگتا جاتا اس میں بھی منی آرڈر کی رقوم ہوتیں اور منشی جی کے تھیلے میں بھی لیکن کسی لچے لفنگے نے ان میں سے کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر

دیکھنے کی جسارت تو درکنار کسی کے دماغ سے اس کا واہمہ بھی نہیں گزرا، سچ تو یہ ہے کہ وہ کتے جو ایک محلے سے دوسرے محلے میں آنے والے کتوں کو بھی نہیں بخشتے ڈاک کے ہر کارے یا منشی جی پر بھونکتے ہوئے نہیں دیکھے گئے۔

سمبھی ایک چھوٹا سا گاؤں تھا لیکن طبقاتی سماج کا ایک نمونہ تھا۔ دس بارہ گھرانے مسلمان زمینداروں کے رہے ہوں گے، وہی پورے گاؤں اور اطراف کے سیاہ وسفید کے مالک تھے۔ جب ڈسٹرکٹ بورڈ کا الیکشن ہوتا جس میں حق رائے دہی کے لیے ملکیت کی شرط تھی، اس شرط پر گاؤں کے اتنے ہی افراد پورے اترتے تھے کہ وہ ایک ہاتھی کی پیٹھ پر سوار ہوجاتے اور تمام شہرہ ہوجاتا کہ وہ ووٹ دینے جارہے ہیں۔ ان لوگوں کے تقریباً مساوی لیکن ذرا کم درجہ ان کائستوں کا تھا جو لالہ کہلاتے تھے اور ان کا عمومی پیشہ پٹواری کا تھا اور یہ پیشہ یا عہدہ موروثی ہوا کرتا تھا۔ گاؤں کے ایک گوشے میں اکٹھا ان کی آبادی تھی۔ ان کے مدارج کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ زمینداروں کے دروازے پر تمام مسلم اور غیر مسلم اقوام میں صرف انہی کو یہ شرف حاصل تھا کہ وہ چارپائی پر بیٹھ سکتے تھے لیکن عموماً پائینتی۔ اپنے دروازے پر وہ ہمیشہ سرہانے تہہ کیے ہوئے بستر سے ٹیک لگائے بیٹھتے یا نیم دراز رہتے اور اگر کسی زمیندار بچے کو ان سے کوئی کام پڑ ہی گیا تو وہ ان کی پائینتی بیٹھنے کے بجائے کھڑے کھڑے باتیں کرکے چلا آتا۔ کوئی زمیندار خود جاتا ہی کیوں عموماً انہی کو بلوا لیا کرتا تھا لیکن اگر چلا جاتا تو لالہ خود چارپائی سے اٹھ کر کھڑے ہوجاتے اور اس طرح مساوی طور پر باتیں کرکے اپنی اپنی راہ لیتے لیکن ان کی ملاقاتیں بالعموم کھیتوں کی مینڈوں پر ہوا کرتیں۔

مسلمانوں میں بنکر، حجام اور درزی تھے۔ فقیروں کا ایک محلّہ بھی تھا۔ ان لوگوں کو سائیں کہا جاتا تھا۔ غیر مسلموں میں بنئے، تیلی، برئی اور کمہار وغیرہ تھے، جن کے الگ الگ گوشے تھے۔ اسی طرح کہار، بڑھئی، دھوبی، لوہار وغیرہ تھے۔ طبقاتی سماج ضرور تھا لیکن سچ یہ ہے کہ دل سے کوئی کسی کو کم نہیں سمجھتا تھا۔ ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں سب

شریک ہوجایا کرتے تھے۔ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ طبقات کی تقسیم پیشوں کے اعتبار سے تھی۔ ہر پیشہ ور اپنے پیشے کے تئیں پورا خلوص، لاگ اور لگاؤ رکھتا تھا کسی کو احساسِ کمتری نہ تھا۔ کسی ایک پیشہ سے وابستہ فرد کو دیگر تمام پیشوں کے لوگوں سے سابقہ رہتا تھا اس لیے کسی کمتری برتری کا سوال ہی نہیں تھا۔ ہاں زمینداروں کا طبقہ یقیناً ممتاز تھا اسی طبقے میں تعلیم بھی نسبتاً زیادہ تھی۔

سمبھی کے اطراف میں حاشیائی آبادیاں بھروں اور اہیروں کی تھیں جو زمینداروں کی زمینوں پر کام کرتے اجرت میں فصلوں کے موقع پر اناج پاتے یا کوئی قطعۂ زمین انھیں دے دیا جاتا جس کی ملکیت تو زمیندار کی برقرار رہتی لیکن اس کی پیداوار ساری کی ساری اسی مزدور کی ہوتی جس کو وہ قطعہ دیا گیا ہوتا۔ یہ طریقہ عام تھا۔ یہ لوگ اسامی کہلاتے اور زمینداروں ہی کی زمینوں پر آباد ہوتے اس لیے ان کے گھر کا ہر فرد ایک طرح سے زمینداروں کا گروی ہوتا۔ لیکن اس کے عوض اس کو خارجی دست برد سے ہر طرح کا تحفظ حاصل ہوتا۔ یوں بھی یومیہ اجرت کے طور پر جنس کی شکل میں کچھ نہ کچھ مل ہی جاتا مثلاً کھیت کھلیان میں کام کرنے والے دس بجے کے قریب کچھ چنا مٹر اور گڑ لے جاتے جس کو وہ نگُل کہا کرتے تھے (دراصل یہ فارسی 'نُقل' کی بگڑی ہوئی شکل ہے)۔

گاؤں میں پولیس نام کی کوئی چیز دور دور تک نہیں تھی۔ سمبھی کے ایک چوکیدار تھے چکھوڑی سنگھ (وہاں مقامی بولی میں گلہری کو چکھوڑی کہتے ہیں) جب کوئی سرکاری سمن تعمیل کرانا ہوتا یا کوئی اور خاص واقعہ ہوتا تو چکھوڑی سنگھ گاؤں میں نظر آتے۔ ایک ملگجا سا کرتا اور اسی طرح کی دھوتی، پاؤں میں چمرودھا جوتا جس پر گرد کی تہہ جمی ہوئی اور لال پگڑی لپیٹ کر کندھے پر دھری ہوئی۔ زمینداروں کے دروازے پر جوتا پہن کر آنے کا اعزاز بھی ان کو حاصل تھا ان کے علاوہ اگر کوئی اس طرح آسکتا تھا تو وہ ڈاک منشی تھے اور لالہ یعنی پٹواری جو ذات کے اعتبار سے کائستھ تھے جو عموماً لکڑی کی کھونٹی دار کھڑاؤں پہنا کرتے۔

چکھوڑی سنگھ کا گاؤں میں آنا ایک سنسنی خیز واقعہ ہوا کرتا تھا۔ یوں تو وہ آبادی

کے کسی گوشے میں اپنے گھر پر رہتے اور وہیں سے تھانے آتے جاتے رہے ہوں گے۔ گاؤں میں رات کو چوری وغیرہ کے واقعات ہوا کرتے تھے وہ بھی معمولی نوعیت کے اور بالعموم جاڑے کی لمبی راتوں میں جب لوگ شام ہی سے گھروں میں روپوش ہوجاتے تھے۔ اکثر تو یہی ہوتا کہ رات کو چوروں کے آنے پر کوئی جاگ جاتا اور شور مچادیتا، چور فرار ہوجاتے اور اگر کوئی چور پکڑا جاتا تو زمینداروں میں سے دو ایک آگے بڑھ کر اس کی ٹھکانے سے مرمت کردیتے۔ آبپاشی کے جھگڑوں کا بھی کم وبیش اسی طرح تصفیہ ہوتا لیکن اگر کوئی واقعہ ایسا ہو ہی جاتا جس کی تھانے میں رپٹ لکھی جاتی تو دو ایک سپاہی زمیندار کے دروازے پر آتے اور اس کے مشورے کے مطابق ضروری کارروائی کرتے یعنی ملزم کو پکڑ کے پیٹ پاٹ کر چھوڑ دیتے یا باندھ کر تھانے لے جاتے پھر زمیندار خود ہی اس کی ضمانت لے کر اس کو چھوڑا لیتا اور اس طرح اس کی کئی پشتیں اس کے زیرِ احسان رہتیں۔ کسی افسر یا غیر افسر کی یہ مجال نہیں تھی کہ کسی اسامی پر اس کے زمیندار کو اطلاع دیے بغیر ہاتھ اٹھا دے اس طرح اسامی اپنے زمیندار کی تمام زیادتیوں کے باوجود خود کو اس کے زیر سایہ محفوظ سمجھتا تھا۔

گاؤں میں تھانیدار کی آمد کی نوبت محض اتفاقی ہوا کرتی تھی وہ یوں کہ جب کوئی نیا تھانیدار آتا تو علاقے سے آگاہی کے لیے گھوڑے پر سوار ایک بار ادھر بھی آنکلتا پھر تو گاؤں میں اس کی بے حساب آؤ بھگت ہوتی اس کے گھوڑے کی بھی آؤ بھگت ہوتی، چوکیدار اس کی گرد جھاڑتے، چنا کھلاتے، اس کی کاٹھی الٹی سیدھی کرتے، تھانیدار صاحب جب تک گاؤں کی سرحد سے باہر نہ نکل جاتے اس کے ہم رکاب رہتے وغیرہ وغیرہ۔ ایک بات اور تھی وہ یہ کہ سمبھی کے زمیندار گھرانوں میں کئی تھانیدار موجود اور پنشن یافتہ تھے اس لیے محکمہ پولیس کی نظر میں یہ گھرانے بالخصوص واجب الاحترام تھے۔ تین روپیہ ماہانہ تنخواہ چکھوڑی سنگھ کی تھی شاید ۱۷ روپیہ ماہانہ سپاہی کی اور غالباً پچاس روپیہ تھانیدار صاحب کی۔ پولیس کا محکمہ رشوت کے معاملے میں ہمیشہ سے بدنام ہے لیکن اس زمانے میں شاذ و نادر

اس کا ذکر سننے میں آتا، اگر کسی تھانیدار کے بارے میں معلوم ہوگیا کہ اس نے کسی سے پانچ روپیہ لے لیے ہیں تو اس کو بہ اکراہ ''راشی'' کہا جاتا تھا۔

سمبھی کے اطراف کے گاؤں میں راجپوت یا چھتری بکثرت آباد تھے جنھیں ٹھاکر بھی کہا جاتا تھا۔ ہاتھ میں لمبی لاٹھی ان کا طرۂ امتیاز تھا بعض ہلکی پھلکی پگڑی بھی لپیٹتے۔ اکثر و بیشتر ٹھاکر زمیندار تھے اس لیے طبقاتی سماج میں سمبھی کے مسلمان زمینداروں سے ان کی گہری چھنتی تھی، ایک دوسرے کی سماجی تقریبات جیسے کہ شادی بیاہ میں کسی نہ کسی طور شریک ہوتے۔ بڑے بڑے ٹوکروں میں بھر کر کھاجا اور لڈو شادی بیاہ کے موقع پر دیا لیا جاتا۔ گونا دوگا وغیرہ جیسے ہلکے پھلکے موقعوں یا دیوالی جیسے تہواروں کے موقع پر گٹا بتاشہ اور لائی لڈو وغیرہ چلتے۔ ہم لوگوں کو دیوالی کی آمد کی خبر یوں بھی ہوجاتی کہ کمہارنیں مٹی کے بہت سارے برتن لے کر آتیں تو بچوں کے لیے مٹی کے کھلونے اور دیئے بھی لاتیں۔

مذکورہ بالا لین دین کا تعلق کسی قدر ذاتی بھی تھا جیسا کہ ہر جگہ ہر سماج میں ہوتا ہے یعنی جن گھرانوں کے درمیان زیادہ تعلقات ہوتے تھے ان کے درمیان زیادہ آنا جانا لینا دینا ہوتا تھا۔ ہمارے گھرانوں کی خواتین تو ٹھاکروں کے گھر نہیں جاتیں، لیکن ٹھکرانیاں ہمارے گھر آتیں اور اگلے زمانے میں قرابتوں میں آتے جاتے تحفے تحائف لے جانے کا جو رواج تھا اس کے مطابق وہ اپنے ساتھ ہانڈیوں میں اور مٹکوں میں اچار، لڈو، گڑ کی بھیلیاں یا کوئی اور فصلی چیز یا پھل لے کر آتیں جیسے آم، کٹہل وغیرہ۔ وہ ہمارے گھروں میں چارپائیوں پر بیٹھتیں عموماً شربت سے آؤ بھگت کی جاتی جو مٹی کے کورے برتن میں پیش کیے جاتے جس میں دہی یا بالائی کی کئی انگل موٹی تہہ اوپر ہوتی۔ گنے کی فصل میں شربت کے بجائے رس ہوتا۔ ٹھکرائنیں دیر تک باتیں کرتی رہتیں کیا باتیں کرتیں یہ مجھے نہیں معلوم۔

پردے کا رواج طبقاتی تھا چنانچہ جس طرح ہمارے گھرانے کی خواتین پردہ نشین تھیں اسی طرح کائستھوں، پنڈتوں اور ٹھاکروں کی عورتیں بھی پردہ نشین ہوا کرتی تھیں۔ ہمارے گھروں میں ان کا آنا جانا اس طرح ہوتا کہ اگر پاس پڑوس میں ہوتیں جیسے کہ لالہ

لوگوں کی عورتیں تو وہ غروب آفتاب کے بعد آتیں اگر دن میں انھیں آنا ہی ہوتا تو وہ ڈولی، پالکی یا دولّے میں آتیں۔ دوالا دراصل ایک طرح کی چھوٹی سی ڈولی ہوتی تھی۔ یہ ہلکی پھلکی سواری ہوتی تھی جس میں بیک وقت ایک ہی عورت بیٹھ سکتی تھی اور اسے صرف دو کہار لے جاتے چھوٹے فاصلوں اور وقتی ضرورتوں کے لیے اس کا استعمال عام تھا۔ ٹھکرائنوں کی آبادیاں چونکہ دور دور تھیں اس لیے وہ ڈولی یا دولّے پر ہی آیا کرتیں۔

سمبھی میں کوئی بیس پچیس گھرانے مسلم طبقہ اشراف کے تھے ان کے علاوہ بنکر، حجام، درزی، فقیر وغیرہ تھے جن کی اصل تعداد کا اندازہ نہیں کرسکتا لیکن بحیثیت مجموعی مسلمانوں کی کوئی قابل ذکر آبادی نہیں تھی۔ ان کے قریب حاشیائی آبادیاں پسماندہ ہندو اقوام کی تھیں، ان سے پرے بیرونی حلقہ دور دور تک چھتریوں یعنی ٹھاکروں کی آبادیوں کا تھا، لیکن آج تک اس گاؤں میں نہ تو ہندو مسلم فساد ہوا نہ اس طرح کا کوئی مناقشہ سننے میں آیا۔ جھگڑے، معاملے مقدمے سب ہوتے تھے لیکن انھیں فریقوں کے درمیان تنازع سمجھا جاتا تھا نہ کہ فرقوں کے درمیان۔ یوں بھی ہندو اور مسلمان پسماندہ اقوام کی معاشرت اور زندگی کے معمولات بہت کچھ ملتے جلتے تھے صرف مذہبی رسوم و رواج الگ الگ تھے۔

گاؤں میں صرف ایک شیعہ گھرانہ تھا، لیکن محرم میں تعزیہ داری بڑی دھوم دھام سے ہوا کرتی، کئی سنی گھرانے اس میں پیش پیش ہوتے۔ گتکے، بنیٹھی اور لاٹھی وغیرہ کے کرتب میں بہتیرے غیر مسلم بھی حصہ لیتے۔ روایتی مرثیہ خوانی بھی خوب زور و شور سے ہوتی۔ اس موقع پر جم غفیر میں سب بلاتفریق گھسے پسے ہوتے۔

سمبھی میں محرم کی روایتی دھوم دھام کے علاوہ سال میں ایک بار بڑا میلہ بھی لگا کرتا تھا جو غالباً چیت میں لگتا تھا وہ سید سالار مسعود غازی کی نسبت سے جن کا مزار بہرائچ میں ہے، غازی میاں کا میلہ کہلاتا تھا، غالباً ان کے عرس کے موقع پر لگتا تھا۔ آج کے میلوں کے مقابلے میں اس میلے کی کوئی حقیقت نہیں تھی لیکن سمبھی کے لیے وہ بہت بڑا واقعہ، وقوعہ یا تہوار ہوا کرتا تھا۔ اعظم گڑھ کے سارے حلوائی اپنے تام جھام کے ساتھ سمبھی

میں وارد ہوتے۔ ان کی مٹھائیوں کی قسمیں معدودے چند تھیں مثلاً گڑ کے شیرے میں ڈوبی ہوئی کالی کالی جلیبیاں، گڑ کے لٹھے یا سیو، گٹا، بتاشہ، چینی اور موتی چور کے لڈو۔ سب سے بڑی مٹھائی امرتی تھی اور برفی جو محض چینی کی ایک بدلی ہوئی شکل ہوتی تھی۔ کھاجے کے اونچے اونچے ڈھیر دور سے نظر آتے۔ چاول کی لائی بھی گٹے بتاشے کے ساتھ بکتی۔ شاید ہی کوئی گاہک ایک آنے سے زیادہ کی مٹھائی بیک وقت خریدتا رہا ہو ورنہ یہی پیسہ دو پیسہ کی۔ ایک پیسے میں چینی والے چار لڈو مل جایا کرتے تھے۔ ایک پیسے کا لائی گٹہ بچے اپنے دامن میں بھرلایا کرتے تھے۔ سودے اناج سے بھی خریدے جاتے تھے۔ اس میلے کے زمانے میں حجامنیں ایک مزار پر دیا بتی کرتی تھیں اور منتیں مانتی تھیں یوں بھی جمعرات کی شام کو کوئی دیا جلا دیتی۔ اس مزار کی ہیئت عام مزاروں کی سی نہیں تھی بلکہ ایک لمبے چوڑے ابھار کی سی تھی جو کھجور کی جھاڑیوں کے نرغے میں تھا، اس کو لوگ قاضی صاحب کہا کرتے تھے۔ دراصل وہ قاضی شہاب الدین دولت آبادی کے اخلاف میں سے کسی کا مزار ہوگا، انہی کی نسبت سے ماموں جان حفیظ الرحمٰن صاحب ایمنؔ خود کو شہابی لکھتے تھے۔

انسانی قدوقامت کے اعتبار سے مسلمانوں کے طبقہ اشراف اور چھتریوں میں کافی مماثلتیں تھیں، بالعموم لمبے چھریرے بدن، رنگ گندمی، ناک نقشہ کھڑا، بال ہلکے یعنی زیادہ گھنے نہیں اور رنگ میں بھی ہلکے، عمریں بالعموم اچھی۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے پسماندہ طبقات میں بھی ظاہری جسمانی خواص میں بڑی مطابقتیں نظر آتی تھیں حتیٰ کہ ان کی بول چال اور رہن سہن میں بھی یکسانیت تھی۔

گاؤں میں صرف ایک مسجد تھی ہمارے گھر کے بالکل قریب یعنی صرف ایک لمبا گلیارہ ان کے درمیان حائل تھا۔ مسلم آبادی کے قلب میں ایک اونچا چوکور چبوترہ تھا جس کی لیپ پوت محرم کے قریب آتے ہی شروع ہوجاتی اور اسی پر تعزیہ رکھا جاتا۔ مندر نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ کوئی مکتب، مدرسہ یا اسکول بھی نہیں تھا۔ قرآن اور ابتدائی اردو گھروں میں پڑھائی جاتی۔ ہمارے گھرانے میں ہماری ماں اس باب میں سب سے آگے تھیں،

محلے کی لڑکیوں کو اور نہ معلوم کتنے لڑکوں بھی پڑھا کر فارغ کر دیا، ان کی زندگیاں بنا دیں اور خود ثواب دارین حاصل کیا۔ لڑکیوں کی تعلیم وہیں ختم ہوجاتی لڑکوں میں سے جس کو پڑھنا پڑھانا ہوتا، اس کا بندوبست کسی شہر میں ہوتا جو عموماً کسی شہر میں رہنے والے عزیز و اقارب کے ذریعہ ہی ممکن تھا جیسے کہ میرے معاملے میں اس بار کی کفالت ماموں جان نے کی انھوں نے خود اپنے پھوپھا کی سرپرستی کچھ عرصہ کے لیے قبول کی تھی۔

سمبھی کے فرمانروا مسلمان زمینداروں کا تذکرہ کسی قدر خصوصیت کے ساتھ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کوئی چار پانچ گھرانے ایسے تھے جنھیں بالادستی حاصل تھی انہی میں سے ایک بلکہ سب سے ممتاز گھرانا میرے نانا نانی کا تھا۔ ان لوگوں کے کئی قطعہ مکانات کچھ خام کچھ پختہ بیشتر یک منزلہ تھے لیکن ہمارے دو گھر دو منزلہ اور طبقہ کی محصور آبادی کے قلب میں واقع تھے اور ایک لمبی گلیاری سے گزر کر صدر دروازے تک پہنچنا ہوتا تھا باہر نکلنے کے بعد سامنے ایک وسیع مرتفع قطعہ تھا جس پر کنواں واقع تھا، صبح سویرے سے کئی گھنٹے تک اور شام کو بھی کہار اور کہارنیں اسی کنوئیں سے پانی بھر بھر کر ہمارے گھروں میں رکھے ہوئے مٹی کے بڑے بڑے برتنوں میں بھرتیں۔ کنوئیں کے قریب ایک چبوترہ تھا جس پر لوگ نہاتے دھوتے رہتے جس کا کوئی وقت نہیں تھا۔

اس مرتفع قطعہ کے سامنے ایک بڑا وسیع علاقہ تھا جس کی لمبائی اتر دکھن تھی، اس کے دکھنی سرے پر ایک لمبا چوڑا سائبان تھا جو دو تین سیڑھیاں اونچا بھی تھا۔ اس سائبان کے پیچھے اتنا ہی بڑا ایک کمرہ تھا اسی کمرے میں چارپائیاں پڑی رہتیں۔ برامدے کی لمبائی پورب پچھّم تھی اس کے پوربی سرے پر ایک کوٹھری تھی جو حقہ کے اہتمام کے لیے وقف تھی یعنی اس کے ایک کونے میں مٹی کی ایک بڑی ناند تمباکو سے بھری ہوئی۔ دوسرے کونے میں اپلے اور لکڑی کے ٹکڑے سلگتے ہوئے۔ حقہ سائبان کے وسط میں ہمیشہ موجود رہتا، پیتل کی فرشی والا تندرست و توانا حقہ۔ صلائے عام تھی جب جس کا جی چاہے چلم اٹھائے تمباکو بھرے، انگارے رکھے اور نوش فرمائے جس کو توفیق ہوتی حقہ تازہ کر دیتا یعنی اس کے نیچے

کو غسل دے دیتا اور فرشی کا پانی بدل دیتا۔ ہاں چلم بھرنے والے آگ جلائے رکھنے کے لیے اس میں حسب ضرورت کچھ ڈال دیا کرتے۔ ناند میں بھرا ہوا تمباکو گاؤں میں ہی کاشت کیا ہوا اور جملہ لوازمات کے ساتھ آمیز کیا ہوا ہوتا جس میں شکر کے کارخانے سے نکلا ہوا شیرہ جزوِاعظم تھا۔

تو اس طویل وعریض برامدے میں بزرگ براجمان ہوا کرتے۔ ان کی چارپائیوں پر سرہانے تکیہ اور پائینتی تہہ کیے ہوئے بستر رکھے ہوتے۔ خوش گپیاں، گزری ہوئی آپ بیتیاں، کسی پر پھبتیاں، کسی مقدمہ کی روداد بیانی، یا کسی مقدمہ کی حکمت عملی کی تیاری وغیرہ ان بزرگوں کے دلچسپ مشاغل ہوتے۔ اذان ہوتے ہی وہ مسجد میں چلے جایا کرتے۔

اس سائبان کے سامنے ایک کھلا ہوا وسیع قطعہ بطور صحن کے تھا جہاں کئی سو چارپائیاں بافراغت بچھ سکتی تھیں۔ اس طبقۂ اشراف کی ساری تقریبات اسی جگہ انجام پذیر ہوتی تھیں لیکن سب سے زیادہ قابلِ ذکر وہ لاثانی درخت تھا جس کو مقامی طور پر پکڑ کہتے ہیں۔ دراصل یہ برگد کی ایک قسم ہے یا برگد اور پیپل کی درمیانی کوئی قسم ہے کیونکہ اس کی بروہ تو ویسی ہی ہوتی ہے جیسی پیپل اور برگد کی۔ اس کی چھال کو تراشنے سے ویسا ہی لس دار دودھ نکلتا ہے لیکن پیپل کا دودھ زیادہ لسدار ہوتا ہے اور چڑیاں پکڑنے کے لیے بہلئے یا عام شکاری اسی کو استعمال کرتے ہیں۔ برگد کا دودھ ادویاتی صفات رکھتا ہے، لیکن پکڑ کے دودھ کے بارے میں ایسی کوئی بات میں نے نہیں دیکھی یا سنی۔ پکڑ کے پھل نہ برگد کے پھلوں جیسے لال نہ اتنے بڑے بلکہ رنگ اور سائز کے اعتبار سے پیپل کے پھلوں کے قریب ابتداً ہرے پھر ہلکے فالسئ اور چڑیوں کے لیے یکساں مرغوب۔ پتیاں نہ برگد جیسی نہ پیپل جیسی یعنی پکڑ کی پتیاں نہ برگد کے پتوں جیسی بڑی اور دبیز ہوتی ہیں نہ پیپل کے پان جیسے پتوں کی نوک بلکہ نرم، چکنی اور لمبوتری ہوتی ہیں۔

خیر تو اس بڑے سے سائبان کے سامنے پکڑ کا ایک درخت تھا اتنا چھتنار کہ زیادہ تر کھلا ہوا علاقہ اس کے سائے سے ڈھکا ہوا۔ صرف ڈھکا ہوا نہیں بلکہ کئی منزلہ سایہ جس

سے چھن کر دھوپ کے نیچے تک پہنچنے کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ برسات کی راتوں میں ہلکی پھلکی بوندا باندی میں اس کے نیچے سونے والے بستر دبا کر بھاگنے کی ضرورت نہیں محسوس کرتے۔ چڑیوں کے بسیرے اوپری تہوں پر ہوتے۔ اس کے زیر سایہ لوگ اپنی اپنی مصروفیات میں ہوتے، کہیں نوجوانوں کی ٹولی تاش کھیلتی ہوتی، کبھی پچیسی جمی ہوتی اور کھلاڑیوں کے فلک شگاف نعرے فضا میں گونجتے اور وہاں سے دور کسی کنارے ہم جیسے بچے اپنی طفلانہ چہلوں میں ہوتے۔ کوئی چارپائی بن رہا ہے یا بنوا رہا ہے، کوئی اسامیوں سے لگان طلبی کے سلسلے میں ان کی سرزنش کر رہا ہے۔ غرض یہ کہ زمین پر ان حشر سامانیوں کی وجہ سے چڑیاں بالائی شاخوں پر ہوتیں۔

اس درخت کے پھیلاؤ کا اندازہ یوں کیا جاسکتا ہے کہ اس کے ایک حصہ نے پھیل کر شمالی کھلے مستطیل کو ڈھک لیا تھا تو دوسرے حصہ نے بڑھ کر دکھنی کھلے مربع کو ڈھک لیا تھا اور تیسرا حصہ پچھّم کی طرف بڑھا جس کے زیر سایہ ایک گڑھی (تالاب) تھی (ہماری طرف تالاب کو گڑھی کہتے ہیں)۔ قیاس ہے کہ آبادیوں کے قریب اس طرح کی گڑھی پوکھروں کی موجودگی کا سبب یہ ہوگا کہ اگلے وقتوں میں لوگوں نے مکان بنانے کے لیے مٹی کھود کر نکالی ہوگی۔ اس گڑھی کے پانی نے کبھی دھوپ نہ دیکھی ہوگی اس میں مچھلیاں بکثرت ہوا کرتیں، نوجوان اس پیڑ کی ڈالیوں پر چڑھ کر پانی میں جست لگاتے، ہمارے جیسے بچے اس کی شاخوں سے لٹکی ہوئی بروہیں پکڑ کر کبھی پانی میں تیرنے کا مزہ لیتے کبھی ہوا میں جھولے کا، غرض اس کی بروہیں ہمارے لیے پالنے سے زیادہ آرام دہ اور خوشگوار تھیں، آہ ان کی شفقتیں!

اس درخت کی عمر کا کوئی اندازہ نہ تھا لیکن بوڑھے پرانے لوگ بھی کہتے تھے کہ ہم نے جب سے ہوش سنبھالا اسے ایسا ہی دیکھا۔ اس کی ہیئت کچھ اس طرح تھی کہ اگر کوئی درخت ۲۰-۲۵ سال کی عمر میں کسی طوفان وغیرہ کی زد میں آکر گر جائے اور اسی طرح زمین پر پڑا پھیلتا جائے خصوصاً بروہ رکھنے والا درخت تو تنا افقی طور پر بڑھتا پھیلتا چلا جائے

گا اور اس پر نکلنے والی شاخیں عمودی طور پر بڑھیں گی۔ اس طرح دو منزلہ درخت تیار ہوتا رہے گا، زمین کے قریب تنے سے پھوٹنے والی بروہیں نئی جڑوں کے طور پر وافر غذا فراہم کرتی رہیں گی۔ یہی ماجرا اس پکڑ کے پیڑ کے ساتھ ہوا ہوگا۔ چنانچہ جڑ سے اٹھ کر زمین پر پھیلا ہوا تنا اتنا چوڑا تھا کہ اس پر آگے پیچھے دو چار پائیاں آرام سے بچھ سکتی تھیں۔ بعض لوگ ازراہِ تفنن کبھی کبھی ایسا کرتے بھی تھے۔ زمین پر پھیلی ہوئی شاخیں ایسی چوڑی تھیں کہ بعض بکریاں چوڑے تنے پر سے بڑھتی ہوئی شاخوں پر کچھ دور تک چلی جاتی تھیں۔

۷۰ء کے عشرہ کے اواخر میں مجھے ایک بار سمبھی جانے کا اتفاق ہوا تو یہ دیکھ کر میری حیرت اور افسوس کی انتہا نہ رہی کہ اس عظیم الشان درخت کا نام ونشان تک باقی نہ تھا۔ نئی نسل نے اس کو بطور ایندھن استعمال کر کے ختم کر دیا۔ اس کی جڑیں تک کھود ڈالیں۔ ان ناعاقبت اندیشوں کو نہیں معلوم تھا کہ وہ اسلاف کے باقیات کو جلا رہے ہیں۔ یوں یہ عمل ان کے حسب حال بھی تھا کیونکہ ان کا سارا ماضی بادِ سموم کے جھونکوں کی نذر ہو چکا تھا، پرانی قدروں کا نام ونشان بھی نہ تھا۔ پختہ سڑکوں نے گاؤں کو شہر سے جوڑ دیا تھا، ہر طرح کی سواریاں دھڑلے سے چلنے لگی تھیں، گاؤں کی سادگی پر شہری ملمع سازی ہو چکی تھی، گاؤں حسنِ سادہ کی تعریف سے عاری ہو چکا تھا۔

ہاں تو جس پیڑ کا میں ذکر کر رہا تھا، اس کی پرورش اور پرداخت میں بزرگوں کی توجہات کو بھی بڑا دخل تھا۔ پت جھڑ کے بعد جب پکڑ کی ٹہنیوں پر نئی پتیوں کے شگوفے نمودار ہوتے، گاؤں کے غریب ان شگوفوں کو چن کر ساگ سبزی یا پوری غذا کے طور پر ابال کر استعمال کرتے۔ ان غریبوں کا تعلق کسی بھی قوم یا مذہب سے ہوسکتا تھا ان کی قدرِ مشترک محض غربت تھی جس کا ذکر دلدوز ہے، تاہم ضروری ہے۔ اس پیڑ کے شگوفے چننے کی غرض سے جو چڑھتا ڈانٹ کر بھگا دیا جاتا کیونکہ بزرگوں کا فرمانا تھا کہ اس طرح پتیاں کم ہو جانے سے سایہ ہلکا ہو جائے گا زیادہ گھنا نہیں رہے گا۔

ایک طرف چیزوں کی فراوانی اور قیمتوں کی ارزانی اور دوسری طرف اتھاہ غریبی

میری فہم و ادراک کے لیے ایک چیستاں سے کم نہیں، بس یہ سمجھ سکتا ہوں کہ شاید طبقاتی سماج میں طبقۂ اشراف کے لیے سب کچھ مہیا اور موجود تھا اور دیگر طبقات کی بساط سے باہر۔ چنانچہ اناج کی زیر استعمال اقسام اور گاؤں میں دستیاب پھلوں کی قیمت اور نرخ سے نہ ہم واقف تھے نہ سوچ سکتے تھے۔ بنیوں کو دیکھا تھا کہ لین دین میں اناج استعمال کرتے تھے، اس کا حساب پنسیری میں کیا کرتے تھے اور کھٹیک آم کا حساب گاہی میں کرتے تھے (ایک گاہی پانچ کی ہوتی تھی لیکن سیکڑہ ۲۲ گاہی کا مانا جاتا تھا)۔

کانپور پہنچنے کے بعد مجھے کچھ شعور آ گیا تھا۔ اس وقت وہاں کلکٹر گنج کے بازار میں ایک روپیہ کا ۱۳ سیر گیہوں اور گیارہ سیر چاول ملا کرتا تھا۔ دالیں بالعموم ایک روپیہ کی سات آٹھ سیر، گھی ایک روپیہ کا بارہ چھٹانک یعنی تین پاؤ۔ ہمارے گاؤں میں گھی ایک روپیہ کا سوا سیر ملا کرتا تھا۔ کپڑوں میں اچھا لٹھا ۳/آنے یا ساڑھے تین آنے گز اور قمیص کے لیے جاپانی ڈوریہ ڈھائی تین آنے گز تھی۔ کانپور میں ماموں جان کا بوٹ آرڈر دے کر پانچ روپیہ میں بنتا تھا اور میرا جوتا ڈھائی تین روپیہ میں۔

خیر! تو گاؤں میں ایک طرف فراوانی اور خوشحالی کا یہ عالم تھا کہ لوگوں کو اناج کا نرخ نہیں معلوم تھا، دوسری طرف غربت کا یہ حال کہ بہت سے لوگ طرح طرح کے خودرو پودے اور جڑیں کھا کر جی رہے تھے اور برگد کے پھل اور گولر وغیرہ بھی۔ سمبھی کے قریب تال یا جھیل بھی طرح طرح کی غذاؤں کا وسیلہ تھی۔ بڑی مچھلیاں اور مرغابیاں تو زمینداروں ہی کا حصہ تھیں جنھیں ملاح بڑی نیاز مندی کے ساتھ پیش کیا کرتے لیکن پانی میں کنول جیسے کئی خودرو پودے بھی ہوتے جن کے پھل، پھول، نرم لتریں، تنے اور جڑیں غذا کے کام آتیں۔

ایک معروف پھل کنول گٹا تھا جو جاڑوں میں دستیاب ہوتا اس کے ہرے ہرے گھنٹی جیسے مخروطی پھل دہلی میں بھی دیکھنے میں آتے ہیں۔ ہر پھل میں مونگ پھلی جیسے دس بارہ دانے ہوتے ہیں جو بالکل پھیکے لیکن مزیدار ہوتے ہیں۔ اس کے تنے بھی دہلی میں

''بھیں'' کے نام سے بکتے ہیں۔ تراش کر سبزی بنانے کے کام آتے ہیں، اس کی جڑ کی گانٹھ بالکل شریفے جیسی لیکن سیاہ ہوتی ہے اور کرکٹ کے گیند جیسی سخت، گھنٹوں ابالے جانے کے بعد اس کے اندر کا پیلا مغز کھانے کے قابل ہوتا ہے۔ تال میں ایک طرح کا خودرو دھان بھی ہوتا ہے جسے ''تنّی'' کہتے تھے اس کا چاول میٹھا اور اس قدر باریک ہوتا کہ واقعی ناخن میں آسکتا تھا، لیکن اس دھان یا تنّی کی دستیابی مشکل ہوتی تھی۔ ملاح چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں، جو پیڑ کے پرانے تنے خول کر کے بنائی جاتی تھیں، چلتے ہوئے اس دھان کے گچھے تراشتے اس طرح دن بھر میں بدقت تمام پندرہ بیس سیر تنی دستیاب ہوتی۔

کاتک میں ربیع کی ساری فصلیں بوئی جاتیں۔ مہینہ ختم ہونے تک ان کے پودے زمین کے اوپر نظر آنے لگتے ان کی خصوصاً مٹر اور چنے کی نئی ٹہنیاں چننے والوں کی دست برد سے، جو کھیتوں کے گرد منڈلاتے رہتے، بچاؤ کے لیے نگرانی کا کام ٹیڑھا تھا، کتنے علاقے میں، کہاں کہاں اور کب تک نگرانی کی جاتی۔ خالی پیٹ تو رات کو بھی بیدار رہتے ہیں، کوئی جاڑے کی لمبی راتوں میں گنے کے کھیت میں گھس کر جی بھر گنے چوس کر اس کے چھلکے وہیں ڈھیر کر دیتا۔ کھلیان میں غلے کی مالش بیلوں کی جوڑیوں کے ذریعہ ہوا کرتی تھی اس دوران بیل منہ مارتے رہتے اور جلدی جلدی اناج کو نگلتے جاتے، دوسری طرف وقفہ وقفہ سے گوبر بھی خارج کرتے جاتے، جسے ان کے پیچھے چلنے والا کسان احتیاط سے لے کر کنارے پھینکتا جاتا، پھر شام کو اسی کے گھر والے سارا گوبر اکٹھا کر لے جاتے اور اس کو سکھا کر، کوٹ کر اس میں سے اناج کے دانے الگ کر کے اس سے پیٹ کی آگ بجھاتے۔ کبھی کبھی جاڑوں کی لمبی رات میں چوری وغیرہ کا عام سبب بھی پیٹ کی مار ہوتی۔

لیکن غربت و افلاس کے اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ایسے چمکدار ذرے بھی تھے جن کی تابانی گزرے ہوئے وقتوں کی گرد میں ڈھک گئی، میں چاہتا ہوں کہ ان کی تب وتاب، صدق وصفا، فقر واستغناء اور عزم ویقین کی ایک جھلک پیش کروں۔ میں اسے پیش کرنے پر مجبور بھی ہوں کیونکہ بالکل ابتدائی بچپن کے ان مشاہدوں کے گہرے نقوش سے

میں شعوری زندگی میں بہت متاثر ہوا، پھر ان کے تذکرے کے بغیر اس سماج کی مکمل عکاسی بھی نہیں ہوسکتی جو میرا خاص مقصد ہے۔

سمبھی میں دو تین گھرانے سادات کے تھے، دراصل وہ سب ایک ہی مورثِ اعلیٰ کی اولادیں تھیں۔ یہ لوگ سید صاحب کہلاتے تھے لیکن مفلسی ان کا مقدر تھی۔ اللہ جانے ان کی پرورش اور گزر بسر کیسے ہوتی تھی، بظاہر ان کے پاس کھیت کھلیان کچھ بھی نہ تھے، کچے بوسیدہ مکانوں میں اپنی آبرو سمیٹے پڑے رہتے۔ انہی میں سے ایک بزرگ کو ہم لوگ فقیراً نانا کہتے تھے۔ اپنے مکان کے چھوٹے سے باہری کمرے میں جو در و زنجیر کی قید سے آزاد تھا ایک بوریا بچھائے کچی دیوار سے ٹیک لگائے نہایت پروقار انداز سے بیٹھے ہوتے، بھنوؤں سے داڑھی تک سب سفید اور اجلے دانت بھی سب سلامت، اچھا میانہ قد، گول گداز اور مضبوط کاٹھی والا جسم، گاؤں میں کرگہ کی بنی ہوئی گزی (کھادی) کا کرتا پائجامہ اور بس، چہرے پر ایسا تبسم جو صرف طمانیت کا مظہر ہوسکتا ہے۔ معاش کا ظاہری وسیلہ یہ تھا کہ اعظم گڑھ سے مٹی کے تیل کا ایک کنستر لاتے جو لال تیل کہلاتا تھا اور گھٹیا درجے کا ہوتا تھا، دو پیسے بوتل بکتا تھا، صاف تیل ایک آنے بوتل دوسری دکانوں پر ملتا تھا۔ وہ اپنا لال تیل پیسے یا اناج کے عوض بیچا کرتے تھے۔ گاہک کو تیل دینے کے لیے وہ اپنی جگہ سے اٹھتے پھر آکر اسی انداز سے بیٹھ جاتے۔ خدا ہی جانتا ہے کہ اس میں ان کو کیا بچت ہوتی تھی، ہوسکتا ہے کچھ فاضل اناج غذا کے لیے نفع میں مل جاتا ہو۔ گھر میں چولہا سلگے یا نہ سلگے لیکن ان کی بیوی جنھیں ہم لوگ نانی کہتے آگ لینے کے بہانے ایک کرچھل لے کر سویرے ہی گھر سے نکلتیں اور ہم لوگوں کی طرف آجاتیں۔ کسی نے کہا تو برتن مانجھ دیے، تھوڑا بہت کوٹنے پیسنے کا کام ہوا تو وہ بھی بلا تکلف کردیا، کھانے پینے کے لیے کچھ مل گیا تو اس کو بھی بلا تکلف قبول کرلیا لیکن مجھے اچھی طرح یاد ہے ان کی نظروں میں نہ کبھی بھوک دیکھی نہ بلا اجازت کسی کا ایک دانہ چھوتے دیکھا یا سنا۔

اس منظر نامے کو مکمل کرنے کے لیے چند تذکرے مختصراً مناسب معلوم ہوتے

ہیں۔ شیخ عیسیٰ صاحب اطراف و دیار تک میں صرف شیخ جی کے نام سے جانے مانے جاتے تھے۔ قدرت نے ان کو طبعًا اور حقیقتاً بالکل آزاد پیدا کیا تھا اور ایسا ہی برقرار رکھا تھا۔ ان کی واحد وابستگی ایک بیٹی تھی جو ہماری نانی کی عمر کی تھی۔ شیخ جی کا سیدھا ستواں جسم ایک سفید لنگی کے علاوہ ہر قید سے آزاد تھا وہ بچوں میں بچے اور جوانوں میں جوان لیکن بوڑھوں سے پرے رہتے۔ پکڑ کے پیڑ تلے یا کسی خرابے میں جہاں بھی تاش یا پچیسی جمتی تو ٹولیاں بدلتی رہتیں لیکن شیخ جی بھوک پیاس سے بے نیاز جمے رہتے۔ ان کی اکثر و بیشتر راتوں کا آخری حصہ راہ نوردی میں گزرتا اس لیے کہ انھوں نے قرابتوں کے سارے گاؤں جو اعظم گڑھ، جونپور، بلیا، گورکھپور، بنارس وغیرہ اضلاع میں پھیلے ہوئے تھے پگڈنڈیوں سے جوڑ رکھے تھے، شیخ جی کی خصوصیت یہ تھی کہ انھوں نے ریل گاڑی تو درکنار کسی سواری کو اپنی باربرداری کی زحمت نہیں دی، کہتے تھے کہ اتنی بھیڑ میں کون جائے اس سے پہلے تو ہم خود چل کر پہنچ جاتے ہیں۔ ستر پچھتر کی عمر میں دانت سلامت اور آنکھیں چمکدار تھیں۔ نپے تلے لمبے ڈگ یکساں رفتار سے بڑھاتے ہوئے چلتے، دورانِ سفر سفید لنگی پر ایک کرتے کا اضافہ ہو جاتا۔ ان کا فرقِ بلند ٹوپی وغیرہ تو درکنار بالکل فارغ البال تھا، صرف عقبی حاشیے پر سپیدیِ سحر کے آثار ہویدا تھے۔ جہاں کہیں قیام کرتے روانگی سے پہلے والی شام کو میزبان سے فرمائش کر دیتے کہ رات کے کھانے کے ساتھ دو روٹی فاضل دے دینا اور صبح کو ناشتہ پر میرا انتظار نہ کرنا چنانچہ وہ عموماً دو بجے رات کو اٹھ جاتے اور اگلے پڑاؤ کی طرف چل پڑتے۔

۱۹۴۲ء کی توڑ پھوڑ کے زمانے میں ریلوے لائنوں کی اکھاڑ پچھاڑ اور اسٹیشنوں کی پھونک تاپ کے واقعات بھی بہت ہو رہے تھے۔ ہمارے رشتے کے ایک ماموں بنارس کے قریب کسی اسٹیشن پر مامور تھے ان کی والدہ بہت پریشان تھیں۔ شیخ جی نے انھیں اطمینان دلایا کہ میں خبر لاتا ہوں۔ اگلی صبح کو وہ غائب تھے، تیسرے دن واپس آئے اور سب کی خیریت لائے۔

☆☆☆

کوئر یا پار

کانپور جانے سے پہلے میں اپنے دادیہال یعنی آبائی گاؤں کوئر یا پار دو تین بار جاچکا تھا کیونکہ وہاں ماں کی حیثیت سے میری خالہ جان موجود تھیں۔ گو میری کم سنی اور بے شعوری کی وجہ سے کوئر یا پار کا وہ قیام برائے نام ہی کہا جائے گا تاہم وہاں میری دلچسپیوں کے سامان بہت تھے۔ مثلاً ہمارے مکان کے لق و دق صحن میں تین عدد آم کے پیڑ تھے۔ ایک امرود اور ایک انار کا تھا مزید براں گلاب، بیلے، چنبیلی اور جوہی وغیرہ کے پودے تھے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے جب میں پہلی بار کوئر یا پار گیا تو کسی آم کے پیڑ سے لگا کھڑا تھا، وہاں سے کوئی پکڑ کر مجھے دادی کے پاس لے گیا جو اس قدر ضعیف و نحیف تھیں کہ سیدھی کھڑی بھی نہیں ہوسکتی تھیں۔ ان کی نقل و حرکت اپنے کمرے سے برآمدے تک محدود تھی، یوں بھی ان کا زیادہ وقت عبادات اور وظائف میں کمرے کے اندر ہی گزرتا تھا۔ عموماً دس بجے کے قریب باہر آتیں اور ظہر کے وقت پھر واپس چلی جاتیں۔ ہماری ساری قرابتوں میں وہ ایک بزرگہ کے طور پر جانی مانی جاتیں، سیدہ تو تھیں ہی۔

ان کے کمرے میں ایک بڑے تخت کے علاوہ جس پر ان کا بستر اور مصلیٰ رہتا ایک بہت بڑا اور اونچا صندوق بھی تھا، جس میں برتن وغیرہ کے علاوہ بہت ساری موٹی موٹی کتابیں بھی تھیں جو ہمارے چچا مرحومین کے باقیات میں سے تھیں۔ دراصل دادا کی وفات کے بعد تین بیٹوں کی جو فضلائے دیوبند تھے پیہم اموات نے دادی کو از خود رفتہ

کر دیا تھا۔ سال میں ایک دو بار صندوق میں سے کتابیں نکال کر انھیں دھوپ میں پھیلایا جاتا لیکن اس اثناء میں ان کا کچھ نہ کچھ حصہ دیمک چٹ کر چکے ہوتے اور کچھ اوراق ہم بچوں کی بے علمی اور بچکانہ حرکتوں کی نذر ہو جاتے۔ کیا معلوم تھا کہ ہم کتنا قیمتی سرمایہ برباد کر رہے ہیں۔ دادی کے کمرے میں تانبے کا ایک گگرا بھی رکھا ہوا تھا جس میں موٹے پیسے بھرے ہوئے تھے۔ اس کو نیپالی ڈبل کہتے تھے اور وہ ہماری طرف سکہ رائج الوقت تھا۔ وہ بے ہنگم سا تراشا ہوا تانبے کا ایک چوکور ٹکڑا ہوتا جو وزن میں ایک تولہ اور قیمت میں ہندوستانی ایک پیسے کے برابر ہوتا۔ بنئے چھوٹے موٹے سودے تولنے کے لیے بھی ان پیسوں کو استعمال کرتے۔ ہم لوگ اس گگرے میں سے پیسے نکال کر کبھی کبھی کھیلتے پھر یا تو اس میں واپس ڈال دیتے یا حلوائی کی دکان کا رخ کرتے۔

دادی کے متعلق کہا جاتا تھا کہ انھیں کئی بار سانپ کاٹ چکا تھا لیکن ان پر کچھ اثر نہیں ہوتا تھا، ان کی بزرگانہ کرامات بھی مشہور تھیں، بعض واقعات کا میں خود شاہد ہوں۔ ایک دن وہ برآمدے میں ایک چارپائی پر چادر تان کر لیٹ گئیں۔ ابا نے تاکید کر دی کہ انھیں جگایا نہ جائے، وہ بلا حس و حرکت پڑی رہیں کھانا بھی نہیں کھایا۔ ظہر کا وقت گزر گیا، عصر کی نماز پڑھ کر بھی لوگ آ گئے۔ میں چھوٹا تو تھا ہی بازار سے کھیرا لا کر اسے چھیلا کاٹا پھر بچوں کی طرح سب کا حصہ لگایا، دادی کا حصہ بھی لگایا پھر اسے لے کر انھیں دینے کے لیے پہنچا اور جگانے لگا۔ وہ ایک عالم جذب میں چیختی ہوئی اٹھیں اور مجھے دوڑا لیا۔ کہاں تو بوجہ ضعف ان میں چلنے کی تاب نہ تھی کہاں مجھے آنگن میں دوڑاتی پھریں۔ گھر میں والدہ اور نانی موجود تھیں لیکن سب دم بخود تھے، اتنے میں ابا گھر میں آ گئے اور زور سے ڈانٹا ''کیا ہو رہا ہے'' اس کے ساتھ ہی دادی فوراً چارپائی پر جا کر پہلے ہی کی طرح سیدھی لیٹ گئیں۔

جب ان پر جذب کی کیفیت طاری ہوتی، تو ان کی آواز، لب و لہجہ، طرزِ تکلم سب مردانہ ہوتا۔ ''السلام علیکم'' سے گفتگو کا آغاز کرتیں اور بیان کرتیں کہ میں فلاں جگہ سے آیا ہوں پھر جو جس موضوع پر چاہے ان سے گفتگو کر سکتا تھا، وہ باقاعدہ اسی لہجے میں گفتگو کرتی

رہتیں۔ پھر اچانک جیسے کچھ یاد آجانے پر کہتیں ''اب بہت دیر ہوگئی، چلتا ہوں۔'' اور ''السلام علیکم''۔ اس کے بعد اپنی اصل کیفیت پر واپس آجاتیں، وہی نحیف آواز۔ کبھی عالم جذب میں بالکل دہقانی بولی میں گفتگو کرتیں۔ ''ائیلی گیلی'' وغیرہ جو کہ ہمارے گھرانے کی زبان نہ تھی۔ وہ اسی زبان میں پند و نصائح کرتی جاتیں۔ بعد میں انھیں کچھ یاد نہ رہتا۔

ایک بار نانی بہت پریشان تھیں کہ کانپور سے بہت دنوں سے حفیظ الرحمٰن (میرے ماموں جان) کا خط نہیں آیا ہے۔ دادی حسبِ معمول کمرے سے باہر آئیں تو نانی نے ان سے اپنی پریشانی کا اظہار کیا۔ دونوں سمدھنیں ایک دوسرے کو ''بہن'' کہہ کر مخاطب کرتیں۔ نانی کی باتیں سنتے ہی دادی دوزانوں بیٹھ گئیں، سر پر لپٹا ہوا دوپٹہ ذرا سامنے کو کھینچ لیا۔ پھر ان کی آواز بدل گئی اور یوں بولتی چلی گئیں جیسے کوئی رننگ کمنٹری دے رہا ہو۔ ''ڈاکٹر آیا ہے، کلائی میں زخم معلوم ہوتا ہے، پٹی لپیٹی جارہی ہے۔'' وغیرہ وغیرہ۔ چند دنوں بعد ماموں جان کا خط آیا۔ واقعی ان کی کلائی میں پھوڑا نکل آیا تھا۔ دادی کی اس کیفیت کی کوئی تاویل یا تشریح نہیں کی جاسکتی۔

کوئریاپار بھی سمبھی کی طرح ایک دور افتادہ گاؤں ضلع اعظم گڑھ کی تحصیل گھوسی میں واقع تھا اب نوتشکیل ضلع مئو میں شامل کردیا گیا ہے، قصبہ محمد آباد گوہنہ سے کوئی پانچ میل مشرق میں واقع ہے، دونوں کے درمیان ٹونس ندی حائل ہے، پہلے اس پر کوئی پل نہ تھا، اب محمد آباد کی آبادی کے قریب ہی بہت اچھا پل بن گیا ہے جس کی وجہ سے رسل ورسائل میں بڑی آسانیاں پیدا ہوگئی ہیں۔ ہمارے بچپن میں کوئریاپار اور محمد آباد کے درمیان پگڈنڈیوں کے راستے آمد و رفت تھی، مشہور قصبہ بندی کے قریب واقع بندی گھاٹ پر ندی پار کی جاتی۔ دوسری چوڑی گزرگاہ جواب پختہ سڑک میں تبدیل ہوچکی ہے ولید پور گھاٹ پر دریا کو قطع کرتی ہے۔

سمبھی اور کوئریاپار کے درمیان موازنہ صرف قدرتی اور معاشرتی حالات تک محدود نہیں یعنی دونوں دور افتادہ گاؤں پگڈنڈیوں کے ذریعہ شہر اور قصبے سے جوڑے

ہوئے، کھیتی باڑی لوگوں کا عام پیشہ، زمیندارانہ نظام کی کارفرمائیاں، طبقوں اور پیشوں کے اعتبار سے گاؤں کے باشندوں کی تقسیم، کچے اور نیم پختہ بے ترتیب مکانات، عام غربت۔

ان دونوں مواضعات کے بعض موازنے دلچسپی سے خالی نہیں ہوں گے جیسے کہ چرند و پرند اور پھل پودوں کا فرق۔ سمبھی میں کوئے بالکل سیاہ اور سائز میں قدرے بڑے ہوتے ہیں اور ان کی آواز تیز اور کرخت ہوتی ہے غالباً انہی کو زاغ دشتی کہتے ہیں، کوئریاپار میں پائے جانے والے کوئے سائز میں قدرے چھوٹے یعنی ہلکے ہوتے ہیں اور مکمل سیاہ نہیں ہوتے ان کی گردن پر ہلکے فاختئی رنگ کی پٹری ہوتی ہے اور آواز بھی نسبتاً کم تیز ہوتی ہے۔ اسی طرح سمبھی میں مَینا کی وہ قسم بکثرت پائی جاتی ہے جو یک رنگ سیاہی مائل فاختئی اور سائز میں بھی تقریباً فاختے کے برابر ہوتی ہے جبکہ کوئریاپار میں بالعموم اس کی دوسری قسم پائی جاتی ہے، جس کی چونچ اور پنجے نمایاں طور پر زرد ہوتے ہیں جو ابلقہ کہلاتے ہیں اور قدرے ہلکے ہوتے ہیں۔ سمبھی میں بار برداری کے لیے اونٹ نظر آتے تھے اور سواری کے لیے ہاتھی بھی لیکن میں نے کوئریاپار میں اونٹ نہیں دیکھا۔ ہاتھی بھی اتفاقی طور پر بارات وغیرہ میں دیکھنے میں آئے۔ سمبھی میں دھان کی کاشت زیادہ ہوتی تھی، کوئریاپار میں گندم بکثرت زیرکاشت تھا۔ سمبھی میں مونگ پھلی بوتے ہوئے نہیں سنا گیا نہ تل نہ پوستہ لیکن کوئریاپار میں مونگ پھلی اور تل اور جب تک سرکاری اجازت نامہ حاصل تھا پوستے کی کاشت بھی ہوتی رہی۔ سمبھی میں بھُٹّے اور پھوٹ بہت اچھے اور بہ افراط ہوتے تھے کوئریاپار میں اس کی فصل اچھی نہیں ہوتی۔ خربوزے کوئریاپار میں بہت عمدہ اور بہ افراط ہوتے ہیں، سمبھی میں وہ بات نہیں۔ قلمی اور تخمی ہر طرح کے آم کے باغات کوئریاپار میں بہت تھے اور لوگوں میں اس کا ذوق بھی تھا سمبھی میں نہیں۔

ان موازنوں سے قطع نظر بھی سمبھی اور کوئریاپار کے درمیان بڑا فرق تھا، ایک تو وہی جو کسی چھوٹے اور بڑے گاؤں کے درمیان ہوا کرتا ہے، کوئریاپار نسبتاً بڑا گاؤں تھا یعنی آبادی زیادہ تھی اور اس میں تنوع بھی زیادہ تھا، تعلیم طبقہ اشراف تک محدود تھی لیکن اس کی

کارفرمائیاں تمام نظر آتی تھیں۔ کئی جید علماء تھے، مذہبی تعلیم کا غلبہ تھا یوں انگریزی تعلیم یافتہ اور سرکاری ملازمتوں میں اعلیٰ عہدوں پر فائز لوگ بھی موجود تھے۔ جنھوں نے شہروں میں رہتے ہوئے بھی گاؤں سے رشتے استوار رکھے تھے۔ گھریلو صنعتوں میں پارچہ بافی بڑے پیمانے پر ہورہی تھی اور اس پیشے سے وابستگان کی اچھی خاصی آبادی تھی، ان میں حفاظ، علماء اور معلم بھی تھے جو اپنی پیشہ وارانہ مصروفیات کے باوجود دینی اور معاشرتی خدمات انجام دے رہے تھے۔ ان لوگوں کے کاروباری رشتے مئو سے استوار تھے۔ یہ سلسلے اب بھی نہ صرف قائم ہیں بلکہ وسعت پذیر ہیں۔ اب کرگہ کی جگہ پاور لوم چلنے لگے ہیں اور اعلیٰ درجے کی بنارسی ساریاں تیار ہونے لگی ہیں۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آگے بڑھنے سے پہلے کوئریاپار کے نام کے بارے میں کچھ عرض کردوں۔ گاؤں کی شمال مشرقی حدوں کے قریب ایک تالاب ہے اس کے پوربی کنارے پر زمانۂ قدیم کا ایک مزار ہے جو لکھوری اینٹوں کا ہے۔ ایک زمانے سے سرد وگرم حالات کی دست و برد کے باوجود اس کا بڑا حصہ باقی ہے۔ محترم خلیل الرحمٰن بھائی نے (شمس الرحمٰن فاروقی کے والد) اپنی تصنیف ''قصص الجمیل فی سوانح خلیل'' میں لکھا ہے کہ وہ مزار ایک بزرگ کوڑیا شاہ کا ہے، انہی کی نسبت سے اس گاؤں کا نام ''کوڑیا پار'' ہوا۔ عین ممکن ہے کہ اس علاقے میں وارد ہونے والے اولین بزرگوں میں وہ شامل رہے ہوں۔ قمر الزماں مبارکپوری اپنی تصنیف ''سخنوران اعظم گڑھ'' میں لکھتے ہیں کہ ضلع اعظم گڑھ میں سات پرگنے تھے جن میں سے ایک کا نام ''کوڑیا'' تھا۔ غالباً اسی پرگنے کے علاقے میں قیام پذیر ہونے والے بزرگ کو کوڑیا شاہ کہا گیا ہو۔ یہ تو نہیں معلوم کہ کوئریا کی سرزمین پر فاروقی بزرگوں کا ورود مسعود کب ہوا لیکن قیاس یہی ہے کہ علمائے جونپور جب تبلیغ کے لیے نکلے اور ہر طرف کارواں در کارواں روانہ ہوئے اسی زمانے میں ان بزرگوں میں سے کچھ اس دیار میں بھی وارد ہوئے ہوں گے۔ اس وقت ضلع اعظم گڑھ کا علاقہ بھی جونپور میں شامل تھا اس لیے علمائے اعظم گڑھ بھی علمائے جونپور میں شمار کیے جاتے تھے۔

اس وقت کوئریاپار ضلع اعظم گڑھ میں شامل تھا اس لیے کوئریاپار میں مقیم علماء کو بھی علمائے اعظم گڑھ میں شمار کیا گیا۔

کوئریاپار میں بہتیری مسلم اور غیر مسلم اقوام آباد تھیں۔ سمبھی کی آبادی میں اس قدر تنوع نہ تھا۔ مثلاً کوئریاپار میں دھنئے اور دفالی بھی تھے جو سمبھی میں نہ تھے۔ غیر مسلموں میں نونئے اور کھٹیک کوئریاپار میں تھے جو سمبھی میں نہ تھے۔ سمبھی میں غیر مسلموں کی ایک ذات برئی بھی تھی جو پان کی کاشت کیا کرتے تھے۔ گاؤں کی آبادی کے قریب وہ مرتفع قطعات کو ٹڑوں سے گھیر کر اس پورے رقبے کو بانس کی فچیوں اور سرکنڈے کے بنے ہوئے چھپروں سے ڈھک دیتے، اس طرح محبوس احاطے میں دھوپ براہِ راست تو نہیں آتی لیکن سورج کی حرارت پہنچتی رہتی۔ اس میں موٹے موٹے بانس قطار در قطار گاڑ کر ان پر پان کی بیلیں چڑھائی جاتیں۔ برسات میں سارا پانی مرتفع زمین پر سے بہہ جاتا، دیگر موسموں میں پانی کی ضرورت گڑھی پوکھروں سے پوری کی جاتی۔ یہ تام جھام بالعموم کسی تالاب کے قریب ہی اونچاس میں بنایا جاتا جس کو مقامی زبان میں بریٹھا کہا جاتا تھا۔

بچپن میں میں سمجھتا تھا کہ نونیوں کے بس دو ہی کام ہیں مکان بنانا اور ان کی مرمت کرنا اور آم کی فصل میں درختوں پر سے پھل توڑنا۔ آم توڑنے کی اجرت ایک گاہی (پانچ) فی سیکڑہ ہوتی تھی۔ یہاں ضمناً یہ بیان کردینے میں کچھ مضائقہ نہ ہوگا کہ ہمارے درختوں پر جو آم نونیوں کی دسترس سے باہر ہوتے وہ میری دسترس سے نہیں بچ سکتے تھے، اس سے پیڑ پر چڑھنے میں میری مہارت اور بےخوفی کا کچھ اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

کوئریاپار میں زمینداروں کے بااثر طبقے کا ایک محلّہ تھا، جو گاؤں کے جنوب مشرقی حصہ پر محیط تھا جس کا بالکل جنوب مشرقی گوشہ ہمارے گھرانوں پر مشتمل تھا اس کے بعد چند گھرانے درمیانی علاقے میں تھے، حیرت کی بات ہے کہ ان گھرانوں کے معاشرتی فرق کو دیکھا اور محسوس کیا جاسکتا ہے۔ غالباً ان لوگوں کے اسلاف بی بی پور اور کوٹھیا کے اطراف سے آکر آباد ہوئے جبکہ ہمارے گھرانے گاؤں کی بنیادی اور ابتدائی آبادی میں

شمار کیے جاتے ہیں گو دو تین خاندان مئو سے بھی آ کر خلط ملط ہو گئے ہیں، تیسرا حصہ پچھمی تھا ان کے کئی گھرانے ایک ہی مورثِ اعلیٰ سے تعلق رکھتے تھے اور ان کی قرابتیں بھی سمبھی سے چلی آ رہی تھیں۔

گاؤں کے قلب سے ایک کچی سڑک پورب پچھّم گزری تھی جو اب پختہ ہو گئی اور اصل بازار کی حیثیت رکھتی ہے اسی کے کنارے بنئے، درزی، سونار اور دیگر پیشہ ور آباد تھے۔ دراصل ان کی رہائشوں ہی کے سامنے کا حصہ بطور دکان استعمال ہوتا تھا، بڑی حد تک اب بھی ایسا ہی ہے۔ چونکہ گاؤں کی بیشتر زمینیں زمینداروں کی ملکیت میں تھیں، اس لیے دکانداروں اور دیگر پیشہ وروں کے بیشتر مکانات قانوناً زمینداروں کی ملکیت میں تھے۔ اس برائے نام قانونی حیثیت کے بدلے میں زمینداروں کو خاص خاص موقعوں پر کچھ رعاتیں حاصل تھیں مثلاً شادی بیاہ اور تہواروں کے موقع پر درزی مفت کپڑے سل دیتے، سونار زیورات صاف کر دیتے اور بنا بھی دیتے۔ گاؤں کے پچھمی اور دکھنی حصوں میں کچھ فاصلے پر غیر مسلم اقوام کی آبادیاں تھیں، جو زمینداروں کے کھیت کھلیان اور گھر دروازے کے سارے کام انجام دینے کے پابند تھے۔ یہ لوگ رعایا، پرجا یا اسامی کہلاتے تھے، ان کے مکانوں کی زمینیں بھی دراصل زمینداروں کی ملکیت ہوا کرتیں۔ آزادی ملتے ہی سب سے پہلے جب یوپی میں زمینداری کے خاتمے کا قانون پاس ہوا تو زمینوں اور مکانوں پر ہر قابض اس کا قانونی مالک بن بیٹھا اور زمیندار اپنی ملکیت سے محروم ہو گیا۔

آزاد ہندوستان میں یہ پہلا امتیاز تھا، جو قانونی طور پر نافذ کیا گیا۔ زمینداری دیہی علاقوں میں راتوں رات ختم کر دی گئی جبکہ شہری علاقوں میں زمینوں اور جائدادوں کو تنسیخ زمینداری کے اس قانون سے بری رکھا گیا، بہ الفاظِ دیگر شہری مگرمچھوں کی زمینداریاں برقرار رہیں۔ دیہی علاقوں میں بڑے بڑے تعلق داروں اور جاگیرداروں اور متوسط اور چھوٹے درجے کے زمینداروں کے درمیان کوئی تمیز نہیں کی گئی نتیجے کے طور پر وہ غریب جو وراثت میں ملی ہوئی برائے نام زمینداری کی تہمت لیے پھر رہے تھے اپنی

جائدادوں سے محروم اور نانِ شبینہ کو بھی محتاج ہو گئے۔ اس تنسیخِ استحقاق کے بدلے میں حکومت نے جو برائے نام معاوضہ دینا منظور کیا اس کی ادائیگی بھی بیس سالانہ قسطوں میں ہونا طے پایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس استحقاق کے دستاویزات جو بانڈ کہلاتے تھے غریب زمینداروں نے اونے پونے شہری بنیوں کے ہاتھ فروخت کر دیے کہ وہ اس پر مجبور تھے۔ اس طرح دیہی املاک کا نام نہاد معاوضہ بھی شہری مگرمچھوں کے حصہ میں چلا گیا۔ اس پر مستزاد یہ کہ مقدمہ بازیوں کے نئے دروازے کھل گئے۔ بانڈ بیچنے پر جو اونے پونے دام ملے تھے وہ وکیلوں، کچہری کے چپراسیوں، پیشکاروں، اہل کاروں اور اسٹامپ فروشوں کی جیب میں گئے اور کچھ جھوٹے سچے گواہوں کی آؤ بھگت پر خرچ ہوا۔ اللہ اللہ خیر صلا۔

میرا تعلق زمینداروں کے انہی گھرانوں میں سے ایک سے ہے جس کے حصے میں آزادی کے دوسرے ہی دن یہ نا انصافی لکھی گئی۔ یہ لوگ مقامی طور پر ''ملکی'' کہلاتے ہیں۔ اب آگے بڑھنے سے پہلے بعض اقتباسات پر نظر ڈال لینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

> ''اعظم گڑھ کے کھلے ہوئے دو حصے ہیں۔ ایک حصے میں اکثر راجپوتوں یا دوسرے نومسلموں کی آبادی ہے۔ دوسرا حصہ وہ ہے جس میں وہ خاندان آباد ہیں جن کے آبا و اسلاف دوسرے اسلامی ملکوں یا شہروں سے ہجرت کر کے یہاں آئے یا آباد ہوئے۔ اس دیار کی زبان میں ان بزرگوں کو 'مِلکی' کہا جاتا ہے۔''
>
> (حیاتِ شبلی از سید سلیمان ندوی، ص ۵۱)
>
> ''مسلمانوں میں جو عرب اور دیگر ممالک اسلامیہ سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے اور اس علاقے میں آباد ہو گئے انھوں نے اپنے حسب نسب کو حتی الامکان محفوظ رکھا، اپنے ہی خاندانوں میں شادیاں کیں۔ وہ اپنے شاہانہ اقتدار، علمی ذوق اور ذاتی وقار کے باعث دوسروں پر خود کو ترجیح دیتے تھے۔ اس علاقے میں ان کو 'مِلکی' کہا گیا۔ لفظ 'ملکی' 'مِلک' سے ماخوذ ہے ..... ملکیوں نے اپنے حسب نسب اور قدیم اسلامی طرز، رہن سہن کو باقی رکھا، تعلیم کا رواج ان میں ہمیشہ رہا اور

تہذیب وتمدن کے حامل رہے، ان کی تہذیب و معاشرت ہر دور میں معیار بنی رہی۔ اللہ نے دین اور دنیا کی نعمتوں سے نوازا۔''

(آثارِ مشرق از مولانا ابراہیم ندوی جامعی، ص ۲۸)

''جونپور کو شیرازِ مشرق قرار دیا گیا ہے اور اس ضمن میں مولانا شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی کا ایک عربی شعر نقل کیا گیا ہے جس کا مطلب ہے۔ جونپور سے جس وقت ہوائے دل پسند چلی تو اس سے ساری دنیا معطر ہوگئی اور دنیا کی ہر شئے پر اس کی خوشبو چھا گئی۔'' (آثارِ مشرق، ص ۲۷)

اس شیراز مشرق کے حسبِ ذیل حدود اربعہ بیان فرماتے ہیں:

''زمانہ قدیم میں بنارس، غازی پور، اعظم گڑھ اور اودھ کا تمام علاقہ صوبہ جونپور کے ماتحت تھا۔ موجودہ اعظم گڑھ کا علاقہ بعد میں بھی مدت دراز تک جونپور کا ہی حصہ رہا اسی وجہ سے اس دور کے علماء جونپوری کہلاتے تھے خواہ وہ موجودہ اعظم گڑھ کے ہی کیوں نہ ہوں ..... انگریزی عمل داری میں خطہ جونپور کئی حصوں میں منقسم ہوگیا..... جونپور، اعظم گڑھ اور غازی پور میں کثرت سے مسلمانوں کی آبادیاں ہیں، اکثر شاہانِ شرقی کے عہد کی ہیں اور کچھ مغلوں کے دور میں آباد ہوئیں۔'' (آثارِ مشرق، ص ۲۷)

''جس شاہی خاندان نے ہندوستانی موسیقی سے بحیثیت ایک فن کے خاص اعتنا کیا وہ غالباً جونپور کا شرقی خاندان تھا، چنانچہ اسی عہد میں خیال عام طور پر مقبول ہوا۔''

(غبارِ خاطر از مولانا ابوالکلام آزاد، ص ۲۴)

مذکورہ بالا عبارت سے متعلق حاشیہ میں جناب مالک رام لکھتے ہیں:

''جونپور شرقی کی ابتدا خواجہ جہان کی ہاتھوں ۷۹۶ھ/۱۳۹۴ء میں ہوئی اور ۸۸۱ھ / ۱۴۷۷ء میں اس کا خاتمہ ہوا جبکہ حکومت دہلی نے اس پر قبضہ جمالیا۔''

محمد آباد گوہنہ

''مردم خیز قصبہ ولید پور کے نزدیک واقع ہے۔ سادات کی آبادی غالباً مغل بادشاہ اکبر کے زمانے سے ہے لیکن اس کی کوئی تاریخی شہادت حاصل نہیں ہے۔ بندوبست کے دوران انگریز گورنر ریڈ صاحب نے یہاں کے حالات قلمبند کیے تھے.....قصبہ کے شمال میں دریائے ٹونس کے کنارے ایک ظالم ہندو راجہ کا محل یا قلعہ تھا.....عوام راجہ کے استبداد سے پریشان تھے.....اکبر نے اپنے سپہ سالار سید حمیدالدین کو راجہ کی سرکوبی کے لیے روانہ کیا۔ راجہ تہِ تیغ ہوا اور امن و امان قائم ہوا۔ سید حمیدالدین کے دو فرزند محمد اور محی الدین تھے جن کے نام سے دریا کے جنوب میں محمد آباد اور شمال میں محی الدین پور گاؤں اب بھی آباد ہیں۔''

(آثارِ مشرق، ص ۳۷)

''محمد آباد میں شرفاء کے متعدد خاندان آباد ہیں جن کے اسلاف قرب و جوار کے اضلاع سے آ کر آباد ہوئے۔ بازار کے جنوب میں محلّہ شیخ واڑہ اور دریا سے متصل سید واڑہ ہے، رؤسا اور سرکاری افسران کی بستی رہی ہے۔ محلّہ شیخ واڑہ کے لوگ دریائے ٹونس کے شمال میں واقع موضع کوئر یا پار سے آ کر آباد ہوئے۔''

(آثارِ مشرق، ص ۳۸)

میرے والد کے بڑے چچازاد بھائی مولوی محمد اصغر صاحب مرحوم کے سب سے چھوٹے بیٹے برادرِ محترم خلیل الرحمٰن فاروقی صاحب مرحوم ''قصص الجمیل فی سوانح خلیل'' میں خاندانی حالات کے ضمن میں فرماتے ہیں:

''میں نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ ہمارا نسب نامہ شیخ عبداللہ بن عمر فاروقؓ تک پہنچتا ہے.....میرے خاندان میں ایک قلمی شجرہ ہے جو میرے والد مرحوم کے چھوٹے چچازاد بھائی مولوی سبحان اللہ صاحب مرحوم کے پاس تھا۔ یہ شجرہ میں نے بھی اپنے بچپن میں دیکھا تھا مگر افسوس کہ چچا مرحوم سے گاؤں کے ایک معزز عالم

نقل کرنے کے لیے لے گئے اور وہ ان سے تلف ہوگیا۔''

والد مرحوم کو اس خاندانی شجرے کے تلف ہوجانے کا بڑا افسوس تھا۔ ان کا بیان تھا کہ وہ کافی بوسیدہ ہوگیا تھا۔ مولوی علی احمد صاحب مرحوم سرائے میر سے آئے ہوئے تھے ان کا نسب نامہ بھی اس شجرے میں موجود تھا، انھوں نے اسے دیکھا اور کہا کہ میں اسے لے جا کر اس کی جلد بندی کرادوں گا چنانچہ وہ لے گئے، پھر وہ انھیں سے کہیں گم ہوگیا۔ اس شجرے کا ایک سراغ مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی کی تصنیف ''تذکرۂ علمائے اعظم گڑھ'' میں ملتا ہے۔ اس کتاب کے ص ۲۱۵ پر حضرت مولانا علی احمد کوئریاپاری سرائے میری کے تذکرے میں مولانا کا سلسلہ نسب حضرت عبداللہ بن امیر المؤمنین عمر بن الخطابؓ تک لکھا ہے۔ بحوالہ ''بیاض خاص قلمی ص ۲۸۸، بخطِ مولانا و خاندانی شجرہ قلمی ص ۲۰ تا ص ۳۳۔'' یہ وہی خاندانی شجرہ ہے جو لاپتہ ہوگیا۔

جب ہمارے اور مولوی علی احمد صاحب مرحوم کے دونوں خاندان کوئریاپاری ٹھہرے اور دونوں کے مورث اعلیٰ ایک ہی ہیں تو ان دونوں خاندانوں کے مشترک اسلاف کو بھی اسی خطے میں ہونا چاہیے۔ میری معلومات کی رسائی تو اپنے دادا خادم الحق صاحب مرحوم اور ان کے والد پیغمبر بخش فاروقی اور انکے چچا خدا بخش تک محدود ہے۔ دوسری طرف مولوی علی احمد صاحب کے والد محمد رضا میرے دادا خادم الحق کے اور مولانا کے دادا میرے پردادا پیغمبر بخش فاروقی کے ہم عصر رہے ہوں گے۔ گویا دونوں خاندانوں کے انہی مذکورہ بالا بزرگوں کے قریب پاس اس سلسلے کی کوئی گمشدہ کڑی ہے۔

میری معلومات کی حد تک ہمارا خاندانی سلسلہ حسب ذیل ہے:

خدا بخش اور پیغمبر بخش فاروقی (دونوں بھائی)

پیغمبر بخش فاروقی: اکرام الحق، سخاوت علی، خادم الحق

اکرام الحق: محمد اصغر

سخاوت علی: محمد کافی

خادم الحق: بسم اللہ، حمد اللہ، سبحان اللہ اور حبیب اللہ

محمد اصغر: محمد طٰہٰ، عبداللہ، عبدالرحمٰن، فضل الرحمٰن، عزیز الرحمٰن، حبیب الرحمٰن، خلیل الرحمٰن، مسعود الرحمٰن

محمد کافی: ذکاء اللہ

سبحان اللہ: غفران اللہ، رضوان اللہ، مطیع اللہ، امان اللہ، ثناء اللہ اور فیضان اللہ

میرے والد مولوی سبحان اللہ صاحب مرحوم اپنے چار بھائیوں میں سے تیسرے تھے۔ ان کے تینوں بھائیوں کا نوجوانی میں انتقال ہوا۔ بسم اللہ چچا حفظ کر چکے تھے۔ حبیب اللہ چچا دیوبند سے فراغت حاصل کر چکے تھے۔ ابا نے روایتی تعلیم اپنے نانیہال مئو میں حاصل کی۔ دینی تعلیم کے علاوہ طب کی تعلیم بھی حاصل کی۔ نانیہال میں ان کے قیام کی وجہ یہ ہوئی کہ دادا کے انتقال کے وقت ان کے بچے نوعمر ہی تھے بعد میں ان میں سے بھی تین باری باری داعی اجل کو لبیک کہتے گئے۔ ایسے میں دادی مرحومہ کے لیے اپنا توازن برقرار رکھنا اور سارے صدمات کو سینے سے لگائے لق و دق مکان میں تنہا پڑے رہنا ممکن نہ تھا۔ ان کے بھائیوں نے انھیں اپنے ہاں بلا لیا۔ ابا کے تینوں ماموں مولوی محمد عمر صاحب، مولوی عبدالعزیز صاحب اور مولوی عبدالحفیظ صاحب عالم بھی تھے اور طبیب بھی۔ وہ سادات کے ایک ایسے خانوادے سے تعلق رکھتے تھے جسے سلاطین کی طرف سے ایک موضع راجن پور بطورِ جاگیر ملا ہوا تھا۔ قصبہ مئو ناتھ بھنجن کے محلّہ اورنگ آباد میں واقع ایک بڑا سا احاطہ ان کا ملجا و ماویٰ تھا۔ آزادیِ وطن کے ساتھ جاگیر کا تو خاتمہ بالخیر ہوا لیکن وہ احاطہ برقرار ہے جس کے اندر اس خاندان کے افراد رہتے بستے چلے آ رہے ہیں۔

بڑے دادا یعنی مولوی محمد عمر صاحب کی طبابت کا شہرہ دور دور تک تھا۔ بہار کے شہر سمستی پور میں عرصہ دراز تک ان کا قیام رہا اس اثناء میں وہ کسی راجہ کے طبیب خاص بھی تھے۔ ان کے وسیلے سے پورے قبیلے میں بڑی فراغ دستی تھی۔ کنبہ پروری کی روایت بڑی پہناور تھی اور قبیلے کے دور تک بکھرے ہوئے افراد پر سایہ فگن تھی چنانچہ کنبے کے کمزور

عناصر کی بھی آرام سے گزر بسر ہوتی تھی۔ انہی حالات میں ابا کی پرورش ہوئی، چنانچہ ان کے مزاجی خواص میں بے نیازی اور استغنا بدرجہ اتم شامل تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کوئر یا پار کی آبائی جائداد کے تئیں بھی ان کا رویہ بے نیازانہ رہا۔ آبادی میں کئی قطعات جس نے مانگے اسے دے دیا، جو شخص کاشت کاری کا نگراں تھا اس نے جس قدر پیداوار بتائی وہ درست تھی۔ جس قدر لگان وصول ہوسکتی ہوتی ورنہ دو تین سال کے بعد بقایا جات کی معافی۔ ابا نے تعلیم کے سلسلے میں کچھ عرصہ بڑے ماموں کے ساتھ لکھنؤ میں گزارا، اس کے بعد کوئر یا پار مئو اور شادی کے بعد سمبھی میں مہینوں کے حساب سے وقت کو تقسیم کرتے رہے اور جہاں بھی رہے وقت کی تقسیم گھر اور مسجد کے درمیان ہوتی۔ کبھی کبھی مچھلی کے شکار سے بھی شوق کرتے۔

میرے دادا تین بھائی تھے۔ بالترتیب اکرام الحق، سخاوت علی اور خادم الحق۔ دادا کے چار بیٹوں میں سے صرف ایک، ابا عمر طبعی کو پہنچے اور ان کے اولادیں ہوئیں۔ دادا کے منجھلے بھائی سخاوت علی کے بھی ایک ہی بیٹے محمد کافی تھے۔ وہ پیدائشی گونگے تھے ان کے ایک بیٹے محمد ذکاء اللہ تھے جن کے کئی اولادیں ہوئیں۔ دادا کے سب سے بڑے بھائی محمد اکرام الحق تھے ان کے بھی ایک ہی بیٹے مولوی محمد اصغر تھے جن کے خاندان کے نام خدا نے سارا شرف لکھ دیا۔ ان کے آٹھ بیٹے تھے بالترتیب محمد طٰہٰ، محمد عبداللہ، عبدالرحمٰن، فضل الرحمٰن، عزیز الرحمٰن، حبیب الرحمٰن، خلیل الرحمٰن اور مسعود الرحمٰن۔ آخر الذکر کا ۱۲ برس کی عمر میں طاعون میں انتقال ہوا۔ دوسرے بیٹے عبداللہ بھائی مرحوم کا انتقال عین عالمِ شباب میں ہوا۔ وہ بلیا میں وکالت کرتے تھے۔ گھر آتے ہوئے راستے میں کوئی غذا استعمال کی جس میں سمیت تھی، قے دست شروع ہوا اور گھر پہنچنے سے پہلے ہی جاں بحق ہوئے۔ دو بیٹے شمس الہدیٰ فاروقی اور قمر الہدیٰ فاروقی اور دو بیٹیاں چھوڑ گئے۔ شمس الہدیٰ فاروقی صاحب جو شاعری سے بھی شغف رکھتے تھے اور قیسیؔ تخلص تھا بحیثیت ڈپٹی کلکٹر جونپور میں ریٹائر ہوکر وہیں پیوندِ خاک ہوئے۔

مولوی محمد اصغر صاحب گورکھپور گورنمنٹ نارمل اسکول میں ٹیچر تھے۔ انھوں نے

فراقؔ صاحب کو بچپن میں اردو اور فارسی پڑھائی تھی، منشی پریم چند ان کے ہم عصروں میں تھے۔ مولوی صاحب جنوری ۱۹۲۵ء میں ریٹائر ہوکر کوئریاپار آ گئے اور وہیں ۱۷؍جولائی ۱۹۴۶ء کو داعی اجل کو لبیک کہا۔ گاؤں اور اطراف و دیار میں وہ صرف مولوی صاحب کے نام سے مشہور تھے۔ انھوں نے خدمتِ خلق کے طور پر طبابت اختیار کی۔ صبح ناشتے سے فراغت کے بعد باہر دروازے پر آ بیٹھتے۔ مریض دور دور سے آتے وہ ان کی نبض دیکھتے اور دیسی دوائیوں کے سستے نسخے لکھ دیتے۔ وہ دوائیاں گاؤں ہی میں دو پیسے یا ایک آنے میں مل جاتیں۔

مولوی صاحب نے اپنی زندگی ہی میں اپنی جائداد اپنے بیٹوں میں تقسیم کردی تھی۔ ان کے چھ بیٹے تاحیات ان کے دل کو ٹھنڈک پہنچاتے رہے۔ سب سے بڑے بیٹے حافظ محمد طٰہٰ صاحب کورٹ انسپکٹر پولیس تھے اسی نسبت سے ''کوٹ صاحب'' کہے جاتے تھے۔ صوم وصلوٰۃ کے بے حد پابند تھے۔ یہ خصوصیت تو خاندان کے سارے افراد میں بدرجۂ اتم موجود تھی۔ وہ رمضان شریف میں تراویح پڑھاتے۔ ملازمت کا بیشتر عرصہ گورکھپور میں گزارا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد کوئریاپار آ گئے۔ یہاں عبادت، تلاوت، اورادو وظائف کے علاوہ ان کی اور کوئی مصروفیت نہ تھی۔ جن لوگوں نے انھیں گورکھپور میں دیکھا تھا ان کا بیان ہے کہ وہ عدالت میں کھڑے ہوتے تو جب تک مقدمے کی کارروائی نہ شروع ہوتی ان کا ہاتھ جیب میں ہوتا اور تسبیح جاری رہتی، تقویٰ اس حد تک تھا کہ سرکاری کاغذ، پنسل یا آل پن تک ذاتی استعمال میں نہ لاتے۔ وہ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے خلیفہ مجاز تھے۔ زمانے کے حالات ناسازگار ہونے کی وجہ سے ۱۹۴۴ء میں قبل از وقت پنشن لے لی۔ ۱۹۶۵ء میں وفات ہوئی اور والدین کے پہلو میں آسودۂ خاک ہوئے۔

بڑے ابا کے دوسرے بیٹے عبداللہ بھائی مرحوم تھے جن کی جوانمرگی کا ذکر ہو چکا ہے۔ تیسرے بیٹے عبدالرحمٰن بھائی تھے۔ وہ گورنمنٹ جبلی ہائی اسکول میں انگریزی کے استاد تھے۔ زہد وتقویٰ جو ورثے میں ملا تھا اس کے علاوہ شعر گوئی سے بھی انھیں شغف تھا،

زاہد تخلص تھا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد کوئریاپار میں قیام فرمایا۔ اہلیہ کے انتقال کے بعد بالکل تنہا رہ گئے۔ ان کے کوئی اولاد بھی نہ تھی، گٹھیا کے مریض تھے، جوڑوں کے درد میں مبتلا رہتے تھے چنانچہ ان کے بھتیجے شمس الہدیٰ فاروقی صاحب جو اس وقت جونپور میں ڈپٹی کلکٹر تھے انھیں اپنے ساتھ لے گئے اور وہیں ۱۹۶۴ء میں وفات پائی۔ ان کی نفاست پسندی انھیں اپنے دوسرے بھائیوں سے ممیّز کرتی تھی۔

ان کے بعد فضل الرحمٰن بھائی تھے۔ وہ بچپن ہی سے عبادت و ریاضت کی وجہ سے گھر میں شاہ صاحب کہے جاتے تھے۔ ہائی اسکول پاس کرنے کے بعد وہ گورنمنٹ ہائی اسکول کانپور میں ٹیچر ہوگئے، لیکن مدرسہ الٰہیات میں دینی تعلیم بھی جاری رکھی۔ دو برس بعد وہاں سے دورۂ حدیث کے لیے دیوبند چلے گئے۔ اس کے بعد اردو و فارسی کے کئی امتحانات اور انٹرمیڈیٹ پاس کرنے کے بعد ہمیر پور، دیوریا اور فیض آباد کے گورنمنٹ اسکولوں میں خدمات انجام دیں۔ بالآخر فیض آباد سے ریٹائر ہوکر اپنے وطن کوئریاپار میں قیام فرمایا اور ۱۹۶۵ء میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ والدین کے پہلو میں آرام فرما ہوئے۔ بچپن سے ہی ان کی پرہیزگاری کے کئی واقعات مشہور تھے۔ ان کے بیٹوں نے گورکھپور میں سکونت اختیار کی۔

بھائیوں میں ان کے بعد مولوی عزیز الرحمٰن صاحب تھے وہ ۱۹۱۹ء سے ۴۲ برس تک شبلی ہائی اسکول اعظم گڑھ میں مدرسی کے فرائض انجام دینے کے بعد ۱۹۶۶ء میں ریٹائر ہوئے اور اعظم گڑھ میں ہی سکونت اختیار کی۔ اپنے بھائیوں میں سب سے آخر میں ۱۹۹۳ء میں ان کی وفات ہوئی۔ انھوں نے انتہائی سادہ زندگی بسر کی۔ اتنے طویل عرصہ تک مدرسی کی وجہ سے ان کے شاگرد برصغیر کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ وہ سترہ سال تک ہر ہفتہ چھٹی کے دن والدہ سے ملاقات کے لیے بذریعہ سائیکل تقریباً بیس میل کوئریاپار آتے اور اگلے دن صبح سویرے واپس جاتے۔ یوں گرمی کی چھٹیوں میں سارے بھائی بالعموم گاؤں آکر چھٹیاں والدین کے ساتھ گزارتے۔

اجن بھائی نے (ہم لوگ انھیں اسی نام سے جانتے مانتے تھے) بتایا کہ میں نے ۴۲ سال کی ملازمت کے دوران اسکول کی چھٹیوں کے علاوہ ایک دن بھی ذاتی چھٹی نہیں لی، دوسرے یہ کہ زندگی بھر کبھی کسی سے دو پیسہ بھی قرض نہیں لیا۔

ان کے بعد حبیب الرحمٰن بھائی تھے جنھیں ہم لوگ حبن بھائی کہتے تھے۔ وہ بھی اپنے بڑے بھائیوں کی طرح وضع دار اور پابند صوم وصلوٰۃ تھے انھوں نے گورکھپور کچہری میں ملازمت کی اور ریٹائرمنٹ کے بعد اسی شہر میں سکونت پذیر ہوئے۔ وہ کچہری کی مسجد میں امامت کرتے تھے ریٹائرمنٹ کے بعد محلے کی مسجد میں امامت کرنے لگے۔ ان کی امامت کی مدت بھی کم وبیش پچاس برس رہی ہوگی۔ ان کے تین بیٹوں میں سے دو گورکھپور ہی میں سرکاری ملازمتوں پر فائز رہے۔ چھوٹے بیٹے محبوب الرحمٰن آل انڈیا ریڈیو سے وابستگی کی بنا پر گورکھپور اور دہلی ٹرانسفر ہوتے رہے بعد میں اردو ماہنامہ ''آجکل'' کی ادارت پر فائز رہے۔ اور آخر میں سینٹرل سکریٹریٹ میں ٹرانسفر ہوگیا وہیں سے ریٹائر ہوئے، ۲۰۱۸ء میں وفات ہوئی۔

بھائیوں میں سب سے چھوٹے خلیل الرحمٰن بھائی مرحوم تھے، وہ ڈپٹی انسپکٹر آف اسکولس تھے، اسی نسبت سے ڈپٹی صاحب کہے جاتے تھے۔ جملہ ظاہری اور باطنی اوصاف سے متصف تھے۔ ان کی ملازمت کا بیشتر زمانہ اعظم گڑھ اور بنارس میں گزرا، ریٹائرمنٹ کے بعد الٰہ آباد میں سکونت پذیر ہوئے اور وہیں ۱۹۷۳ء میں وفات پائی۔ ان کے سات بیٹوں میں جو سب کے سب اعلیٰ سرکاری عہدوں پر مامور ہوئے سب سے بڑے بیٹے شمس الرحمٰن فاروقی ہیں جو اردو دنیا میں محتاج تعارف نہیں ہیں بلکہ اردو ادب کی آئندہ تاریخ ان کے تذکرے کے بغیر نامکمل ہوگی۔

ان بزرگوں کے علم وفضل، زہد وتقویٰ، خدمتِ خلق اور پاک باطنی کے ساتھ ہی ان کی زندہ دلی اور بذلہ سنجی اور دنیاوی امور کو دین کے اصولوں کے مطابق برتنے کے ان کے سلیقے اور ان کی شانِ بے نیازی کا میں خود جس قدر شاہد ہوں اور جو کچھ میں نے چشم

دید راویوں سے سنا اس کو بیان کرنے کے لیے ایک علیٰحدہ مکمل تصنیف کی ضرورت ہے جو فی الحال میری بساط سے باہر ہے۔ کاش اللہ کا کوئی بندہ ان درخشندہ مثالوں کو تلف ہونے سے بچانے کے لیے انھیں قلمبند یا صدا بند کر لیتا کہ اس گئے گزرے دور میں بھی اسلاف کے کارنامے آئندہ نسلوں کے لیے مشعلِ راہ ہوتے ۔

خدا رحمت کند بر عاشقانِ پاک طینت را

بہرحال جیسا کہ بیان کر چکا ہوں میرے ابا اور بڑے ابا چچا زاد بھائی تھے اور اپنے اپنے والدین کے تنہا نور چشمان بھی۔ ان کے درمیان محبتیں سگے بھائیوں سے کم نہ تھیں۔ ان کی عمروں کے درمیان فرق تقریباً ایک پشت کا تھا یعنی بڑے ابا کے بیٹے عبداللہ بھائی مرحوم ابا کے ہم عمر تھے۔ چنانچہ بڑے ابا کے بیٹے ہمارے ابا کو چچا تو کہتے لیکن ان کے درمیان بے تکلفی بھائیوں اور ہم عمروں کی سی تھی۔ اسی طرح میری اور ان بھائیوں کی عمروں میں بھی ایک پشت کا فاصلہ تھا اس لیے وہ سب میرے ساتھ بزرگانہ شفقت اور محبت رکھتے تھے۔ ان کے بیٹوں میں سے کئی میرے ہم عمر تھے ہم لوگ گرمی کی چھٹیوں میں کوئر یا پار میں اکٹھا ہوتے، ان میں سب سے زیادہ میرا طبعی تعلق فضل الرحمٰن بھائی کے دوسرے بیٹے محمد عزیر سے تھا، جن کی پرورش اور تعلیم و تربیت عبدالرحمٰن بھائی نے کی تھی۔ عزیر کے بچپن ہی میں ماں کا انتقال ہو گیا تھا اور عبدالرحمٰن بھائی لاولد تھے، اس لیے بڑے ناز و نعم میں عزیر کی پرورش ہوئی نتیجہ ظاہر ہے وہ بڑا بے فکرا تھا۔ ۱۹۵۲ء میں میرے ساتھ کلکتہ گیا اور کوئی دو مہینے ہمارے ساتھ گزارنے کے بعد ایک دن اچانک لاپتہ ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہماری بے تکلفی ابے تبے اور مکے لات تک تھی۔ وہ دردِ گردہ میں مبتلا ہوا تو نصف شب تک میری بڑی بہن اس کی تیمارداری کے لیے اس کے پاس موجود رہتیں پھر دو بجے تک پریس سے واپسی کے بعد صبح تک میں اس کے پاس رہتا۔ خیر اس کی گمشدگی سے ہم لوگ بہت پریشان ہوئے۔ کوئی تین ہفتے بعد ڈھاکہ اور چٹاگانگ سے آنے والوں نے بتایا کہ عزیر سلمہٗ وہاں دیکھے گئے۔ غرض یہ کہ وہ پاکستان کے ہو رہے۔ محکمہ کسٹم کے ایک

افسر کی حیثیت سے ریٹائر ہوکر کراچی میں سکونت پذیر ہوئے۔ دہلی میں ۱۹۸۷ء میں اور کراچی میں ۱۹۸۸ء میں اس سے مختصر ملاقاتیں ہوئیں تو لپٹ لپٹ گیا۔ نئی صدی میں عزیر ایک بار دہلی سے گزرے تھے تو ہم لوگ پھر لپٹ کر مل لیے۔ بس اس کے بعد جلد ہی اس نے دنیا سے منہ موڑ لیا۔ اس خاندانی پس منظر کو بیان کرنے کے بعد اپنے لڑکپن کے اس مختصر عرصے کا تذکرہ آسان ہوگیا جو وقتاً فوقتاً کوئر یا پار میں گزرا۔

میں چونکہ اپنی نانی کے ساتھ ننھی تھا اس لیے بچپن میں انہی کے ساتھ کوئر یا پار آتا جاتا رہا اور ان کے قیام کے دوران وہاں رہتا۔ اسی اثناء میں میں نے اردو پڑھنا لکھنا شروع کیا اور کچھ ابتدائی حساب بھی۔ ان دنوں ابا کی زیرِ نگرانی گاؤں کی بڑی مسجد کی تعمیر کا سلسلہ جاری تھا، اس لیے ان کا زیادہ تر وقت اسی طرف گزرتا میں بھی کتاب سلیٹ لے کر کہیں آس پاس رہتا۔ جب ذرا شد بد ہوگئی تو ابا نے یہ فریضہ مجتبیٰ بھائی کو سونپ دیا وہ ابا کی پھوپھی زاد بہن کے بیٹے تھے اس لیے ابا کو ماموں کہتے تھے۔ اسی رشتے سے میں انھیں بھائی کہتا تھا۔ وہ مدرسے کے پڑھے ہوئے تھے اور بچوں کو پڑھانے لگے تھے لیکن بڑے چڑچڑے تھے اس لیے مارتے زیادہ اور پڑھاتے کم تھے۔ ابا میری مرمت کی کہانیاں سن کر اَن سنی کر دیتے۔ اس زمانے میں بچوں کی کھال کھینچنا استاد کا استحقاق تھا۔ کہاوت تھی کہ ماں باپ بچے کو استاد کے حوالے کرتے تو کہہ دیتے کہ اس کی ہڈی گڈی ہماری ہے اور کھال آپ کی۔

غالباً مہینے دو مہینے اس عذاب سے گزرا ہوں گا کہ میری نانی نے بچشم خود اس کا مشاہدہ کرلیا جو کہ ان کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ انھوں نے اسی وقت ابا سے کہا کہ میں رضوان کو لے کر سمبھی چلی جاؤں گی میرے جانے کا بندوبست کرو۔ ان کے غصے کی شدت کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے کوئر یا پار میں دانہ پانی حرام قرار دے دیا اور اگلے دن علی الصباح مجھے لے کر سمبھی روانہ ہوگئیں۔ کوئر یا پار میں میرے بچپن کا پہلا باب یہیں ختم ہوا۔ سمبھی آجانے کے بعد پھر میں نے دادی کو نہیں دیکھا کیونکہ مجھے وہیں سے کانپور روانہ کر دیا گیا

اور اسی سال دادی کا انتقال ہوگیا۔ کانپور سے گرمی کی چھٹیوں میں آتا تو کچھ دن کوئریاپار میں بھی گزار لیتا۔ جوں جوں شعور آتا گیا اور کوئریاپار کے لڑکوں سے گھلتا ملتا گیا وہاں میری دلچسپیاں بڑھتی گئیں۔ وہاں زیادہ تر لڑکے شہروں میں زیرِ تعلیم تھے اور گرمی کی چھٹیوں میں آکر اکٹھا ہوتے۔ ماشاءاللہ کئی ٹیمیں تو صرف بڑے ابا کے گھرانے کی ہوتیں۔

ہمارے دروازے کا صحن چونکہ بہت وسیع تھا اس لیے اپنے محلے کے لڑکوں کی بیسیوں چارپائیاں تو بچھتی ہی تھیں آس پاس کے لڑکے بھی جو دن بھر ہماری ٹولیوں میں رہتے رات کو اپنے اپنے بسکھٹ لے کر ادھر ہی آجاتے۔ گرمیوں میں بستر تکئے اوڑھن بچھاون کی چنداں ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ یہ نقشہ ۱۹۴۶ء تک رہا۔ کوئریاپار میں ہمارا قیام یہی کوئی پانچ چھ ہفتے سالانہ ہوا کرتا تھا، بقیہ مدت کانپور کی مشقتوں میں گزرتی تھی جس کا احوال آگے آئے گا۔ ان پانچ چھ ہفتوں میں ہم سال بھر کی کسر پوری کر لیتے۔ ہماری سرگرمیوں کا میدان محدود بھی تھا اور لامحدود بھی۔ روزانہ کا ٹائم ٹیبل کچھ اس طرح ہوتا:

صبح فجر کے وقت ہم سب کو اٹھنا ہی پڑتا اس لیے کہ سارے بزرگ گھروں سے نکل کر مسجد کو جاتے ہوئے ہم لوگوں کو نام بہ نام پکارتے جاتے یا ٹھوکے لگاتے جاتے۔ صبح کا کچھ وقت اِدھر اُدھر چہلوں میں گزرانے کے بعد ناشتے پر ٹوٹ پڑتے۔ اس سے پہلے اگر خربوزہ آم وغیرہ دستیاب ہوتا تو اس سے حسبِ توفیق استفادہ کرتے۔ مئی میں آم کی تیاری سے پہلے خربوزہ بہ افراط ملتا۔ اس سے ناشتے پر کوئی ناخوشگوار اثر نہ پڑتا۔ ناشتے کے بعد اگر بزرگوں نے کسی کام سے لگادیا تو اسے نپٹانا ہی پڑتا اسی لیے حتی الوسع بزرگوں کی نظر سے بچنے کی کوشش کرتے۔

مختلف دروازوں پر چارپائیاں اور کہیں ایک آدھ کرسیاں پڑی رہتیں، وہاں بزرگوں کی نشستیں جمی رہتیں اور لطیفے، مقدمات کی روداد، حالاتِ حاضرہ وغیرہ گفتگو کے موضوعات ہوا کرتے اور کچھ مقامی سیاست بھی، حقے کی نے بھی گردش میں رہتی۔ ایک دربار تو بڑے ابا کا تھا جہاں سنجیدگی کا دور دورہ رہتا، گفتگو کے موضوعات محدود اور سنجیدہ

ہوتے، ان کے بیٹے بھی آس پاس ہوتے جو مختلف ملازمتوں میں تھے اور چھٹیاں والدین کے ساتھ گزارنے کے لیے معہ اہل وعیال آجاتے۔ بڑے ابا کے ہاں آنے والوں میں وہ لوگ ہوتے جو اپنی تکلیفیں بیان کرنے آتے اور نسخے لے کر چلے جاتے۔

دوسرا دربار باری چچا کے دروازے پر لگا ہوتا چونکہ وہ مکھیا تھے اور معاملے مقدمے سے زیادہ دلچسپی رکھتے تھے اس لیے ان کا دربار زیادہ پر رونق ہوا کرتا تھا اور بڑے تنوعات بھی ہوتے۔ کھیت کٹنے سے لے کر فوجداری کے معاملات تک ان کے ہاں زیرِ بحث ہوتے، اور ان کے حقے کے ہر کش کی گڑگڑاہٹ کے ساتھ پہلے کھانسی کا ایک گچھا پھر معاشرتی گالیوں کا فوارہ اس لیے کہ گنوار اور کاشتکار وغیرہ جو اپنے معاملات لے کر حاضر ہوتے ان کے درباریوں میں شامل ہوتے ان کے علاوہ سرکاری حکام اور عمال جو گاؤں میں آتے ان کے ہاں براجمان ہوتے۔

باری چچا کے والد عبدالخالق صاحب محکمہ پولیس میں افسر تھے ایک عرصہ تک مین پوری میں کوتوال رہ چکے تھے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد انھوں نے ہم لوگوں کے مکان کے دکھن طرف ایک بڑا سا بنگلہ بنوایا لیکن باری چچا کی سکونت ہمیشہ پرانے آبائی مکان میں ہی رہی جو ہمارے گھر کے پچھّم طرف تھا۔ ہم نے اپنے بچپن میں اس بنگلے کو بھوت بنگلے ہی کی شکل میں دیکھا یعنی بالکل ویران اور اس کے کمروں میں پرانی تعمیراتی لکڑیاں، فرنیچر اور معلوم نہیں کیا کیا کچھ بھرا تھا۔ اس کی بیرونی چہار دیواریاں شکستہ تھیں اس لیے ہم لوگ کبھی کبھی اس میں پھلانگ جاتے اور گلی ڈنڈا کھیلتے۔ باری چچا کا باغ بھی گاؤں میں مشہور تھا جس میں بہت اقسام کے آم، چیکو، امرود اور بھی مختلف پھلوں کے درخت تھے اس لیے ان کے ہاں ہر سیزن کے پھل بہ افراط آیا کرتے۔ اس باغ میں درختوں کی تعداد یا اس کے رقبے کا مجھے کوئی اندازہ نہیں ہے۔ یہ میرے گھر کے پورب میں کوئی ایک فرلانگ کے فاصلے پر واقع تھا۔ باری چچا نے کسی ملازمت یا کاروبار کی الجھن کبھی مول نہیں لی، اس کے باوجود ان کا دسترخوان ہمیشہ عام رہا نتیجہ ظاہر ہے آزادی اور خاتمہ زمینداری کے بعد سخت مشکلوں

سے دوچار ہوئے، ان کے بیٹوں کی بھی کوئی خاص اٹھان نہیں ہوئی چنانچہ جب تک اراضیاں بیچ سکتے تھے بیچتے رہے پھر باغ کے درخت کٹوا کر گزارہ کرتے رہے بالآخر وہ بھی صاف ہوگیا اور اس کی زمین بھی۔ باری چچا مرحوم جو عمر کے زیادہ حصے میں یار باشی اور سیر وشکار سے سروکار رکھتے تھے ان کی عمر کا آخری دور کافی تکلیف سے بسر ہوا۔

آگے چل کر للّن بھائی کا احاطہ تھا۔ ان کا اصل نام مقصود الرحمٰن تھا جو کم ہی لوگ جانتے رہے ہوں گے وہ اپنی عرفیت سے اطراف و دیار میں مشہور تھے۔ دراصل وہ گاؤں کے سب سے بڑے زمیندار ضیاء الحق چچا کے نواسے تھے اور ان کا آبائی وطن موضع بی بی پور تھا، لیکن ضیاء الحق چچا کے اور کوئی اولاد نہ تھی اس لیے انھوں نے نواسے کی پرورش کی اور ساتھ رکھ لیا۔ ان کے دروازے پر احاطے کے اندر ایک طرف بیلوں کی ہودیوں کا سلسلہ تھا جن پر بیلوں کی تین جوڑیاں ہمیشہ لگی رہتیں۔ کھیتی باڑی کا کام بہت تھا، اس لیے اس سے متعلق آدمی ان کے پاس آتے جاتے رہتے۔ بزرگوں سے گریزاں نوجوانوں کے لیے وہ ایک اچھی جائے امان تھی وہاں چند چارپائیاں اور ایک تخت پڑا رہتا، وہ کاہلوں اور بے فکروں کے لیے بھی ایک اچھا گوشہ تھا۔

آزادی کے بعد ۱۹۴۸ء میں جب کوئریاپار میں ڈاک خانہ قائم ہوا تو ابا کے مشورے پر للّن بھائی پوسٹ ماسٹر مامور ہوئے۔ انھوں نے ابتدائی اردو فارسی اور قرآن تو پڑھ لیا تھا لیکن محکمہ ڈاک کی ذمہ داریوں کے اعتبار سے ان کی ایک بڑی کوالی فیکیشن تھی وہ یہ کہ انھیں صرف ایک بار کسی طرح بنارس تک جانے کا اتفاق ہوا تھا اور اس طرح انھوں نے ریل گاڑی دیکھ لی تھی، گویا کہ وہ گاؤں کے قطب تھے جو کہ از جانمی جنبد۔ دوسرے یہ کہ وہ پیسے پر خزانے کے سانپ کی طرح بیٹھ سکتے تھے۔ چنانچہ بقول شخصے ان کے دروازے پر نہ کبھی کسی نے ایک بتاشا کھایا نہ ایک بیڑا پان کا۔ انھوں نے نہ کبھی کسی کا ختنہ عقیقہ کرایا نہ اپنے علاوہ کسی کی شادی بیاہ کے چکر میں پڑے۔ ان کی خوش قامتی کرتے پاجامے اور ایک عدد ٹوپی کے علاوہ کسی بار کی متحمل نہ ہوئی اور ان کی پاپوش پالش کے لیے

زندگی بھر ایڑیاں رگڑتی رہ گئی۔ ان کا کوئی درد کبھی ممنونِ معالج نہ ہوا۔ ان حالات میں چالیس برس سے کچھ اوپر محکمہ ڈاک کی خدمات پابندی سے انجام دینے کے بعد پسماندگان میں ایک بیوہ کو چھوڑ کر دارِ فانی سے رحلت فرمائی لیکن ان کے اثنائے حیات میں تقریباً ساری اراضیات ان کے تصرف سے نکل چکی تھیں، نہ بیل رہ گئے تھے نہ ہو دیاں۔ ان کی ساری دولت کیا ہوئی جبکہ انھیں ڈاک خانے سے تنخواہ بھی ملتی تھی۔ یہ چیستاں نہ ان کی زندگی میں حل ہوئی نہ ان کے بعد۔ ہاں بازار میں انھوں نے ایک پختہ مکان ضرور تعمیر کرایا تھا جس میں وہ کبھی نہیں رہے۔ ایک راوی کا بیان ہے کہ محکمہ چک بندی نے اسے پندرہ روپیہ ماہوار کرائے پر لے لیا تھا اب اسی مکان میں ڈاک خانہ ہے۔

ان چند دروازوں کے علاوہ لوگ بازار میں بھی نظر آتے تھے۔ سارے بڑوں کا بالعموم معمول یہ تھا کہ دس گیارہ بجے تک دن کے کھانے سے فارغ ہوجاتے، اس کے بعد آرام فرماتے پھر دو بجے کے بعد ظہر کی اذان کے ساتھ بیدار ہوتے اور مسجد کی راہ لیتے۔ یہ تین گھنٹے کا وقفہ ہم لڑکوں کے لیے پوری چھوٹ کا ہوتا تھا۔

گاؤں کی آبادی کے بالکل قریب جنوب مغربی حاشیہ پر ہمارا چھوٹا سا آم کا باغ تھا جس میں ایک کشادہ جگہ بھی تھی، بس وہی سارے شیطانی اکھاڑے کا مرکز تھا۔ وہ باغ ''کریوا آم'' کے نام سے مشہور تھا شاید کسی زمانے میں وہاں آم کا ایک چھتنار درخت تھا جس کے سائے کی مناسبت سے اس کو ''کریوا آم'' کہتے تھے۔ وہ درخت تو ہم نے نہیں دیکھا لیکن ہم لوگوں کے زمانے میں ایک درخت ایسا ضرور تھا جس کے کچے پھل بھی میٹھے ہوتے تھے اس لیے اس کے پھلوں کی نگرانی بڑی مشکل تھی اس پر اکثر جھگڑا ہوجایا کرتا اس درخت پر ہر سال خوب پھل آتے لیکن کبھی دو ڈھائی سو سے زیادہ پھل نہیں حاصل ہو سکے۔

اس باغ میں ہم لوگوں کا سب سے محبوب کھیل تھا ''چکئی''۔ میں نے یہ کھیل کہیں اور نہیں دیکھا سنا۔ اس کے لیے زمین پر بڑے بڑے خانوں کے نشان بنائے جاتے۔ لڑکوں کی دو پارٹیاں یا گروہ ہوتے، ایک خانوں کے اندر اور دوسرا باہر۔ باہر والوں

کو خانوں سے گزر کر پار جانا ہوتا اور پھر واپس آنا ہوتا اس طرح کہ اندر والے ان کی ٹانگ پر لتّی نہ مار سکیں اس کوشش میں بڑی بھاگ دوڑ، زور آزمائی، لمبی کدان، اونچی کدان، پکڑ دھکڑ، کھینچ تان غرض یہ کہ ساری جسمانی ورزشیں شامل ہوتیں۔ ظاہر ہے گرمی کی چھٹیوں کا زمانہ ہوتا، شدت کی لو ہوتی، اسی حال میں ساری دوپہر ہم لوگوں کے سر پر گزر جاتی، نہ کسی کو لو لگتی نہ بخار ہی آتا۔ ظہر کی اذان سنتے ہی سارے شیاطین بھاگ نکلتے اور بزرگوں کی نظروں سے بچتے بچاتے اپنے اپنے گھروں میں گھس جاتے۔ کوئی کھانا کھاتا کوئی شربت کی فکر کرتا غرض یہ کہ عصر کے وقت تک کھاتے پیتے اور اس کے بعد بزرگوں کے احکام کے مطابق چھوٹے ہوئے گھریلو کام اور مغرب بعد رات کی ایکٹیویٹی کا آغاز۔

کبھی چکئی کے بجائے گلی ڈنڈے کی بات ہوتی تو اسی جگہ اور انہی اوقات میں گلی ڈنڈا شروع ہو جاتا۔ ہاں نصف جون گزر جانے کے بعد اگر ایک دو چھینٹے پڑ جاتے اور مٹی نرم ہو جاتی تو کبڈی کے اکھاڑے بھی جمتے لیکن کبڈی روز نہیں کبھی کبھی ہوتی اور اس کا وقت بھی عموماً سہ پہر میں ہوا کرتا۔ کبڈی کا محل وقوع بھی بدل جاتا اس لیے کہ اس وقت بہتیرے کھیت خالی ہوتے۔

غرض یہ کہ جب زمین نم اور مٹی نرم ہوتی تو ہم لوگوں کی پلٹن آبادی سے باہر کبڈی کے میدان میں ہوتی، بزرگوں کی نظر اور دسترس سے دور۔ بعد مغرب بزرگوں کا معمول یہ تھا کہ رات کے کھانے سے فراغت حاصل کی اور عشاء کی نماز کے لیے مسجد کا رخ کیا۔ وہاں سے واپسی کے بعد استراحت کے لیے اپنی اپنی خلوتوں میں چلے جاتے۔ صرف باری چچا اس معمول سے مستثنیٰ تھے، ان کے دروازے پر دیر تک حقے کی گڑگڑاہٹ اور کھانسیوں کی دھونس سنائی دیتی کبھی کبھی قہقہے بھی بلند ہوتے، لیکن ان کی طرف سے ہم لڑکوں کی ٹولیوں کی کارروائی میں کسی مزاحمت کا اندیشہ نہیں ہوتا تھا، اس لیے ہم لوگوں کو ان کے رہنے نہ رہنے یا سونے جاگنے کی کوئی فکر نہیں ہوتی تھی۔ چنانچہ بزرگوں کے گھروں میں داخل ہوتے ہی ہم لوگوں کی سرگرمیاں شروع ہو جاتیں، کسی کی چارپائی الٹ دی، کوئی

جلدی سوگیا تو اس کو چارپائی سمیت اٹھا کر دور میدان یا کھیت میں ڈال آئے یا کسی کے باغ میں آم توڑنے کی اسکیم بنی۔ باغ تو تمام ہی تھے لیکن اصل سوال پہروں کو توڑنے کا تھا کہ آم سے زیادہ مزہ اسی میں تھا۔ عیسیٰ ماموں کا باغیچہ آبادی سے ملحق ہی تھا اور کچی چہار دیواری سے محصور ان کے باغیچہ میں چیدہ چیدہ اقسام کے بہترین آم بھی تھے لیکن مشکل یہ تھی کہ وہاں رات کو بھی ایک نگراں سویا کرتا تھا چنانچہ جس رات کو اس باغیچہ کا ہم لوگوں کو رخ کرنا ہوتا تو ذرا دیر کرتے تا کہ اس نگراں کی پہلی نیند ہو پھر مٹی کے ڈھیلے درختوں پر مارتے کہ اس کے ٹکڑے چھٹک کر اس پر گریں، وہ بڑبڑاتا ہوا اٹھتا اور بھوت پریت سمجھ کر باہر بھاگتا۔ اسی وقت کوئی مضبوط لڑکا مرغا بنتا اور اس کی پیٹھ پر چڑھ کر دو ایک لڑکے دیوار کے پار ہوجاتے، اناپ شناپ کچھ پھل توڑ کر اسی حکمت سے واپس آجاتے۔ قلمی آم کے درخت زیادہ اونچے نہیں ہوتے اس لیے ان پر چڑھنے اترنے میں کوئی خاص زحمت نہیں ہوتی۔

ہم لوگوں کی بعض چھوٹی موٹی مصروفیات بھی ہوتیں جیسے کہ صبح کو غلیل سے چڑیاں مار لینا یا شام کو عصر اور مغرب کے درمیان اکھاڑے بازی۔ اس مقصد کے تحت ہم لوگوں نے لطیف چچا کے دروازے پر مہوئے کے جھاڑ جھنکاڑ پیڑ کے سائے میں ایک اکھاڑا کھود رکھا تھا، گو اکھاڑے باڑوں کی تعداد بہت کم تھی اور کوئی پابندی بھی نہیں کی جاتی تھی تاہم مصروفیات میں اس کا شمار بھی تھا، غرض یہ کہ کوئی وقت مصروفیتوں سے خالی نہ تھا۔ اس عادت نے آئندہ انتہائی مصروف زندگی میں بڑی مدد کی۔

لطیف چچا کے دروازے پر ہم لوگوں کی دلچسپی کا ایک سامان اور بھی تھا یعنی ان کی لطیفہ گوئی۔ وہ اپنی جھونپڑی کی چوکھٹ پر نیم دروں نیم بروں ایک سونٹی لیے بیٹھے رہتے اور ہم لوگوں کی دھینگا مشتی کو بڑے چاؤ سے دیکھا کرتے گویا وہ اپنے ماضی میں کھوئے ہوئے ہوں۔ ان کے دروازے پر مہوئے کا ایک بڑا سا پیڑ تھا جس کے دکھن پورب کچھ دور ایک گھورا تھا، جو ہر سال کنوار کا تک میں کھود کر آس پاس کے کھیتوں میں بکھیر دیا جاتا لیکن سال کا چکر پورا ہوتے ہوتے وہ پھر اپنے شباب پر آجاتا۔ اسی گھورے

کے قریب ایک تاڑ کا پیڑ تھا۔

لطیف چچا ایک سونٹی لیے اپنی چوکھٹ پر اکڑوں بیٹھے پہرا دیا کرتے، ان کے جسم پر جو یادوں کے بوجھ سے جھک کر بالکل دوہرا ہوگیا تھا عموماً صرف ایک لنگی ہوا کرتی تھی کبھی کوئی جھاڑ سی قمیص بھی لیکن نہ اس قمیص میں جیب نہ لنگی میں انٹی ہاں وہ اپنے نچلے ہونٹ میں البتہ ہمیشہ کچھ چھپائے رہتے۔ وہ دولت بھی ان کو کہاں سے ملتی تھی خدا جانے کیونکہ بظاہر ان کی آمدنی کا کوئی خاص ذریعہ نہ تھا، ان کی ساری پونجی وہی مہوے کا پیڑ، جب تک مہوے کے پھول زمین پر تاروں کی طرح بکھرے رہتے وہ انھیں گن گن کر اکھٹا کرتے اور سکھاتے اور پیٹ کی آگ بجھاتے، پھر کوئندی یعنی مہوے کے پھل آتے، اس کی گٹھلیاں بھی چند پیسوں میں بک جاتی رہی رہوں گی ممکن ہے اسی کے بدلے میں انھیں وہ دولت ملتی رہی ہو جسے وہ اپنے ہونٹوں میں دانت کے بجائے چھپائے رکھتے تھے۔ وقت نے لطیف چچا کی کمر ضرور دوہری کردی تھی لیکن ان کی آنکھوں کی چمک نہیں مدھم پڑی تھی نہ ان کے چہرے پر بکھری ہوئی مسکراہٹ میں کمی آئی تھی نہ ان کی زندہ دلی پر اوس پڑی تھی۔

چوکھٹ کے اندر ذرا ہٹ کر ایک اور ایسی ہی سدا بہار صورت ہوا کرتی تھی جو اپنا سب کچھ لطیف چچا پر نچھاور کر چکی تھی اور اب اس کے پاس پردہ نشین شرافت کے سوا کچھ نہ تھا پھر بھی ان دونوں کے پاس ایک دوسرے کو دینے کے لیے اتنا کچھ تھا جو کسی خزانے کے بدلے نہیں مل سکتا تھا۔ کبھی کبھی ایک چھناکے کے ساتھ ایک گول ڈبہ کھلتا اور بند ہوتا لیکن اس میں سے ایک چٹکی راکھ کے سوا کچھ نہ نکلتا جسے وہ دونوں ہم سفر برابر برابر بانٹ لیتے۔ لطیف چچا خود اپنی کہانیوں کے ہیرو ہوتے اور ان کے سارے واقعاتی تانے بانے اور مناظر سب گاؤں ہی کے ہوتے اس لیے ان سے مقامی لوگوں کو طبعی دلچسپی ہوتی پھر ان کی اپنی زبان اور انداز بیان۔ کہانیاں سناتے سناتے آخر ایک دن وہ تھک کر سو گئے۔

گرمی کی چھٹیوں کا زمانہ اپنے اندر اور بھی کشش کے سامان رکھتا تھا جس میں چھوٹے بڑے سب شریک ہوتے اور دوسرے شہروں، قصبات اور مواضعات میں رہنے والے اقارب بھی حسبِ توفیق شرکت کرتے۔ شادی بیاہ کے علاوہ اسی طرح کی ایک تقریب وہ سالانہ مشاعرے بھی تھے جن کا اہتمام اسی زمانے میں کیا جاتا۔ یہ طرحی مشاعرہ ہوا کرتا تھا لیکن اس میں بے طرح چھیڑ خانیاں بھی ہوا کرتی تھیں۔ اس مشاعرے کا انعقاد ہمارے ہی دروازے پر ہوا کرتا تھا۔ مصرع طرح طے ہوتے ہی اصحابِ ذوق اور متوقع شرکاء کو خطوط لکھ کر اس کی اطلاع دے دی جاتی تھی اور باری چچا کے دروازے کی ایک دیوار پر بخطِ جلی مشاعرے کی تاریخ اور مصرع طرح وغیرہ درج کر دیا جاتا۔ اس کے ساتھ ہی غزلیں اور ہزلیں ڈھلنی شروع ہو جاتیں۔ بعضوں کا گلا اچھا تھا وہ گلے بازی کی مشق شروع کر دیتے، بعض بزرگ جو سامنے نہیں آنا چاہتے، اپنی غزلیں انہی سے پڑھواتے۔ عبدالرحمٰن بھائی اپنی تمام تر سنجیدگی کے باوجود اس مشاعرے سے بڑی دلچسپی لیتے اور غزلیں لکھ لکھ کر لڑکوں کو دیتے۔ نوجوانوں میں شمس الہدیٰ فاروقی یعنی ہدیٰ بھائی جو عبدالرحمٰن بھائی کے زیرِ سرپرستی رہ چکے تھے کافی فعال ہوتے تھے۔ چنانچہ ایک بار میں ان کے پیچھے پڑ گیا کہ مجھے بھی غزل لکھ دیجیے میں بھی پڑھوں گا۔ انھوں نے تین چار شعر لکھ کر دیے اس کے مقطع میں میرا نام نہیں تھا، بس میں نے انھیں پھر دوڑا لیا کہ اس میں میرا نام تو ہے ہی نہیں چنانچہ انھوں نے اس شعر کا اضافہ کیا ؎

درِ سبحان سے رضواں کا اٹھنا غیر ممکن ہے
ازل سے ہے جبینِ شوق وقفِ آستاں میری

ان مشاعروں میں سنجیدہ غزلیں تو ہوتی ہی تھیں لیکن اصل رونق ان ہزلوں کی وجہ سے ہوتی تھی جن کا سیدھا نشانہ سخنور صاحب ہوا کرتے تھے۔ ان کا نام نامی ضمیر احمد اور تخلص سخنورؔ تھا اور عرفیت چمکوّا۔ ان کے پڑھنے لکھنے کا حال معلوم نہیں لیکن اس کا کچھ اندازہ خلیل الرحمٰن بھائی کے اس جملے سے ہو سکتا ہے کہ ''سخنورؔ پر سرقے کی تہمت آ ہی نہیں

سکتی۔'' ۵۰ء کے عشرہ کے اواخر میں ایک تقریب کے سلسلے میں بچے کھچے بھائی برادر اکٹھا ہوئے تھے اور سخنورؔ صاحب بھی آ نکلے تھے وہ بھی ضعیف ہوگئے تھے۔ فرمائشوں اور اصرار پر انھوں نے چند شعر سنائے۔ اسی موقع پر بھائی مرحوم نے وہ فقرہ چست کیا تھا۔ اتنی گفتگو کے بعد سخنورؔ صاحب مرحوم کا نمونۂ کلام نہ پیش کرنا بے انصافی ہوگی۔ افسوس یہ ہے کہ ان کا کلام اکٹھا کرنے کا کبھی کسی کو خیال نہیں آیا بس چند اشعار جو سینہ بہ سینہ نقل ہوتے رہے حاضر ہیں اور چند اشعار وہ بھی جو انھیں چھیڑنے کی غرض سے کہے جاتے، اس میں عبدالرحمٰن بھائی مرحوم پیش پیش ہوتے۔ سخنورؔ صاحب کے اشعار۔

حسینانِ جہاں جب صف صف محشر میں نکلیں گے
قیامت اور برپا ہوگی میدانِ قیامت میں

☆☆

موسم نہ جانے پائے عروسِ بہار کا
یا رب نہ خون ہوئے مرے انتظار کا

☆☆

بیمارِ غم نے لیں جو نقاہت میں کروٹیں
دل خون ہوکے بہہ گیا تیمار دار کا

☆☆

جس کی نظروں سے تنِ مردہ میں جاں آجائے
بزمِ عشاق میں وہ رشکِ مسیحا نہ بنے

ان کا کمال یہ تھا کہ مشاعرے کے دوران لوگ اپنے اشعار میں ان پر جو چھینٹے کستے تھے وہ سب خاموشی سے سنتے رہتے، آخر میں اپنا کلام سناتے اور ہر کسی کا فی البدیہہ جواب دیتے، ان کی یہ خداداد صلاحیت حیرت انگیز تھی۔

ایک روز عبدالرحمٰن بھائی ان کے کمرے کے پاس سے گزر رہے تھے تو بیرونی

دیوار پر کسی لڑکے سے کوئلے سے یہ مصرع لکھوادیا:

''یہی ہے وہ کمرہ نحوست زدہ''

سخنور صاحب باہر تشریف لائے تو دیکھا کہ دیوار پر کچھ لکھا ہوا ہے، کسی لڑکے سے پوچھا کہ کیا لکھا ہے، اس نے پڑھ کر سنا دیا تو اس سے کہا کہ اس کے آگے یہ بھی لکھ دو:

''یہی لکھنے والے کا ہے مرقدہ''

غرض یہ کہ گرمی کی چھٹیوں کے دوران بڑی رنگا رنگی رہتی تھی۔ دور نزدیک سے اقارب آجاتے تو ایک ہی جگہ سب کی باہم دگر ملاقاتیں ہوجاتیں۔ ان لوگوں کے تنوعات کا اندازہ اسی سے ہوسکتا ہے کہ ایک طرف مولوی رشید احمد چچا، مولوی علی احمد چچا اور مولانا ابوحامد خالو شیخپوری جیسے جید علماء ہوتے تو دوسری طرف نئی نسل کے فضلائے دیوبند جو سیاسی بصیرت بھی رکھتے تھے، وہ شیخپور، مئو اور چندائر وغیرہ سے آتے، ان میں ابا کے ماموں زاد بھائی اور بھانجے خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں، جن میں سے اکثر و بیشتر کو ۱۹۴۰ء کے اطراف میں پھیلی ہوئی ٹی بی کی وبا نے صاف کردیا جسے یاد کرکے دل ہل جاتا ہے۔ ہائے ہائے کیسے کیسے وجیہہ اور خوش فکر نوجوان تھے! آنے والوں میں تیسرا طبقہ سرکاری ملازمین کا تھا جس میں مختلف محکموں اور مختلف مدارج سے تعلق رکھنے والے حکام اور افسران ہوتے۔ اسی اثناء میں مولوی بخشش احمد چچا جیسے فنا فی اللہ بزرگ بھی کبھی کبھی اپنی جھلک دکھا جاتے۔ میں حیران ہوں کہ ان بزرگوں کا تذکرہ میرے بس کی بات نہیں ان میں سے ہر ایک پوری پوری تصنیف کا متقاضی ہے۔

مثال کے طور پر مولوی بخشش احمد صاحب گورکھپور کے ایک مدرسے میں مدرس تھے۔ اس زمانے میں مدرسے میں تنخواہ ہی کیا رہی ہوگی اس کا اندازہ آج بھی ان کی تنخواہوں سے کیا جاسکتا ہے۔ دراصل انہی بزرگوں کی اللہ واسطے بے لوث دینی خدمات کے نتیجے میں آج بھی دینی تعلیمات کے چراغ روشن ہیں۔ جن لوگوں نے گورکھپور میں مولانا کی مصروفیات دیکھی تھیں انہی کا قول نقل کرتا ہوں۔ اگر اثنائے درس میں کوئی شخص

مولانا سے ملاقات کے لیے آجاتا یا انھیں خود کوئی ذاتی ضرورت درپیش ہوتی تو وہ وقت نوٹ کر لیتے اور مہینے کے اختتام پر اتنے وقت کا معاوضہ اپنی تنخواہ میں سے وضع کرادیتے۔ وہ ہمشیرہ کو آٹا دے کر روٹی پکوالیتے اور خود چٹنی کوٹ کر اسی سے روٹی کھالیتے۔ گاؤں میں ان کی کچھ اراضی تھی جسے کسی کاشتکار کو بٹائی پر دے رکھا تھا لیکن اس کو سخت تاکید تھی کہ کھلیان میں اپنے اناج کو مالش کے لیے دوسرے ڈھیروں سے دور رکھے تاکہ اس میں کسی اور کا ایک دانہ بھی شامل نہ ہونے پائے۔ نتیجہ ظاہر ہے، تنسیخ زمینداری کے بعد جب کاشتکاروں نے دوسروں کی زمینوں پر قبضہ کرلیا مولانا کی زمین بدستور محفوظ رہی، کاشتکار حسبِ دستور ان کے حصے کا غلہ ان کے صاحبزادے مولوی ابراہیم صاحب کو دیتا رہا۔

یا فضل الرحمٰن بھائی کی مثال ہے۔ گاؤں کے مسلمان پٹواری نے اپنے بیٹے یا بیٹی کی شادی کے موقع پر جب ان کے گھر کھانا بھیجا تو سب اٹھا کر بیل کی ناند میں ڈال دیا کہ اس میں رشوت کی آلائش کا گمان تھا۔ وہ گرمی کی چھٹیوں میں آتے تو اپنے کپڑے گاؤں کے درزی فاضل سے ہی سلواتے۔ ایک بار جولائی میں کالج کھلا اور وہ نئی شیروانی پہن کر جانے لگے تو انھیں کالر کچھ کڑا محسوس ہوا، شیروانی اتار کر رکھ دی اور پرانی شیروانی پہن کر چلے گئے۔ بڑے دن کی چھٹیوں میں آئے تو فاضل سے پوچھا کہ کالر کڑا کیوں ہے؟ اس نے کہا ذرا لٹھا اس میں لگا دیا ہے، فضلو بھائی نے کہا کہ میں نے تو لٹھا نہیں دیا تھا اس نے کہا کہ میں نے اپنے پاس سے لگا دیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ یہ شیروانی لے جاؤ اور کالر کھول کر وہ کپڑا نکال دو۔ ایک بار میں نے فضلو بھائی کو سامنے سے آتے دیکھا کہ وہ یکا یک جھکے اور اپنی ٹوپی اتار کر زمین پر رکھ دی اور اسی ٹوپی سے کوئی چیز چٹکی میں پکڑے ہوئے آگے بڑھے، میں نے دیکھا کہ ایک کاغذ کا ٹکڑا ہے، وہ قرآن شریف کے ورق کا ٹکڑا تھا، مسجد میں پڑھا کر آتے ہوئے کسی بچے کے پارے میں سے پھٹ کر گر گیا رہا ہوگا۔

اس قدر محتاط اور ایسے پاک باطن لوگوں کے بارے میں میں کیا لکھ سکتا ہوں۔ ان کے علم وفضل کی برکت سے گاؤں کی فضا منور اور ہوا معطر تھی۔ ہنگاموں اور فتنے فساد سے گاؤں بالعموم پاک تھا حالانکہ ہر فرقے اور طبقے کے لوگ آباد تھے۔ معمولی چوری چماری کے واقعات بھی شاید و باید سننے میں آتے تھے۔ ۱۹۴۷ء کے آتے آتے گاؤں کی بزم آرائیاں ماند پڑ گئیں اور اس کے بعد تو ساری محفلیں ہی اجڑ گئیں، نہ وہ لوگ رہے نہ وہ ذوق رہا، سب تتر بتر ہو گئے۔

''اٹھئے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی''

☆☆☆

دبستانِ کانپور

وہ دن ''آبِ رودِ گنگا'' کو یاد ہو یا نہ ہو لیکن وہ جولائی ۱۹۳۷ء کی ابتدائی تاریخوں میں سے کوئی تاریخ رہی ہوگی، جب ۸-۹ بجے رات کے قریب ''ہمارا کارواں'' اس کے کنارے اترا اور ہماری نگاہیں پہلی بار بجلی کے قمقموں کی تماشا گاہ سے آشنا ہوئیں۔

کانپور یوپی کا سب سے بڑا صنعتی شہر یا مزدوروں کی بہت بڑی نوآبادی ہے جہاں انسانوں کے پھیپھڑے کارخانوں کی چمنیوں سے ابلتے ہوئے دھوئیں کے مرغولے نگلتے اور اگلتے رہتے ہیں، وہی کانپور جہاں ہندوستان کی پہلی جنگِ آزادی کے بعض خونیں مناظر گنگا کے شفاف پانی کو شفق رنگ کر گئے، وہی شہر جو آزادی سے پہلے کئی مسلم تنظیموں کی جولانگاہ تھا، جہاں حسرت موہانی نے نغمہ سرائی کی اور مکمل آزادی کے منشور کو حرزِ جاں بنایا۔

ماموں جان کے ساتھ میں ایک یکے پر اسٹیشن سے چل کر بیکن گنج، ناظر باغ کے ایک مکان میں وارد ہوا۔ اس زمانے میں اسٹیشن سے مول گنج چوراہے تک یکے کا فی کس کرایہ ایک آنہ تھا اور وہاں سے پریڈ یا بیکن گنج تک فی کس ایک آنہ۔ بیکن گنج میں ایک پیر میاں رہا کرتے تھے جن کی قیام گاہ پر ہر جمعرات کو زبردست محفلِ سماع ہوا کرتی تھی۔ ان کے مریدوں کو جہاں سے ان کی رہائش نظر آتی وہیں ازراہِ ادب ہاتھ باندھ لیتے اور واپس جاتے وقت کچھ دور تک الٹے چلتے تاکہ ان کی رہائش کی طرف پشت کرنے

کی بے ادبی نہ ہو۔ اب پیر صاحب کا مزار اس مکان سے قریب ہی طلاق محل سے چمن گنج جانے والی سڑک پر پانی کی ٹنکی کے قریب ہے۔

ہم لوگ جس مکان میں اترے وہ پیر صاحب کی رہائش کے سامنے ذرا بائیں ہٹ کر تھا۔ وہ کافی کشادہ بڑا سا مکان تھا۔ ہم لوگ مکان میں داخل ہوئے تو دستر خوان بچھ چکا تھا اور رات کے کھانے کی تیاری تھی۔ صاحبِ خانہ ایک بزرگ صورت اور نہایت فراخ دل شخص تھے منشی عظیم اللہ صاحب جو عرفِ عام میں صرف منشی جی کہے جاتے تھے، پیچ باغ کی چمڑا منڈی کی ایک فرم میں منشی تھے؛ فرم کی کاروباری حالت اچھی تھی اس لیے منشی جی کے حصے میں بھی کافی خوشحالی اور فراغ دستی آئی تھی جس سے اقربا اور احباب بھی فیضیاب ہوا کرتے تھے۔ ماموں جان کی ایک پھوپھی زاد بہن ان سے منسوب تھیں اس لیے ماموں جان انھیں بھائی صاحب کہتے تھے اور وہ بھی ماموں جان کو بے حد مانتے تھے۔

وہ نہایت خوش مزاج اور یار باش تھے۔ ہر اتوار کی شام کو دوستوں کی دعوت کا اہتمام کرتے یہی ان کی تفریح تھی۔ صوم وصلوٰۃ کے سخت پابند تھے اور نظریاتی اعتبار سے کانگریسی، کھادی بھنڈار میں دستیاب سب سے موٹی کھادی کے کپڑے پہنتے، اکہرا جسم، میانہ قد، گھنی نورانی داڑھی اور باہر نکلتے تو بر بنائے عادت ایک عدد سونٹا بھی ہاتھ میں ہوتا۔ پن ڈبا پان سے بٹوا دیگر لوازمات سے لبریز صدری کے جیبوں میں ہوتے۔ المونیم کے برتنوں سے سخت متنفر تھے، انھیں مضر صحت سمجھتے تھے۔ گھر میں تانبے کے سارے برتنوں پر قلعی کا سخت اہتمام کرتے کہ اس میں ذرا فرق نہ آئے۔ اسی طرح چائے کا بھی بڑا اہتمام کرتے اور لپٹن گرین کے علاوہ کسی چائے کو منہ نہ لگاتے۔ لیکن آخری ایام میں انھوں نے بڑی تکلیف اٹھائی، فرم کی مالی حالت خراب ہوگئی، ان کی دو بیٹیوں کی شادی ہوچکی تھی، انھوں نے بیوی کو اقارب کے پاس بنارس میں چھوڑا اور خود عالمِ ضعیفی میں ۱۹۵۷ء کی گرمیوں میں کام کی تلاش میں کلکتہ پہنچے۔ ایسی شخصیتوں کی بااصول، فیاضانہ اور مشفقانہ زندگی کے حالات بڑے عبرت انگیز اور سبق آموز ہیں۔ وقت رہتے اپنے مستقبل کے لیے

خود کچھ کرنا چاہیے۔ برے وقتوں میں کون کس کے کام آتا ہے، ہر کسی کی اپنی مجبوریاں بھی ہوتی ہیں۔ ۱۹۵۸ء میں شب برات کے موقع پر کولوٹولہ کی مسجد میں مصروف عبادت تھے کہ اچانک حالت خراب ہوئی اور وہ معبودِ حقیقی سے جا ملے۔

تو ان بزرگ کا پہلا جملہ جو میرے متعلق تھا مجھے آج تک یاد ہے۔ ہم لوگ گھر میں داخل ہوئے تو دستر خوان لگ رہا تھا۔ ماموں جان بھی ہاتھ منہ دھوکر بیٹھ گئے تو خالو نے کہا ''صاحبزادے کو بھی بلاؤ۔'' ماموں جان نے کہا کہ کپڑے تبدیل کر کے آ رہا ہے، یہ میرا بھانجہ ہے۔ ہم لوگ کھانے سے فارغ ہوئے تو بالٹی بھر آم لاکر رکھ دیا گیا جو ٹھنڈا کرنے کی غرض سے گھنٹے دو گھنٹے پہلے ہی بھگو دیا گیا ہوگا۔ شاید اس زمانے میں قلمی آموں کی بہ نسبت تخمی آم زیادہ پسند کئے جاتے تھے۔ ہم لوگوں کے محلے بیکن گنج میں ہفتے میں دو روز سوموار اور جمعہ کو بازار لگتے تھے، اب بھی لگتے ہوں گے، چنانچہ بیکن گنج کے چوراہے سے گورا قبرستان کو جانے والی سڑک پر جس کے دونوں اطراف عمارتوں سے خالی تھے، آم سے لدی ہوئی بیل گاڑیاں کھڑی ہوتی تھیں، ہر بیل گاڑی کے سامنے ایک کھاٹ بچھا کر گاڑی الار کر دی جاتی، اس طرح نیچے سے اوپر تک آم لدے ہوتے تھے۔ آموں کا نرخ تو یاد نہیں لیکن اتنا یاد ہے کہ بائیس گاہی یعنی ایک سو دس آم کا سیکڑہ مانا جاتا تھا (پانچ کی ایک گاہی ہوتی) چکھنے کی کوئی قیمت نہیں تھی، نہ اس میں کوئی روک ٹوک تھی، چنانچہ ہم بچے کبھی کبھی شرارتاً ایک طرف سے ایک ایک آم چکھتے اور منہ بسورتے چلے جاتے یعنی آم کھٹے ہیں۔

ماموں جان فیض عام اسکول، مکھنیا بازار میں پڑھایا کرتے تھے لیکن اسی سال ان کو کانیہ کبج ہائی اسکول میں جو نہر پار تھا فارسی کے استاد کی جگہ مل گئی اور وہ وہاں چلے گئے۔ اسی فیض عام اسکول میں میرے پھوپھی زاد بھائی مولوی حبیب الرحمٰن صاحب بھی پڑھایا کرتے تھے وہی اگلے دن صبح کو مجھے اپنے ساتھ اسکول لے گئے اور درجہ اول میں داخلہ کرادیا۔ یہیں فیض عام اسکول کے بارے میں کچھ بتانا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

مدرسہ فیض عام

سید سلیمان ندوی کی تصنیف ''حیات شبلی'' سے مدرسہ فیض عام، کانپور کے متعلق حسب ذیل اقتباس برمحل ہوگا:

''مفتی عنایت احمد صاحب نے کانپور میں مستقل قیام فرمایا اور اسی سال ۱۲۷۷ھ (غالباً ۱۸۵۸ء) میں مدرسہ فیض عام جاری کیا۔ دو برس بعد اپنی جگہ اپنے دو شاگردوں کو جن میں سے ایک مولوی لطف اللہ صاحب تھے جانشین بنا کر حج کو روانہ ہوئے (راستے میں انتقال فرمایا) شاگردوں نے مدرسہ کے کام کو سنبھالا اور مدرسہ کو بڑی رونق دی۔ اسی مدرسہ کا فیض تھا جو بالآخر ندوۃ العلماء کی شکل میں نمایاں ہوا۔

حسنِ اتفاق سے اس خوش قسمت مدرسہ فیض عام، کانپور کی چٹائی پر مدرسہ مذکور کے چند فارغ التحصیل طلبہ کی دستار بندی کے موقع پر چند نفوسِ قدسیہ اس صورتِ حال پر غور فرما رہے تھے (انگریزوں اور عیسائیوں کا اثر ونفوذ اور مسلمانوں کے باہمی اختلافات) یہ ۱۳۱۰ھ مطابق ۱۸۹۲ء تھا۔

اس موقع پر جو علماء شریک تھے ان میں مولانا اشرف علی تھانوی اور مولانا محمود الحسن صاحب بھی شامل تھے۔ اس منتخب جلسے میں طے پایا کہ باہمی مشورے سے علماء کی ایک مجلس قائم کی جائے اور آئندہ سال مدرسہ فیضِ عام کے سالانہ اجلاس کے موقع پر تمام ہندوستان کے علماء کو اس کے لیے عام دعوت دی جائے۔ اس مجلس کا نام ندوۃ العلماء قرار پایا۔'' (حیاتِ شبلی، ص ۳۰۰)

حبیب الرحمٰن بھائی نے اسکول میں میری تاریخ پیدائش ۱۵/جولائی ۱۹۳۱ء درج کرائی، نام کے ساتھ میری کنیت فاروقی نہیں درج کرائی گئی جو کہ ماموں جان کے مشورے یا ہدایت کے مطابق لکھی گئی ہوگی، اس لیے اس وقت سے آج تک اسی تاریخِ پیدائش کے اعتبار سے امتحانوں سے گزرتا رہا، چاہے وہ اسکول اور کالج کے امتحانات رہے

ہوں یا ملازمتوں کے لیے۔ لیکن ابا کے انتقال کے کچھ عرصہ بعد (وفات مارچ ۱۹۶۹ء)، ان کے بعض کاغذات دیکھ رہا تھا جو والدہ کے پرانے بکس میں پڑے ہوئے تھے ان میں ایک بوسیدہ اور کرم خوردہ رقعہ ملا، وہ ابا کی تحریر تھی جس میں بیٹے کی پیدائش پر تاثرات کا اظہار تھا، والدہ نے بتایا کہ اس کا تعلق میری پیدائش سے تھا اس اعتبار سے میری تاریخ پیدائش ۲ر یا ۴ر ستمبر ۱۹۲۹ء ہوگی۔ یہ امر قرینِ قیاس بھی ہے کیونکہ اس زمانے میں باضابطہ تعلیم دیر سے شروع ہوتی تھی اس لیے اسکولوں وغیرہ میں عمریں کچھ کم درج کرانے کا رواج تھا، والدین یا سرپرست جو کچھ درج کرادیتے اسی کو حرفِ آخر سمجھا جاتا، اس کے لیے کوئی سند نہیں طلب کی جاتی تھی، بلکہ وہ اندراج ہمیشہ کے لیے سند بن جاتا تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ماموں جان کو میری ٹھیک ٹھیک تاریخ پیدائش نہ معلوم رہی ہو اور بربنائے قیاس لکھوادی ہو۔

داخلے کے بعد بیکن گنج سے فیض عام اسکول جانا آنا ہمارا روز کا معمول ہوگیا۔ یہ اچھا خاصا فاصلہ تھا جس کے شارٹ کٹ کے لیے ہم چمڑا منڈی سے گزرتے ہوئے نئی سڑک کو قطع کرتے اور مکھنیا بازار کی گلیوں میں سے ہوتے ہوئے ''زمانہ'' اخبار کے دفتر کے سامنے سے نکل جاتے۔ فیض عام اسکول چونکہ صرف آٹھویں جماعت تک تھا، اس لیے ۱۹۴۴ء تک اس سے تعلق رہا۔ اس اثناء میں ہم لوگوں کی سکونت گڈریا محال اور چمن گنج میں بھی منتقل ہوتی رہی، لیکن اسکول اور رہائش کے درمیان فاصلہ بہرحال طویل سے طویل تر ہوتا گیا، سواریاں کم تھیں، پیدل چلنے کا رواج عام تھا، ہم بھی پیدل چلتے رہے، جوتے گھستے رہے، ان میں نعلیں اور کیلیں جڑواتے رہے۔

میرا داخلہ تو درجہ اول میں ہوا تھا لیکن میرے متعلق اساتذہ کی خوش گمانیاں سہ ماہی امتحان میں درست ثابت ہوئیں۔ ششماہی امتحان میں اس پر مزید مہرِ تصدیق ثبت ہوگئی تو ہیڈ ماسٹر نورالحسن صاحب نے جو اپنے پورے رویہ اور شباہت سے بھی نہایت مشفق و مہربان معلوم ہوتے تھے یہ طے کیا کہ میرے ساتھ ناانصافی ہوئی ہے، چنانچہ میرا ایک

سال بچانے کے لیے انھوں نے ششماہی امتحان کے بعد مجھے دوسری جماعت میں ترقی دے دی۔ سالانہ امتحان میں میں نے ان کے اس اعتماد کو درست ثابت کیا اس کے بعد بھی امتحانات میں اپنی جماعت میں اول آتا رہا، چوتھی جماعت تک یہ سلسلہ رہا، پانچویں جماعت میں ایک لڑکا ذاکر حسین آ گیا اس نے مجھے پچھاڑ دیا پھر تو ہر امتحان میں اس کی پہلی پوزیشن اور میری دوسری رہنے لگی۔ دو برس بعد ساتویں جماعت میں محمد یعقوب صاحب آ گئے جن کی کنیت تھی بن یامن اور آلم تخلص بھی فرماتے تھے، بہ اعتبار عمر ہمارے گروپ سے سینئر تھے، مولوی اور منشی کے امتحانات سے فراغت کے بعد آئے تھے، انھوں نے ہماری اور ذاکر حسین کی اجارہ داری ختم کردی پھر تو ساتویں اور آٹھویں دونوں جماعتوں کے ہر امتحان میں وہ اول، ذاکر دوم اور میں سوم رہنے لگا۔ میرے پچھڑ جانے کے دیگر اسباب بھی تھے، جن کا ذکر آگے آئے گا لیکن ابھی فیض عام اسکول کا ذکر۔

یہ اسکول مکھنیا بازار کی ایک گلی میں واقع ہے، اب ہائی اسکول ہو چکا ہے۔ اس وقت اس کا انتظام و انصرام بساط خانہ بازار کے دہلی والوں کے ہاتھ میں تھا۔ صبح کو اجتماعی دعا سے آغاز ہوتا۔ کوئی خوش گلو لڑکا حمد پڑھتا:

تعریف اس خدا کی جس نے جہاں بنایا
کیسی زمیں بنائی کیا آسماں بنایا

یا

وہ شمع اجالا جس نے کیا چالیس برس تک غاروں میں

یا

یا رب دلِ مسلم کو وہ زندہ تمنا دے

میرے ابتدائی برسوں میں ہی نورالحسن صاحب ہیڈ ماسٹر رہے، ان کے بعد شمس الحئ لاری صاحب ہیڈ ماسٹر ہوئے، جو لار روڈ ضلع بلیا کے رہنے والے تھے۔ اسی نسبت سے لاری کہے جاتے تھے۔ وہ ٹیچر تو جیسے بھی رہے ہوں لیکن سخت اور خشک آدمی تھے۔ کسی

کسی دن صبح کی دعا کے وقت بید لے کر گیٹ پر کھڑے ہوجاتے اور دیر سے آنے والے لڑکوں کی تادیب فرماتے۔

اسکول کے پورے نظام میں کئی خوبیاں تھیں، ڈسپلن سخت تھی، اخلاقی اور مذہبی پہلو پر خاص زور تھا، اس کو ایک کردار ساز ادارہ کہنا حق بجانب ہوگا۔ گرمیوں میں تو اسکول صبح سے دوپہر تک ہوتا لیکن جاڑوں میں دس بجے سے چار بجے تک اس طرح نماز ظہر کا وقت اثنائے اسکول میں ہوتا چنانچہ سارے لڑکوں پر ظہر کی نماز فرض تھی۔ بیک وقت بہت سارے لڑکوں کے وضو کرنے کا بندوبست تھا جیسے بڑی مسجدوں میں موٹے سے پائپ سے ٹونٹیاں لگی ہوتی ہیں۔ کسی کسی دن ہیڈ ماسٹر صاحب اسکول کے کمروں کا گشت بھی کرتے کہ کوئی لڑکا چھپا تو نہیں ہے۔ شام کو اسکول بند ہونے سے پہلے ہی بیرونی گیٹ بند کردیا جاتا اور اس طرح سارے لڑکوں پر نماز عصر بھی لازم آتی، اس کے بعد ہی گیٹ کھلتا۔

انگریزی تیسری جماعت سے لازم تھی، جسمانی ورزش کا بھی ایک گھنٹہ تھا، ہفتے میں ایک دن حفظانِ صحت کی تعلیم ہوتی، خدمتِ خلق کی تحریک بھی تھی۔ اسکول میں زیادہ جگہ نہیں تھی اس لیے اس کے احاطے کے اندر والی بال اور فٹ بال ہی ممکن تھا، شام کو باری باری یہ کھیل ہوا کرتے، ہاکی کھیلنے کا انتظام باہر کہیں کیا تھا، ہفتے میں ایک دن ہاکی کھیلنے والے لڑکوں کو ماسٹر صاحب لے کر وہاں چلے جاتے۔ صبح کو پہلا گھنٹہ دینیات کا ہوا کرتا تھا۔ ہر درجہ سے متعلق ''سلسلہ دینیات'' کی کتاب پڑھائی جاتی اس طرح ابتدائی مذہبی معلومات اور فرائض سے آگاہی اور دیگر ضروری معلومات وقت کے ساتھ ساتھ حاصل ہوتیں۔ کوئی جماعت پاس کرنے کے لیے دینیات میں پاس ہونا لازمی تھا۔ ایک دن کے ناغے سے ڈرل ہوتی۔ ڈرل ماسٹر صاحب شاید ہاتھ میں بید لے کر ہی پیدا ہوئے تھے۔ نہایت اذیت پسند تھے، بچوں کو پیٹنا اور سخت چٹکیاں کاٹنا ان کا پسندیدہ شغل تھا لیکن ایک دن کسی بچے کے باپ نے اسکول کی گلی میں آکر انھیں ایک دو بید رسید کیا۔

اسکول میں ایک مختصر سی لائبریری تھی، انٹرول میں اور چھٹی کے بعد بھی کچھ دیر

بچوں کو کتابیں پڑھنے کی اجازت تھی، کتابیں جاری بھی کی جاتی تھیں۔ مہینے میں ایک بار ڈیبٹ اور مضمون نویسی کے مقابلے ہوتے۔ سالانہ جلسے کے موقع پر تحریری اور تقریری مقابلے مختلف جماعتوں کے درمیان ہوتے مثلاً تیسری اور چوتھی جماعتوں کے لیے ایک موضوع ہوتا، پانچویں چھٹی کے لیے دوسرا اور ساتویں اور آٹھویں کے لیے کوئی اور۔ بیت بازی کے مقابلے اسکول کے اندر اور دوسرے اسکولوں سے بھی ہوتے۔ ان مقابلوں میں مجھے اکثر انعامات ملے۔ غالباً ۱۹۴۳ء میں جب میں ساتویں جماعت میں تھا ایک تقریری مقابلہ سندیلہ میں ہوا، اس میں فیض عام اسکول سے دو لڑکے گئے تھے، ان میں سے ایک میں تھا، دوسرا میری ہی جماعت کا لڑکا محمد صدیق تھا۔ ڈاکٹر سلام سندیلوی ہمارے کلاس ٹیچر تھے، وہی لے کر گئے اور ہم لوگ انہی کے گھر پر ٹھہرے۔

اس سفر میں ہماری اور صدیق کی دوستی بڑھ گئی۔ واپسی کے بعد ہم لوگوں کو ایک ہفتہ وار پرچہ نکالنے کی سوجھی۔ اس کا نام تجویز ہوا ''شیطان''۔ اس کی اشاعت کے لیے جمعہ کا دن مقرر کیا گیا۔ ہم لوگ جمعرات کو کاپی کے چار صفحوں پر مشتمل یہ پرچہ تیار کرتے اس میں محض خرافات اور جھوٹی سچی باتیں ہوتیں۔ جنگ کا زمانہ تھا، جرمنی اور برطانیہ کے نشریات نے ایک ذہنی فضا بنادی تھی اس لیے ''ریڈیو جھوٹستان'' کے حوالے سے خبروں کا ایک کالم رکھا گیا اور پروپیگنڈے کی ٹیکنک کے مطابق اس کالم کے اوپر لکھ دیتے ''لعنة اللّٰه علی الکاذبین''۔ اس پرچے کی ایک ایک نقل جمعہ کی صبح کو ہر جماعت میں رکھ دی جاتی۔ ایک دن ہماری شامتِ اعمال کہ پہلے ہی گھنٹے میں غیر متوقع طور پر مولوی ظفر الدین صاحب آ گئے۔ وہ ایک جید عالم تھے، سبز صافہ باندھتے اور ڈھیلی ڈھالی اچکن پہنا کرتے، انھوں نے میز پر تازہ شمارہ دیکھا اور قرآن کی آیت کی بے حرمتی دیکھ کر آپے سے باہر ہو گئے۔ انھوں نے ہم دونوں کی ایسی مرمت کی کہ اخبار نکالنا بھول گئے یوں آگے چل کر زندگی بھر اخبار ہی اوڑھنا بچھونا بنا رہا۔

میرا دوسرا اچھا دوست عزیز الدین تھا، جو پھول والی گلی میں رہتا تھا، خلشؔ تخلص

بھی کرتا تھا، جسے ہم ''فُلش'' کہا کرتے تھے۔ مولوی صاحب موصوف نے ہماری دوسری مرمت عزیز الدین کے ساتھ فرمائی۔ بات یوں ہوئی کہ ہیڈ ماسٹر لاری صاحب کا گھنٹہ ایک روز خالی تھا۔ ہم اور عزیز الدین دنوں بلیک بورڈ پر پہنچے اور ایک بیل گاڑی کا جیسا تیسا کارٹون بنایا اور اس کے نیچے لکھ دیا:

ان کی لاری عجیب لاری ہے
کوئی سمجھے کہ بیل گاڑی ہے

ہماری شامتِ اعمال کہ مولوی صاحب کا گھنٹہ خالی تھا، وہی بھیج دیے گئے، بورڈ پر ان کی نظر پڑی تو اطمینان سے دریافت کیا کہ یہ کس کی کارستانی ہے۔ لڑکوں نے ہمیں نامزد کر دیا۔ آناً فاناً مولانا کا چہرہ سرخ ہو گیا اور نہ معلوم کہاں سے ایک ٹوٹی ہوئی لکڑی ان کے ہاتھ آ گئی پھر تو انھوں نے اسی سے ہم لوگوں کی پیٹھ ٹھونک ٹھونک کر واقعی پھوڑ دی۔

فیض عام اسکول میں فرسٹ ایڈ کی بھی تعلیم دی جاتی تھی جو چاہے زائد وقت میں سیکھے چنانچہ میں نے اسے بھی لے رکھا تھا اور اس میں مجھے کئی اسناد بھی ملی تھیں۔ اس تحریک کے روح رواں گورنمنٹ ہائی اسکول کے ایک ٹیچر شیر محمد خاں صاحب تھے جو اسکاؤٹ اور سنٹ جانس ایمبولنس جیسی خدمت خلق کی تحریکوں کے سالارِ کارواں تھے۔ وہ زندگی کے آخری دور میں اپنے بیٹے کے ہاں کراچی چلے گئے اور ۱۹۹۰ء میں ۹۶ برس کی عمر میں وہیں وفات پائی۔ اسکول میں ہفتے میں ایک دن تلاوتِ قرآن کا بھی گھنٹہ ہوتا۔ جو بچے قرأت کا شوق رکھتے تھے، ان کے اس ذوق کی تسکین کے لیے مایہ ناز قاری نیاز احمد صاحب کی ذات بابرکات موجود تھی۔ مچھلی بازار کی تاریخی مسجد میں وہی تراویح پڑھایا کرتے تھے۔ میں نے کچھ دنوں تک تجوید اور مخارجِ حروف کی مشق ان کے سامنے کی، چند سورتیں بھی انھوں نے اصول قرأت کے مطابق مشق کرا دیں لیکن بات اس سے آگے نہیں بڑھ سکی۔ اسکول کے پورے نظام میں یہ بہت ساری خوبیاں تھیں، کردار سازی کے لیے ان کی آج بھی ضرورت ہے۔

اسکول کے ایک واقعہ سے میری افتادِ طبع کا کچھ اندازہ ہوسکتا ہے۔ چوتھی جماعت میں ہمارا ایک ساتھی اعجاز احمد تھا جو فراش خانے میں رہتا تھا اسکول آتے جاتے اس کا ساتھ ہوجایا کرتا تھا، ذرا موٹا تھا ویسی ہی اس کی عقل بھی تھی۔ حساب کے ماسٹر صاحب نہ معلوم کہاں سے آگئے تھے اور شاید ایک ہی سال رہے، وہ بید لے کر کلاس میں داخل ہوتے، حساب کم سمجھاتے مارتے زیادہ۔ اعجاز بیچارہ ذرا کمزور تھا اور فربہی کی وجہ سے اچھا نشانہ بھی بس اسی کو بلا کر بورڈ کے قریب کھڑا کر دیتے اور سوالات حل کرنے کو کہتے اور تقریباً ہر سوال پر اس کی بید بازی کرتے۔ مجھے اس بات پر سخت غصہ آتا لیکن کر ہی کیا سکتا تھا۔ ان کا گھنٹہ انٹرول کے بعد فوراً ہی پڑتا تھا اور وہ گھنٹہ بجتے ہی جلاد صفت کلاس میں داخل ہوتے۔ ایک دن ان کے ظلم پر میرا غصہ دوسرے دن تک جاری رہا۔ اعجاز کا آنسوؤں میں ڈوبا ہوا چہرہ رات بھر میری آنکھوں کے سامنے رہا تھا، اس روز انٹرول ختم ہوتے ہی میں نے کلاس روم کے چاروں بڑے بڑے دروازے اندر سے بند کر دیے کہ ماسٹر صاحب اندر نہ آنے پائیں۔ جو عمر تھی اسی کے مطابق عقل بھی تھی۔ ماسٹر صاحب آئے تو دروازے بند دیکھ کر غصے میں آپے سے باہر ہوگئے، دروازے پیٹتے رہے۔ میں نے سب لڑکوں کو قسم دے دی تھی کہ دروازے کوئی نہ کھولے۔ لیکن کچھ دیر بعد ایک صاحبزادے کی ہمت نے ساتھ چھوڑ دیا۔ اس کا نام اسماعیل تھا۔ اس نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ ماسٹر صاحب غصہ میں کانپتے ہوئے میز تک آئے اور پوچھا کہ یہ کس کی حرکت تھی، سب لڑکے ساکت رہے پھر انھوں نے بید اٹھایا اور سب کی بید بازی کی دھمکی دی تو اسی اسماعیل نے میرا نام بتادیا اور اس حرکت کا سبب بھی، پھر تو معلوم نہیں کتنے بید مجھ پر پڑے لیکن اس کے بعد دو باتیں ضرور ہوئیں ایک تو یہ کہ ماسٹر صاحب نے اعجاز کو نشانہ بنانا چھوڑ دیا دوسرے یہ کہ لڑکے اسماعیل کو کفن چور کہنے لگے۔

فیض عام اسکول کے اس سات آٹھ برسوں کے دوران ہم لوگوں کی رہائش بدلتی رہی۔ اول تو وہی مکان تھا جس میں پہلے پہل وارد ہوا تھا اس کے بعد گڈریا محال میں۔

وہاں کی مسجد میں نشورواحدی صاحب پیش امام تھے، انھیں مسجد میں حجرے کے علاوہ قریب ہی رہائش کے لیے ایک مکان بھی ملا ہوا تھا لیکن ان کے اہل وعیال وہاں نہیں تھے۔ قرابت قریبی کی بنا پر انھوں نے ماموں جان سے کہا کہ وہیں آ کر رہیں وہاں سے ان کا کانیہ کبج ھائی اسکول قریب تھا، لیکن میرا فیض عام اسکول تو معلوم نہیں کتنی دور تھا، ایک گھنٹہ پیدل کا فاصلہ تو ضرور رہا ہوگا، ہم لوگ چار پانچ لڑکے ساتھ ساتھ آتے جاتے تھے۔

اس کے بعد چمن گنج کی بلڈنگ سعید آباد میں کوئی چھ ماہ قیام رہا، اسی اثناء میں ۱۹۳۹ء میں کانپور کا بدترین فرقہ وارانہ فساد ہوا، پھر ہم لوگ اسی بلڈنگ سے ملحق عاشق حسین کی بلڈنگ میں منتقل ہو گئے۔ اسی بلڈنگ میں کانپور کی مشہور عوامی شخصیت شیر محمد خاں صاحب بھی رہائش پذیر تھے۔ اس کے بعد بیکن گنج ناظر باغ کے اس قدرے بڑے مکان میں رہنے لگے جو پولیس چوکی والی سڑک پر اسی لائن میں واقع ہے۔ اس رہائش کے تذکرے رنگا رنگ ہیں۔ اس کے بعد قیام کانپور کے آخری دو برس افتخار آباد کے ایک مکان میں گزارے اور وہیں قیام کے دوران ہائی اسکول کے امتحان سے فراغت حاصل کی۔

ہم لوگوں کے پہلے مکان میں کچھ عرصہ تک شبیر ماموں بھی ہم لوگوں کے ساتھ رہے۔ وہ ماموں جان کے چچازاد بھائی تھے۔ ان کے والد مولانا احسن اللہ صاحب احسنؔ سمبھی نے کانپور میں خاص شہرت حاصل کرنے کے بعد ۱۹۲۸ء میں وہیں وفات پائی۔ ماموں جان نے ۱۹۴۳ء میں ''احسنؔ سمبھی کے سو شعر'' کے عنوان سے ان کے کلام کا ایک مختصر انتخاب شائع کیا تھا، جس میں مولانا احسنؔ سمبھی کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''عنفوانِ شباب میں علی گڑھ پہنچے وہاں سے حیدرآباد دکن اور دیگر مقامات گھومتے ہوئے ۱۹۱۹ء میں کانپور تشریف لائے اور مولانا آزاد سبحانی کے یہاں امین گنج میں قیام فرمایا۔ آپ کی تشریف آوری کو کانپور کا اردو داں طبقہ ایک غیبی امداد سمجھ کر بہت زیادہ مسرور ہوا اور آپ کے گرد عقیدت کیشوں کا ایک ہجوم رہنے لگا، یہیں سے حلقہ ادبیہ کی ابتدا ہوئی..... ایک ادبی رسالہ ''الادب'' نکالنا شروع کیا جو مولانا

آزاد سبحانی کی سرپرستی میں ایک عرصے تک نکلتا رہا.....آپ نے ایک عرصے تک دفتر زمانہ میں نائب مدیر کی حیثیت سے کام کیا، آنجہانی منشی دیانرائن نگم ہمیشہ آپ کا احترام کرتے تھے۔ وفات سے چند ماہ پہلے آپ نے دفتر زمانہ سے علیٰحدگی اختیار کر لی تھی، ۸ر ستمبر ۱۹۲۸ء بروز شنبہ آپ نے کانپور ہی میں انتقال کیا۔''

''کانپور میں آپ کے شاگردوں کی تعداد بہت زیادہ تھی جن میں زیادہ تر اس وقت بذاتِ خود استاد ہیں اور کافی شہرت کے مالک ہیں۔ چند حضرات کے نام ہیں — جناب ثاقبؔ کانپوری، جناب گنگا دھرناتھ فرحتؔ، جناب محمد زبیر روحیؔ، جناب عبدالصمد بزمیؔ، جناب رازؔ چاندپوری، جناب سلیم نیدوری، جناب لیاق اللہ نظرؔ بریلوی (مرحوم)۔''

اسی کتابچے میں نشورؔ واحدی صاحب رقم طراز ہیں:

''اردو میں جن لوگوں نے بہترین تغزل کے نمونے پیش کیے ان میں سے ایک احسنؔ بھی ہے۔ حسرتؔ کے بعد غزل گوئی میں سب سے ممتاز حیثیت اسی کی ہے، اگر چہ دورِ جدید کے تنقید نگاروں نے اس سلسلے میں بڑی بے خبری اور تنگ دلی کا ثبوت دیا ہے کیونکہ احسنؔ ان معروف ومشہور لوگوں میں تھا جسے اس زمانے کا ہر شاعر اور نقاد اچھی طرح جانتا تھا اور پایۂ کلام سے بھی واقف تھا، اس کے باوجود تاریخ غزل میں اس کا نام جلی حروف میں نہ ہونا صرف بے بصری اور کم نظری نہیں بلکہ ایک ایسے جرم کا ارتکاب ہے جسے تاریخِ شعر وسخن کی عدالت کبھی معاف نہیں کرے گی۔''

احسنؔ نانا مرحوم کے تیسرے بیٹے وسیم احمد تھے جو وسیمؔ بھی کے نام اور تخلص کے ساتھ زندگی بھر صرف شاعری کرتے رہے وہ بھی زیادہ وقت اور توانائی قطعات پر صرف کی اس کے علاوہ کوئی کارِ خیر کیا تو اپنے مرحوم بڑے بھائی کے یتیم بچوں کی پرورش۔ وہ خود کانپور میں تعلیم سے فراغت کے بعد جونپور چلے گئے جہاں ان کی سسرال تھی اور وہیں کے

ہو رہے۔ ۱۹۷۶ء میں ان کا انتقال ہوا۔ ان کی بے نیازی، زمانے کی افراتفری اور ہم عصروں کی بے اعتنائی نے ان کے ساتھ نا قابلِ تلافی نا انصافی کی یہ نہیں معلوم کہ ان کا کلام جو معیار و مقدار میں بہت وافر تھا کیا ہوا۔

شبیر ماموں ان کے بڑے بھائی اور احسنؔ نانا کے دوسرے بیٹے تھے۔ ان سے میری آخری ملاقات ۱۹۸۸ء میں کراچی میں ہوئی۔ سندھ یونیورسٹی (حیدرآباد) سے ایجوکیشن کے پروفیسر کی حیثیت سے ریٹائرمنٹ کے بعد انھوں نے کراچی میں اپنی بھتیجی کے یہاں قیام اختیار کیا۔ ان کی سیاسی اور تعلیمی مصروفیات نے انھیں گھر بار کے جھگڑوں میں پڑنے کی مہلت ہی نہ دی اس لیے تجرد کی زندگی اختیار کی۔ اُس وقت بھی کوئی ستر بہتر کی عمر میں چاق و چوبند تھے اور شاہراہ ریشم دیکھنے کے لیے جانے کے خواب بن رہے تھے۔ ان کی ناہموار زندگی کا منظر اس وقت بھی سامنے تھا۔ ایک بوسیدہ سی کرسی پر منوسکرپٹ کا انبار تھا، اسی کے سامنے ایک اور کرسی پڑی تھی جس پر بیٹھ کر وہ کام کرتے رہے ہوں گے۔ انھوں نے اپنی ایک ضخیم تصنیف ''تعلیم کی کہانی'' مجھے عطا کی۔ ان کی اسی تصنیف سے مجھے معلوم ہوا کہ کانپور کا اصل نام خانپور تھا جو کہ قرین قیاس ہے ورنہ ہم لوگوں کو بچپن میں بتایا گیا تھا کہ پہلے یہاں انگریز فوجوں کا کیمپ ہوا کرتا تھا اسی نسبت سے اس جگہ کو کمپو کہتے تھے، جو آگے چل کر کانپور ہو گیا۔ شبیر ماموں کی مذکورہ بالا تصنیف انگریزوں کے عہد میں خصوصاً گزشتہ صدی میں نظامِ تعلیم پر ایک تحقیقی کاوش کا حاصل ہے جو برصغیر میں ایجوکیشن کے طلبہ کے لیے خاصی رہنمائی کا سامان ہے۔

پروفیسر شبیر احمد

میں جب اول اول کانپور پہنچا اسی سال شبیر ماموں نے شمشادیہ اسکول سے کنارہ کشی اختیار کی اور ہمایوں باغ کی ایک بلڈنگ میں ابتدائی جماعتوں سے ایک درسگاہ کی بنیاد رکھی جو اب مولانا محمد علی میموریل انگلش ہائی اسکول کے نام سے بیکن گنج میں پانی کی ٹنکی کے پاس اپنی عمارت میں موجود ہے۔ ابتدائی کارروائی کے بعد وہ ہر سال ایک

ایک جماعت کا اضافہ کرتے گئے۔ اسکول ہی کے ایک کمرے میں رہتے بھی تھے اور کوئی نہ کوئی امتحان ہر سال خود بھی دیتے جاتے تھے۔ چنانچہ کئی مضامین میں ایم اے کر ڈالے۔

شبیر ماموں میں کئی خوبیاں تھیں جو دوسرے زاویوں سے دیکھنے پر خرابیاں معلوم ہوتیں۔ وہ نہایت سخت مزاج اور اٹل قوتِ ارادی اور قوتِ فیصلہ کے مالک تھے۔ ایک بار جو راہ اختیار کر لیتے اس سے انھیں ہٹانا ناممکن ہوتا۔ اسی قوت ارادی نے ایک زندہ جاوید ادارے کو جنم دیا۔ ان کی درویشی اور بے نیازی دوسرے خصائص تھے۔ کھانے کے معاملے میں ان کا اصول یہ تھا کہ جب بھوک لگے اس وقت کوئی ایک چیز کھالی جائے چنانچہ کبھی صرف گاجر کھا لیتے، کبھی مولی، کبھی صرف کچا چنا، کبھی دودھ پی لیتے یا جی بھر گنا چوس لیتے۔ لائبریری کی ایک الماری میں اس طرح کی چیزیں رکھی ہوئی بھی ملتیں۔ اسی لائبریری کے ایک گوشے میں ایک کھاٹ پڑی یا کھڑی رہتی، سر کے نیچے ہاتھ رکھ کر اسی پر سو رہتے۔

میں نے ۱۹۴۶ء میں ہائی اسکول کا امتحان دینے کے بعد کانپور سے رخصت لے لی تھی پھر تین سال بعد مراجعت ہوئی۔ اس اثناء میں اسکول کے معاملات میں کیا ہوا معلوم نہیں لیکن شبیر ماموں کے گھریلو بلکہ خاندانی حالات بڑے صبر آزما بلکہ حوصلہ شکن رہے۔ ان کی والدہ کا انتقال ہوا، بڑے بھائی داروغہ نورالہدیٰ صاحب اور ان کی بیوی کا انتقال ہوا بہن اور بھانجی کا انتقال ہوا اور یہ سب ۱۹۴۸ء کے آس پاس ہوا، بظاہر کوئی ذریعہ معاش نہ تھا، اراضیاں رہن رکھنے لگے، وہ خود بھی صحت کے مسائل سے دوچار ہو گئے۔ ان کا ایک بازو شل ہو گیا۔

وہ مولانا محمد علی میموریل اسکول کی عمارت کے لیے زمین حاصل کر چکے تھے، کچھ بلڈنگ فنڈ بھی اکٹھا ہو گیا تھا، انھوں نے یہ سب اسکول کی مینجنگ کمیٹی کے حوالے کیا اور خود سمبھی چلے آئے۔ خاموشی سے وقت گزارنے لگے لیکن وہ ان کی قوتِ ارادی تھی جس نے انھیں پھر سیدھا کھڑا کر دیا۔ شل بازو کو درست کرنے کے لیے وہ تالاب میں کئی کئی گھنٹے تیرتے رہے بالآخر وہ درست ہو گیا اور انھوں نے اتر ولیا، ضلع اعظم گڑھ کے کسی کالج میں

پڑھانا شروع کیا، پھر وہاں سے مرزا پور چلے گئے، کچھ روز وہاں کسی کالج میں پڑھاتے رہے، وہاں سے بھی رخصت ہوئے، دراصل انھیں کسی کی بالادستی تسلیم نہ تھی۔ بالآخر انھوں نے وطن کو خیر باد کہنے کا فیصلہ کیا۔

۱۹۵۰ء میں سابق مشرقی پاکستان جانے سے پہلے وہ ایک بار چند دنوں کے لیے کانپور آئے تھے، اس وقت میں پھر کانپور پہنچ چکا تھا۔ وہ کچھ عرصہ تک مشرقی پاکستان کے مختلف شہروں میں معرکہ آراء رہے، اسی اثناء میں بیروت کی امریکن یونیورسٹی سے رابطہ قائم کیا اور ایم ایڈ کرنے کی غرض سے وہاں چلے گئے اور تین سال قیام کیا، اسی زمانے میں بیروت میں شورشوں کا آغاز ہوا۔ بیروت سے واپسی کے وقت کسی بات سے انھیں اختلاف ہوا تو ہوائی جہاز کا ٹکٹ واپس کر دیا اور بیروت سے ڈھاکہ تک کا سفر بذریعہ بس کیا۔ کلکتہ میں مجھ سے ملاقات ہوئی۔ میں نے کہا کہ یہ سفر تو بڑا تکلیف دہ رہا ہوگا تو کہنے لگے نہیں بھائی بڑا دلچسپ تھا، سارے مغربی ایشیا کو قریب سے دیکھنے اور لوگوں سے ملنے کا موقع ملا بڑا لطف آیا۔ کچھ عرصہ بعد وہ مشرقی پاکستان کو خیر باد کہہ کر مغربی پاکستان چلے گئے اور حیدرآباد سندھ یونیورسٹی کے شعبہ ایجوکیشن سے وابستہ ہوگئے اور وہیں سے ریٹائر ہوکر کراچی میں سکونت پذیر ہوئے۔

میرا پہلا تعلیمی سال اسی مکان میں گزرا جس میں میں وارد ہوا تھا، دوسرا سال اسی مکان کی بالائی منزل پر۔ ان دونوں برسوں کے دوران ہمارے دو پھوپھی زاد بھائی ایک تو مولوی حبیب الرحمٰن صاحب جو مجھے فیض عام اسکول میں لے گئے اور پھر ساتھ لاتے لے جاتے رہے دوسرے ان سے چھوٹے سعید بھائی ماموں جان کے ساتھ ہی رہے، یہ دونوں ہماری ممانی جان کے بھانجے بھی تھے، اس لیے ماموں جان کو خالو کہتے تھے۔ سعید بھائی آٹھویں نویں جماعت میں پڑھتے تھے، وہی کھانا بھی پکاتے تھے میں ان کا ہاتھ بٹاتا تھا۔ ہم لوگوں کا رہن سہن بہت سادہ تھا اور لوازماتِ زندگی بہت مختصر۔ مہینے میں ایک بار کلکٹر گنج سے جنس خرید کر آتی۔ مجھے یاد ہے کہ ایک روپیہ کا ۱۳ سیر گیہوں اور ایک

آنہ اس کی صفائی اور پسائی کی اجرت، ایک روپیہ کا دس یا گیارہ سیر چاول، ایک روپیہ کی ساتھ آٹھ سیر دالیں ملا کرتی تھیں، چار آنے سیر چینی تھی، جھلی والا یہ سامان گھر تک پہنچانے کا ایک آنہ لیا کرتا تھا۔

ایندھن کے لیے ببول کے چیلے ایک روپیہ میں تیرہ چودہ پنسیری ملتے تھے، ڈھاک کے چیلے ایک پنسیری زیادہ ملتے تھے۔ ببول کے چیلوں کو کوئلہ بہت اچھا ہوتا وہ سویرے ناشتہ پکانے کے لیے انگیٹھی میں کام آتا۔ کانپور میں ببول کی لکڑی کی وافر دستیابی کی ایک خاص وجہ وہاں چمڑے کی صنعت تھی کیونکہ اس کی چھال چمڑے کی رنگائی کے کام آتی تھی اور لکڑیاں ٹال پر آجاتی تھیں۔

میرے تیسرے تعلیمی سال کے آغاز پر ممانی جان بھی ہم لوگوں کے ساتھ کانپور آگئیں اور ہم لوگوں نے گڈریہ محال کے ایک مکان میں قیام کیا۔ وہ مکان نشورؔ واحدی صاحب کی رہائش کے طور پر ملا ہوا تھا وہ اس وقت محلے کی مسجد میں پیش امام تھے اور مسجد کے اندر ہی ایک حجرے میں رہا کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے وہ نماز فجر کے بعد اسی حجرے میں ایک چارپائی پر خاموش مراقبے کی کیفیت میں بیٹھے رہتے اور نیچے بچھے ہوئے فرش پر ان کے حلقہ بگوش اسی طرح خاموش بیٹھے ہوتے۔

کچھ عرصے بعد نشورؔ صاحب نے خانقاہی زندگی سے پاؤں باہر نکالے اور درس و تدریس کی راہ پر گامزن ہوئے جس کو منطقی انجام تک پہنچا کر فارغ ہوئے اسی اثناء میں اپنے کلام کے دفتر تیار کرتے رہے جو طبع ہو کر منظرِ عام پر آتے رہے اور جنوری ۱۹۸۳ء میں رحلت فرمائی۔

۱۹۳۹ء میں ہم لوگ گڈریا محال سے چمن گنج منتقل ہوئے۔ پہلے سعید آباد کی بلڈنگ میں پھر عاشق حسین کی بلڈنگ میں رہے۔ یہ دونوں اس زمانے کے اعتبار سے بڑی بلڈنگیں تھیں جن میں بہت سی رہائشیں تھیں گویا اس وقت کے فلیٹ تھے۔ اس وقت ماموں جان کے پہلے صاحبزادے خلیق الرحمٰن کی طفلانہ شرارتوں کا اضافہ ہو چکا تھا اور حبیب

الرحمٰن بھائی اور سعید بھائی علیٰحدہ رہنے لگے تھے۔ اسی سال کانپور کا بدترین فساد ہوا۔ پہلے ہی دن شام کو سیسہ مئو کے چوراہے پر جو چمن گنج سے زیادہ دور نہیں ہے میں صاف بچ گیا۔ اسی بلوے کے دوران میں نے پہلی بار آدمی کی لاش دیکھی جو ایک نالے سے نکالی جارہی تھی۔ اس طرح شعور کی آنکھیں کھلنی شروع ہوئیں۔

کانپور میں فسادات عام طور سے مول گنج کے چوراہے سے شروع ہوتے، جو ہندو آبادی اور مسلم آبادی کا نقطۂ اتصال یا خطِ تقسیم تھا۔ ۱۹۳۹ء کے بعد تو تقریباً ہر سال ہی فسادات ہوتے رہے۔ اس وقت مجھے سمجھ نہیں تھی لیکن اب سمجھتا ہوں کہ فسادات ہوا نہیں کرتے تھے بلکہ کرائے جاتے تھے۔ ہوتا یہ تھا کہ مول گنج کے چوراہے پر واقع مسجد کے سامنے کسی حیلے سے باجا بجادیا جاتا، بس اینٹ پتھر چلنے لگتے پھر کوئی کسی کو چھرا مار دیتا اس کے بعد شہر میں ہر طرف شور ہوجاتا کہ ''چل گئی''۔ یہ اصطلاح تھی ہندو مسلم فساد کی۔ پھر معصوم اور ناآگاہ راہ چلتے لوگوں کو جہاں تہاں چھرے گھونپ کر ان کی زندگی کے چراغ گل کردیے جاتے۔ اس کیفیت کی بربریت میں کیا کلام ہوسکتا ہے لیکن اس زمانے میں زندگی ہر اعتبار سے سادہ تھی تو یہ بربریت بھی سادہ تھی یعنی افراد کو تنہا پاکر موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا۔ آج ترقی یافتہ دور کے شانہ بشانہ مردم کشی بھی ترقی کرگئی ہے اس لیے قتل بھی تھوک کے بھاؤ ہوتے ہیں۔ بچے بوڑھے بھی نہیں بخشے جاتے، رہائشوں اور اسباب زندگی کو خاکستر کردیا جاتا ہے تاکہ پھر پھلنے پھولنے کا امکان باقی نہ رہے، انسان اب زیادہ دور اندیش ہوگیا ہے۔ وہ فساد کتنے دن جاری رہا یہ تو نہیں یاد لیکن اتنا یاد ہے کہ کھانے پینے کی چیزیں کمیاب ہورہی تھیں۔ چمن گنج کے گھوسی اپنا دودھ بھی محلے کے باہر نہیں لے جاسکتے تھے۔ چنانچہ خالص دودھ ایک آنے سیر بکنے لگا۔ بس حسبِ خواہ دودھ لے کر اس میں چاول اور قدرے چینی ڈال دی جاتی اس طرح ہم لوگ کھیر کھاتے رہے۔ اس سال میں تیسری جماعت میں تھا۔

جب میں پانچویں جماعت میں آیا تو ہم لوگ ناظر باغ، بیکن گنج کے ایک مکان

میں منتقل ہوگئے جو پولیس چوکی والی لائن میں نکڑ پر واقع تھا اور اب بھی ہے اسی کے بالمقابل وہ بلڈنگ ہے جس میں نشورؔ صاحب اپنے آخری دور میں قیام فرما رہے۔ وہ مکان بہت بڑا تھا اور دو حصوں میں منقسم تھا۔ اس کے ایک حصے میں عظیم اللہ خالو معہ اہل وعیال آ گئے تھے اور دوسرے حصے میں ہم لوگ رہتے تھے۔ ہم لوگ سے مراد یہ ہے کہ ماموں جان، میں اور خلیق کی ایک یونٹ تھی، دوسری یونٹ حبیب الرحمٰن بھائی کی تھی، ان کے ساتھ اب سعید بھائی کے بجائے ان کا سب سے چھوٹا بھائی مسعود تھا۔ ان کے علاوہ کوئریاپار کے عبدالحافظ چچا تھے جو باری چچا کے چھوٹے بھائی تھے اور انکم ٹیکس آفس میں برسرکار تھے۔ لذیذ کھانے اور طرح طرح کے حلوے پکانا ان کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ دو تین اور مجرد افراد تھے جو آتے جاتے رہے۔ اب اپنا کھانا پکانے کی ذمہ داری میری ہوگئی تھی اور خلیق میرے معاون تھے۔

سعید بھائی نے ہائی اسکول پاس کرنے کے بعد کچھ عرصے تک ٹی بی میں مبتلا رہ کر داعی اجل کو لبیک کہا، ان کے دو چھوٹے بھائی ودود اور مسعود بھی اسی نامراد مرض کے ہاتھوں جوانمرگی کا شکار ہوئے۔ میری دیگر دو پھوپھوؤں کے چار جوان جٹھا بیٹے اسی راہ لگے۔ ۳۰ء اور ۴۰ء کے عشروں کے دوران ہماری قرابتوں میں اس منحوس مرض نے ایسا گھر کیا کہ خاندانوں کے چراغ گل ہوگئے۔

سعید بھائی مرحوم میرے بچپن کی خشک اور پابند زندگی میں خوشیوں کے چند لمحے داخل کر دیا کرتے تھے اللہ تعالیٰ انھیں اس کا اجر عظیم عطا فرمائیں۔ مثلاً دسہرے اور محرم کے موقعوں پر شبیر ماموں کے چھوٹے بھائیوں کے ساتھ مل کر ایک ٹولی بنا لیتے اور مجھے بھی رام لیلا اور میلوں کی سیر کرا دیتے۔ محلے میں جن پیر صاحب کا ذکر ہو چکا ہے ان کے یہاں جمعرات کو معرکۃ الآرا قوالیوں کا منظر سعید بھائی کے طفیل ہی دیکھ سکا۔ میرے ہی جیسے پابندیوں کے حالات سے گزرنے کے باوجود ان کے اندر ایسی جسارت اور توانائی تھی کہ آزادی کے لمحات چھین لیا کرتے تھے۔ عقوبتیں بھی دیکھیں لیکن اس سے خائف کبھی نہیں

ہوئے۔ ہاکی کے اچھے کھلاڑی تھے۔ کسی کسی جمعرات کو شرارتاً ایک حرکت یہ کرتے کہ بیکن گنج کے چوراہے پر خانقاہ میں عورتیں جو مٹھائی اور پیسے چڑھا کر جاتیں مجاوروں کی نظر بچا کر ان میں سے کچھ جلیبی بتاشے اور اپنی بیڑی کے لیے آنے دو آنے پیسے مار لاتے۔ اس زمانے میں محرم جاڑوں میں پڑتے تھے اس لیے سبیلوں پر شربت کے بجائے چائے چلتی جو مٹی کے کوزوں میں تقسیم ہوتی تھی۔ سعید بھائی کی ٹولی مول گنج سے نئی سڑک اور پریڈ ہوتے ہوئے گوال ٹولی تک رات گئے تک رواں دواں رہتی اور راستے میں پڑنے والی سبیلوں پر یہ لوگ بازی لگا کر چائے پیتے۔ مول گنج کے قریب مسٹن روڈ پر محرم کے اکھاڑے اور اطراف کے بالاخانوں سے اترنے والیوں کی نوحہ خوانی دیکھنے اور سننے کے لیے شہر امنڈ پڑتا تھا اس کی سیر بھی سعید بھائی نے ہی کرائی لیکن ان کی پتنگ بازی کے طفیل مار میں نے ہی بہت زیادہ کھائی۔

ایک دن ایک صاحب حفیظ الرحمٰن صاحب کا مکان پوچھتے ہوئے معہ بکس اور بستر کے وارد ہوئے اور عظیم اللہ خالو سے اپنا تعارف یوں کرایا ''میرا نام صدر الدین ہے، میں شیخپورکا رہنے والا ہوں، سی.او.ڈی. کلکتہ میں ملازمت تھی اب میرا ٹرانسفر کانپور ہوگیا ہے، حفیظ الرحمٰن صاحب سے قرابت کی بنا پر یہیں چلا آیا ہوں۔'' خالو نے سمجھا کہ ماموں جان کے سسرالی ہیں اور ان کو خوش آمدید کہتے ہوئے بتایا کہ وہ کالج سے چار بجے تک آئیں گے، آپ آرام کریں۔ خیر، شام کو ماموں جان آئے تو انھیں بتایا گیا کہ یہی حفیظ الرحمٰن صاحب ہیں، تو وہ حیرانی کے عالم میں کہنے لگے کہ ''یہ تو وہ نہیں ہیں جن کے ہاں میں آیا ہوں۔'' ماموں جان فوراً سمجھ گئے کہ یہ نشورواحدی کی تلاش میں ہیں جو اپنے وطن میں اصل نام سے ہی جانے پہچانے جاتے ہیں، اس وقت نشور صاحب غالباً بانس منڈی میں رہتے تھے۔ ماموں جان نے ان سے کہا کہ آپ ان کے عزیز ہیں تو میرے بھی عزیز ہیں، یہاں بلا تکلف قیام کر سکتے ہیں۔ بس پھر کیا تھا، صدرالدین صاحب نے مستقل قیام کا قصد کرلیا اور اسی مکان میں ہاتھ پاؤں پھیلا لیے۔ ایک انگیٹھی لاکر رکھ دی اور کچھ پکانے کھانے لگے۔

کچھ ہی دنوں بعد انھوں نے اپنے چھوٹے بھائی فخرالدین کو بلالیا جو لیدمشین پر کام کرنا جانتے تھے، بڑے اچھے شکاری تھے، جنگلی جانوروں کا شکار کرتے تھے بندوق خواہ کسی کی ہو۔ تعلیم کے بارے میں وہ فخریہ بیان کرتے تھے کہ ہم مدرسے سے بھاگ جاتے تھے اور مولوی صاحب ہمیں پکڑنے کے لیے جن لڑکوں کو بھیجتے تھے ہم انھیں ڈھیلے بازی کے ذریعہ دور ہی رکھتے تھے۔ بس اس طرح انھوں نے تعلیم سے فراغت حاصل کی۔ صدرالدین صاحب نے ان کے لیے بھی سی او ڈی میں کوئی کام ڈھونڈھ نکالا۔ پھر اپنے سالے سکندر کو بلالیا جو فخرالدین کے تقریباً ہم عمر تھے۔ دیگر اعتبارات سے بھی ان کے برابر ہی تھے لیکن اس فرق کے ساتھ کہ انھیں لیدمشین کا کوئی تجربہ نہ تھا اور یہ کہ وہ ہر کسی کی تھوڑی بہت تفریح کا سامان تھے۔ صدرالدین صاحب نے ان کو بھی سی او ڈی میں کہیں فٹ کردیا۔ پھر اپنے بہنوئی ابرار صاحب کو بلالیا، وہ شکاریات میں فخرالدین کے بھی استاد تھے باقی اللہ اللہ خیر صلا۔ ان کو کام دھرانے کی کوشش میں کوئی قابلِ ذکر کامیابی نہیں ہوئی مگر تاش کھیلنے میں طاق تھے۔ کچھ دنوں بعد انھوں نے اپنے بیٹے کو یعنی صدرالدین صاحب کے بھانجے کو بلالیا۔

اس زمانے میں کارخانے کے مزدوروں کی ڈیوٹی بارہ گھنٹے کی ہوا کرتی تھی یعنی ۲۴ گھنٹے میں دو شفٹیں۔ چنانچہ کسی مل کا وقت صبح ۶ بجے سے شام ۶ بجے تک کسی کا ۷ بجے صبح سے ۷ بجے شام تک اسی حساب سے ملوں کے بھونپو بجنے شروع ہوتے۔ مزدور اپنے اپنے کارخانے کی سیٹیاں پہچانتے تھے۔ زیادہ تر کارخانے سوتی کپڑے کے تھے، اونی کپڑوں اور کمبل کا مشہور کارخانہ لال املی تھا۔ سی او ڈی (سنٹرل آرڈی نینس ڈپو) ایک فوجی ادارہ تھا، جہاں فوجی ضرورت کی بیشمار چیزیں تیار ہوتی تھیں۔ دوسری عالمی جنگ جاری تھی اس لیے ہندوستانی فوج کی ضرورتیں بھی بڑھی ہوئی تھیں انھیں پورا کرنے کے لیے کانپور کے مختلف محلوں میں گھر گھر چھوٹے موٹے کام گھریلو صنعت کے طور پر ہو رہے تھے، ان کا سارا سامان کنٹراکٹروں کے ذریعہ سی او ڈی میں پہنچ جاتا۔ غرض یہ کہ سی او ڈی

بہت طرح کے ورکروں اور مزدوروں کا براہِ راست یا بالواسطہ ذریعہ معاش تھا۔

حسنِ اتفاق سے سی او ڈی کے چیف اکاؤنٹینٹ محمد شعیب صاحب کلکتہ سے ٹرانسفر ہوکر کانپور آ گئے تھے، اعظم گڑھ کے رہنے والے تھے اور مشرقی یوپی کے مسلمانوں کی بھرتی کا زبردست وسیلہ بن گئے تھے۔ وہ تقسیم وطن کے بعد پاکستان چلے گئے اور وہاں غالباً صدر ایوب خاں کے دورِ اقتدار میں ان کے مالی مشیر رہے پھر اقوامِ متحدہ میں سکریٹری جنرل کے مالی مشیر کے طور پر خدمات انجام دیں۔

ہاں تو کانپور میں صبح شام مزدوروں کے ریلے چلتے تھے، سواریوں سے کام پر آنے جانے کا دستور نہ تھا نہ ہی اتنی سواریاں دستیاب تھیں، چنانچہ مزدوروں کو میلوں چل کر اپنے کارخانے آنا جانا پڑتا تو ظاہر ہے ہفتے میں چھ دن ۱۲ گھنٹے یومیہ ڈیوٹی اور دو گھنٹے آنے جانے کے، بقیہ دس گھنٹے میں جو چاہیں کریں۔ صدرالدین برادرس کے بھی یہی لیل ونہار تھے۔ چنانچہ ان لوگوں کو نہانے دھونے کی فرصت خصوصاً جاڑوں میں ہفتے میں ایک ہی دن ملتی تھی، اس لیے دور ہی سے ان لوگوں کی موجودگی کا پتہ چل جاتا تھا۔

کانپور میں مختلف تحریکوں کی دھما چوکڑی تھی جن میں سے بعض کانگریس یا مسلم لیگ جیسی ملک گیر سیاسی تحریکیں تھیں یا مزدور تحریکیں لیکن بعض علاقائی یا مقامی نوعیت کی بھی تھیں جیسے کہ خاکسار، سبز پوش، نیلی پوش، سرخ پوش وغیرہ ان کی سرگرمیوں کے علاقے بیکن گنج، چمن گنج، طلاق محل، نئی سڑک وغیرہ کے مسلم علاقے تھے۔ میرا شعور اتنا بالیدہ نہ تھا کہ میں ان تحریکوں کا کچھ مطلب سمجھتا اس لیے میرے لیے یہ سب رنگ رنگ کے تماشے تھے۔ ایک حقیقت یہ بھی تھی کہ مجھے یہ تماشے دیکھنے کی بھی فرصت یا مہلت نہ تھی۔ بس اسکول آتے جاتے راستے میں ''جو کچھ خدا دکھائے سو ناچار دیکھنا'' خواہ پیچ باغ کی تنگ سڑک کے دونوں جانب چمڑے کے گوداموں سے اٹھتے ہوئے بدبو کے بھبکے ہوں خواہ برسات میں انہیں غلیظ راستوں سے گھٹنوں گھٹنوں پانی میں گزرنا ہو، خواہ مول گنج چوراہے کے اطراف کی گلیوں میں بالانشینوں کی ٹھٹھول ہو۔

بات یوں تھی کہ میرے کام کی شفٹ بارہ گھنٹوں سے زیادہ لمبی ہوا کرتی تھی، طالب علمی کی ساری مدت اتنی ہی لمبی شفٹوں میں کام کرتے گزری اور اس پر کبھی احتجاج نہیں کیا، شاید اتنی لمبی شفٹ میں کام کرتے رہنا میرا مقدر بن گیا تھا اس لیے عملی زندگی میں بھی کام کی طوالت کا یہی عالم رہا بلکہ اس سے زیادہ ہی۔ میں فجر کے وقت اٹھایا جاتا پھر اپنے آپ اٹھ جانے کی عادت بن گئی، اب بھی طلوع آفتاب تک پڑے رہنا میرے لیے ناممکن ہے ہاں بصورتِ علالت ممکن ہے۔ لڑکپن ہی سے یہ طریقہ رہا کہ سویرے جاکر دودھ لانا پھر چائے بنانا، ناشتہ کرنا اور ماموں جان کو ناشتہ کرانا پھر جلدی جلدی کھانا تیار کرنا، نو ساڑھے نو بجے تک کھاپی کر فارغ ہوجانا اور اسکول روانہ ہونا، چار بجے اسکول سے آکر پھر برتن باسن، چولہاچوکا سنبھالنا۔ کھانا تیار کرنا پھر ماموں جان کی آمد کا انتظار کرنا، وہ شام کو خواجہ عبدالسلام صاحب کے بچوں کو پڑھاتے تھے، توپ خانے میں ان کی رہائش سے گھر آتے آتے انھیں رات کے نو بج جاتے تب ہم لوگ کھانا کھاتے لیکن کوئی پابندی نہ تھی، میں پہلے بھی کھالیا کرتا تھا۔ ماموں جان کے پہلے صاحبزادے خلیق الرحمٰن بھی ذرا ہوش سنبھالنے پر کانپور آگئے اور اسکول میں داخل کردیے گئے، وہ بھی آگے چل کر میرے شریکِ حال ہوگئے۔

کام کا یہ نظام اس زمانے میں رہتا جب اسکول کے اوقات دس بجے سے چار بجے تک ہوتے۔ گرمیوں میں جب اسکول صبح سے ہوتا تو سویرے ناشتہ کرکرا کے اسکول روانہ ہوتے، دوپہر کو کانپور کی پگھلے ہوئے تارکول کی سڑکوں سے گزرتے ہوئے گھر آکر جلدی جلدی چولہا گرم کرکے کچھ تیار کرتے تب جاکر کھانا نصیب ہوتا، اس زمانے میں پڑھنے لکھنے کے لیے بھی کچھ بچا کھچا وقت مل جاتا تھا۔ چھٹیوں میں کپڑوں کی دھلائی گھر کی صفائی وغیرہ کا کام بڑھ جاتا۔ نتیجہ اس کا وہی ہوا جو ہونا تھا۔ جیسا کہ بیان کرچکا ہوں کلاس میں میری پوزیشن کم ہوتی چلی گئی، آٹھویں جماعت تک کم سے کم فرسٹ ڈویژن بنا ہوا تھا اس کے بعد بھی سیکنڈ ہوگیا۔

شام کو کھانا کھلا کر فارغ ہوتا تو پڑھنے بیٹھتا۔ چارپائی سے لگا کر اسٹول رکھتا اور اس پر لالٹین۔ کتاب کھولتا پھر مجھے کچھ خبر نہیں ہوتی۔ اس پر کئی بار مار بھی کھائی۔ بات یوں تھی کہ جب ماموں جان گھر میں داخل ہوتے اور مجھے لالٹین کے سامنے اوندھا دیکھتے تو کبھی کبھی غصہ ضبط نہ کر پاتے آخر وہ بھی دن بھر کے تھکے ہارے ہوتے تھے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ نیند آتی ہے تو لالٹین الگ رکھ کر سو جایا کرو تا کہ اتفاقاً جلنے کا اندیشہ نہ رہے لیکن ایسا تو اسی وقت ہوسکتا تھا جب میرا سونے کا ارادہ ہوتا یا مجھے خبر ہوتی کہ کب لڑھک گیا۔

جنگ کا زمانہ تھا ہر چیز کی قلت تھی، مٹی کا تیل بھی بڑی مشکلوں سے ملتا تھا اس لیے وہ بھی کم سے کم خرچ کرنے کی کوشش کی جاتی ایسا بھی ہوتا کہ مٹی کا تیل نہ ملنے پر سرسوں کے تیل سے دیا جلایا جاتا۔ ابھی اسی مکان کا تذکرہ جاری ہے، جس میں اصحابِ شیخپور کی آمد شروع ہوئی تھی اور ان کا یہ سلسلہ جاری ہی تھا۔

صدرالدین صاحب کے ایک منجھلے بھائی بدرالدین صاحب آ گئے جو اپنی وضع قطع سے پنجابی معلوم ہوتے تھے، شلوار اور لمبی قمیص اور کبھی کبھی طرّہ دار صافہ بھی۔ وہ فوج میں ملازمت کے دوران عراق میں مامور رہ چکے تھے۔ جنگ کے اختتام پر فارغ ہوئے تو کانپور چلے آئے۔ وہ آدمی بڑے ہوشیار اور محنتی تھے۔ فوج سے تعلق کی بنا پر کانپور ہوائی اڈے پر انھیں کوئی کام مل گیا لیکن شام کے فاضل وقت میں بھی کسی کارخانے میں کام کر کے کچھ کما لیتے تھے۔ ان بھائیوں کے علاوہ بھی بعض شیخپوری حضرات آئے، ان میں سے ایک ہماری ممانی جان کے بھانجے شاہ اختر الحق تھے جو آر ایم ایس میں ملازم تھے، انھوں نے اپنے چھوٹے بھائی معین الحق کو بلا لیا وہ بھی کوئی کام کرنے لگے۔ ان دونوں بھائیوں کی انگیٹھی الگ سلگنے لگی۔

جولائی ۱۹۴۴ء کی بات ہوگی، ہم لوگ گرمی کی چھٹیوں کے بعد واپس آئے تو اندرونِ خانہ صدرالدین صاحب کی اہلیہ تشریف فرما تھیں جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ مکان کے اندر ماموں جان کی آمد و رفت محدود ہوگئی، وہ باہری کمرے ہی میں رہتے۔ یہ ایک

تکلیف دہ صورت تو تھی ہی ماموں جان کے خیال سے کسی ان کہے معاہدے کی خلاف ورزی بھی تھی، اس کیفیت سے ایک ذہنی کھنچاؤ کا پیدا ہونا لازمی تھا لیکن حسب خواہ مکان ملنا کچھ آسان بھی نہ تھا، اس لیے چار و ناچار وہ برس اسی عالم میں گزرا۔

اس سے پہلے اسی مکان میں قیام کے دوران ہم لوگ شدید حالات اور سانحات سے بھی گزرے۔ ماموں جان دردِ گردہ میں مبتلا ہوکر سخت علیل ہوئے، اس وقت جو دوا علاج ممکن تھا ہوتا رہا، ان کے لیے پرہیزی کھانا پکانا ہوتا، گرم پانی کی تھیلی تیار رکھنی پڑتی، انھیں قے بہت ہوتی تھی اس کا طشت پھینکنا اور ضروری صفائی وغیرہ کرنا یہ سارے کام مہینوں جاری رہے، لیکن اللہ کے فضل سے وہ پوری طرح شفایاب ہوئے۔ ایک پوسٹ ماسٹر صاحب ان کے دوست تھے چمن گنج میں رہتے تھے وہ ہومیو پیتھ تھے اور صبح شام مطب کرتے غالباً انہی کے علاج سے فائدہ ہوا۔ ان کی اس علالت سے پہلے ہم لوگ ایک بڑی محرومی سے بھی دوچار ہوئے، یہ بات ۱۹۴۲ء کی ہے۔ گرمی کی چھٹیوں کے بعد جولائی میں ہم لوگ کانپور واپس ہی آئے تھے کہ نانی کی علالت میں شدت کی خبریں ملنے لگیں، وہی نانی جنھیں میں اماں کہتا تھا جن کی آغوشِ عاطفت میں میں نے پرورش پائی تھی پھر اسی جنتِ ارضی سے نکال کر کانپور کی سرزمین پر پھینکا گیا تھا۔ وسط اگست میں ہم لوگ یعنی میں اور ماموں جان پھر کوئریا پار گئے، دوسرے دن ماموں جان انھیں لے کر سمبھی چلے گئے جہاں چند یوم بعد وہ رحلت کر گئیں۔

اسی روز صبح سویرے خالہ جان ایک چوپالے میں کوئریا پار سے سمبھی روانہ ہوئیں، میں بھی ان کی ڈولی کے پیچھے ہولیا۔ ۲۵ میل کا پیدل سفر کہاروں کے ساتھ درپیش تھا۔ دن بھر چلتے رہے چار بجے کے قریب سمبھی کے جوار میں پہنچ چکے تھے۔ جب حجام اسی راستے آتا ہوا ملا جس نے اس سانحے کی الم ناک خبر سنائی۔ ہم گرتے پڑتے سمبھی پہنچے۔ اس کے چند دنوں بعد ہم لوگ کانپور واپس آ گئے۔ مہاتما گاندھی کی ''کوئٹ انڈیا'' تحریک جاری تھی اس لیے ریلوے لائنوں کی اکھاڑ پچھاڑ کی وجہ سے ٹرین کا سفر بھی کافی

مخدوش ہوگیا تھا چنانچہ ہم لوگ شاہ گنج والے روایتی راستے کے بجائے چھوٹی لائن سے براہ گورکھپور، لکھنؤ کانپور آئے۔

اس مکان کے دورانِ قیام میں ایک واقعہ کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے۔ جیسا کہ بیان کرچکا ہوں گھر میں ایک تناؤ کی کیفیت پیدا تھی، صدرالدین صاحب کے لواحقین کی دھاچوکڑی ماموں جان کی سنجیدہ طبیعت سے میل نہیں کھاتی تھی اس پر سے ناانصافی یا عہد شکنی کا احساس۔ یہ حضرات چھٹی کے دنوں میں تاش کھیلنے کے لیے کچھ وقت نکال لیا کرتے تھے۔ ایسا ہی ایک اتوار کا دن تھا، ماموں جان ناشتے کے بعد چمن گنج چلے گئے تو تاش کی چوکڑی جمی، لوگوں نے اس میں مجھے بھی شریک کرلیا۔ ماموں جان کے آنے کا تخلخہ تو لگا ہی ہوا تھا اس لیے خلیق کو دروازے پر تعینات کردیا کہ انھیں آتے دیکھ کر بتادیں۔ کھیل میں ذرا گرمی آئی تو خلیق میاں باہر دیکھنے کے بجائے اندر دیکھنے لگے، اتنے میں ماموں جان آپہنچے، تاش تو فوراً دبا دیا گیا، لیکن ماموں جان غصے میں آپے سے باہر ہورہے تھے۔ انھیں میرے تاش کھیلنے سے زیادہ اس بات پر غصہ تھا کہ صدرالدین صاحب نے مجھے اس کھیل میں کیوں شریک کیا غرضیکہ ان کا غصہ دوآتشہ ہوگیا۔ ایک لکڑی لے کر انھوں نے جو مجھے مارنا شروع کیا تو بے حد وحساب مارا۔ ان دنوں امتحان قریب رہا ہوگا اس لیے میں نے اپنا بستر زمین پر بچھا رکھا تھا، میں اسی بستر پر ناچ رہا تھا اور وہ بے تحاشا مارے جارہے تھے۔ مجھے بس اتنا یاد ہے کہ اس کے بعد مجھے نیند آگئی اور میں شام تک سوتا رہا۔ اب سمجھتا ہوں کہ میں دراصل بے ہوش ہوگیا تھا اور کسی نے یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ آخر اس لڑکے کا کیا حال ہے۔ ایک دوطمانچے خلیق کے حصے میں بھی آئے تھے۔

وہ مار ماموں جان کے ہاتھ کی آخری مار تھی، زمانے کی مار شروع ہونے سے پہلے۔ لیکن اس سلسلے میں ایک واقعہ اور بھی ہوا جس کی عقلی یا سائنسی بنیادوں پر کوئی تاویل نہیں کی جاسکتی، اس واقعہ کو جھٹلایا بھی نہیں جاسکتا۔

خالہ جان نے جو سمبھی میں تھیں ایک رات خواب میں دیکھا کہ میری والدہ جو

مجھے شیر خوار چھوڑ کر رحلت کر گئی تھیں آئی ہیں اور انتہائی برہمی اور برافروختگی کے عالم میں کہہ رہی ہیں ''حفیظ الرحمٰن کی یہ مجال! کل ہی بنیا آج ہی سیٹھ'' انھوں نے غصے کے عالم میں اسی جملے کو بار بار دوہرایا۔ خالہ جان گھبرا گئیں اور ان کی آنکھ کھل گئی۔ انھوں نے اسی روز ماموں جان کو خط لکھا اور اپنا خواب بیان کیا۔ ماموں جان نے جواب دیا کہ ان کی برہمی صحیح ہے میں نے رضوان کو مارا تھا۔ ماموں جان کے احساس ندامت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے پھر کبھی مجھ پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔ حالانکہ اپنے بچوں کے ساتھ اسی سختی سے پیش آتے رہے، اس کی وجہ ان کی بدمزاجی نہ تھی بلکہ سخت ڈسپلن تھی۔

بڑی بہن یعنی میری والدہ سے ماموں جان کے لگاؤ کا اندازہ اس بات سے ہوسکتا ہے کہ میری ماں کو مونگ پھلی بہت پسند تھی، ماموں جان (پڑھنے کے لیے) اعظم گڑھ جانے لگے تو ان سے انھوں نے فرمائش کی تھی کہ آنا تو مونگ پھلی لیتے آنا، لیکن بھائی بہن کی وہ آخری ملاقات تھی اور آخری فرمائش بھی۔ ماموں جان نے پھر کبھی مونگ پھلی نہیں کھائی۔

جولائی ۱۹۴۵ء میں نیا تعلیمی سال شروع ہونے پر ہم لوگ ناظر باغ سے افتخار آباد کے ایک مکان میں منتقل ہوگئے۔ نیچے مالک مکان خود رہتے تھے اوپر کے ایک حصے میں ہم لوگ رہنے لگے، دوسرے حصے میں ایک کرایہ دار تھے۔ لیکن ابھی صدرالدین برادرس کا کچھ تذکرہ۔

تقسیم وطن کے بعد سرکاری ملازموں کی بھی بڑے پیمانے پر دونوں طرف ہجرت ہوئی۔ سی او ڈی سے محمد شعیب صاحب کے چلے جانے کی وجہ سے مسلمان ملازمین اکثر و بیشتر چلے گئے۔ صدرالدین صاحب بھی ابتدائی دور میں ہی کراچی چلے گئے۔ بدرالدین صاحب نے ۱۹۴۹ء تک کانپور میں قیام کیا اس کے بعد ٹرین سے کھوکھراپار کے راستے کراچی کے لیے روانہ ہوئے انھیں اسٹیشن تک پہنچانے والوں میں میں بھی شامل تھا۔ وہ اپنا سارا سامان لاد کر لے گئے۔ زادِ سفر میں سات کنستر پانی تھا کہ اس راستے میں پانی کا قحط ہوا کرتا تھا۔ انھوں نے کراچی پہنچ کر روداد سفر تفصیل سے لکھی، سارا سامان اور نقدی بہ حفاظت لے کر پہنچے اس پر صرف ایک قالین کا صدقہ کرنا پڑا۔ ان کی بیوی گود میں ایک بچہ

لے کر گئی تھیں اس کو میں نے ۱۹۸۳ء میں لندن میں دیکھا، اپنے باپ سے بھی زیادہ تن و توش کے ساتھ برطانوی فوج کا ایک افسر تھا۔

بدرالدین صاحب کو کراچی میں فلپس کمپنی میں کام مل گیا تھا کچھ عرصہ بعد کمپنی نے کسی ٹریننگ کے لیے ان کو لندن بھیجا وہاں انھوں نے فورڈ موٹر کمپنی والوں سے سانٹھ گانٹھ کر لی اور اچھی ملازمت حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے پھر وہیں سکونت اختیار کر لی۔ میں ۱۹۸۳ء میں امریکہ جاتے ہوئے لندن میں مختصراً ٹھہرا تو ان کو ٹیلی فون کیا تھا، انھوں نے پہچاننے سے انکار کر دیا، جب میں نے کانپور کا حوالہ دیا تو بڑے زوروں سے قہقہہ لگایا اور دریافت خیریت کے بعد اپنے گھر بلایا۔ میں سفر کی تکان اور ٹھنڈ کی وجہ سے اس روز تو نہیں جا سکا اگلے دن گیا۔ ظاہر ہے وہ بہت خوش ہوئے۔ انھوں نے بیان کیا کہ ''میرے چار بیٹے ہیں، تین کی شادی ہو چکی ہے، ایک زیرِ تعلیم ہے۔ چاروں بیٹوں کے الگ الگ مکانات اور کاریں ہیں، میرے دو مکان ہیں اور دو کاریں — ایک سرکاری اور ایک ذاتی۔ انگریزوں نے ہندوستان پر ڈیڑھ سو برس حکومت کی اب انگریز میرے انڈر میں کام کر رہے ہیں، میں چھ ماہ سے میڈیکل چھٹی پر ہوں، قلب کی تکلیف ہے، آپریشن کا منتظر ہوں۔'' ان سے آخری ملاقات دسمبر ۱۹۹۲ء میں دہلی میں ہوئی جب وہ اپنے بیٹے کے ساتھ دہلی آئے تھے۔

افتخار آباد والے مکان میں میں نے دو سال گزارے یعنی نویں اور دسویں جماعت سے اسی مکان میں گزرے۔ آٹھویں جماعت تک مدرسہ فیض عام میں تھا، نویں میں کانیہ کبج کالج میں داخلہ ہوا اسی اسکول میں ماموں جان فارسی کے استاد تھے۔ فیض عام اسکول میں حمد و ثناء یا ترانۂ ہندی سے صبح کا آغاز ہوتا تھا، کانیہ کبج میں پنڈت جی کی پرارتھنا سے صبح شروع ہونے لگی۔ بی. کے. پانڈے صاحب پرنسپل تھے، اپنی پوری وضع قطع سے نہایت نفاست پسند اور نستعلیق آدمی معلوم ہوتے تھے، چوڑی دار پاجامہ، اچکن کے بٹن پوری طرح بند، نہایت نفیس سنہری کمانی کی عینک، سیدھا ستواں جسم اور نہایت رعب

دار رویہ۔ وہ کبھی کبھی دسویں جماعت میں انگریزی پڑھانے آجاتے۔ وہ زبان کے معاملے میں بھی نہایت سخت گیر تھے، کوئی لڑکا ذرا بھی غلط بولتا تو اس کی گرفت ضرور کرتے۔

نویں اور دسویں جماعتوں کے تین تین سیکشن تھے جو تقریباً ڈیڑھ ڈیڑھ سو طلبہ پر مشتمل تھے لیکن ان میں صرف نو مسلمان لڑکے تھے، وہ سب ایک ہی سیکشن میں تھے اور گڈریہ محل اور اطراف کے رہنے والے تھے جن کے لیے کرائسٹ چرچ کالج کچھ دور اور حلیم مسلم کالج بہت دور تھا۔ میرے محلے کے اکثر و بیشتر لڑکے حلیم کالج ہی میں جاتے تھے لیکن میرا داخلہ کانیہ کبج میں ماموں جان نے کرادیا تھا اس لیے کافی دور چلنا پڑتا تھا۔

وہ زمانہ کچھ ایسا تھا کہ آزادی کی تحریک پورے شباب پر تھی تو ہندو مسلم تنظیمیں بھی پوری طرح سرگرم تھیں لیکن اس کے باوجود کانیہ کبج کالج میں جو کہ برہمنوں کا کالج تھا اور مسلمان طلبہ معدودے چند تھے ہمیں کبھی کسی شکایت کا موقع نہیں ملا۔ اردو اور فارسی تعلیم کا باقاعدہ انتظام تھا۔ فارسی کے کلاس میں پندرہ سولہ طلبہ تھے اور اردو کے کلاس میں تقریباً چالیس۔ ان میں سے بیشتر ہندو اور چند سکھ شامل تھے، ایک دو مسلمان طالب علم جو شرارتی لیکن مقبول بھی تھے ایک شرارت یہ کرتے کہ انٹرول میں جب مانیٹر ناشتہ تقسیم کرنے لگتا جو عام طور سے خشک یا ترچنے کی کوئی قسم ہوتی لیکن کبھی کبھی کوئی بہتر چیز بھی ہوتی تو یہ لڑکے اپنا حصہ لینے کے بعد مزید مانگتے اور مانیٹر کو دھمکی دیتے کہ اگر نہیں دیا تو ہم بالٹی میں ہاتھ ڈال دیں گے۔ ان کی اس بات کا کوئی برا نہیں مانتا صرف شرارت سمجھتا اور مانیٹر کچھ اور دے کر گلا چھڑاتا۔

بعض ہندو لڑکے خود میرے بڑے اچھے دوست تھے۔ ان میں سے دو ایک اسکول کے بعد ہی دوسرے لڑکوں کو اکٹھا کرنے لگتے کہ شاکھا میں چلو، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ شاکھا کیا چیز ہے۔ ایک بے تکلف ساتھی سے جس کا نام برج بہاری واجپئی تھا میں نے کبھی کبھار پوچھا بھی کہ یہ شاکھا کیا ہے تو وہ کہتا کہ وہاں ڈرل ہوتی ہے، میں کہتا کہ مجھے بھی لے چلو تو وہ کترا جاتا اور آئیں بائیں شائیں کرکے نکل جاتا۔ دراصل وہ آر

ایس ایس کی شاکھائیں ہوا کرتی تھیں لیکن کالج کے احاطے میں اس کی اجازت نہیں تھی، اس لیے لڑکے کہیں اور جایا کرتے تھے۔

تاریخ کے ایک ٹیچر اگنی ہوتری جی تھے، مسلم دور کی تاریخ پڑھانے میں بھی وہ بہت احتیاط برتتے تھے، کبھی کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں کہتے بلکہ اگر کسی مسلمان لڑکے نے کوئی وضاحت چاہی تو بڑی خندہ پیشانی اور خوش اسلوبی سے اس کا جواب دیتے۔ کبھی کبھی ازراہِ مذاق کہتے کہ اللہ میاں اتنے ناانصاف نہیں ہوسکتے کہ تھوڑے سے مسلمانوں کو جنت میں بھیج کر باقی سارے انسانوں کو دوزخ میں ڈھکیل دیں۔ سب سے دلچسپ شخصیت اردو کے مولوی صاحب کی تھی۔ وہ بہت ضعیف ہوچکے تھے اور بھاری بھرکم بھی تھے، ان کے کرتے پاجامے پر پیک کے چھینٹوں سے گل بوٹے بنے ہوتے۔

ایک بار انسپکٹر آف اسکولس معائنے میں آئے ہوئے تھے، مولوی صاحب کے کلاس میں بھی آ گئے، اس وقت وہ شہر لکھنؤ سے متعلق رجب علی بیگ سرور کا مضمون پڑھا رہے تھے۔ انسپکٹر صاحب نے پوچھا ''شیر مال کیا ہوتا ہے؟ کوئی ہندو لڑکا بتائے؟'' جب کوئی لڑکا نہیں کھڑا ہوا تو ایک لڑکے کے سر پر گاندھی ٹوپی دیکھ کر جو شوقیہ یا شرارتاً پہن آیا تھا، انھیں اس پر ہندو ہونے کا گمان ہوا، اسی سے کہا کہ ''تم بتاؤ۔'' صاحبزادے نے شادی بیاہ میں تو شیر مال کھائی ہی ہوگی، بولے ''شیر مال ایک طرح کی روٹی ہوتی ہے۔'' مولوی صاحب نے کڑک کر لقمہ دیا: ''پوری بات کیوں نہیں کہتا کہ اس کے آٹے میں گھی شکر ملا کر دودھ سے گوندھا جاتا ہے۔'' انسپکٹر صاحب مسکراتے ہوئے کمرے سے باہر چلے گئے۔

انگلش کے ایک ٹیچر پانڈے جی تھے، ان کے بارے میں لڑکوں کو اتنا معلوم ہونا کافی تھا کہ انھوں نے تھرڈ ڈویژن میں ایم اے پاس کیا تھا۔ چنانچہ کبھی کبھی جب وہ بڑے انہماک سے پڑھاتے ہوتے کوئی لڑکا نہایت معصومیت کے ساتھ ان سے کسی ایسے انگریزی لفظ کی اسپیلنگ پوچھ بیٹھتا جس میں ذرا اے ای وغیرہ کا گھپلا ہو۔ پھر تو پانڈے جی زور سے ڈانٹتے کہ گھر سے ڈکشنری میں اسپیلنگ دیکھ کر کیوں نہیں آیا کرتے۔

انگریزی کے ایک اور استاد بھٹا چارجی تھے وہ ہندی میں جب سمجھانا شروع کرتے تو لڑکے ہنسنا شروع کر دیتے لیکن اس بندۂ خدا نے اس کا کبھی برا نہیں منایا۔ وہ کبھی کبھی اخلاقیات پر بھی لیکچر دیتے۔ ان کی ایک بات اب تک مجھے خوب یاد ہے۔ پہلے تو انھوں نے تمہید کے طور پر کہا تھا کہ میری بات ابھی تم لوگوں کی سمجھ میں نہیں آئے گی، لیکن جب وقت آئے گا تب یاد کرو گے۔ انھوں نے بالکل سچ کہا تھا ان کی وہ بات مجھے خوب خوب یاد آئی۔ انھوں نے کہا تھا کہ ''خوشی ہمیشہ اپنے گھر میں تلاش کرنا۔ اگر اپنے گھر میں خوشی نہیں ملی تو یاد رکھو دنیا میں کہیں نہیں ملے گی۔'' میں نے ایک زندگی گزاری، دنیا دیکھی، دنیا گھوما، مشاہدے کیے، میں اس بنگالی استاد کا قائل ہوگیا۔ وہ واقعی گرو تھا۔

افتخار آباد والے مکان میں ہم لوگوں نے دو برس گزارے۔ پہلے سال ممانی جان موجود تھیں اس لیے مجھ پر خانہ داری کا بار کم تھا، ہاں اسکول بہت دور جانا پڑتا تھا۔ دوسرے سال جبکہ میں دسویں جماعت میں تھا ممانی جان نہیں تھیں، خانہ داری کا بار بڑھ گیا لیکن ہم لوگ صرف تین نفر تھے، ماموں جان، خلیق اور میں۔ اسی زمانے میں کئی قابلِ ذکر اقارب کا آنا ہوا جن میں ابا اور ہماری وہ خالہ شامل تھیں جن کے یہاں آگے چل کر بنارس میں میں نے قیام بھی کیا، وہ صرف ماں کی طرح مانتی ہی نہ تھیں بلکہ میرا مستقبل بنانے میں ان کا کلیدی رول بھی رہا۔ امتحان کے قریب میں حسبِ معمول اپنا بستر فرش پر لگا چکا تھا کہ ایک اور رشتے کی خالہ خالو آ گئے، ان کے ساتھ خالو کی ایک بہن بھی تھیں۔ ان لوگوں نے ایک ماہ قیام کیا۔ خالو ہوائی اڈے پر وائرلیس میکانک تھے لیکن اپنے والد کے اصرار کی بنا پر ملازمت سے استعفیٰ دے کر گھر جانے کی تیاریوں میں تھے۔ عبوری وقفے کے دوران انھوں نے ہمارے گھر قیام کیا۔ ماموں جان کے سخت ڈسپلن کی وجہ سے یہ عرصہ مجھے پر سخت گزرا، میرا بستر اوپر بھیج دیا گیا۔ جہاں صرف ایک برامدہ تھا، وہیں میں نے اپنا بستر ڈال دیا اور خلیق کا بستر بھی۔

محلے کے بازار میں ایک حلوائی کی دکان تھی، وہ صبح کو چھوٹے بڑے دو سائز کے

کلہڑوں میں گاڑھا پکا ہوا دودھ بھر کے اس میں جلیبی بھگوئے رکھتا۔ چھوٹا کلہڑ تین آنے کا ہوا کرتا تھا لیکن دو سال کے دوران سارے موسم گزر گئے روز صبح کو میں للچائی ہوئی نظروں سے ان کلہڑوں کو دیکھتا ہوا گزر جاتا لیکن میرے پاس تین آنے پیسے کبھی نہیں ہوئے کہ میں وہ شوق پورا کر لیتا نہ کبھی کسی سے اس کا اظہار کیا۔ اب دودھ ہضم ہی نہیں ہوتا۔

انہی دونوں برسوں کی درمیانی گرمی کی چھٹیوں میں میری کل کائنات لٹ گئی۔ ماموں جان ہائی اسکول کے اگزامنر تھے فارسی کی کاپیاں جانچنے کے لیے ان کے پاس آئی تھیں۔ وہ نمبر جوڑ کر کاپیوں پر لکھ دیتے۔ میرے ذمے دوبارہ جوڑ کر ملانے کا کام کیا اور ایک پیسے میں دو کاپی اس کی اجرت مقرر کی۔ اس طرح میرے کچھ پیسے بنے تو اس سے میں نے لوہے کا ایک بکس خرید لیا۔ گرمی کی چھٹیاں ہوئیں تو اپنا کل اثاثہ اسی میں رکھ کر گھر چلے۔ اثاثہ کیا تھا چند درسی کتابیں اور وہ خوبصورت کتابیں جو وقتاً فوقتاً مجھے انعام میں ملی تھیں اور درجہ اول سے درجہ نہم تک سارے امتحانوں کے نتائج۔ ابتدائی نتائج بہت اچھے تھے اس لیے وہ مجھے بہت عزیز تھے۔ اس کے علاوہ دو جوڑے کپڑے تھے۔ بس یہ تھی میری ساری کائنات۔ جنگ کی وجہ سے ٹرینوں کی حالت بہت خراب تھی، بھیڑ کا یہ حال کہ آدمی پر آدمی سوار اور سب بدحواس۔ اسی افراتفری میں شاہ گنج اور لکھنؤ کے درمیان میرا سوٹ کیس لے کر کوئی کھسک گیا۔ اس کو مال دیکھ کر پچھتاوا ضرور ہوا ہوگا۔

جس شہر میں میرے شعور نے آنکھ کھولی تھی، اس میں تقریباً دس برس کارخانوں کے مزدوروں کے موج در موج رواں دواں، کارخانوں کی چمنیوں کو دھواں اگلتے، چمڑا منڈی اور بیچ باغ کی گلیوں کو اپنی سڑاند میں ڈوبتے چھوڑ کر ۱۹۴۶ء میں دبے پاؤں کوئر یا پار چلا آیا۔

قیام کانپور کا یہ پہلا باب تھا، ابھی ایک باب اور باقی ہے لیکن ایک بات ابھی کہہ دینے میں کچھ مضائقہ نہیں کہ ابتدائی زندگی کی مشقتیں دیکھنے اور سننے میں ناگوار ضرور معلوم ہوتی ہیں لیکن وہی کردار سازی میں ایک مستحکم بنیاد کی حیثیت رکھتی ہیں۔

مولوی حفیظ الرحمٰن ایمنؔ شہابی (۱۹۰۹ء تا ۱۹۹۳ء)

میری تصنیف ''ہمارے گاؤں ہمارے لوگ'' میں سمبھی اور کوئریا پار کی شخصیات کے تذکرے ہیں۔ ان میں ماموں جان کا تذکرہ شامل نہیں ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہوئی کہ میں ان کے متعلق ایک الگ تصنیف کا ارادہ رکھتا تھا اس لیے مختلف مواقع پر لکھے ہوئے جو مضامین موجود تھے انہی کو مرتب کر کے ایک کتاب کی شکل دے دی۔ لیکن جب ماموں جان کے بارے میں کسی تصنیف پر غور کیا تو اس راہ میں سب سے بڑی دشواری یہ تھی کہ ان کے کلام کے نمونے کے طور پر میرے پاس ایک شعر بھی نہیں تھا اور اس کے بغیر کوئی تصنیف بے معنی ہوتی۔ بچپن سے ماموں جان کے ساتھ رہنے کے باوجود ان کی ادبی کاوشوں سے اتنا بے خبر رہنا نہایت حیرت انگیز ہے لیکن یہ حقیقت ہے۔ انھوں نے خوردوں کو اس سے آگاہ کرنا غیر ضروری سمجھا اور ہم اس کو جاننے کی جسارت نہیں کر سکتے تھے۔ بس اتنا معلوم تھا کہ وہ حلقہ ادبیہ کی نشستوں میں جایا کرتے تھے۔ وہ بھی کب اور کہاں ہوا کرتی تھیں کبھی نہیں معلوم ہوا۔ ان کے ملنے والوں میں صرف دو تین شعراء اتفاقاً کبھی ہمارے گھر آجاتے تھے۔

ماموں جان کی شخصیت نہایت تہ دار اور گلیم پوش تھی۔ بالکل صوفی منش ہونے کے باوجود خدمت خلق کا جذبہ رکھتے تھے اور ان کا یہی عمل ایسا تھا جو ہزار چھپائے نہیں چھپتا تھا۔ کانپور کارخانوں اور مزدوروں کا شہر ہونے کے باوجود وہاں ساری عصری تحریکیں پورے شدومد سے جاری تھیں، سیاسی، ادبی، دینی، علمی اور خدمتِ خلق کی بھی۔ انہی میں سنٹ جانسن ایمبولینس اور اسکاؤٹس کی تحریکیں بھی شامل تھیں جن کے روح و رواں گورنمنٹ ہائی اسکول کے ایک ٹیچر شیر محمد خاں تھے۔ یہ تنظیمیں ہر طرح کے جلسہ جلوس، میلے ٹھیلے میں فعال ہوجاتیں۔ ان کے والنٹیئر بھیڑ بھاڑ میں لوگوں کی مدد کرنے کے لیے موجود ہوتے، زخمیوں کی مرہم پٹی بھی کرتے۔ ان موقعوں پر ماموں جان خاکی وردی اور اس زمانے میں پہنا جانے والا اونچا خاکی ہیٹ نکال کر ایک اخبار میں لپیٹ کر خاموشی سے نکل جاتے اور تنظیم کے مرکز پر جا کر اسے پہن لیتے اور اپنی وضعداری کی مستقل نمائندہ

شیروانی، ٹوپی اور چوڑی موری کا پاجامہ اسی کاغذ میں لپیٹ کر رکھ دیتے۔ بوٹ ان کی وضعداری میں شامل تھا اس لیے اسے بدلنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ آخر میں اپنی اصلی حالت میں خاموشی سے واپس آجاتے۔ اس کارروائی میں شاید میری شرکت پر بھی انہیں کوئی اعتراض نہیں تھا چنانچہ اس کی تیاری کے لیے فرسٹ ایڈ کی ٹریننگ لینے کی مجھے بھی اجازت تھی۔ فیض عام اسکول میں وقتاً فوقتاً اس کا اہتمام شیر محمد خاں اور دو ایک ڈاکٹروں کی نگرانی میں ہوا کرتا تھا۔ میں نے بھی اس کے تین کورس کیے جس کے لیے مجھے سرٹیفیکٹ دیے گئے لیکن عملاً کسی موقع پر شرکت کا مجھے کوئی موقع نہیں ملا۔

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں کسی تصنیف کے متعلق ذہنی کشمکش میں تھا کہ معلوم ہوا کہ ماموں جان کے سب سے چھوٹے بیٹے مولوی فیض الرحمٰن ان سے متعلق کوئی تصنیف کررہے ہیں۔ اس سے مجھے ایک گونہ اطمینان ہوگیا کہ وہ ہر طرح اس کے اہل ہیں اور یقین تھا کہ ماموں جان کے آثار بطور وراثت بھی ان کے پاس موجود ہوں گے چنانچہ یہ فرض بحسن وخوبی انجام پاجائے گا۔ انھوں نے ''معارفِ ایمن'' کے عنوان سے ایک کتابچہ ۲۰۱۴ء میں شائع کیا اس میں ماموں جان کے ابتدائی حالات مختصراً بیان کرنے کے بعد شمس الرحمٰن فاروقی، پروفیسر علی احمد فاطمی اور فیض الرحمٰن کے کلام ایمنؔ پر تبصراتی مضامین شامل ہیں۔ یہ ناکافی ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اتنا بھی میرے بس کا نہیں تھا۔ کچھ نمونۂ کلام بھی شامل ہے۔ مولوی فیض الرحمٰن نے ماموں جان کے اردو اور فارسی کلام کا مبسوط انتخاب شائع کرنے کا ارادہ ظاہر کیا ہے، ہماری دعائیں اور نیک خواہشات ان کے ساتھ ہیں۔

قمر الزماں مبارکپوری نے اپنی تصنیف ''سخنورانِ اعظم گڑھ'' میں جو ۲۰۱۵ء میں شائع ہوئی مولوی حفیظ الرحمٰن ایمنؔ کا تذکرہ بھی شامل ہے۔ اس میں موصوف کے بچپن اور ابتدائی عمر کے واقعات شامل ہیں چونکہ وہ مولوی قمر الزماں صاحب کے ہاں مبارکپور جایا کرتے تھے اس لیے ظاہر ہے کہ انھوں نے جو کچھ ایمنؔ صاحب کے بارے میں لکھا ہے بالکل مصدقہ ہے اور یہ معلومات ہم لوگوں میں سے کسی کو نہیں تھیں۔ مختصراً وہ لکھتے ہیں کہ:

''مولوی حفیظ الرحمٰن صاحب کا نام مولوی غلام عباس مبارکپوری نے رکھا ہے۔ اس سے مادۂ تاریخ ۱۳۲۷ھ نکلتا ہے۔ یہ سمبھی میں اہلِ علم گھرانوں کے اتالیق تھے۔ ایمنؔ کی بسم اللہ بھی انھوں نے ہی کرائی تھی۔ سمبھی کے پرائمری مکتب میں پڑھنے کے بعد چندولی، ضلع بنارس اپنے عزیز کے یہاں رہ کر ۱۹۲۴ء میں مڈل پاس کیا۔ ۱۹۳۱ء میں شبلی ہائی اسکول، اعظم گڑھ سے ہائی اسکول کی ڈگری لی، کانپور میں انٹرمیڈیٹ اور منشی کامل اور اردو اعلیٰ قابلیت کے امتحان میں کامیابی حاصل کی۔ ۱۹۳۲ء میں مدرسہ فیض عام کانپور سے وابستہ ہوکر تدریسی مشغلہ کا آغاز کیا۔ ۱۹۳۶ء میں کے کے کالج، کانپور میں بحیثیت اردو پرشین لکچرر تقرر ہوا۔ ۱۹۵۲ء تک اس عہدہ پر فائز رہے۔''

''ایمنؔ کی شاعری کا پہلا دور ۱۹۳۲ء سے پہلے کا ہے۔ اس دور میں ان کا تخلص احقرؔ ہوا کرتا تھا۔ اس زمانے میں زیادہ تر قیام سمبھی میں تھا۔ مولانا غلام عباس صاحب جب تشریف لاتے تھے تو ہر ہفتہ نشست ہوجایا کرتی تھی۔ مصرعہ طرح دیے جاتے تھے۔ مولانا غلام عباس کی شعرخوانی اور شاباشی کی وجہ سے ۱۹۲۴ء میں آغاز سخن کیا۔ اس زمانے میں غزلیں کہتے تھے۔ جب کانپور گئے تو احقرؔ تخلص ترک کرکے ایمنؔ ہوگئے۔''

قیامِ جونپور:

میرے بہنوئی شاہ محمد امین الدین صاحب مرحوم کلکتہ میں ایک فروٹ فرم کے منیجر تھے۔ چونکہ بہن وہیں تھیں اس لیے ۱۹۴۵ء کی گرمی کی چھٹیوں میں کلکتہ جاکر گھوم آیا تھا۔ اس کے بعد بھائی صاحب گھر آئے تو ابا نے ان سے کچھ کام دھندے کا ذکر کیا ہوگا کیونکہ بچے بڑے ہورہے تھے، اخراجات بڑھ رہے تھے، جو زمین کی آمدنی سے پورے نہیں ہوسکتے تھے۔ بھائی صاحب نے ابا سے کہا کہ جونپور چلے جائیں وہاں سبزی منڈی کے ایک آڑھت دار حبیب صاحب کے یہاں قیام کریں میں فرم کی طرف سے پیشگی رقوم بھیجتا رہوں گا اور آپ ان کی فرم کی طرف سے اپنی نگرانی میں خربوزہ اور آم جس کی فصل اس وقت تھی کلکتہ بھیجتے رہیں، نفع میں آپ دونوں برابر کے شریک ہوں گے۔ ابا جونپور

چلے گئے وہاں حبیب صاحب اور ان کے آدمیوں نے ابا کا بڑا احترام کیا اور ان کی آسائشوں کا ہر طرح خیال رکھا۔ اگلے برس ہائی اسکول کے امتحان سے فراغت کے بعد میں بھی وہاں پہنچ گیا اور اپنے نام سے الگ مال کلکتہ بھیجنے لگا۔ میرے شریک کار جونپور سے قریب ہی ظفر آباد کے ایک پنڈت جی تھے۔

روزانہ کا معمول یہ تھا کہ ایک بیل گاڑی جو مستقلاً طے تھے رات میں تین بجے کے قریب آجاتی اور میں جاکر اسی میں سو جاتا۔ میرے ساتھ ایک آدمی اور ہوتا۔ گرمیوں کی صبح پانچ بجے کے قریب ہوتی اس وقت ہم لوگ ظفر آباد کے جوار میں ہوتے وہاں بیل گاڑی سڑک سے اتر کر گاؤں کی طرف چل پڑتی۔ ایک ہی بیل تھا اور اتنا سدھا ہوا تھا کہ ٹھیک جگہ پر پہنچ کر رک جاتا، بس اونگھتا ہوا گاڑی بان جاگ جاتا۔ جن کاشتکاروں کو پیشگی رقوم دی ہوئی ہوتیں وہ خربوزے توڑ کر اپنے کھیتوں کے کنارے انبار کیے ہوئے ہوتے اور ہمارے ساتھ کا آدمی خربوزے تول کر مزدوروں سے گاڑی پر لدواتا۔ تقریباً ۱۳-۱۴ من یعنی پانچ چھ کوئنٹل خربوزہ لاد کر ہم لوگ دس بجے کے قریب جونپور واپس آجاتے وہاں خربوزے ٹوکروں میں بھر کے کوئی ۲۵-۳۰ ٹوکرے ہر روز دہرہ دون ایکسپریس میں کلکتہ کے لیے لاد دیے جاتے جہاں اگلے دن صبح وہ نیلام ہوجاتے۔ بازار کے اتار چڑھاؤ کے مطابق نفع نقصان ہوتا۔

ہائی اسکول امتحان کا رزلٹ آیا۔ میں سیکنڈ ڈیویژن میں پاس ہوگیا تھا۔ اس کے بعد ہی میں نے تلاش معاش میں کلکتہ کی راہ لی۔

☆☆☆

کلکتہ میں ورود

جون ۱۹۴۶ء کے آخری ہفتے میں میں عازم کلکتہ ہوا۔ بنارس سے وہی دہرہ دون ایکسپریس پکڑی جو مجھے کانپور کے سفر میں شاہ گنج سے لکھنؤ تک لے جایا کرتی تھی اور جونپور کے خربوزے کلکتہ پہنچایا کرتی تھی۔ اس زمانے میں ٹرینوں میں سوار ہونا اور سفر کرنا جوئے شیر لانے سے کم دشوار نہ تھا لیکن ایک آسانی ضرور تھی وہ یہ کہ ٹرین کی کھڑکیوں میں سلاخیں نہیں لگی ہوتی تھیں اس لیے ان کھڑکیوں میں سے بھی ڈبوں میں گھسا جا سکتا تھا۔ میں دبلا پتلا تھا اس لیے دروازے پر دھینگا مشتی کرنے کی بہ نسبت کھڑکی سے ڈبے میں گھسنا میرے لیے آسان تھا۔ چنانچہ اسی حکمت سے میں دہرہ دون ایکسپریس کے ایک ڈبے میں گھسنے میں کامیاب ہوگیا لیکن شام کو بنارس میں جس جگہ اور جس طرح بیٹھ گیا تھا اگلے دن صبح کو ہوڑہ پہنچنے تک اسی حال میں بیٹھا رہ گیا۔ میرے دونوں پاؤں کافی سوج گئے تھے، لیکن ہوڑہ پہنچ گیا۔ ایک سال قبل گرمی کی چھٹیوں میں آچکا تھا اس لیے بھائی صاحب کی فرم اور مکان سب دیکھا بھالا تھا مچھوا بازار پھل منڈی میں فرم اور منشی صدرالدین لین میں رہائش۔

اس زمانے میں بنگال میں مسلم لیگ کی حکومت تھی اور حسین شہید سہروردی اس صوبے کے وزیر اعظم تھے۔ کلکتہ شہر کے اینگلو انڈین اور کرسچین آبادی والے علاقوں پر تو

انگریزوں کی چھاپ تھی لیکن، کئی محلے اور خاصے بڑے علاقے مسلم آبادی کے تھے جن پر مسلم تہذیب اور سیاست کی گہری چھاپ تھی۔ ان میں جنوب کے مٹیا برج، خضر پور وغیرہ کے علاوہ شہر کا قلبی اور مرکزی علاقہ جو چونا گلی سے لے کر کولوٹولہ، زکریا اسٹریٹ، پھل منڈی اور کیلا بگان تک پھیلا ہوا تھا اور شمال میں راجہ بازار اور بلگچھیا تک شامل تھے۔

پھل منڈی پر مسلم پیشاوری برادری کا غلبہ ہی نہ تھا بلکہ تقریباً تازہ پھلوں اور خشک میوے کا سارا کاروبار انہی کے ہاتھ میں تھا، فرموں کے مالکان پیشاوری تھے اور تمام کارندے بہار اور مشرقی یوپی کے۔ ان دونوں کے درمیان بڑا اچھا تال میل تھا اور دھندھا خوب زوروں سے چل رہا تھا۔ کاروباری بالعموم خوشحال تھے اس لیے کافی وقت عیش و آسائش اور تفریحات میں بھی صرف کرتے تھے لیکن اس کے ساتھ ہی فیاضی بھی ان کی ایک خصوصیت تھی۔ کلکتہ اور بنگال تو درکنار ملک کے دوسرے حصوں میں بھی بیشمار مسلم ادارے ان کے فیوض کے طفیل چل رہے تھے۔ خود کلکتہ میں اسلامیہ ہسپتال، مسلم یتیم خانہ، محمڈن اسپورٹنگ کلب اور خلافت کمیٹی کے لیے سرمایہ کی فراہمی میں ان کا بڑا حصہ تھا۔ مسلم اسکول اور مدارس ان کے علاوہ تھے۔ مزید برآں میں نے خود دیکھا کہ یہ لوگ جمعرات اور جمعہ کو جھولیوں میں بھر کر پیسے سائلوں کو بانٹ دیتے۔

اس فیاضی کے کئی دور رس نتائج سامنے آئے۔ ایک تو یہی کہ یہ محلے بھکاریوں کی آماجگاہ بن گئے، بہت سارے اینچی اور مدکچی بھی جابجا اکٹھا ہوگئے، انھیں زکریا اسٹریٹ اور اطراف کے ہوٹلوں سے کچھ نہ کچھ کھانا اور کچھ پیسے بھی مل جایا کرتے، دوسرا نتیجہ یہ نکلا کہ پھل منڈی کا سرمایہ اکٹھا ہوکر کسی بڑے ادارے یا صنعت کی صورت نہیں اختیار کرسکا یعنی ایسا بادل جس کی رِم جھم سے سبزے شاداب رہے لیکن کوئی دھارا یا سیلاب نہیں بنا سکا جس سے وسیع علاقے سیراب ہوکر زرخیز ہوتے۔ پھر ان بادلوں کی پھوار وقت کی ریت میں جذب ہوگئی۔ سبزہ زار بے آب وگیاہ اور ویران ہوگئے۔ تناور درخت تھے ہی نہیں جو خشک موسم یا بادِ سموم کا مقابلہ کرتے۔ اس تجارت پیشہ قوم کا جو وقت اور سرمایہ

کاروباری مصروفیات اور فیاضانہ خصائل سے بچ رہتا، تاش، شطرنج، گنجفہ، ریس، سنیما اور دیگر تفریحات کی نذر ہوجاتا۔ رہی سہی کسر تقسیمِ وطن نے پوری کردی۔

میں اس زمانے کی بات کررہا ہوں جب کلکتہ کی آب وتاب شباب پر تھی، سارے شہر کی سڑکیں علی الصباح اور شام کو چار پانچ بجے دھلی جاتی تھیں، غالبًا اس اعتبار سے کلکتہ اپنی نوعیت کا واحد شہر تھا، جہاں سڑکوں کی دھلائی کے لیے دریا کے پانی کی فراہمی کا ایک مکمل نظام تھا۔ کارپوریشن کا پورا عملہ اس کام پر مامور تھا، فائر بریگیڈ جیسے واٹر ہوز تھے جن کے سروں پر پیتل کی لمبی نلکیاں لگی ہوتیں ان کی مدد سے دور دور تک پانی کا چھڑکاؤ اور دھلائی ہوتی۔ اب وہی شہر ہے جس کے چہرے پر ہفتوں جھاڑو نہیں پھرتا۔ جس نے کلکتہ کا وہ روپ دیکھا ہو وہ اب اسی شہر میں کوڑے کے انبار اور تعفن کا تصور نہیں کرسکتا۔ کلکتہ والوں کو بڑا فخر تھا ہوڑہ پل پر جو ایشیا میں واقعی لاثانی تھا۔ کلکتہ آنے والے اسے دیدۂ حیرت سے دیکھتے، کلکتہ کے ٹرام وے نظام نے بھی اس کو شمالی ہند کے شہروں میں ممتاز کررکھا تھا۔ اب اہالیانِ کلکتہ کو زمین دوز ریل پر بھی فخر ہے اور بنگال کو اصرار ہے کہ ہندوستان میں ہر اچھے اور نئے کام کا آغاز اسی دھرتی سے ہوتا ہے جس کا بہترین نمائندہ کلکتہ ہے۔

۱۹۴۶ء میں جب میں کلکتہ پہنچا تو پھل منڈی کے عقب میں منشی صدرالدین لین کے ایک مکان میں بھائی صاحب رہتے تھے جس کی زیریں منزل میں مسلمان مارواڑی رنگریز رہتے تھے اور بالائی منزل کے ایک گوشے میں فرم کے مالک ''میاں صاحب'' رہتے تھے جو نہایت شریف النفس انسان تھے اور بھائی صاحب کو بیٹے کی طرح مانتے تھے اور اسی بالائی منزل کے دوسرے گوشے میں انھیں رہائش دے رکھی تھی۔ گھر میں بہن بہنوئی کے علاوہ ایک لڑکا گھریلو کام کاج کے لیے ملازم تھا، اس مختصر آبادی میں میرا اضافہ ہوگیا۔

اگلے دن سے ہی مجھے کام کی دھن ہوئی۔ اس زمانے میں کلکتہ کارپوریشن کے میئر محمد عثمان صاحب تھے جو مسلم پریسڈنسی ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے، نہایت سادہ مزاج

اور مسلمان دوست، ان کے چچا سے بھائی صاحب کے مراسم تھے اسی حوالے سے بھائی صاحب نے مجھے ان کے پاس لے جانے کی سوچی۔ چنانچہ ایک دن صبح صبح بھائی صاحب مجھے لے کر اسکول کی اس عمارت میں گئے جو زکریا اسٹریٹ میں اپنی مسخ شدہ حالت میں اب بھی موجود ہے، اوپر اپنے کمرے میں موصوف موجود تھے، ان سے ملاقات کے لیے کسی اجازت کی ضرورت نہ تھی ہم لوگ بلا تکلف اندر گئے، بھائی صاحب نے اپنا تعارف کرایا اور مدعا بیان کیا۔ موصوف نے ایک نظر مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھا، ابھی ریخیں بھی نہیں نکلی تھیں، پوچھا: ''تمہارا پڑھنے میں جی نہیں لگتا؟'' میں نے عرض کیا: ''حالات اس کی اجازت نہیں دیتے۔'' انھوں نے اسی وقت ایک خط سٹی کالج کے پرنسپل کو لکھا اور مجھ سے کہا کہ وہاں شام کے کلاس میں داخلہ لے لو، فیس معاف ہوجائے گی، مجھے اپنا پتہ دے جاؤ۔ کارپوریشن میں کام کی کوئی صورت نکلی تو خبر کردوں گا۔ وہاں سے ہم لوگ سٹی کالج پہنچے جو مرزا پور اسٹریٹ میں واقع تھا اور زکریا اسٹریٹ سے کچھ زیادہ دور نہ تھا۔ پرنسپل صاحب سے ملے اور وہ خط پیش کیا، انھوں نے اسی وقت کلرک کو طلب کیا اور داخلہ فارم مکمل کرانے کی ہدایت کی۔ اس فارم کی خانہ پری کے بعد داخلہ فیس وغیرہ کے طور پر غالباً ۶۰/روپیہ دینا تھا وہ بھائی صاحب نے دے دیا اور اگلے دن سے شام کو کالج جانے لگا۔ جلد ہی رمضان شریف کا مہینہ آ گیا۔

رمضان کی ۱۸/تاریخ کو اگست کی ۱۶/تاریخ تھی اور جمعہ کا دن تھا جو مسلم لیگ نے ڈائرکٹ ایکشن منانے کے لیے تجویز کیا تھا۔ یوں تو پورے ملک میں جلسے جلوس ہوئے ہوں گے لیکن بنگال میں مسلم لیگ کی حکومت ہونے کی وجہ سے وہاں کچھ زیادہ ہی اہتمام کیا گیا تھا جو قیامت کا اہتمام ثابت ہوا۔ پروگرام کے مطابق شہر و مضافات کے مختلف علاقوں اور ہوڑہ سے آنے والے جلوسوں کو کلکتہ کے منومنٹ میدان میں اکٹھا ہونا تھا لیکن کئی علاقوں میں ہیجانی کیفیت پیدا ہوچکی تھی اور کہیں کہیں ایک روز قبل ہی شام کو ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اینٹ پتھر بھی چل چکے تھے۔ ۱۶/اگست کی صبح کو ہوڑہ

سے آنے والا جلوس ہوڑہ پل سے گزر کر جونہی بڑا بازار کی حدوں میں داخل ہوا اس پر کچھ اینٹیں آ کر گریں، جیسا کہ سیاسی جلسے جلوس میں ہوا کرتا ہے، بس ایک فساد کی صورت پیدا ہوگئی اور جمعہ کی نماز کا وقت آتے آتے اس آگ کے شعلوں نے سارے شہر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ پھل منڈی کی مسجد میں جمعہ کی نماز کے بعد ہم لوگ باہر آئے تو دیکھا کہ منڈی کے چوراہے پر مسلمانوں کی بھیڑ اچھل کود کر رہی ہے اور چیت پور روڈ کے کنارے ہندوؤں کے ہجوم کا وہی عالم۔

سارے شہر میں زبردست کشت وخون، آتش زنی اور لوٹ مار جاری تھی لیکن تین دن تک پولیس کا کہیں پتہ نشان نہ تھا۔ اس کے بعد شہر میں مارشل لا نافذ کر دیا گیا اور فوج پورے جاہ وجلال کے ساتھ شہر پر نازل ہوئی۔ یہ ہندوستان کی عالمی جنگ والی فوج تھی جو تھوڑے ہی دنوں پہلے اختتامِ جنگ پر بارکوں میں واپس آئی تھی۔ اس نے پوری شدت کے ساتھ شہر کو اپنی گرفت میں لے لیا، گھر گھر تلاشیاں شروع ہوگئیں۔ جہاں کہیں لوٹ کا مال برآمد ہوتا حتیٰ کہ کسی کے گھر میں نئے سامان پر بھی لوٹ کا شبہ ہوتا تو اس کو گرفتار کر لیا جاتا، کرفیو کے اوقات میں سختی سے نفاذ ہوتا، فوجی گولی چلانے میں ذرا تامل نہیں کرتے۔ اسی طرح کے ایک واقعہ میں مسلم لیگ کے ترجمان روزنامہ عصر جدید کے ایڈیٹر مولانا عبدالجبار وحیدی دفتر کی سیڑھیوں پر ہی کسی اتفاقی گولی کا شکار ہو کر جاں بحق ہوگئے۔

پہلے تین دنوں تک تو بالکل نراج کی کیفیت تھی، دونوں فرقوں کے لوگ بے تحاشہ قتل وغارت گری کر رہے تھے، مکانوں، دکانوں کو لوٹ کر ان میں آگ لگائی جا رہی تھی دیکھتے دیکھتے سارے شہر کا چہرہ داغدار ہوگیا، فضا شعلوں اور دھوئیں سے مکدر ہوگئی، نعروں، گالیوں، چیخ پکار اور اینٹ پتھر کی بوچھار کے شور سے کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی تھی۔ سڑکوں پر لاشیں بکھری پڑی تھیں کوئی ماتم گسار تو کیا ہوتا انھیں اٹھانے والا بھی کوئی نہ تھا، سڑک کے نیچے بڑے نالوں میں جابجا لاشیں ٹھونس دی گئی تھیں، جس کی وجہ سے متعفن پانی سڑکوں پر ابلنے لگا اور کوڑے کرکٹ اور جلے ہوئے سامانوں کے الاؤ میں

جذب ہونے لگا۔ کوئی ہفتہ بھر بعد سڑکوں پر پڑی ہوئی لاشوں کی کیفیت ایسی نہ تھی کہ کوئی انھیں اٹھاتا۔ چنانچہ فوجیوں کی نگرانی میں مردہ جانور ڈھونے والی گاڑیاں لائی گئیں اور کرین سے اٹھا اٹھا کر لاشیں ان میں لادی گئیں، پھر ان کا جو بھی حشر ہوا ہو۔

جب فوج نے گھر گھر تلاشی شروع کی تو لوٹ کا مال لے جانے والوں نے سارا مال سڑکوں پر پھینکنا شروع کیا اس طرح سڑکوں پر کپڑوں، فرنیچر وغیرہ کے ڈھیر لگ گئے، لوگ ان انباروں میں آگ لگا دیتے۔ عجب تباہی اور بربادی کا منظر تھا۔

ہم لوگ منشی صدالدین لین کے مکان میں رہ رہے تھے۔ میاں صاحب نے قریب ہی سید صالح لین میں ایک مکان لیز پر لے لیا تھا اور اس کی ضروری اصلاح اور مرمت کے بعد فساد شروع ہونے سے کچھ پہلے وہاں منتقل ہو گئے تھے۔ بھائی صاحب سے بھی کہہ رہے تھے کہ اس مکان کی بالائی منزل پر ایک طرف میں ہوں دوسری طرف تم آ جاؤ لیکن وہ آنا کانی کرتے رہے۔ ۱۶/اگست کی صبح کو جب فضا خراب ہوئی تب بھی میاں صاحب نے تاکید کی کہ وہ گلی خطرناک ہے، تم لوگ وہاں سے نکل آؤ، لیکن بھائی صاحب نے اس روز بھی سنی اَن سنی کر دی۔ شام تک حالات بہت خراب ہو گئے۔ ہم لوگوں کی بلڈنگ میں نیچے اوپر رہنے والے سارے لوگ بھاگ نکلے پھر تو اس بلڈنگ کے ایک کمرے میں بھائی صاحب، آپا اور میں تین نفوس رہ گئے۔ نیچے گیٹ کے بڑے بڑے دو دروازے تھے وہ بند کر دیے گئے۔ پھر تو رات بھر ایسی قیامت برپا رہی کہ الامان والحفیظ۔ ہر طرف شعلے لپکتے دکھائی پڑتے تھے اور دھوئیں کے مرغولے، شور اس قدر کہ گھر کے اندر کچھ سنائی نہیں پڑتا تھا۔ آپا رات بھر بدحواس قرآن سینے سے لگائے ہوئے ٹہلتی رہیں، میں بھی کروٹیں بدلتا رہا لیکن بھائی صاحب اطمینان سے سوتے رہے۔ ان کے اعصاب واقعی فولادی تھے۔ وہ تو خیر ہوئی کہ بلوائیوں کا کوئی ہجوم اس مکان تک نہیں پہنچ سکا، تین نکڑوں پر محاذ آرائی ہوتی رہی، خدا خدا کر کے صبح ہوئی۔

اس مکان میں نیچے ایک تنگ و تاریک گلیاری میں ایک چھوٹا سا داخلی دروازہ تھا

جس سے نکل کر پھل منڈی میں جایا جاسکتا تھا۔ صبح کو میاں صاحب نے اسی راستے سے چار چھ جوانوں کو ہم لوگوں کی خبر لینے کے لیے بھیجا اور وہاں سے نکل آنے کی تاکید کی۔ انہی کے حصار میں ہم لوگ ضروری سامان لے کر وہاں سے نکلے اور سید صالح لین کے اسی مکان کی بالائی منزل میں آ گئے جس کے ایک حصے میں میاں صاحب کی فیملی رہتی تھی اور دوسرے حصے میں ان کی برادری کے وہ لوگ جو دوسرے متاثر علاقوں سے بھاگ کر آئے تھے، بھر رہے تھے۔ خیر ایک کمرہ ہم لوگوں کے لیے خالی کر دیا گیا۔

پھر ایسا ہوا کہ شام کے جھٹ پٹے میں یعنی کرفیو شروع ہونے کے قریب جب سب کو اپنی اپنی پڑی ہوتی میں اسی بغلی راستے سے اس سنسان خالی مکان میں داخل ہوتا اور تھوڑا تھوڑا سامان لے کر نکل آتا۔ اس طرح رفتہ رفتہ وہاں سے تقریباً سارا سامان لے آیا، اِدھر عالم یہ تھا کہ کھانے پینے کی چیزوں کی قلت ہونے لگی۔ فرم کے ملازمین کے لیے کھانے پینے کا جو سامان آتا، اسی میں سے ہم لوگوں کا حصہ بھی آ جاتا۔ اکثر ایسا ہوا کہ چنے کی دال میں ناشپاتی ڈال کر پک جاتی، اتفاق سے ناشپاتی کے بہت زیادہ ٹوکرے فرم میں آ گئے تھے، انھیں محفوظ کر لیا گیا تھا۔ دودھ کی ڈیری جسے کلکتہ میں کھٹال کہتے ہیں قریب ہی تھی، وہاں سے دودھ بہ افراط مل جاتا تھا۔

فسادات کی وجہ سے سارے تعلیمی ادارے بند تھے۔ کوئی ایک ماہ بعد حالات کچھ سنبھلے کہ ہم لوگ گھر جانے کی سوچ سکتے تھے لیکن ٹرینوں میں بھی قتل کے واقعات ہو رہے تھے۔ اس لیے وطن واپسی کے لیے اکتوبر تک انتظار کرنا پڑا۔ یوں میرا کلکتہ کا مختصر قیام ختم ہوا اور تعلیمی سلسلہ بھی منقطع ہو گیا۔

☆☆☆

قیام دیوریا

ہم گھر آ کر فرصت کے رات دن گزارنے لگے۔ اسی اثناء میں ہدیٰ بھائی آئے۔ یہ وہی شمس الہدیٰ فاروقی صاحب ہیں جن کا ذکر آچکا ہے، وہ اس وقت دیوریا میں نائب تحصیلدار تھے، انھوں نے ابا سے میرے بارے میں کہا کہ اس کو میرے پاس بھیج دیجیے کسی کام سے لگا دوں گا۔ دسمبر ۱۹۴۶ء کی ابتدائی تاریخیں تھیں کہ آدھی رات کو میں دیوریا پہنچا، ٹھنڈ تھی، بارش ہلکی ہلکی ہورہی تھی، ہر طرف گھپ اندھیرا تھا۔ تحصیل اسٹیشن سے قریب ہی تھی اس لیے اپنا سامان لے کر چل پڑا۔

اگلے ہی دن صبح کو ہدیٰ بھائی نے ٹاؤن راشننگ آفس کے ایک انسپکٹر قدوائی صاحب کو بلا بھیجا اور مجھے ان کے حوالے کرتے ہوئے کہا کہ انھیں لے جایئے یہ میرے چچا ہیں۔ وہ مجھے سپلائی افسر صاحب کے بنگلے پر لے گئے، وہ ایک مسلمان ڈپٹی کلکٹر تھے فراست حسین صاحب وہ برآمدے میں ایک کرسی پر کمبل لپیٹے اطمینان سے بیٹھے حقے کے کش لے رہے تھے اور ان کے ارد گرد حلقہ بگوش جو اپنا کوئی نہ کوئی معاملہ لے کر پہنچے ہوئے تھے۔ انھوں نے قدوائی صاحب کو بیٹھنے کا اشارہ کیا اور اگلے چند منٹوں میں سب کو رخصت کر کے خود اندر چلے گئے۔ پیچھے پیچھے قدوائی صاحب بھی اندر گئے، ان سے کچھ کہا اور واپس آ کر مجھ کو اندر بھیجا۔ موصوف نے مجھ سے میرا نام پوچھا اور کہا کہ جاؤ جی لگا کر کام کرنا۔ بس یہی اتنا انٹرویو تھا اور دیوریا ضلع کے سنٹرل کلاتھ کلرک کے طور پر میرا تقرر ہوگیا۔ میں واپس آیا تو ہدیٰ بھائی انتظار کر رہے تھے۔ میں نے انھیں روداد سنائی اس کے

بعد انھوں نے کہا کہ قدوائی صاحب کے ساتھ چلے جاؤ۔ جب میں چلنے لگا تو انھوں نے آواز دی، فرمایا: ''سنو! ایک پیسہ بھی جیب میں لے کر آئے تو گھر میں نہیں گھسنے دوں گا۔'' یہ اس طرح کا دوسرا انتباہ تھا۔ پہلی تاکید ابا نے کی تھی۔ جب وہ گھر سے روانگی کے وقت کچھ دور تک مجھے پہنچانے آئے تو رخصت کرتے وقت کہا: ''بیٹا! تنخواہ کے علاوہ ایک پیسے کو بھی ہاتھ نہ لگانا۔'' اس وقت تنخواہ مبلغ -/52 روپیہ ماہانہ تھی۔

تو میں نے ایک پیسے یا ایک پان کو بھی ہاتھ نہیں لگایا۔ وہ جاڑا میں نے ایک سوتی کوٹ اور پائجامہ پہن کر گزار دیا۔ گرم کپڑوں کے لیے میرے پاس پیسے نہیں تھے لیکن میرے کمرے کے باہر اسٹول پر بیٹھنے والا چپراسی رحیم گرم سوٹ پہن کر آیا کرتا تھا۔

بات یوں تھی کہ گورکھپور ضلع کی چار تحصیلوں (دیوریا، پڈرونہ، سلیم پور اور ہاٹا) پر مشتمل دیوریا کا نیا ضلع بنایا گیا تھا اس لیے ضلع کے نئے نئے دفاتر قائم ہو رہے تھے ایسے میں یونہی کھانے کمانے کے بڑے دھندے نکل آتے ہیں، دوسرے یہ کہ جنگ کے بعد کا زمانہ تھا ہر چیز کی قلت تھی، کپڑے کا تو یہ عالم تھا کہ لوگ مرنے والے کو نہیں روتے تھے کفن کے لیے روتے تھے۔ کوئی شخص اپنے عزیز کی موت کا ثبوت لے کر ضلع ہیڈ کوارٹر پر جاتا، ڈپٹی صاحب کو درخواست دیتا، درخواستیں لکھنے والے اور منظور کرانے والے موجود ہوتے، یہ سب نئے دھندے تھے۔ اس کے بعد کپڑا لینے کے لیے کوٹے والی دکانوں کے چکر لگاتا تو دس پندرہ گز کپڑا ملتا۔ اس دھندے میں ایک ایک جنس مثلاً کپڑا، چینی، مٹی کا تیل وغیرہ سے متعلق کلرکوں اور انسپکٹروں کو بلا تکلف سو دو سو روپیہ یومیہ کا لینا معمول کی بات تھی۔ مجھے اس کا کوئی تجربہ نہ تھا، جن بزرگوں نے مجھے اس کے خلاف تحدید کی تھی وہ ان حالات سے آگاہ رہے ہوں گے، چنانچہ ان کی تاکید کے مطابق اس باڑھ کو روکنے کے لیے میں نے چپراسی کو تاکید کر دی تھی کہ کسی کو میرے کمرے کے اندر نہ آنے دے۔ پھل مٹھائی وغیرہ بھی بطورِ ہدیہ آتا اس کو دفتر کے دوسرے لوگ ٹھکانے لگاتے۔ میرے بارے میں ان کی عام رائے یہ تھی کہ یہ بیوقوف لڑکا ہے۔

شاید میری اس بیوقوفی سے سارا دفتر آگاہ ہوگیا تھا اس لیے کہ چھ ماہ بعد جب میں نے اس ملازمت سے اپنا استعفیٰ پیش کیا تو ٹاؤن راشننگ افسر نے جو ایک بنگالی ڈپٹی کلکٹر مسٹر چٹر جی تھے استعفیٰ منظور کرنے سے انکار کردیا اور سمجھانے بوجھانے کے بعد دلجوئی کے طور پر ۴۵ گز کپڑے کا پرمٹ بھی دے دیا جو کہ بڑی بات تھی۔ میں اتنا کپڑا خریدنے کے لیے پیسے کہاں سے لاتا، چنانچہ ایک کلاتھ ڈیلر سے بیس گز کپڑا لے کر بقیہ پچیس گز اس کے حق میں چھوڑ دیا۔ اب وہ پیسے لینے کو تیار نہ تھا بڑی مشکل سے لیے۔

میں نے ایک ماہ ہدیٰ بھائی کے ساتھ قیام کیا۔ ان کی شخصیت ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ، شریف النفس، صوفی منش سرکاری افسر کا مرقع تھی، جس میں مشرقی تہذیب، مغربی طرزِ تعلیم، مذہب کی سخت پابندی، علمی مشاغل، شعروشاعری، بذلہ سنجی سب اکٹھا تھے۔ شکار کا شوق مستزاد تھا۔ مالی معاملات میں انتہائی محتاط تھے جو ہمارے خاندان اور قبیلے کا طرۂ امتیاز تھا۔ بیرے، خانساماں وغیرہ تک کو سخت تاکید تھی کہ کسی زمیندار، تعلقدار کا کوئی تحفہ تحائف گھر میں نہ آنے پائے۔ مہمان نوازی اور اقربا پروری کی صفات سے بھی متصف تھے، اس لیے بندھی ٹکی تنخواہ میں واقعی بدقت بسر ہوتی تھی۔

دیوریا ریلوے اسٹیشن کے پوربی یارڈ کے سامنے ایک چار منزلہ مستطیل عمارت تھی۔ ظاہر ہے اتنی بڑی عمارت اس زمانے میں کسی راجہ کی رہی ہوگی، اسی عمارت کی زیریں منزل میں غلے کا گودام تھا، پہلی منزل پر ٹاؤن راشننگ آفس تھا، دوسری منزل پر ڈسٹرکٹ سپلائی آفس تھا، جس میں میرا تقرر ہوا تھا اور اس کے اوپر والی منزل کے سارے کمرے خالی پڑے تھے، گورنمنٹ نے وہ پوری عمارت اپنے تصرف میں لے لی تھی۔

ایک ماہ ہدیٰ بھائی کے ہاں قیام کرنے کے بعد میں اسی بالائی منزل کے ایک کمرے میں منتقل ہوگیا اور دفتر کے ایک اور کلرک کامل خاں کے ساتھ رہنے لگا جو قریب ہی تحصیل ہاٹا کے رہنے والے تھے۔ انہی کے گاؤں کا ایک بوڑھا شخص جو پہلی جنگ عظیم میں سپاہی رہ چکا تھا ہم لوگوں کا کھانا پکانے لگا۔ وہ کھانا بہت اچھا پکاتا تھا یا شاید وہ عمر ہی

ایسی تھی کہ ہر چیز لذیذ معلوم ہوتی تھی۔ دراصل تلذذ تو اپنے ہی کام و دہن کا کرشمہ ہے ورنہ منہ کو سُن کر کے تو دانت بھی اکھاڑ لیے جاتے ہیں اور پتہ نہیں چلتا۔ اگر چشم بینا نہ ہو تو دنیا کا حسن غارت ہو جائے۔ گوشِ نیوش نہ ہو تو لحنِ داؤدی بھی بے معنی۔

چار منزلیں ہر ضرورت پر طے کرنا بھی ایک مسئلہ تھا۔ چنانچہ کوئی مہینے بھر بعد ہم لوگ اس شوگر مل کے ایک کوارٹر میں منتقل ہو گئے جو ریلوے اسٹیشن کے سامنے بلکہ عقب میں بالکل متوازی تھی۔ کسی وجہ سے وہ فیکٹری بند ہو گئی تھی اور اسٹاف کوارٹر خالی پڑے تھے۔ ایک کوارٹر میں ہم لوگ رہنے لگے۔ سنیچر کی شام کو کامل خاں ہاٹا کی بس پکڑتے اور میں گورکھپور سے آ کر مئو جانے والی ٹرین میں سوار ہو جاتا۔ جس میں کوئریا پار کے کئی لوگ گورکھپور سے ہی آتے، ہم لوگ صبح ۴ بجے کے قریب کہرہٹ اسٹیشن پر پہنچتے اور اسی وقت گاؤں کے لیے چل پڑتے کیونکہ سواری کا کوئی راستہ نہ تھا اور درمیان میں دریا بھی حائل تھا۔ ہم لوگ علی الصباح گھر پہنچتے، فجر کے وقت ماں باپ، بھائی بہن سب کو راہ دیکھتے ہوئے منتظر پاتے۔ خوشی کی کیسی روشنی گھر میں ہر طرف پھیلتی تھی اس کو بیان نہیں کیا جا سکتا صرف محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ہم لوگ دن بھر گاؤں میں گزارنے کے بعد عشا بعد پیدل کہرہٹ اسٹیشن کے لیے چل پڑتے، گیارہ بجے ٹرین ملتی پھر مئو میں ٹرین بدل کر صبح سویرے اپنی اپنی منزل پر پہنچ جاتے۔ اس طرح پت جھڑ موسم بہار میں اور بہار گرمیوں میں بدل گئی۔ گنے اور مٹر کے بجائے آم، جامن کا موسم آ گیا۔

جیسا کہ بیان کر چکا ہوں کوئریا پار کے ماسٹر عیسیٰ صاحب گورکھپور میں ریلوے کے کوئی بڑے افسر تھے۔ ابا کی پہلی شادی ان کی بہن سے ہوئی تھی، اس تعلق کی بنا پر میں ان کو عیسیٰ ماموں کہتا تھا اور مان جان بھی ویسی ہی تھی۔ عیسیٰ ماموں بھی ہر سنیچر کی شام والی ٹرین سے گورکھپور سے گھر آتے تھے اور دن بھر قیام کے بعد رات کو ہم لوگوں کے ساتھ واپس ہوتے۔ کسی کسی سنیچر کو ٹرین میں ان کا سیلون بھی لگتا بصورتِ دیگر وہ فرسٹ کلاس میں سفر کرتے۔ اس زمانے میں ریلوے کا فرسٹ کلاس بہت بڑی چیز تھی، عموماً انگریز یا

کلکٹر اور جج وغیرہ جیسے اعلیٰ حکام ہی فرسٹ کلاس میں سفر کرتے۔ جس دن عیسیٰ ماموں کا سیلون لگا ہوتا میں دیوریا اسٹیشن پر اسی میں گھس جاتا ورنہ گاؤں والوں کے ساتھ دوسرے ڈبوں میں بیٹھ جاتا۔ ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ ہم لوگ جاڑا گرمی، برسات اتوار کے اتوار قدم سے قدم ملا کر آگے پیچھے کہرہٹ اسٹیشن اور کوئریاپار کی درمیانی مسافت طے کرتے، کبھی گھٹا ٹوپ اندھیرے میں کبھی عالم غنودگی میں نیم وا آنکھوں کے ساتھ نیچی اونچی ٹیڑھی سیدھی پگڈنڈی پر بالکل ٹھیک ٹھیک چلے جاتے۔ کچھ عرصہ بعد جب میرا قیام بنارس میں ہوگیا تب بھی آمدورفت کا یہ سلسلہ جاری رہا، کیوں کہ گورکھپور اور بنارس سے آنے والی اَپ اور ڈاؤن دونوں ایکسپریس ٹرینوں کا میل مئو میں ہی ہوا کرتا تھا اور وہاں سے کہرہٹ جانے والی ٹرین ایک ہی تھی اس لیے مئو سے کوئریاپار تک اور کوئریاپار سے مئو تک ہم لوگوں کا ساتھ رہتا۔

عیسیٰ ماموں ہر مسلم امیدوار کے لیے ریلوے میں گنجائش نکالنے کے لیے شہرت رکھتے تھے، چنانچہ وہ میرے بارے میں بھی سوچ رہے تھے۔ یہ بھی بتادوں کہ وہ ہدیٰ بھائی کے خسر تھے۔ اس زمانے میں ریلویز میں ہندوستانی براہِ راست ڈرائیور نہیں ہوا کرتے تھے بلکہ خلاصی اور فائرمین کی حیثیت سے بیسوں برس کی مشقت کے بعد ڈرائیوری کی مراد پوری ہوتی تھی۔ انگریز یا اینگلو انڈین براہِ راست اپرنٹس ڈرائیور لیے جاتے تھے اور ہائی اسکول پاس ہونا لازمی تھا۔ ریلویز نے پہلی بار دس ہندوستانی اپرنٹس ڈرائیور بھرتی کرنے کا فیصلہ کیا۔ بس عیسیٰ ماموں نے میرا نام تجویز کیا اور مجھ سے درخواست دلوادی۔ فارم کی خانہ پُری کے وقت معلوم ہوا کہ میری عمر مطلوبہ سولہ برس نہیں ہے اس میں چھ ماہ کم ہیں۔ فارم میں یہ ہدایت بھی تھی کہ عمر کی تصدیق کے لیے ہائی اسکول کی سند کی ایک نقل درخواست کے فارم کے ساتھ لگائی جائے اور اصل سرٹیفیکٹ انٹرویو کے وقت پیش کیا جائے۔ میں نے یہ ساری باتیں عیسیٰ ماموں کو بتائیں۔ انھوں نے فرمایا تم یہ سب بھول جاؤ فارم میں تاریخ پیدائش اس حساب سے درج کرو کہ سولہ سال ہوں اور درخواست میں

نقل کے بجائے ہائی اسکول کا اصل سرٹیفیکٹ نتھی کردو۔ انٹرویو کے موقع پر جب اصل سرٹیفیکٹ طلب کیا جائے تو بتادینا کہ وہ اسی درخواست کے ساتھ منسلک ہے۔ باقی میں سمجھ لوں گا۔ میں نے ایسا ہی کیا۔

انٹرویو والے دن معلوم ہوا کہ دس جگہوں کے لیے کوئی ایک سو بیس امیدوار ہیں۔ میں نے عیسیٰ ماموں کو اپنے سرٹیفیکٹ والی بات یاد دلائی۔ انھوں نے کہا کہ جب تم سے پہلے پانچ سات امیدوار رہ جائیں تو مجھے بتادینا۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ بس وہ اپنے کمرے سے نکل کر دوسرے کمرے میں گئے اور ایک شخص سے کچھ کہا، وہ اٹھا اور بڑھ کر انٹرویو والے کمرے میں گیا۔ انٹرویو بورڈ کا چیئرمین انگریز تھا اس کے علاوہ دو ہندوستانی افسر تھے جو انٹرویو لے رہے تھے۔ یہ صاحب جو آئے تو ایک کرسی کھینچ کر انگریز افسر کے بغل میں بیٹھ گئے اور اس کے سامنے درخواستوں کی جو فائل رکھی ہوئی تھی اس کو معاونت کے انداز میں اپنے سامنے کرلیا۔ میں جھانک کر یہ سب دیکھ رہا تھا۔

جب میری باری آئی اور میں اندر گیا تو ان لوگوں نے مجھ سے دو چار سوالات کیے پھر اس انگریز افسر نے میری عمر دریافت کی اور سرٹیفیکٹ طلب کیا۔ میں نے عمر سولہ سال بتائی اور کہا کہ اوریجنل سرٹیفکیٹ درخواست کے ساتھ نتھی ہے۔ اس پر اس کو حیرت تو ہوئی اس کے بعد اس نے ان موصوف کو صدیق کرنے کا اشارہ کیا، انھوں نے الٹ پلٹ کر دیکھا اور تصدیق میں گردن ہلادی۔ بس میرا سلیکشن ہوگیا۔

اس انٹرویو کے دوران ایک چونکا دینے والی بات یہ ہوئی کہ چیئرمین نے مجھ سے ایک سوال یہ کیا کہ آیا میرے والد ریلوے ملازم ہیں۔ میرا جواب نفی میں تھا۔ اس زمانے میں ایک دستور یہ بھی تھا کہ ریلوے ملازمین کے لواحقین کو ملازمت کے معاملے میں ترجیح دی جاتی تھی۔ نفی میں میرے جواب کا مطلب یہ تھا کہ میں اس ترجیح کا مستحق نہیں۔ اسی وقت ناپختہ ذہن میں یہ بات راسخ ہوگئی کہ انسان کو روزِ اول سے اپنے لواحقین اور متعلقین کا خیال رکھنا چاہیے کہ وہ بھی اس کے مستقبل کا حصہ ہیں۔ میں نے اسی احساس کے ساتھ

ریلوے کی ملازمت شروع کی اور اسی احساس کی بنا پر اس ملازمت کو ترک بھی کیا۔

انٹرویو کے ہفتہ عشرہ بعد میں نے عیسیٰ ماموں کو یاد دلایا کہ میرا میڈیکل اگزامینیش باقی ہے۔ انھوں نے کہا کہ تم دیوریا سے رخصت ہونے کے لیے تیار ہوکر آجاؤ میں نے ایسا ہی کیا اور گورکھپور پہنچ گیا۔ انھوں نے کسی کو ہدایت کی کہ اس کا میڈیکل ٹسٹ کرادو۔ بس اگلے گھنٹے دو گھنٹے میں اس کارروائی سے بھی فراغت ہوگئی۔ شام تک رپورٹ مل گئی۔ تو عیسیٰ ماموں نے پوچھا کہ تم پوسٹنگ کہاں چاہتے ہو۔ ظاہر ہے میں گھر سے قریب ترین چاہتا تھا اس لیے مئو یا بنارس تجویز کیا لیکن مئو میں ممکن نہ تھا اس لیے بنارس طے پایا۔

اسی شام عیسیٰ ماموں مجھے لے کر الٰہ آباد ایکسپریس سے روانہ ہوئے۔ اگلے دن صبح کو مجھے لے کر ڈیویزنل افسر بنارس کے دفتر میں پہنچے۔ اندر جاکر کسی سے کچھ بات کی پھر مجھے لیے لیے لوکوفورمین کے دفتر میں داخل ہوئے۔ ایک بھاری بھرکم شخص بالکل ریل کے انجن سے مشابہ انھیں دیکھتے ہی اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس سے موصوف نے صرف ایک جملہ کہا ''رحمت علی دیکھو یہ میرا بھانجہ ہے اس کا خیال رکھنا۔'' وہ بس الٹے پاؤں کمرے سے باہر اور واپس گورکھپور چلے گئے اور میرا تقرر ہوگیا۔ جولائی ۱۹۴۷ء کی ابتدائی تاریخیں تھیں۔

رحمت علی صاحب نے لوکوشڈ کے سپروائزر کو بلایا اور کچھ ہدایت کرتے ہوئے کہا کہ ان کو شڈ میں لے جاکر کام سے لگاؤ۔ میں اس شخص کے پیچھے پیچھے شڈ میں گیا۔ وہاں مجھے ایک بالٹی اور جوٹ کا ایک بنڈل دے کر بتادیا گیا کہ فلاں انجن کو رگڑ رگڑ کر صاف کرو اور میں آستین چڑھا کر اس کام میں لگ گیا۔

دیوریا میں قیام کے دوران ایک دلچسپ واقعہ کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے۔ میں شوگر مل کے گیسٹ ہاؤس سے ملحق ایک کوارٹر میں رہتا تھا۔ چونکہ مل بند تھی اس لیے گیسٹ ہاؤس اور کوارٹر وغیرہ سب خالی پڑے ہوئے تھے۔ ایک دن گیسٹ ہاؤس کا گیٹ کھلا اور ایک نواب صاحب معہ اپنے تام جھام کے وارد ہوئے۔ بیرا، خانساما، خدمت

گزار، کار ڈرائیور وغیرہ اور بہت سارا سازوسامان۔ وہ کار سے اترے اور سارا سامان اندر رکھا گیا۔ پھر میں کبھی کبھی جھانک کر دیکھتا تو نواب صاحب تنزیب کے کرتے اور چوڑی دار پاجامے میں ملبوس آرام کرسی پر بیٹھے حقے کے کش لگاتے نظر آتے۔ ان کے خدمت گزار بھانت بھانت کے تھے۔ مثلاً ایک شخص دیہاتی طرز کی گھٹنوں تک دھوتی اور بنڈی پہنے ہوتا، ایک اور صاحب باریش کرتے پاجامے میں، دو ایک جوان قمیص پتلون میں نظر آتے۔ یہ لوگ گیسٹ ہاؤس سے زیادہ بازار میں دکانداروں سے بے تکلفانہ گپ شپ کرتے دیکھائی پڑتے۔ دیوریا کوئی بڑا شہر تو تھا نہیں ایک سیدھی سڑک تھی اسی کے دونوں جانب دکانیں تھیں، وہی بازار تھا۔

میں نے ان حضرات کو گورکھپور اور دیوریا کے درمیان چلنے والی ٹرینوں میں بھی دیکھا اور یہ بھی کہ وہ ہر اسٹیشن پر ایک ڈبے سے اتر کر دوسرے ڈبے میں چلے جاتے۔ یہ سب کچھ کوئی مہینے بھر جاری رہا۔ بات کچھ سمجھ میں نہ آتی تھی۔ ایک دن دیکھا کہ وہی کار جس میں نواب صاحب آئے تھے آ کر رکی اوراس میں سے نواب صاحب برآمد ہوئے لیکن وہ ایک پولیس افسر کی یونیفارم میں تھے۔ دوسرے دن صبح کو قصبے کے ایک مشہور کاروباری کی کار وہاں آ کر ٹھہری جس میں سے وہ صاحب نکل کر سیدھے افسر موصوف کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ لیکن اس کے بعد پھر وہ نظر نہیں آئے جبکہ اکثر بازار میں چہل قدمی کرتے نظر آتے تھے۔ اگلے دو دنوں کے اندر ہی وہ افسر یا نواب صاحب اپنے عملے کے ساتھ جس طرح اچانک وارد ہوئے تھے اسی طرح غائب ہوگئے۔ گیسٹ ہاؤس خالی ہوگیا۔ بازار میں طرح طرح کی افواہیں گشت کرنے لگیں کہ نندا صاحب گرفتار ہوگئے۔ اس کے بعد جلد ہی مجھے بھی دیوریا چھوڑنا پڑا، اس لیے واقعات کا پورا علم نہ ہوسکا لیکن ان نو واردوں کی آمد سے کوئی ایک مہینے پہلے قصبے میں ایک واقعہ ہوا تھا وہ یوں کہ—

ایک رکشے والا تھا اور اس کی چھوٹی بہن تھی۔ دونوں ایک چھوٹے سے ٹوٹے پھوٹے گھر میں رہتے تھے۔ ان کے ماں باپ مرچکے تھے۔ چند ماہ قبل دیوریا میں طاعون

پھیلا تھا، لوگ بالعموم آبادی سے باہر بھاگ گئے۔شہر میں ہوکا عالم تھا۔ میں اور ایک ساتھی کلرک کامل خاں دفتر والی عمارت کی بالائی منزل پر رہتے تھے۔ غالباً اسی وبا میں رکشے والے کے ماں باپ ختم ہوگئے تھے اور تقدیر نے دونوں بھائی بہن کو اس مکان میں تنہا چھوڑ دیا تھا۔ رکشے والا دن بھر محنت کر کے کمالیتا اور بہن پکا کھلا دیتی۔ اسی طرح دن گزرنے لگے۔ پھر رفتہ رفتہ نندا صاحب رکشے والے پر مہربان ہونے لگے اور اس کو روپئے پیسے دینے لگے اور اس کے یہ فاضل پیسے تاڑی خانے کی طرف بہنے لگے اور اس کا وقت بھی اس طرف گزرنے لگا۔ دوسری طرف نندا صاحب اس کے غریب خانے کی طرف آتے جاتے دیکھے گئے۔ایک دن رکشے والے نے اپنی بہن سے کہا کہ وہ کام پر نہیں جارہا ہے بلکہ اپنے کسی دوست کے ساتھ باہر جارہا ہے کل واپس آئے گا۔ پھر وہ کبھی نہیں لوٹا۔ دن پر دن گزرتے تھے، چونکہ نندا صاحب مہربان تھے اس لیے لڑکی کو دلاسہ دیتے رہے۔ اس واقعے کے کوئی ہفتے بھر بعد ایسا ہوا کہ ریلوے اسٹیشن سے کچھ فاصلے پر ریلوے لائن کے قریب کھیلتے ہوئے گاؤں کے بچے قریب ہی واقع کنوئیں تک آگے کسی لڑکے نے اس میں جھانکا تو ایک بڑا بنڈل سا نظر آیا اور بدبو بھی بہت تھی۔ یہ خبر گاؤں میں پہنچی تو گاؤں والے بھی آگئے۔ کنوئیں سے بورے کا بنڈل نکالا گیا۔ اس میں ایک نوجوان کی لاش تھی، جس کے دونوں ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ اس کی شناخت مشکل تھی کیونکہ لاش خراب ہورہی تھی اور چہرے پر تارکول پوتی ہوئی تھی۔ بالآخر معلوم ہو ہی گیا کہ وہ اسی گمشدہ رکشے والے کی لاش تھی۔

اس زمانے میں انفرادی قتل وغیرہ کے واقعات شاذ و نادر ہوتے تھے اور جب ایسا کوئی واقعہ ہوجاتا تو محکمہ پولیس پوری شدت سے حرکت میں آجاتا، تفتیش اور تلاش کے بعد مجرم کو کیفرِ کردار تک پہنچایا جاتا۔ اس زمانے میں شہر اور گاؤں کے لوگ پولیس کے ''انکاؤنٹر'' کی اصطلاح سے نا آشنا تھے۔

☆☆☆

قیامِ بنارس

ریلوے میں ملازمت مل جانے پر پوسٹنگ کے لیے بنارس کو ترجیح دینے کی ایک خاص وجہ یہ تھی کہ وہاں محلّہ اردلی بازار میں میری ایک خالہ رہتی تھیں۔ خالو جان قاضی محمد اختر صاحب ضلع کلکٹر کے اسٹینو گرافر تھے اور ٹائپ بابو کے نام سے جانے پہچانے جاتے تھے۔ دفتری اوقات میں بلکہ شام کو دیر تک کلکٹر صاحب کے بنگلے پر ہی رہتے تھے اور وہیں کام کرتے تھے۔ نہایت خلیق اور سادگی پسند تو تھے ہی اقربا پروری ان کو وراثت میں ملی تھی، گھر کا ماحول ''وہائٹ کالر'' والوں کا تھا۔ ان کے چچا قاضی محی الدین صاحب کچہری میں پیشکاری سے ریٹائر ہوئے تھے اور چچیرے بھائی جمیل الدین کالج میں پڑھ رہے تھے جن کی عمر مجھ سے سال دو سال کم رہی ہوگی اور ان کے بہنوئی امین احمد صاحب ریلوے کے سی سی ایم آفس میں انسپکٹر تھے، ان کے علاوہ قریب پاس اور بھی اقارب تھے جو مختلف دفاتر وغیرہ میں کام کرتے تھے۔ اس ماحول میں اپنے کام اور حلیہ کے اعتبار سے میں مختلف اور اَن فِٹ بھی تھا۔ خود مجھے طبعی طور پر بھی اس کام سے لگاؤ نہ تھا۔

صبح سات بجے سے شام سات بجے تک انجنوں کی جھاڑ پونچھ کرتا، کوئلہ توڑتا، کوئلہ جھونکتا، ہاتھ زخمی کبھی اس میں آبلے پڑے ہوئے۔ شام کو کالا کلوٹا، میلا کچیلا گھر واپس آتا، نہاتا دھوتا اور کوئی گوشہ اختیار کرتا۔ محنت سخت تھی اس لیے کھانا کھاتے ہی بے ہوش

ہوجاتا۔ میلے کپڑے تخت وغیرہ کے نیچے کہیں چھپا دیتا تاہم بعض لوگوں کو کراہت ہو ہی جاتی جس کا اندازہ مجھے ہوتا لیکن خالو جان اس قدر خیال رکھتے تھے اور خالہ اتنا مانتی تھیں کہ کسی کو لب کشائی کی مجال نہ تھی۔

پہلے دن لوکوشڈ میں دوپہر سے شام تک اور دوسرے دن صبح سے شام تک مجھ سے انجن رگڑنے پوچھنے کی خدمت لی گئی اور تیسرے دن ایک شنٹنگ انجن پر مامور کردیا گیا لیکن ڈیوٹی کے اوقات وہی صبح سات بجے سے شام سات بجے تک رہے۔ اس زمانے میں ورکروں کے کام کے اوقات بارہ گھنٹے یومیہ ہوا کرتے تھے۔

میں جب انجن پر پہنچا تو وہاں حسبِ معمول تین افراد پر مشتمل اسٹاف موجود تھا۔ ڈرائیور، فائرمین اور خلاصی۔ یہ سب تقریباً اَن پڑھ تھے۔ انھوں نے پہلے تو میرا انٹرویو لیا پھر جب انھوں نے یہ سنا کہ شڈ میں سال دو سال گزارے بغیر ہی یہاں چلا آیا ہے تو ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی پھر وہ یہ سوچ کر چپ ہو رہے کہ ''اے'' گریڈ اور پڑھا لکھا ہے انھیں کیا معلوم کہ یہ سب ماسٹر صاحب کی کرامات تھیں۔ ان لوگوں کو دوسری حیرت یہ تھی کہ آخر پڑھے لکھے لوگ اس گندے کام کی طرف کیوں آرہے ہیں جبکہ وہ دفتری کام کرسکتے ہیں، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ سب ایک طرف تو کسی قدر احترام کرتے تھے اور صاحب کہہ کر مخاطب کرتے تھے تو دوسری طرف مجھ کو مشکلوں میں مبتلا دیکھ کر محظوظ ہوتے تھے اور طنزیہ جملے بھی کستے تھے۔ دن میں شنٹنگ ڈیوٹی یعنی یارڈ میں ڈبے کاٹنے جوڑنے کا کام کوئی دو ہفتے رہا پھر رات کی ڈیوٹی لگی یعنی شام ۷/بجے سے صبح ۷/بجے تک۔ دراصل اس وقت ڈیوٹی کا یہی طریقہ رائج تھا، دو ہفتے دن میں پھر دو ہفتے رات میں، اسی اثناء میں رمضان آ گیا۔

گرمیوں کے لمبے دن ہوتے تھے سحری کھا کر فجر کی نماز کے بعد ذرا جھپکی لیتا پھر اٹھ کر اسٹیشن روانہ ہوجاتا۔ روزے رکھ کر شام تک انجن پر کوئلہ توڑتا، بھٹی میں کوئلہ جھونکتا اور آگ کے سامنے کھڑا رہتا، اللہ ہی جانتا ہے یہ وقت کیسے کٹتا تھا۔ ہمارے انجن کا خلاصی

بنگالی تھا، جو مسلمانوں کی معاشرت سے کچھ واقف تھا اس کو میرے حال پر بڑا ترس آتا تھا، وہ میری کچھ مدد بھی کرتا اور شام کو سات بجے سے کچھ پہلے ہی کہتا کہ ''صاحب تم چلا جاؤ ہم تمہارا کام دیکھ لے گا۔ تمہارا روجا کا ٹائم ہوتا ہے۔'' میں اسٹیشن سے چل کر اردلی بازار آتا ابھی اپنی منجھائی صفائی میں ہی ہوتا کہ افطار کا وقت ہو جاتا۔

جب رات کی ڈیوٹی ہوتی تو خالو جان کی سائیکل خالی تھی، افطار بعد سائیکل سے جاتا، سائیکل کو انجن پر لادے ہوئے کوئلے پر ڈال دیتا، سحری کے وقت بھاگ کر آتا اور سحری کھا کر واپس چلا جاتا۔ یہ ڈیوٹی دن والی ڈیوٹی کی بہ نسبت آسان تھی لیکن ماسٹر صاحب کا تعویذ کام کیے جا رہا تھا۔ چنانچہ جلد ہی ہمارے انجن کو رننگ ڈیوٹی پر لگا دیا گیا۔ دیگر اسٹاف کے ساتھ میں بھی چلنے لگا جو کہ کسی نو وارد کے لیے غیر معمولی بات تھی لیکن سمجھا یہ جا رہا تھا کہ میری ٹریننگ کی مدت ہے اس لیے میری حیثیت ایک فاضل اسٹاف کی تھی اس لیے مجھے ہر طرح کا کام بھی کرنا پڑتا تھا، یعنی خلاصی کے ساتھ کوئلہ توڑنا، فائر مین کے ساتھ کوئلہ جھونکنا، تپتے ہوئے پرزوں میں کبھی کبھی چلتی ٹرین میں ہی تیل ڈالنا پھر ڈرائیور کے ساتھ کھڑے ہو کر اس کی کارکردگی میں ہاتھ بٹانا یعنی لائن کو ہوشیاری سے دیکھتے رہنا، سگنل پر نظر رکھنا، اسٹیشنوں پر لائن کلیر لینا وغیرہ اس کے علاوہ ڈرائیور صاحب جو حکم دیں اسے بجالانا۔ رننگ ڈیوٹی کے ابتدائی چند ٹرپ مالگاڑی میں ہوئے یعنی ہمارا انجن مالگاڑی میں جوتا جاتا رہا اس کے بعد ہمارے ٹرپ پسنجر ٹرین میں ہونے لگے۔ ہم بنارس سے بھٹنی، بنارس سے الٰہ آباد اور بنارس سے چھپرہ تین لائنوں پر چلتے تھے۔ اس ملازمت کے دوران تجربات اور مشاہدات کا تذکرہ بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

اب تو بجلی اور ڈیزل والے انجنوں کے اسٹاف کے لیے ڈیوٹی کی پابندی اور سخت چوکسی کی شرط تو باقی ہے لیکن کوئلے والے پرانے انجنوں میں کوئلہ توڑنے، جھونکنے اور چلتے انجن میں بھٹی کے اندر لمبی اور بھاری آہنی سلاخ سے کوئلہ کی راکھ جھاڑنے کا جو دوزخی عمل تھا، اس کے سامنے تو موجودہ سختیاں گرد ہیں۔ ان سے قطع نظر شدید گرمی میں

تپتی ہوئی بھٹی کا سامنا ہر پرزہ تپتا ہوا جسے جوٹ ہاتھ میں لے کر ہی چھوا جاسکتا تھا، بارش میں ہر طرف سے بوچھار اور مسلسل بھیگتے سوکھتے رہنا، سردیوں میں تندوتیز ہواؤں کے سامنے بے پناہی اور مستقلاً کھڑے رہنا اور کھڑے رہنے کی جگہ بھی زلزلے کی کیفیت میں۔ جسم کے مختلف حصوں خصوصاً ہاتھوں کا جل جانا، کٹ جانا، کچل جانا معمول کی بات تھی۔ کبھی کبھی سوچتا تھا کہ یا اللہ کہاں پھنس گیا ہوں۔ خصوصاً اپنے ہاتھوں کو دیکھ کر سوچتا کہ کیا میرے وابستگان ان جلے کٹے سیاہ ہاتھوں پر کبھی فخر کرسکیں گے! میرے نزدیک اس کا جواب نفی میں تھا، اس لیے میں نے بہت جلد اس ملازمت سے کنارہ کش ہونے کا فیصلہ کرلیا، میں نے ٹھیک ہی کیا۔ جس پیشے سے دلچسپی نہ ہو اس پیشے میں انسان ترقی نہیں کرسکتا، کامیاب نہیں ہوسکتا۔

شنٹنگ ڈیوٹی کے زمانے میں روز جب ڈیوٹی ختم ہونے کو آتی تو فائرمین بہت سارے کوئلے کے بڑے بڑے ٹکڑے انجن میں جھونک دیتا جو جل اٹھتے تو ان کا تارکول اور کاربن بڑی حد تک اڑ جاتا پھر ڈرائیور انجن کو یارڈ میں لے جا کر جلے ہوئے کوئلہ کو نیچے جھاڑ دیتا پھر اس پر بہت سارا پانی ڈال کر اس کو بجھا دیا جاتا۔ خلاصی اس کو اکٹھا کر کے بورے میں بھرتا پھر یہ تینوں ایک ساتھ گیٹ سے باہر نکل جاتے اور اس مالِ غنیمت کو باہم تقسیم کرلیتے۔ یہ کوئلہ گھروں میں قابلِ استعمال اور قابلِ فروخت بھی تھا۔ انجن پر دو چیزیں اور بھی قابلِ فروخت ہوا کرتی تھیں، مٹی کا تیل اور رینڈی کا تیل جو پرزوں میں ڈالنے کے علاوہ جلنے کٹنے کی صورت میں زخم پر ملنے کے بھی کام آتا۔

رننگ ڈیوٹی میں یہ کاروبار زیادہ نفع بخش ہوتا اور لامحدود بھی۔ ایک تو یہی کوئلے کا کاروبار۔ ہر جنکشن پر ڈھیر سارا جلا ہوا کوئلہ گرادیا جاتا جسے لے جانے والے ڈرائیور کو کچھ دیتے رہے ہوں گے، صبح کے وقت گوالے دودھ لے کر کھڑے رہتے جسے لے کر فائرمین یا ڈرائیور پی جاتے اور اس کے عوض کوئلے کے کچھ ٹکڑے دوسری طرف پھینک دیتے۔ ایک دھندا اور بھی تھا۔ اس زمانے میں بکنگ پر پابندی تھی یعنی مال کو ایک جگہ سے

دوسری جگہ بک کرنے کے لیے بھی پرمٹ کی ضرورت ہوتی تھی۔ چنانچہ بعض کاروباری اپنا مال بوروں میں بھر کے ڈرائیور کے حوالے کر دیتے جسے انجن کے کوئلہ کے اوپر ڈال دیا جاتا۔ اس کے نقد پیسے مل جاتے۔ اگر کسی نے پوچھ لیا کہ بورے میں کیا ہے تو ڈرائیور کہہ دیتا کہ اس میں ہمارا راشن ہے (رننگ ڈیوٹی والے ریلوے اسٹاف کو اجازت تھی کہ جس ڈپو پر انھیں سہولت ہو وہیں سے راشن لے لیں) کوئی بورے کھول کر دکھانے پر اصرار نہیں کرتا کیونکہ اسی وجہ سے ڈرائیور ٹرین کو لیٹ کر دیتا اور اس تاخیر کی جوابدہی اسی شخص پر ہوجاتی۔ تو یہ جو مال لادنے والا دھندا تھا اس کی آمدنی میں سے صرف ایک بار ڈرائیور نے مجھے ایک روپیہ پکڑا دیا۔ میں نے بے خیالی میں لے تو لیا پھر سوچنے لگا کہ اب کیا کروں بالآخر اس کو رکھ ہی لیا۔

لیکن اصل دھندا بہت بڑے پیمانے پر دوسرا تھا یعنی ویگنوں سے سامان نکالنے کا۔ جنگ کے بعد کا زمانہ تھا ہر چیز کی قلت تھی حتیٰ کہ نمک بھی کبھی کبھی مشکل سے ملتا تھا۔ گاندھی جی نے اسی نمک کے لیے ستیہ گرہ کی تھی اور ان کی آنکھوں کے سامنے اس نمک کا یہ حال ہوا کہ بلیک میں ملتا تھا۔ مٹی کا تیل عنقا تھا۔ شکر نایاب تھی لیکن ان ساری چیزوں کی نقل وحمل تو مال گاڑی ہی کے ذریعہ ہوتی تھی۔ چنانچہ ویگنوں کی صفائی کا کام عموماً شام کو شروع ہوتا اور وقفے وقفے سے رات بھر جاری رہتا۔ مال گاڑی یارڈ میں دور کھڑی کردی جاتی، ایک نوکیلی سلاخ سے ویگن کے پیندے میں سوراخ کر دیا جاتا بس تیل یا شکر وغیرہ کے قسم کی چیزیں نیچے گرتی رہتیں کیونکہ ویگن کے پیندے کے بعد پیسے یا بورے وغیرہ میں بھی سوراخ ہوجاتا۔ ویگن کے نیچے چیزیں اکٹھا کرنے کے لیے کوئی بالٹی وغیرہ رکھ دی جاتی حسبِ خواہ چیزیں لے لینے کے بعد اس کو اسی طرح گرتا چھوڑ دیا جاتا۔

ویگن کے کنڈے مہر بند ہوتے بلٹی والا سیل دیکھ کر اپنا مال چھوڑا لیتا لیکن ویگن کھولنے کے بعد اس کو اپنا مال کم یا ضائع شدہ ملتا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ ویگن کا کنڈا کھول کر اتنا ڈھیلا کیا جاتا کہ سیل نہ ٹوٹنے پائے لیکن ہاتھ اندر چلا جائے۔ پھر ہاتھ بڑھا کر اندر

جو چیز جس قدر ہاتھ آ جائے چنانچہ آم کے ویگنوں سے ایک ایک کر کے بورے کا بورا آم نکال لیا جاتا۔ ایک بار پسنجر ٹرین کے بریک ڈین میں مچھلی کے بنڈل لدے ہوئے تھے۔ برف کوٹ کر اس میں بڑے بڑے روہو دبائے ہوئے تھے۔ اس پر گارڈ صاحب کی بھی رال ٹپک رہی تھی چنانچہ انھوں نے ایک اسٹیشن پر انجن کے خلاصی کو اسی وین میں بند کر دیا اور ہری جھنڈی دکھا دی۔ ڈرائیور صاحب ٹرین لے کر روانہ ہو گئے۔ راستے میں خلاصی نے پیکنگ کھول کر حسبِ ہدایت مچھلیاں نکال لیں اور اگلے اسٹیشن پر گارڈ صاحب نے اس کو باہر کر دیا، انھوں نے ایک روہو لے لیا اور بقیہ مچھلی لے کر وہ انجن پر آ گیا۔

اس ساری لوٹ میں صرف دو بار میں حصہ دار بنا۔ ایک بار تو ایسا ہوا کہ جب بنارس واپس آ کر انجن سے اترا تو فائرمین نے بہ اصرار میرے ناشتہ دان کے دو ڈبوں میں چینی بھر دی۔ ڈرائیور کے کہنے پر میں نے اسے قبول تو کر لیا لیکن بہت شش و پنج میں پڑا کہ کیا کروں، اسے گھر نہیں لے جانا چاہتا تھا حالانکہ شب برات قریب تھی جب شکر حاصل کرنے کے لیے نہ معلوم کتنے جتن کرنے پڑے۔ اس کو پھینکتے بھی نہیں بنتا تھا۔ چنانچہ وہیں اسٹیشن پر بیٹھ کر ساری شکر گھول کر پی گیا اور اطمینان سے اردلی بازار کو چل پڑا۔

دوسرا واقعہ آم کا ہے۔ ایک ویگن میں بنارس کا لنگڑا بھرا ہوا تھا، ہم لوگ الٰہ آباد جا رہے تھے۔ جب مالگاڑی رکتی خلاصی اور فائرمین ہاتھ ڈال کر کچھ نہ کچھ آم نکال لیتے اور ایک بورے میں بھرتے چلے جاتے۔ اس دوران مجھے جب جب بھوک لگی میں آم کھاتا چلا گیا۔ رات میں کوئی دو بجے ہم لوگ الٰہ آباد پہنچے اور انجن لے کر لوکوشڈ میں گئے تو ایک بورا آم کا بھی مسئلہ تھا، شڈ والے دیکھ لیتے تو وہ بھی حصہ مانگنے لگتے چنانچہ ڈرائیور اور فائرمین نے اس کی بھی تدبیر سوچ لی۔ میرا یوروپین گریڈ تھا اس لیے یوروپین رننگ روم میں ٹھہرنے کا استحقاق رکھتا تھا جو کچھ بہتر تھا اور بستر وغیرہ بھی ٹھیک رہتا۔ آنے جانے والوں کی بھی بھیڑ بھاڑ نہیں ہوتی تھی، بیرے خانسامے بھی اس طرف بلا وجہ جانے سے گریز کرتے۔ بس فائرمین میرے آگے آگے شور مچاتا ہوا چلا کہ صاحب آئے ہیں ان کا کمرہ کون سا

ہے۔فوراً ایک کمرہ میرے لیے کھول دیا گیا میں اس میں داخل ہوگیا تو فائر مین نے بیرے کو ہدایت کردی کہ صاحب کو کھانا وغیرہ یہیں لاکر دینا اور یہاں کسی کو نہ آنے دینا، پھر رات کے اندھیرے میں خلاصی پیٹھ پر لاد کر آم کا بورا میرے کمرے میں لایا اور چارپائی کے نیچے ڈال دیا۔

گاڑی میں انجن جوڑنے سے ایک گھنٹہ پہلے ہم لوگوں کو اپنے انجن کا چارج لینا ہوتا تھا اور اس میں آگ پانی ٹھیک کرکے اسٹیم تیار کرنی ہوتی تھی لیکن اگلے دن جب واپسی کا وقت قریب آیا تو فائر مین نے کہا کہ صاحب تم یہیں رہو ہم لوگ انجن تیار کرلیں گے تو چلتے وقت تم کو بلالیں گے۔ چنانچہ عین روانگی کے وقت خلاصی آیا اور باہر ہی سے پکارتا ہوا آیا کہ صاحب تمہارا راشن کہاں ہے اس کو بھی تو انجن پر لادنا ہوگا یہ کہتے ہوئے اس نے آم کا بورا پیٹھ پر لادا اور روانہ ہوگیا۔ واپسی میں بھی میں حسب خواہ آم کھاتا رہا، بنارس تک۔بس اتنی ہی حرام خوری ہوئی اللہ معاف کرے۔

ایک بار ایسا ہوا کہ ہم رات کی ٹرین لے کر بھٹنی سے بنارس آرہے تھے۔ رمضان شریف کی آخری تاریخیں تھیں۔مئو سے آگے بڑھنے کے بعد ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر جہاں پینے کا پانی بھی موجود نہ تھا گاڑی ٹھہر گئی معلوم ہوا کہ آگے مال گاڑی کا ایک ڈبہ پٹری سے اتر گیا ہے۔ میں نے دیکھا کہ کئی بزرگ صورتیں لوٹے لیے ہوئے پانی کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔سحری کا وقت نکلا جارہا تھا اور پینے کا پانی کہیں نہ تھا۔ میں نے ان لوگوں کو بلایا اور انجن کی ٹنکی میں ہم لوگوں کے استعمال کے لیے جو صاف پانی رہتا تھا اس میں سے ان کو دیا۔

ایک نہایت حیرت خیز واقعہ یہ ہوا کہ جمعۃ الوداع سے ایک روز قبل میری ڈیوٹی بھٹنی جانے کے لیے اس طرح پڑی کہ دوسرے دن یعنی جمعہ کو واپسی ہوتی اور نمازِ جمعہ کے وقت مئو کے آس پاس ہوتا۔ مجھے بہت افسوس تھا کہ رننگ ڈیوٹی میں روزے تو چھوٹ ہی رہے ہیں جمعہ کی نماز بھی گئی۔ خیر رو دھو کر اس خیال سے کہ شاید کہیں نماز کا موقع نکل

ہی آئے روانگی سے پہلے میں نے یہ کیا کہ ایک جوڑا صاف کپڑا اور ٹوپی لے کر کاغذ میں لپیٹ کر ایک تھیلے میں احتیاط سے رکھ لیا کہ انجن پر کوئلے پانی سے خراب نہ ہو۔ ہم لوگ ٹرین لے کر بھٹنی پہنچے رات بھر آرام کیا پھر اگلی صبح ڈیوٹی کے مطابق انجن پر آئے اس کو تیار کیا لیکن جب اسے ٹرین میں لگانے کے لیے شڈ سے لے کر چلے تو وہ اسٹارٹ ہی نہیں ہوا۔ لوکو شڈ کے انجینئر آئے انھوں نے سب جتن کیے لیکن وہ انجن جو پچھلی شام پسنجر ٹرین لے کر آیا تھا اور ابھی تیاری کے وقت تک ٹھیک تھا کسی طرح اسٹارٹ نہیں ہوا، بالآخر طے ہوا کہ کوئی دوسرا انجن ٹرین لے کر جائے گا۔ ہم لوگوں کا انجن وہیں ٹھہر گیا اور اس کے ساتھ ہم لوگ بھی۔ بس میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ خوب اچھی طرح نہایا دھویا قریب ہی ایک مسجد میں جا کر جمعہ کی نماز پڑھی۔ واپس آیا تو معلوم ہوا کہ خالی انجن لے کر بنارس جانے کا حکم ہوا ہے۔ اس کے اسٹارٹ ہونے کے عمل میں خرابی واقع ہوئی تھی اس لیے اس کو کار کی طرح ڈھکیل کر چلانا تھا۔ اس کی مرمت بنارس ہی میں ممکن تھی اس لیے اس کو کسی طرح لانا تھا اپنے سے نہ آتا تو باندھ کر لایا جاتا۔ پائلٹ انجن یعنی خالی انجن کو ایک جنکشن سے دوسرے جنکشن تک کا لائن کلیئر دے دیا جاتا تھا۔

بہرحال ہم لوگ بعد از خرابیِ بسیار دو بجے دن کو انجن لے کر بھٹنی سے روانہ ہوئے جو مئو پہنچ کر رک گیا تو میں نے ڈرائیور سے کہا کہ پرسوں عید ہے میں نے چھٹی لے رکھی ہے اب بنارس پہنچ کر فوراً ہی واپس آنا ہوگا اور یہ خالی انجن جا رہا ہے کسی طرح چلا ہی جائے گا اس لیے اجازت ہو تو یہیں سے گھر چلا جاؤں جو ایک ہی اسٹیشن کے فاصلے پر ہے۔ وہ راضی ہو گیا اور میں مئو میں اتر کر گھر یعنی کوئریا پار چلا گیا اور خوشی خوشی اسی کپڑے میں عید کر لی جس کو الوداع کے خیال سے لے کر گیا تھا۔

عید کے دوسرے دن بنارس واپس آیا۔ میں نے اس ملازمت سے کنارہ کشی کا فیصلہ تو کر ہی لیا تھا لیکن نقطۂ عروج اس دن آیا جب ڈرائیور نے مجھے ایک حکم دیا اور میں اس کی تعمیل نہیں کر سکا۔ ریلوے یارڈ میں دور ایک کنارے پر ریل کی پٹریوں کے درمیان

ایک پختہ گڈھا ہوتا، جب انجن کے زیریں پرزوں کی صفائی اور ان میں تیل وغیرہ ڈالنا مقصود ہوتا تو اس کو وہاں لے جایا جاتا اور خلاصی نیچے گڈھے میں اتر کر ضروری کام انجام دیتا۔ ایسا ہی ایک موقع تھا لیکن بارش کی وجہ سے اس گڈھے میں پانی بھرا ہوا تھا۔ ڈرائیور بڑا سا ایک رنچ لیے ہوئے کچھ کر رہا تھا کہ رِنچ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر اسی گڈھے میں گر گیا۔ میں پاس ہی کھڑا تھا ڈرائیور نے مجھ سے کہا کہ اس میں اتر کر رِنچ نکالو، میں نے صاف انکار کر دیا۔ ڈرائیور نے مجھے تنبیہ کی کہ تمہارا ٹریننگ کا زمانہ ہے ہر کام کرنا ہوگا انکار نہیں کر سکتے۔ پھر خلاصی کو بلا کر رِنچ نکلوایا۔ بس وہ دن میری ملازمت کا آخری دن تھا۔

میں اس کام کی نوعیت سے تو نالاں تھا ہی، قیام گاہ پر بھی عجیب وغریب ذہنی کوفت میں مبتلا تھا۔ سارے لوگ وہائٹ کالر والے چکنے مکنے، دفتری بابو۔ ان کے درمیان میں بالکل اجنبی بن کر رہ گیا تھا۔ اگر کسی ریلوے کالونی میں رہنے کا اتفاق ہوتا تو شاید سوچ کچھ مختلف ہوتی۔ عیسیٰ ماموں نے پاکستان جاتے جاتے مجھ سے کہا تھا کہ کوئلے سے سر پھوڑ لینا لیکن اس نوکری کو نہ چھوڑنا۔ وہ رہتے تو شاید میرے فیصلے پر بریک لگتی، وہ بریک بھی نہ تھی اس لیے میں نے اپنی گاڑی کو دوسری طرف موڑ لیا۔

۱۵/اگست ۱۹۴۷ء کو بنارس سے بھٹنی تک اسٹیشنوں کی سجاوٹ کے سامان جو ریلوے کی طرف سے فراہم کیے گئے تھے میں نے تقسیم کیے۔ ہم لوگوں نے اپنے انجن کو بھی سجانے کی کوشش کی تھی، کیلے کے پورے پورے درخت دونوں طرف باندھے گئے جو بنارس سے بھٹنی تک کے سفر میں ہی سوکھ کر جھناٹا ہو گئے۔ ۱۴/اگست کو صبح دس بجے جو بھٹنی گیا تو رات کو دس بجے واپس آیا بہت تھک گیا تھا سو گیا۔ کب آزادی کا گھڑیال بجا نہیں معلوم۔ آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کی وہ تاریخی تقریر بھی نہیں سنی جو ۱۴/اگست اور ۱۵/اگست کی درمیانی نصف شب کو انھوں نے پارلیمنٹ ہاؤس کے ہال میں کی تھی۔

انھوں نے اس تقریر میں کہا کہ ''جب ساری دنیا سوتی ہے تو ہندوستان بیدار ہوتا

ہے۔'' آج سوچتا ہوں تو حقیقت کا اندازہ ہوتا ہے، جو اس کے برعکس تھی۔ اس وقت نصف کرۂ ارض میں تو دن دوپہر تھا۔ یورپ میں گرمیوں کی شام منائی جارہی تھی، سارے مغربی ایشیا میں غروب کے بعد سے ابتدائے شب کا منظر تھا۔ دوسری طرف مشرق بعید میں آفتاب طلوع ہونے والا تھا۔ اکثر لوگ سو رہے تھے تو ہندوستان میں۔ یہاں پارلیمنٹ ہاؤس میں جمع لوگ جاگ رہے تھے یا وہ بدقسمت ہندوستانی جنھیں خالی پیٹ بھوک کی وجہ سے نیند نہیں آتی تھی۔

سوچتا ہوں کہ سیاست کیسا طلسم سامری ہے جو صریح غلط کو بالکل صحیح ہونے کا یقین دلا دیتا ہے۔ کسی نے اس تاریخی غلط بیانی کی تردید نہیں کی۔

وہائٹ کالر

ریلوے سے سبکدوشی یا کنارہ کشی کے بعد چند ہی دنوں میں خالو جان نے جو کلکٹر صاحب کے اسٹینو گرافر تھے بنارس کچہری کے محکمہ نقل نویسی میں بطورِ نقل نویس ملازمت دلادی اس طرح وقت کا مصرف نکل آیا۔ کچہری کے ہر شعبے میں روزانہ اچھی خاصی آمدنی کے دروازے کھلے ہوتے ہیں۔ ہر مقدمہ برسہا برس چلتا ہے اور ایک عدالت سے دوسری اور دوسری سے تیسری میں منتقل ہوتا رہتا ہے، کوئی اخلاقی معیار نہیں ہوتا۔ پیشکار اور سارے عمال کی دلچسپی صرف مقدمات کی پیشی سے ہوتی ہے کیونکہ ہر پیشی پر سب الگ الگ فیس لیتے ہیں خواہ مقدمے کی سماعت ہو یا نہ ہو، فریقین اپنے کاغذات اور گواہوں کے ساتھ دور دور سے آتے ہیں، صبح سے دوپہر تک وہ وکیل پیشکار کے آگے پیچھے دوڑتے پھرتے ہیں، سب اپنی اپنی فیس وصول کر لیتے ہیں، پھر دن میں کسی وقت فریقوں کو بتادیتے ہیں کہ سماعت ملتوی ہوگئی۔ پھر اگلی تاریخ کا پتہ بتانے کی فیس، حسبِ خواہ تاریخ ڈلوانے کی فیس، فریق ثانی کو پریشان کرنے کے لیے نوٹس سمن وغیرہ جیسی کارروائیوں کی الگ فیس، چپراسیوں کو اور وکیل صاحب کے کارندوں کو چائے پانی کا خرچہ یہ سب ہر پیشی کے دن واجب الادا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے اتنا نفع بخش کاروبار جس میں

اتنے سارے لوگ کام سے لگے ہوں کیونکر ختم ہوسکتا ہے۔ آخر یہ سب لوگ بھی تو اسی سماج کا حصہ ہیں جس میں ہم سب جی رہے ہیں۔ یہی وکلاء جب اپنے فن میں کافی مہارت حاصل کر چکتے ہیں تو سماجی قدروں کی نگہبانی پر مامور ہوتے ہیں۔

مقدمات سے متعلق ریکارڈوں کی نقل کے لیے مقدمات کے فریق ریکارڈ روم میں اسٹامپ پیپر پر درخواست دیتے ہیں (تب فوٹو کاپی یا زیراکس کا چلن نہیں ہوا تھا) ظاہر ہے ان کی کوشش ہوتی ہے کہ ایک ہی آمد میں یہ کام ہوجائے۔ چنانچہ وہ ریکارڈ کیپر کی خدمت کرتے ہیں پھر جب یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ اس کے کاغذات کس نقل نویس کو دیے گئے ہیں تو اس کی پوجا کرتے ہیں تاکہ وہ نقل تیار کر کے تصدیق کے لیے بھیج دے، پھر جس افسر کو تصدیقی دستخط کرنے ہوتے ہیں جو بالعموم ڈپٹی کلکٹر ہوا کرتا ہے اس کے پیشکار کی بھی خدمت کرنی ہوتی ہے تاکہ دستاویزات کی نقول پر جلد مہر تصدیق ثبت کرادے۔ یہ سب مجموعی رقم بہرحال دوبار آمدورفت اور دن بھر کی بھاگ دوڑ کی مشقت کی بہ نسبت کم ہوتی ہے اس لیے ہر مظلوم اس بار کو بہ رضا و رغبت قبول کر لیتا ہے۔ لیکن میں نے نقل نویسی کرتے ہوئے کبھی ایک پیسہ بھی قبول نہ کیا۔ عموماً نقل نویس کو بعجلت کوئی کام نمٹانے پر آٹھ آنے (یعنی پچاس پیسے) مل جاتے۔ اس طرح ۷۲/روپیہ ماہانہ تنخواہ پانے والا کلرک چند روپیہ یومیہ مزید کمالیتا۔

اب بنارس میں میری بےفکری کا نیا دور شروع ہوا۔ خالی وقت میں خالو جان سے شارٹ ہینڈ سیکھنے لگا۔ کچہری میں کہیں ٹائپ رائٹر خالی دیکھ کر ٹائپ کی بھی مشق کرنے لگا۔ ظاہر ہے اس ماحول میں اسٹینوگرافر کی حیثیت سے ملازمت مل جانے کو ایک بڑا نشانہ تصور کیا جاتا تھا۔ میرا ایسا کوئی نشانہ نہیں تھا بلکہ خالی وقت میں کچھ کرتے رہنے والی بات تھی۔ چنانچہ بنارس کے ڈپٹی کمشنر کا اسٹینو رخصت پر تھا تو اس کی جگہ ایک ہفتہ کام کرنے کا موقع بھی ملا۔

کچھ عرصہ بعد یوپی میں ایک نیا فورس پراونیہ رکشک دل (پی آر ڈی) کے نام

سے قائم ہوا۔ یہ بات ۱۹۴۸ء کی ہے۔ اس وقت صاحبزادہ رشید الظفر خاں اے ڈی ایم تھے وہ رامپور کے رہنے والے تھے، لمبے چوڑے سرخ وسفید، اپنی شکل و شباہت اور رہن سہن سے یوروپین معلوم ہوتے تھے۔ سخت اور بدمزاج ایڈمنسٹریٹر تھے، وہی اس فورس کے افسر انچارج تھے۔ ابتداءً کاغذی کارروائی اور فائل وغیرہ رکھنے کے لیے ایک کلرک کی ضرورت ہوئی تو خالو جان نے میرا نام تجویز کر دیا اور میرا تقرر ہوگیا۔ دراصل خالو جان کلکٹر صاحب کے اسٹینو ہونے کی وجہ سے کلکٹری کچہری کے تمام معاملات سے باخبر رہتے تھے اور ان کی بات کوئی ٹالتا بھی نہ تھا کیونکہ ایک تو وہ کافی سینئر تھے اور اچھا نام اور شہرت رکھتے تھے۔ جو کلکٹر بھی آتا ان کے کام سے خوش ہوتا اور انہی کو ترجیح دیتا۔

تو میں پی آر ڈی کلرک انچارج ہوگیا۔ جب سارا ڈھب دفتری ہوگیا تو میں پھر اتوار کے اتوار بنارس سے کوئریا پار جانے لگا۔ مئو اور کہرہٹ کے درمیان تو وہی پرانی ٹرین تھی جو گورکھپور اور دیوریا کی طرف سے آنے پر ملتی تھی لیکن اس طرف سے آنے والے تقریباً ندارد تھے اس لیے کہ ان میں سے بیشتر ریلوے ملازم تھے اور پاکستان کے لیے ہجرت کر گئے تھے۔ رفتہ رفتہ تو ایسا ہوگیا کہ میں تنہا رہ گیا اور ندی کے گھاٹ پر ملاح نے ایک دوبار سمجھایا بھی کہ بابو اب زمانہ بہت خراب ہوگیا ہے رات میں اکیلے نہ آیا کریں لیکن میں اسی طرح آتا جاتا رہا، دو ایک بار اندیشے بھی لاحق ہوئے لیکن ایک واقعہ سنگین ہوا جسے جسارت نہیں حماقت کہنا چاہیے۔

ہوا یہ کہ ۱۹۴۸ء میں دسمبر کا مہینہ تھا کرسمس کے آگے پیچھے کہیں اتوار رہا ہوگا گویا چھٹی دو روز کی ہوگئی ایسے میں گھر جانے سے کون باز رہ سکتا تھا لیکن چھٹی سے پہلے والی شام کو اے ڈی ایم صاحب نے حکم دیا کہ چھٹیوں میں باہر نہ جانا، لکھنؤ ہیڈ آفس سے کوئی تار آنے کا امکان ہے، وہ آئے تو ضروری کارروائی کر دینا۔ میں نے خالو جان کو بتایا تو انھوں نے کہا کہ تمہاری فائلیں کس کمرے میں کہاں ہیں اور کس کاغذ کی طلبی متوقع ہے۔ مجھے بتا دو میں دیکھ لوں گا۔ میں انھیں یہ سب بتا کر اطمینان سے گھر چلا گیا۔ دوسرے روز

۸؍بجے رات کے قریب حسبِ معمول واپس روانہ ہوا تو سردی شدید تھی، اندھیری رات اور کہرے کی وجہ سے ہاتھ کو ہاتھ نہیں دکھائی پڑتا تھا، میرے ساتھ ایک مزدور تھا جس نے میرا بستر اٹھا رکھا تھا اور گاؤں کے ایک عزیز بھی تھے جنھیں گورکھپور جانا تھا، ہم لوگ چل پڑے۔ جب ندی کے گھاٹ پر پہنچے تو کوئی کشتی نہ تھی ملاحوں کی آبادی دوسرے کنارے پر کچھ دور تھی۔ میں نے ملاحوں کو آواز دینی شروع کی لیکن بہت دیر تک چیخنے کے بعد بھی کوئی جواب نہ ملا۔ دراصل ملک کی آزادی کے بعد زمینداروں کا ڈر ان کے دل سے نکل چکا تھا اور اپنا فرض بھی فراموش کر چکے تھے۔

مختار بھائی نے کہا کہ لوٹ چلیں اب گاڑی نہیں ملے گی، صبح پھر چلیں گے۔ میں نے کہا کہ آپ واپس جائیں میں تو اسٹیشن ضرور جاؤں گا۔ یہ کہہ کر میں نے کپڑے اتارے اور دریا میں کود پڑا تاکہ تیر کر اس پار سے کشتی لاؤں۔ آدھی رات کو شدت کی سردی میں برا حال ہوا، دوسرے کنارے پر گھپ اندھیرے میں کشتی بھی مشکل سے ملی، لیکن اس میں چپو نہ تھا جسے ملاح قریب کے کھیتوں میں چھپا دیا کرتے تھے۔ میں نکل کر مٹر کے کھیت میں گیا اور چپو ڈھونڈھ لیا پھر کشتی کو اس کنارے پر لایا، کپڑے مانگ کر پہنے اور کشتی کو پھر پار لے آیا تب تک ٹرین کی گھڑگھڑاہٹ بھی سنائی دی جس کی وجہ سے نہ آگ تاپنے کا موقع ملا نہ ملاحوں سے پرسش کا اور بھاگنا شروع کیا اسی میں بدن گرما گیا۔ ٹرین کے اسٹیشن میں داخل ہونے کے ساتھ ساتھ ہم لوگ بھی داخل ہوئے۔ اگلے دن صبح کو حسبِ معمول بنارس پہنچے۔ خالو جان کو سارا ماجرا سنایا۔ انھوں نے بھی بتایا کہ لکھنؤ سے متوقع تار آیا تھا اور انھوں نے جوابی کارروائی کر دی۔

اے ڈی ایم صاحب نے کلارک ہوٹل میں ایک سوٹ لے رکھا تھا، وہیں ان کا قیام تھا ایک روز دن کے کھانے کے بعد وہیں آرام کر رہے تھے کہ کسی کاغذ پر ضروری دستخط کرانے کی غرض سے میں وہاں گیا کمرے میں جھانک کر دیکھا تو وہ ایک سوفے پر لیٹے لیٹے سو گئے تھے۔ میں نے انھیں جگانا مناسب نہیں سمجھا، لیکن وہ سوفا اور اس پر ان کے

سونے کا انداز آنکھوں میں بس گیا۔ پھر خدا نے وہ دن بھی دکھائے جب میں نے ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں، لندن میں اور امریکہ کے کئی شہروں میں فائیو اسٹار ہوٹلوں کو اپنے قیام کا شرف بخشا ان میں بنارس اور لکھنؤ کے کلارک ہوٹل بھی شامل تھے۔

بہرحال بعد میں اے ڈی ایم صاحب نے ایک ڈپٹی کلکٹر محمود الحسن صاحب کو چارج دے دیا جو نہایت شریف اور مخلص انسان تھے اور آگے چل کر انھوں نے اپنی ہمدردیوں کا اظہار بھی کیا۔ پھر ان کا تبادلہ ہوگیا اور ایک نوجوان ڈپٹی کلکٹر جے این تیواری نے چارج لیا۔ وہ بھی نہایت مہربان تھے، انھوں نے مجھے کئی سرٹیفیکٹ دیے جو بڑے کارآمد ثابت ہوئے۔ انھوں نے میری ملازمت کو بچانے اور ایک عرصے تک جاری رہنے میں بھی مدد کی۔

اب زندگی نے ایک ڈھب اختیار کرلیا تھا۔ اردلی بازار میں گول گھر کے قریب قاضی محمد اختر صاحب کا گھر جس سے چاہے پوچھ لے، ہم لوگ اسی میں رہتے تھے۔ بڑا سا دومنزلہ مکان تھا جس کی زیریں منزل میں ان کے چچا قاضی غلام محی الدین صاحب معہ اہل وعیال رہتے تھے وہ کچہری میں پیشکاری سے ریٹائر ہوئے تھے۔ ان کے بڑے بیٹے جمیل عمر میں مجھ سے تین چار چھوٹے رہے رہوں گے انٹرمیڈیٹ کے طالب علم تھے ان کی دوستی میرے لیے بڑا نیک شگون ثابت ہوئی۔ مکان کی بالائی منزل پر ایک طرف خالہ جان، خالو جان اور دوسری طرف ان کے بہن بہنوئی رہتے تھے۔ بنارس میں خصوصاً اردلی بازار میں اور بھی کئی قریبی اقارب رہتے تھے، جن کا آنا جانا رہتا تھا جیسے کہ خالہ کے بھائی امتیاز احمد صاحب جنھیں میں چھوٹے ماموں کہتا تھا۔ وہ سب انسپکٹر پولیس تھے اور جونپور سے تبدیل ہوکر بنارس آگئے تھے لیکن بنارس آنے سے پہلے وہ ضلع غازی پور کے تھانہ یوسف پور محمد آباد میں تعینات رہ چکے تھے وہاں ان کی تعیناتی کے دوران ایک عجیب واقعہ پیش آیا:

شاہ صاحب

واقعہ یوں ہوا کہ شہر سے کچھ دور ایک گاؤں کے باہر بدمعاشوں سے ایک مڈبھیڑ

میں چھوٹے ماموں زخمی ہوگئے۔ دوسرے دن اس واقعہ کی خبر اخباروں میں چھپی تو ہم لوگ انھیں دیکھنے کے لیے بنارس سے یوسف پور محمد آباد گئے وہاں معلوم ہوا کہ وہ غازی پور کے ہسپتال میں داخل کردیے گئے ہیں۔ ہم لوگ وہاں پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ان کے ماں باپ بیوی سب موجود ہیں اور چھوٹے ماموں کا سارا جسم لپیٹ کی ممی بنا ہوا ہے لیکن دیکھنے سے وہ ہشاش بشاش معلوم ہورہے تھے۔ انھوں نے واقعہ کی تفصیلات بیان کیں اور اِدھر اُدھر چلتے پھرتے بھی رہے۔ اس موقع پر ایک شاہ صاحب کی پُراسرار شخصیت بھی موجود تھی۔ دراصل انھوں نے اس واقعہ سے پہلے ہی سمبھی (میرے نانیہال) پہنچ کر داروغہ جی کے والد کو آگاہ کردیا تھا اور وہ لوگ فوراً ہی روانہ ہوکر غازی پور پہنچ گئے تھے۔

یہ شاہ صاحب کون تھے؟ اس واقعہ سے کئی برس پہلے ایک دن یہ شاہ صاحب سمبھی میں وارد ہوئے تھے۔ درمیانہ قد چھریرے بدن کے آدمی یہی کوئی پچاس کے پیٹے میں۔ رنگ دہکتے ہوئے تانبے جیسا، بھوری بھوری چمکدار آنکھیں، بھورے ہی رنگ کی قدرے لمبی ہلکی داڑھی مونچھیں، ننگے پاؤں، سر پر گیروئے رنگ کی بڑی سی پگڑی جس کے اندر سے جھانکتی ہوئی لمبی لپیٹی ہوئی جٹا، گیروئے رنگ کا کرتا اور لنگی۔ دونوں کانوں میں ہیرے کے لمبوترے آویزے، ہاتھ کی انگلیوں میں مختلف رنگوں کی انگوٹھیاں، کلائی پر لپیٹی ہوئی چھوٹے چھوٹے سچے موتیوں کی لڑیاں۔ ایک بہت چھوٹی سی تھیلی کندھے سے لٹک کر بغل میں دبی ہوئی، ہاتھ میں ایک لمبا سا آہنی چمٹا، دوسرے ہاتھ میں ایک تھیلا۔

جب یہ گاؤں میں وارد ہوئے تو انھیں کسی نے نہ پہچانا، لیکن انھوں نے خود اپنا نام سمیع شاہ بتایا اور یہ کہ ان کے باپ اسی گاؤں کے رہنے والے تھے، جن کا شاہ صاحب کے بچپن میں ہی انتقال ہوگیا تھا پھر ان کی والدہ کا بھی انتقال ہوگیا تو ان کے ماموں انھیں اپنے ساتھ لے کر کلکتہ چلے گئے اور بڑی محبت سے ان کی پرورش کرنے لگے، کسی اچھے اسکول میں ان کا داخلہ بھی کرادیا، جہاں اس زمانے میں انگریزوں کے بچے پڑھا کرتے تھے۔ ایک دن وہ اسکول سے غائب ہوگئے اور سادھوؤں کے ایک گروہ کے نرغے

میں آ گئے۔ رفتہ رفتہ سب لوگ ان کو بھول بھلا گئے اور صبر کر کے بیٹھ گئے۔ وہ عرصہ دراز تک سادھوؤں کے زیر تربیت رہے پھر جنگلوں میں گھومتے پھرتے، فقیروں کے کسی حلقے میں جا پڑے اور ان کے ساتھ کچھ عرصہ بسر کر کے ان کا رنگ بھی پکڑا۔ اسی حلقے سے نکل کر گھومتے پھرتے ایک دن سمبھی کی طرف آ نکلے۔ گاؤں میں ان کی جان پہچان کا کوئی نہ تھا لیکن شیخ سعیداللہ صاحب نے ان کی شناخت کی وہ پرانے آدمی اور گاؤں کے مکھیا تھے، انہی کے بیٹے داروغہ امتیاز صاحب تھے۔

شاہ صاحب نے مہینے دو مہینے انہی کے ہاں قیام کیا، پھر ایک دن علی الصباح اسی طرح یکا یک غائب ہو گئے جیسے نمودار ہوئے تھے۔ اس کے کئی برس بعد ایک دن شام کو پھر نمودار ہوئے اور نانا کو آگاہ کیا کہ تمہارا بیٹا امتیاز بڑے خطرے میں ہے۔ یہ انگوٹھی لے کر فوراً غازی پور جاؤ اور اس کی حفاظت کے لیے اس کو پہنا دو۔ نانا نے کہا کہ آپ خود کیوں نہیں جاتے، چنانچہ وہ اسی وقت غازی پور کے لیے روانہ ہو گئے اور ان کے پیچھے پیچھے نانا، نانی، ممانی وغیرہ۔ یہ لوگ جب پہنچے تو چھوٹے ماموں زخمی ہو کر آ چکے تھے، ان کی کھوپڑی دو طرف سے پھٹ گئی تھی، تین پسلیاں اپنی جگہ سے ہل گئی تھیں، بازوؤں پر بلم کے آٹھ زخم تھے اور سارا جسم کوٹا ہوا تھا۔ ہم لوگ پہنچے تو شاہ صاحب نے بتایا کہ امتیاز کو اس حال میں دیکھ کر میں نے اپنی دوا کا تین قطرہ اس کو پلا دیا ہے اب گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ میں تو اس دوا کا صرف ایک قطرہ ہر سال جاڑوں میں ایک بار پیتا ہوں، یہ پہاڑوں میں کہیں بہت مشکل سے ملتی ہے پھر انھوں نے اپنی بغل میں دبی ہوئی بقچی میں سے ایک چھوٹی سی شیشی نکال کر دکھائی جس میں لال رنگ کی اس دوا کے چند قطرے شہد جیسے گاڑھے باقی تھے۔ ہم لوگ اگلے دن بنارس واپس آ گئے۔

بنارس میں شب و روز اطمینان اور بے فکری کے ساتھ گزرنے لگے۔ صبح ناشتے کے بعد جمیل کے بہنوئی امین صاحب کے ساتھ ایک دو بازی شطرنج کی ہو جاتی۔ پھر کھانا کھا کر کچہری چلا جاتا جو کہ گول گھر کے بالکل سامنے ہی ہے۔ شام کو ناشتے اور چائے کے

بعد پھر شطرنج کی بساط بچھ جاتی جو وقفے وقفے سے رات کے کھانے تک جاری رہتی۔ چھٹی کے دنوں میں صبح سویرے اطراف ومضافات کے باغات میں چڑیوں کے شکار کے لیے نکل جاتے۔ ہم لوگوں کے اقارب میں سے ایک اقبال بھائی تھے جو مرزا پور کی کوتوالی میں تھانیدار تھے، ان کی وساطت سے مرزا پور کے اطراف میں جنگل میں بھی شکار کے مزے لیے۔ خالو جان کے ساتھ یا ان کی وساطت سے پاس لے کر کبھی کبھی سنیما دیکھنے بھی چلے جاتے اس اثناء میں کئی برسوں کے دوران کئی بہت اچھی فلمیں آئیں وہ سب دیکھنے کا موقع ملا یا شاید اس وقت ساری فلمیں اچھی لگتی رہی ہوں کیونکہ وہ عمر کا حصہ ہی ایسا تھا جب ہر طرف ہریالی ہی نظر آتی ہے۔ بلا لائسنس سائیکل، رات کو بلا روشنی سائیکل اور ڈبل سواری وغیرہ کی بنا پر بنارس کے چوراہوں پر پکڑے جاتے رہے اور ٹریفک کے سپاہی چالان کرتے رہے۔ میں درمیانی عمر اور درمیانی رشتے کی وجہ سے چھوٹے بڑے سب کے درمیان فٹ ہوجاتا تھا، چنانچہ امرود کے موسم بھر معمول یہ تھا کہ صبح سویرے جمیل کے ساتھ ندیسر کی کوٹھی تک جاتے جہاں آم اور امرود کے باغات تھے (اب انہی باغات کو صاف کرکے اس جگہ تاج ہوٹل کی تعمیر ہوئی ہے) اپنی پسند کے امرود توڑتے اور باغ والے کو دو آنے دے دیتے (یعنی موجودہ بارہ پیسے) نہار منہ امرود کھاتے ہوئے گھر آتے۔ جمیل کی والدہ جنھیں میں آپا کہتا تھا کیونکہ وہ کوئر یا پار کی لڑکی تھیں، سویرے سویرے امرود کھانے سے روکتیں کہ زکام ہوجائے گا، یہ ہوگا وہ ہوگا، لیکن سنتا کون تھا، اس وقت تو آدھی رات کو دریا میں تیرنے سے بھی کچھ نہیں ہوتا تھا۔ یونہی سردی، گرمی، برسات کے دن رات گزرتے رہے، دنیا کا کوئی غم شریکِ حال نہ تھا۔ تھوڑے پیسے ملتے تھے لیکن ضروریاتِ زندگی بھی محدود تھیں۔

اسی اثناء میں یعنی ۱۹۴۸ء میں پہلا گرم کوٹ بنوایا اور پہنا۔ خالہ نے ایک ہاف سوئیٹر بن کر دیا تو پہلا اونی سوئیٹر پہنا اس وقت تک میں ان تکلفات سے بالکل عاری تھا۔ دفتری معاملات میں یوں ہوا کہ پی آر ڈی کا محکمہ ترقی کرتا جارہا تھا اس کے ڈسٹرکٹ

آرگنائزر اور سٹی آرگنائزر کے سلیکشن کے بعد ان دفتروں کی انتظامی ذمہ داریاں ان کو سونپ دی گئیں، پھر انھوں نے تمام عملہ بھرتی کیا، جب یہ سب کچھ ہو چکا تو ایک دن لکھنؤ سے ایک جی او آ گیا کہ ابتدائی کلرک انچارج کی ضرورت باقی نہیں رہی اس لیے اس کی جگہ کو ختم کر دیا جائے۔

لکھنؤ سے جو کاغذات آتے تھے وہ کلکٹر کے نام آتے تھے، جنھیں کچہری کے ہیڈ کلرک متعلقہ افسروں کے پاس بھیج دیا کرتے تھے۔ چنانچہ یہ جی او آیا تو اس کو پی آر ڈی افسر کے پاس ضروری کارروائی کے لیے بھیجا گیا، ظاہر ہے میری برطرفی کا پروانہ میرے ہاتھ آیا۔ تیواری صاحب کو دکھایا تو انھوں نے کہا کہ اس کا جواب لکھ دو، خالو جان سے جواب تیار کرایا، تیواری صاحب نے اس پر دستخط کے لیے کلکٹر صاحب کے پاس بھیج دیا یعنی پھر خالو جان کے پاس، انھوں نے کچھ تاخیر کر کے لکھنؤ بھیجا۔ یہ کارروائی ایک مہینے میں پوری ہوئی۔ پھر دوسرا جی او آیا وہ بھی انہی مرحلوں سے گزرا۔ ایک مہینہ اور گزر گیا۔ تیواری صاحب واقعی میرے کام سے خوش تھے اور مجھے روکے رکھنا چاہتے تھے۔

میں دوسرے کسی کام کی فکر میں تھا، دریں اثناء ریلوے کے کسی محکمے میں اسامیوں کا اشتہار شائع ہوا۔ میں نے بھی درخواست دے دی، مقابلے کے امتحان میں شرکت کے لیے لکھنؤ طلبی ہوئی۔ جگہیں کم تھیں اور امیدوار بہت۔ کامیاب امیدواروں کی فہرست میں میرا نام نہیں آیا۔ زندگی میں یہ پہلی ناکامی تھی، بڑا جھٹکا لگا۔ بنارس لوٹ آیا، آزردہ اور فکرمند رہنے لگا۔

جمیل مجھ سے بہت قریب آ گئے تھے، ایک عزیز دوست اور ہمدرد بن گئے تھے اور میری اس کیفیت سے وہ بھی متاثر تھے۔ معاً انھوں نے کہا کہ رضوان بھائی انٹر کا امتحان کیوں نہیں دے دیتے وہ اس سال انٹر کے فائنل میں تھے۔ پرائیویٹ امیدواروں کے امتحان کے فارم داخل کرنے کی آخری تاریخ میں بس دو تین دن باقی رہ گئے تھے۔ میں نے اس امکان پر غور کیا تو پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ میں لکھنؤ آمدورفت میں

سارے پیسے خرچ کر چکا تھا، سوال یہ تھا کہ چالیس روپئے امتحان کی فیس کے لیے کہاں سے لاؤں۔ گھر جا کر ابا سے پیسے لینے کا موقع نہ تھا، ادھار کبھی کسی سے لیا نہ تھا، اس کا ڈھنگ ہی نہیں جانتا تھا۔ ایک عالم بے بسی میں بھاگ کر اوپر خالہ کے کمرے میں گیا وہ نیچے تھیں۔ میں ایک چارپائی پر لیٹ گیا اور میری آنکھوں سے بیساختہ آنسو رواں ہو گئے۔ عین اسی وقت جمیل آئے۔ انھوں نے جھانک کر مجھے دیکھا اور الٹے پاؤں واپس گئے۔ انھوں نے خالہ سے معلوم نہیں کیا کہا کہ چند منٹوں میں ہی وہ کھکھلا کر ہنستی ہوئی اوپر آئیں۔ کمرے میں داخل ہوئیں اور میری مٹھی میں لپیٹے ہوئے نوٹ ٹھونستی ہوئی کڑک کر بولیں ''اس میں رونے کی کونسی بات ہے، یہ روپیہ لو، جا کر فارم لے آؤ اور امتحان کی فیس جمع کر دو۔'' ان کی کھکھلاہٹ اور ان کے وہ جملے اب تک میرے ذہن پر نقش ہیں۔ ان کی شفقتیں بے حد تھیں، میرے لیے طرح طرح کے ناشتے تیار کر کے بچوں کی نظر سے دور تالے میں بند کر کے رکھتیں، کنجی کا صرف مجھ کو پتہ رہتا تھا اس لیے شام کو دفتر سے آنے کے بعد اوپر ان کے کمرے میں جاتا اور کھا پی کر نیچے آجاتا۔

اس روز خالہ کے کمرے سے جاتے ہی میں اٹھا اور سائیکل لے کر چوک بھاگا، وہاں سے امتحان میں داخلے کا فارم حاصل کیا، اس کی خانہ پُری کی، تصویر کھنچوائی، دوسرے دن جمیل کے کالج کے پرنسپل سے اپنے سرٹیفکٹوں اور تصویروں کی تصدیق کرائی۔ آخری دن ہونے کی وجہ سے بینک میں فیس جمع کرنا مشکل تھا کسی طرح اس مرحلے سے بھی گزرے۔

بس اسی دن ذہن نے ایک نئی کروٹ لی۔ اس دن سے میرا معمول ہو گیا کہ میں صبح ۳ر بجے اٹھتا چائے بنا کر پیتا اور جمیل کی کتابیں اور کالج کے نوٹس لے کر پڑھتا۔ ۳ر بجے سے ۵ر بجے تک دو گھنٹے روز۔ وقت کی سوئی پھر تیزی سے چلنے لگی۔ امتحان سے کچھ دنوں قبل خالو جان نے میرا اور جمیل کا ٹسٹ لیا اور کہا کہ جمیل فرسٹ آئیں گے اور رضوان سیکنڈ۔ امتحان کا نتیجہ بعینہٖ ایسا ہی ہوا۔ بنارس میں پہلا رمضان انجن میں کوئلہ توڑتے بھٹی جھونکتے گزرا تھا، دوسرا قدرے آرام سے گزرا اور تیسرے رمضان میں انٹر کا نتیجہ نکلا۔

اس سلسلے میں ایک دلچسپ واقعہ قابلِ ذکر ہے۔ میں نے جو مضامین اختیار کیے ان میں جمیل کے مضامین سے ایک فرق یہ ہوا کہ انھوں نے اکنامکس لی تھی میں نے پولیٹکل سائنس لے لی حالانکہ ایسا کرنا مزید مشکلوں کو دعوت دینا تھا کیونکہ اس مضمون میں جمیل کی کتابوں اور نوٹس کی سہولت دستیاب نہ تھی۔ دو ایک کتابیں خرید کر لایا۔ ایک کتاب بھائی صاحب نے کلکتہ سے بھیج دی، گاڑی چل نکلی لیکن میں مطمئن نہیں تھا۔ جمیل سے کہا کہ کسی ایسے لڑکے سے ملا دو جس کا مضمون پولیٹکل سائنس ہو۔ امتحان کے قریب وہ مجھے ایک رئیس زادے کے پاس لے گئے وہ ندیسر کے قریب رہتے تھے۔ ہم لوگ جب ان سے ملے اور عرضِ مدعا کی تو صاحبزادے ہنسے اور خوب ہنسے کہنے لگے کہ بھائی میں پڑھنے پڑھانے کے چکر میں نہیں رہتا میں تو بس امتحان کے سوالات معلوم کر کے انہی میں سے چند سوال اسٹڈی کر لیتا ہوں، چنانچہ اپنے سارے مضامین کے سوالات مجھے مل گئے ہیں چاہو تو پولیٹکل سائنس کے سوالات نقل کر لو اور کسی کتاب سے اس کے جوابات تیار کر لو۔ اندھا کیا چاہے، دو آنکھیں، اس نے دونوں پرچوں کے سوالات مجھے لکھا دیے اور تاکید کر دی کہ کسی کو نہ بتانا یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔ غرض یہ کہ جب امتحان شروع ہوا تو پولیٹکل سائنس کے دونوں پرچے اسی کے نقل کرائے ہوئے آئے۔ اللہ جانے اس کے پاس کونسا مؤکل تھا۔

رمضان کا زمانہ تھا، عین افطار کے وقت جمیل کے ایک کلاس فیلو نے نتیجہ نکلنے کی خبر دی۔ سب کے لیے خوشخبری تھی لیکن اس خبر کے ساتھ ہی مجھے ایسا لگا کہ سناٹا ہو گیا ہے اور میں ہوا میں معلق ہوں۔ بس ایک ہی احساس تھا کہ میں تو کہیں کا نہ رہا، بی اے کے بغیر انٹرمیڈیٹ کی کوئی افادیت نہیں۔ اس احساس نے مجھے بالکل گونگا بہرہ بنا دیا۔ ہر وقت سوچ میں ڈوبا رہتا، کیسا شطرنج اور کیسا شکار۔ اس وقت بنارس میں شام کا کوئی کالج نہ تھا کہ دن میں نوکری کرتے ہوئے شام کو کالج جوائن کر لوں، دفتر کی نوکری بھی بے یقینی کے عالم میں جاری تھی، لکھنؤ سے ہر مہینے میری برطرفی کا آرڈر آتا جو میرے افسر انچارج اور کلکٹر صاحب کے دفتروں میں گھومتا اور اس کا جواب بھیج دیا جاتا۔ امتحان کے قریب میں

نے کچھ دنوں کی چھٹی لی اس اثناء میں جو آرڈر آیا اس پر واقعی ضروری کارروائی کردی گئی تاہم مجھے کافی مہلت مل ہی گئی تھی، دریں اثناء میں نے نوکری چھوڑ کر تعلیم کا سلسلہ جوڑنے کا فیصلہ کرلیا تھا اور انہی امکانات کے تانے بانے جوڑنے میں مصروف تھا لیکن دوسری طرف میرے سارے بہی خواہ کسی نہ کسی طور میرے خلاف صف آرا تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ والد کا اب کوئی ذریعہ معاش نہیں ہے، بھائی، بہن چھوٹے ہیں اور زیرِ تعلیم ہیں ایسے میں مجھے کام نہیں چھوڑنا چاہیے۔ ان لوگوں کو میرا جواب یہ تھا کہ میری تعلیم بہتر ہوئی، آمدنی کے وسائل بہتر ہوئے تو انہی لوگوں کی زیادہ خدمت کرسکوں گا ورنہ اپنے ہی تانے بانے میں الجھ کر رہ جاؤں گا۔ ابا کی بات بہت معقول تھی وہ کہتے تھے بیٹا تم جو کچھ کرنا چاہتے ہو درست ہے لیکن میری مجبوری یہ ہے کہ میں تمہاری تعلیم کی کفالت کیسے کروں گا۔ میرے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔

سوچتے سوچتے دماغ نے ایک راہ تلاش کی۔ کانپور میں جو خالو تھے وہ اپنی لڑکی کی شادی آئندہ کسی وقت جمیل کے ساتھ کرنا چاہتے تھے اور وہ کانپور میں جمیل کے قیام کے متمنی تھے۔ میں نے سوچا کہ اسی اسکیم کو بڑھاوا دیا جائے پھر میں کانپور میں ماموں جان کے ہاں قیام کرلوں گا اور کچھ ٹیوشن وغیرہ کر کے اپنے اخراجات پورے کرلوں گا اور جمیل کی کتابوں سے کام چلالوں گا اس طرح یہ خرچ بچ جائے گا۔ اس اسکیم کے ذہن میں آتے ہی میری توانائیاں پھر بحال ہوگئیں۔ کالجوں میں داخلے شروع ہوگئے۔ یہ سوال زیرِ غور تھا کہ جمیل کا داخلہ کہاں ہو۔ اس سلسلے میں کانپور کا امکان بھی لوگوں کے سامنے تھا لیکن امین صاحب اس رائے سے اختلاف رکھتے تھے۔ ہم اور امین صاحب جس طرح شطرنج کھیلتے ہوئے ایک دوسرے کو قطع کرنے والی چالیں سوچا کرتے تھے اسی طرح زندگی کی عملی بساط پر بھی یہ کھیل خاموشی کے ساتھ جاری ہوگیا۔ میں نے سوچا کہ کانپور جا کر داخلے وغیرہ کے اخراجات معلوم کروں تاکہ اتنے پیسوں کا بندوبست کروں اور خالو کو بھی جمیل کے معاملے میں ہموار کروں لیکن اندیشہ یہ تھا کہ کہیں اسی اثناء میں امین صاحب جمیل کا داخلہ بنارس

یونیورسٹی میں نہ کرادیں۔ خیر، جمیل کو سمجھایا کہ میں کانپور جا کر سب پتہ لگا کر آتا ہوں۔ دو دن میں واپس آجاؤں گا، بس تم اتنا کرنا کہ اس اثناء میں بنارس یونیورسٹی میں ایڈمیشن نہ کرانا۔ پھر رات کی ٹرین سے کانپور چلا گیا۔ وہاں کرائسٹ چرچ کالج میں ضروری معلومات حاصل کیں اور اسی دن رات کی ٹرین سے بنارس واپس ہوا یعنی صرف ایک دن بنارس سے غیر حاضر رہا۔ کانپور سے روانگی کے وقت ممانی جان نے اپنے مخصوص مشفقانہ لہجے میں پوچھا کہ میں پھر کب واپس آؤں گا۔ میں نے ان سے کہا ''تین چار دن میں۔'' لیکن یہ کہتے کہتے میری آواز رندھ گئی اور میں آنسو پونچھتا ہوا باہر نکل گیا۔

رات میں کوئی دو بجے بنارس پہنچا۔ دروازہ کھٹکھٹایا تو جمیل ہی نے دروازہ کھولا۔ میں نے ان سے اتنا ہی کہا ''تمہارا داخلہ ہوگیا نا!'' ان کا جواب تھا: ''ہاں، نوشے بھائی نے کل داخلہ کرادیا۔'' بس اسی وقت میری زبان بند ہوگئی۔ نہ کھانا نہ پینا، اگلے دن میں نے ماموں جان کو لکھ دیا کہ اب میں کانپور نہیں آسکتا۔ میری کیفیت ایک سحر زدہ کی سی تھی۔ تین چار دن اسی کیفیت میں گزرے۔ طبیعت کو ذرا سکون ہوا تو کلکتہ آپا کو لکھا کہ میں نے آپ لوگوں کے کہنے کے مطابق کانپور جانے کا ارادہ ترک کردیا۔ لفافہ بند کیا اور دفتر جانے لگا۔ اتنے میں ڈاکیہ آگیا، اس نے ایک پوسٹ کارڈ دیا جس پر ماموں جان نے صرف چند سطریں تحریر کی تھیں ''معلوم نہیں اتنی جلدی تم نے اپنا ارادہ کیوں بدل دیا، ابھی وقت ہے آجاؤ۔'' ان کی اس تحریر میں گویا اسم اعظم تھا۔ اس نے میرے جسم و جان میں ایک نئی روح پھونک دی اور درحقیقت تقدیر ہی بدل دی۔ میں نے آپا کے بند لفافے کی پشت پر لکھ دیا کہ ابھی ماموں جان کا خط ملا ہے اور میں کانپور جارہا ہوں۔ اسی وقت اپنی نوکری سے استعفیٰ بھی لکھا، دفتر گیا، استعفیٰ حوالے کیا، ڈاک میں خط ڈالا اور گھر آکر سامان باندھ لیا۔ شام کو کوئریا پار کے لیے روانہ ہوگیا تاکہ والدین سے ملاقات کرلوں۔ اگلے دن صبح کوئریا پار پہنچا، دن بھر رہا پھر شام کو بنارس واپسی کے لیے روانہ ہوا۔ ابا مجھے گھر سے کچھ دور تک پہنچانے کے لیے آئے اور رخصت کرتے ہوئے آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا: ''جاؤ

بیٹا خدا تمہاری مدد کرے۔ ایسا نہ ہو کہ تمہیں پچھتانا پڑے۔'' ابا کا یہ جملہ اگلے دو برس تک میرے کانوں میں گونجتا رہا۔ اگلے دن صبح کو میں بنارس پہنچا۔ ایک انجانے جنون کی کیفیت تھی، کچھ خوشی، کچھ اندیشے، وسوسے، انہماک اور فکر مندی۔ اسی عالم میں دن بھر اپنا سامان درست کیا اس اندیشے سے کہ سال بھر کے لیے منجن، شیونگ کا سامان بلیڈ وغیرہ اور کپڑے درست ہو جائیں اور داخلے وغیرہ کے لیے درکار رقم بھی بچ رہے۔ رات کی ٹرین سے بنارس سے روانہ ہو کر اگلے دن صبح کو کانپور پہنچا۔ جولائی ۱۹۴۹ء کی کوئی ایسی ہی تاریخ تھی کہ کالج میں زیادہ تر داخلے ہو چکے تھے، اکا دکا جاری تھے۔ میں جلدی جلدی تیار ہو کر کرائسٹ چرچ کالج روانہ ہوا۔

چلتے وقت ماموں جان نے مجھ سے پوچھا کہ داخلے کے لیے تمہارے پاس روپے ہیں۔ میں نے کہا ''ہاں۔'' میں نے اطمینان کر لیا تھا کہ جس قدر روپیہ درکار ہوگا وہ میرے پاس موجود ہے تاہم ماموں جان نے دس روپیہ مجھے دیا کہ رکھ لو شاید ضرورت پڑے۔ ان کے اصرار پر میں نے وہ روپئے رکھ لیے۔ کرائسٹ چرچ کالج پہنچا سب سے پہلے خواجہ عبدالواجد صاحب کو تلاش کیا جو فارسی کے استاد تھے۔ ماموں جان سے ان کی رسم و راہ تھی۔ کالج کے پرانے اساتذہ میں سے تھے اس لیے ان کا ایک خاص اثر تھا لیکن ان کے طور طریقے کچھ ایسے تھے کہ جب میں دفتر میں پوچھ گچھ کر رہا تھا اس وقت وہ اس طرف آئے گئے لیکن میں نے سمجھا کہ یونہی کوئی ہوگا اور جب ان کا کمرہ پوچھتے ہوئے وہاں پہنچا تو اسی شخص کا سامنا ہوا۔ متوسط قد، گول فربہ جسم، یہی کوئی پچپن چھپن برس کا سِن، داڑھی وہ بھی صرف ٹھوڑی پر اور مونچھیں اتنی باریک ترشی ہوئی کہ بس برائے نام لیکن ان سے سفیدی عیاں، پتلی موری کا ٹخنوں سے اونچا پائجامہ، ڈھیلی ڈھالی سوتی کپڑے کی شیروانی، دفتی والی کپڑے کی ٹوپی اور کرمچ کے جوتے۔ ان کی سماعت تقریباً ختم ہو چکی تھی اس لیے ان سے زور زور سے باتیں کرنی پڑتی تھیں۔ میں نے اپنے بارے میں بتایا تو فوراً مجھے لے کر آفس میں گئے فارم کی خانہ پری کرائی اور غالباً فیس کی معافی کی سفارش

بھی کی جس کی بنا پر میری فیس معاف ہوگئی۔ داخلے کے وقت کلرک نے حساب کتاب کرکے جب مجھ سے کل رقم طلب کی تو وہ میرے حساب سے دس روپیہ زیادہ تھی یعنی ماموں جان نے جو دس روپئے دیئے تھے وہ بھی لگ گئے اور میں جیب اور ہاتھ جھاڑ کر خوش خوش گھر لوٹ آیا۔

اس روز جب میں کالج سے گھر لوٹا تو میری جیب میں ایک پیسہ بھی نہ تھا لیکن میں اتنا خوش اور مطمئن تھا کہ گویا سارا زمانہ جیت کر آیا ہوں۔ وہ میرے لیے ایک نئی صبح تھی، میں نے زندگی کا ایک نیا باب شروع کر دیا تھا۔

لیکن اس سے پہلے قیام بنارس کے دوران اور بھی کئی باتیں ہوئیں، جب میں پی آر ڈی کلرک تھا تو کسی دفتر سے ایک چپراسی آیا کرتا تھا، وہ بہت بوڑھا بنگالی تھا، اس کی داڑھی مونچھیں بڑھی ہوئی تھیں لوگ اس کو بابا کہتے تھے، وہ فوج میں سپاہی رہ چکا تھا۔

اس کو دست شناسی میں بھی کچھ درک تھا۔ ایک روز اتفاقاً اس نے میرا ہاتھ دیکھا تو پکڑ لیا، کہنے لگا بابو تم کو تو بہت دور تک جانا ہے، تم اب تک یہاں کیسے ہو میرے حساب سے تو اب تک چلے جانا چاہیے تھا۔ وہ بات آئی گئی ہوگئی لیکن جلد ہی وہ بات حقیقت بن کر سامنے آئی۔

دوسرا واقعہ یہ ہوا کہ کانپور کے کینال ڈیپارٹمنٹ میں ایک اسٹینوگرافر کی ضرورت تھی۔ ماموں جان نے مجھے تار دیا کہ فوراً آجاؤ میں تار پاتے ہی کانپور گیا۔ اس دفتر میں پہنچا۔ افسر موصوف نے جو کائستھ تھے میرا انٹرویو لیا اور ایک ڈکٹیشن دے کر اسے ٹائپ کرنے کو کہا، میں نے وہیں ٹائپ کرکے دے دیا۔ کچھ غلطیاں ضرور تھیں لیکن انھوں نے خود ہی کہا کہ یہ نروس ہونے کی وجہ سے ہے کوئی بات نہیں تم کل آفس جوائن کرلو۔ میں نے عرض کیا کہ میں نے انٹرمیڈیٹ کے امتحان کی تیاری کرلی ہے اور صرف ایک مہینہ امتحان کو رہ گیا ہے، مجھے جوائن کرنے کے لیے ایک ماہ کی مہلت دے دیں۔ انھوں نے فرمایا کہ کام بہت ہے ہم اس قدر انتظار نہیں کرسکتے دو تین دن کا موقع دے سکتے ہیں۔ میرے

لیے بڑے کٹھن فیصلے کی گھڑی تھی، اس لیے کہ اس زمانے کے اعتبار سے اسٹینوگرافر کی تنخواہیں اچھی ہوا کرتی تھیں اور دوسری بات یہ کہ صاحب موصوف نے خود ہی فرمایا۔ انھوں نے ماموں جان کے پاس کہلایا کہ اس لڑکے کو سمجھا دیں یہ سمجھتا نہیں ہے کہ مسلمانوں کے لیے یہ وقت کتنا سخت ہے، پوچھتا کون ہے، میں تو اس لیے لینا چاہتا ہوں کہ یہ کام ٹھیک کرے گا، ہندو اس وقت آزادی کے نشے میں ہے کام ٹھیک نہیں کرتا۔ میں نے ان کی ہمدردیوں کا شکریہ ادا کیا اور سوچنے کی مہلت لے کر چلا آیا۔ ماموں جان نے مجھ سے پوچھا کہ تم نے کیا طے کیا میں نے کہا کہ انٹر کا امتحان دینے کے بعد سوچوں گا۔

اس زمانے میں مسلمانوں سے ایک عام نفرت تو تھی ہی کیونکہ انھیں تقسیم ملک اور تشکیل پاکستان کا ذمہ دار سمجھا جاتا تھا، دوسری طرف یہ بات تھی کہ مغربی پاکستان سے ہندوستان کی طرف آنے والے رفیوجیوں کا ریلا سارے شمالی ہند میں پھیلتا جارہا تھا ان میں سے کچھ لوگ تو واقعی لُٹ پٹ کر برباد ہوکر آئے تھے، کچھ حالات کے جبر کے تحت ترک وطن کو مناسب سمجھ کر آرہے تھے اور کچھ نظریاتی اعتبار سے ہندوستان آرہے تھے۔ یہ سب آنے والے اپنی تباہی اور بربادی کی داستانیں کچھ واقعی کچھ ہمدردیاں حاصل کرنے کے لیے مبالغے کے ساتھ سناتے اور پھیلاتے جارہے تھے اور عام لوگوں کی ہمدردیاں ان کے ساتھ تھیں آنے والوں میں ہر طرح کے لوگ تھے۔ کاروباری، ملازمت پیشہ، طلبہ اور اہلِ حرفہ، وہ سب اپنے اپنے پیشوں میں جگہ بنانے کی کوششوں میں لگ گئے تھے۔ چونکہ بنارس کی عوامی فضا میں فرقہ پرستی کا زہر زیادہ نہیں گھلا تھا اس لیے ان حالات میں ہمیں اپنے خلاف کوئی خاص بات نظر نہیں آرہی تھی، بس اتنا معلوم ہورہا تھا کہ پاکستان سے آئے ہوئے رفیوجیوں کے ساتھ لوگوں کی عام ہمدردیاں ہیں۔

اسی اثناء میں ریلوے کے سی سی ایم آفس (کلیمس آفس) میں ایک اسٹینوگرافر کی جگہ نکلی۔ میں اس کے لیے انٹرویو میں شریک ہوا۔ ڈکٹیشن میں دو غلطیاں نکلیں لیکن میرا سلیکشن ہوگیا۔ اس کے بعد مجھے میڈیکل اگزامیشن کے لیے بھیج دیا گیا۔ وہاں ڈاکٹر نے

میرے کاغذات دیکھ کر کہا کہ تمہاری عمر تو ۱۸ سال سے کم ہے، صرف دو ماہ کم، اس لیے تم کو نہیں لیا جا سکتا۔ میں چلا آیا۔ کانپور میں کالج جوائن کرنے کے دو ہی مہینے بعد مجھے بنارس آنے کا اتفاق ہوا تو وہاں میرے سامنے دو تجویزیں آئیں:

امین صاحب نے کہا کہ میرے آفس میں وہ جگہ ابھی خالی ہے تم صرف یہ درخواست دے دو کہ میرا ٹیسٹ اور انٹرویو ہو چکا ہے صرف عمر کچھ کم تھی وہ اب پوری ہوگئی ہے۔ اس طرح تمہارا تقرر ہو جائے گا۔ میں نے صاف انکا کر دیا۔ دوسری طرف خالہ اپنی محبت سے مجبور تھیں وہ کہہ رہی تھیں کہ قریب ہی مہارانا پرتاپ کالج میں ایوننگ کلاس شروع ہوگئے ہیں، یہیں آ کر داخلہ لے لو اور تمہارے خالو جان دن میں کوئی کام دلا دیں گے۔ لیکن مجھے نہ معلوم کیسا صدمہ پہنچا تھا کہ کوئی مرہم کام نہیں کر رہا تھا یا کوئی ایسی دھن تھی جس کے سامنے مجھے کچھ اور نظر نہیں آ رہا تھا۔

انٹرمیڈیٹ کے رزلٹ اور کانپور کرائسٹ کالج میں داخلے کے درمیان انتہائی ذہنی کشمکش کے دوران میں نے ایک خواب دیکھا جسے میں نے اپنے لیے رہنمائی تصور کیا اور اس سے مجھے کانپور چلے جانے کا قطعی فیصلہ کرنے اور اس پر قائم رہنے کا حوصلہ ملا۔

☆☆☆

دوسرا ورق

اخبار نویسی

میری اخبار نویسی

ایک بحر بیکراں میں قطرۂ شبنم کے گر کر اس میں ضم ہو جانے کی کہانی کیا، ابدیت کے ناپیدا کنار دھندھلکے میں ایک چنگاری کا وجود ہی کیا تاہم ان کا وجود ایک حقیقت ہے اور ہر حقیقت اپنا اثبات چاہتی ہے۔ یہ ناہموار تحریر اسی اثبات کے ابلاغ کی ایک کوشش ہے جس کا مقصد صرف یہ بتانا ہے کہ اردو صحافت کے شجر سایہ دار کے برگ و بار لانے تک کس کس کے خونِ جگر سے اس کی آبیاری ہوئی۔ کبھی کبھی تشنگانِ علم اپنی پیاس بجھانے کے لیے سمندر کی تلاش میں سراب کو سراب سمجھتے ہوئے بھی اس کی طرف دوڑ پڑتے ہیں ممکن ہے انھیں اس سراب ہی میں شبنم کے چند قطرے مل جائیں۔

صحافت کی تعریف

ہمارے سامنے نصف صدی سے بھی کم عرصہ میں صحافت نے جن بلندیوں کو پالیا ہے ان کے پیش نظر یہ قیاس بھی مشکل ہے کہ آنے والے وقتوں میں اس کی کمند کن کہکشاؤں تک پہنچے گی تاہم مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس بحرِ بیکراں کے بارے میں جسے صحافت کہتے ہیں اپنے خیالات کا اظہار کر دوں۔ صحافت ہے کیا؟ بامقصد صحیفہ نگاری - اگر مجموعی صحافت کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے — خبر اور تبصرہ— تو دونوں جگہ الگ الگ طریقے سے مقصدیت کارفرما نظر آئے گی۔ خبروں کی فراہمی اور ان کے ابلاغ کے لیے

پیشہ وارانہ دیانتداری اور بے کم و کاست بیان کرنے کی شرط ہے جو بذاتِ خود ایک مقصد کی حیثیت رکھتی ہے۔ تبصرہ، تشریح و توضیح وغیرہ اس راہ میں اور آگے بڑھ جاتے ہیں اور مقصدیت سے اس حد تک مشروط ہوجاتے ہیں کہ مقصد ہی ان کی پرکھ کا معیار قرار پاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس ایک لفظ ''صحافت'' میں ایسی پہنائی آتی ہے کہ ایک طرف اس کے ڈانڈے عملی سیاست سے ملتے ہیں تو دوسری طرف ادب و ثقافت، سیاحت و سائنس، اقتصادیات و عمرانیات حتیٰ کہ خرافات تک سے جا ملتے ہیں۔ تحقیقی اور تفتیشی صحافت نے تو اس کو گھس پیٹھ اور خفیہ کاری کی حدوں تک پہنچا دیا ہے۔

لیکن ہم بات شروع کرتے ہیں خبروں کی فراہمی اور ترسیل سے کہ یہی بنیادی عنصر ہے اور صحافت کی عمارت اسی پر کھڑی ہوتی ہے۔ یہ خبریں متعلقہ اخباروں کی زبان میں براہِ راست لکھی جاتی ہیں یا کسی اور زبان سے ترجمہ کی جاتی ہیں۔ گویا صحافت ہندوستانی زبانوں کی ہو یا دنیا کی کسی اور زبان کی، خبروں کے لین دین میں ترجمہ جزوِ اعظم ہے۔ اسی حقیقت کی بنا پر اخبار نویسی میں مترجم کی اہمیت مسلم ہے۔

ترجمہ کی اہمیت کو واضح کر دینا میں نے اس وجہ سے ضروری سمجھا کہ ۱۹۵۱ء میں اسی ترجمہ سے میری اخبار نویسی کا آغاز ہوا۔ جب ہندوستانی اخباروں کو آزادی کی ہوا میں سانس لیتے ہوئے محض چار برس ہوئے تھے اور کوئی پونے دو سو برس کی معتبر اور مستند تاریخ ان کے پیچھے تھی جس پر ایک سرسری نظر بھی ڈالنے سے یہ حقیقت صاف نظر آتی ہے کہ ہندوستان میں صحافت کی ابتدا ہی مقصدیت کے ساتھ ہوئی۔

۱۷۸۰ء میں ہکیز گزٹ کی اشاعت کو اگر ہندوستانی صحافت کی ابتدا قرار دیا جائے تو اس اخبار کی اشاعت کا مقصد واضح تھا یعنی ایسٹ انڈیا کمپنی کے افسروں کی بداعمالیوں کی تشہیر۔ صحافت کی یہی مقصدیت روزِ اول سے اس کے لیے پر صعوبت آزمائشوں کا موجب رہی ہے چنانچہ خود جیمس آگسٹس ہکی کو ان دشوار گزار راہوں سے گزرنا پڑا پھر ہندوستان کی آزادی کے دن تک اور اس کے بعد بھی با مقصد صحافت کا یہی مقدر رہا ہے۔

اگر ہم اور پیچھے جائیں اور عہدِ مغلیہ میں وقائع نگاروں کے رقعات و مراسلات کو اخبار نویسی کی ابتدائی شکل قرار دیں تو بھی مقصدیت صاف عیاں ہے۔ جے۔ بٹراجن نے ہسٹری آف انڈین جرنلزم میں اس طرح کی وقائع نگاری کے ڈانڈے اشوک کے عہدِ سلطنت سے ملائے ہیں۔ ہندوستان میں صحافت کی ابتدا ہم جہاں سے چاہیں کریں دو باتیں صاف ہیں اول مقصدیت اور دوسرے بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ ساتھ مقاصد میں تبدیلی چنانچہ بیرونی تسلط سے نجات کے لیے مقصد نے جنگ آزادی کے دوران ہندوستانی صحافت کو اس جنگ کا قلمی محاذ بنا دیا جس کے دریچے کئی طرف کھلتے تھے۔ ایک طرف سے عوام کو محاذ آزادی کی خبریں فراہم کی جاتیں، دوسری طرف عوام کے احساسات و جذبات سے حکمرانوں کو آگاہ کیا جاتا۔ پھر عوام کو اس جنگ آزادی کے لیے درکار قربانیوں کے لیے تیار کیا جاتا اور اس جنگ کے کمانداروں کا پیغام گھر گھر پہنچا کر ہر چنگاری کو شعلہ جوالہ بنایا جا رہا تھا۔

اگست ۱۹۴۷ء میں ہندوستانی صحافت کی تاریخ میں بھی ایک موڑ آیا۔ عوامی نمائندوں نے قدرتی طور پر یہ طے کیا کہ آزاد ہندوستان میں صحافی کا قلم آزاد ہوگا لیکن یہ وضاحت باقی رہی کہ وہ آزاد قلم کس کی گرفت میں ہوگا اور وہ کس کا ترجمان ہوگا یعنی اخبار کی صنعت میں سرمایہ لگانے والے کی یا میدان صحافت کے شہسواروں کی گرفت میں ہوگا۔ یہ فیصلہ آنے والے وقتوں پر چھوڑ رکھا گیا۔ یہ طے ہونا بھی باقی رہا کہ صحافتی آزادی کی حدیں کیا ہوں گی لیکن یہ صراحت جلد ہی ایک ضرورت بن گئی۔ اس ضمن میں قوانین کا سلسلہ ایک صدی سے بھی زیادہ پرانا ہے۔ جس کی ابتدا ۱۸۶۷ء میں چھاپہ خانوں اور اخباروں کے رجسٹریشن کے قانون سے ہوئی تھی۔ وقتاً فوقتاً اسی قانون میں ترمیمات ہوتی رہیں، مزید براں نئے ضابطے وضع ہوتے رہے اور نئے ادارے بھی تشکیل پاتے رہے۔ رجسٹرار آف نیوز پیپرس کا دفتر اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ ان طول طویل قوانین اور ضابطوں کی تفصیلات میں جانا فی الحال ہمارا مقصد نہیں ہے۔

نوتشکیل اداروں میں سے ایک پریس کمیشن تھا جس نے پہلی بار ہندوستانی صحافت کی مستند اور معتبر تاریخ مرتب کی جو آئندہ تاریخ صحافت ہندو پاکستان پر کام کرنے والوں کے لیے حوالہ جات کا ناگزیر وسیلہ بن گئی۔ اس کمیشن کے ذیلی اداروں نے دوسرا بنیادی کام اخباروں اور اخبار نویسوں کی درجہ بندی کا کیا جس کے نتیجہ میں ٹریڈ یونین طرز کی کشاکش دنیائے صحافت میں داخل ہوئی۔ میں اس وقت اس میدان میں نووارد تھا، صحافت کو ایک پیشہ اور ایک نفع بخش صنعت بنتے دیکھ رہا تھا لیکن ایک بامقصد مشن کے طور پر اس کی کارفرمائیوں کا شاہد نہیں تھا۔

بات آگے بڑھانے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آزاد ہندوستان کی مجموعی صحافت میں اردو صحافت کے مقام کا تعین کر دیا جائے۔ اس سلسلہ میں ضروری ہے کہ الفاظ کو چبائے بغیر صاف صاف بات کی جائے۔ تاریخی حقائق کو بیان کرنے میں کسی لاگ لپیٹ کی یوں بھی گنجائش نہیں ہوتی اور جب بات صحافتی دیانتداری تک پہنچتی ہو تو قلم پر گرفت اور بھی سخت ہونی چاہیے۔

اردو صحافت آزادی کے بعد

چنانچہ آزادی کے بعد ہندوستان سے شائع ہونے والے اردو اخبارات کو دو خاص زمروں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک وہ جن کے مالکان اور بیشتر کارکنان مسلمان تھے اور دوسرے وہ جن کے مالکان اور بیشتر کارکنان غیر مسلم تھے اور بیشتر وہی تھے جو لاہور سے ہجرت کر کے ہندوستان آ گئے تھے۔ پہلے زمرے کے اخبارات دہلی اور ہندوستان کے دیگر شہروں میں بکھرے ہوئے تھے اور اسی دھرتی سے ابھرے تھے، تاہم ان میں سے کئی معروف اخباروں کی ملکیت تبدیل ہوگئی تھی اور اس کے ساتھ ہی ان کے سیاسی رویے بھی بدل گئے تھے۔ بہ الفاظ دیگر ان کی پالیسی بدل گئی تھی۔

مجھے اپنی صحافتی زندگی میں اسی پہلے زمرے سے سابقہ پڑا۔ چونکہ یہ تحریر میری آپ بیتی ہے اس لیے میں نے جو کچھ دیکھا سنا یا مجھ پر جو کچھ گزری اس کی حیثیت اولین یا

ترجیحی ہے اور بقیہ صحافتی دنیا کے حالات و واقعات جن کا سیاق وسباق کے طور پر بیان ہوگا ان کی حیثیت ثانوی ہے، اس لیے انھیں تاریخی دستاویز کا اعتبار نہیں حاصل ہوسکتا نہ ہی یہ اس تحریر کا مقصد ہے تاہم جو جھلکیاں میں پیش کرسکوں گا اس سے ناظرین کو ان حالات کی تفہیم میں مدد ملے گی جن سے مجھے اور مجھ جیسے دوسرے اخبار نویسوں کو گزرنا پڑا۔ ان میں سے بیشتر کو مٹی سمجھا اور برتا گیا لیکن جب وہ اس دنیا سے باہر نکل کر اپنی پرکھ کرانے کے لیے دوسرے پارکھوں کے پاس گئے تو کھرا سونا ثابت ہوئے۔ حقائق پر یہ ایک المناک تبصرہ ہے لیکن اس سے صرفِ نظر بھی کس طرح کیا جاسکتا ہے کہ یہ ہم پر ہمارے اپنے ہی ہاتھوں بیتی ہے۔

من از بے گانگاں ہرگز ننالم
کہ با من ہرچہ کرد آں آشنا کرد

موازنے ہی کی خاطر میں یہ کہوں گا کہ لاہور سے ہجرت کرکے آنے والے اخباروں کی حالت یقیناً سقیم رہی ہوگی لیکن جلد ہی انھوں نے اپنے پاؤں جما لیے کہ ان کے ضمیر پر کوئی بوجھ نہیں تھا اور انھیں ایک نئی زندگی شروع کرنے کی دھن تھی اور حکومت کی ساری مشنری اس کام میں ان کی بھرپور اعانت کے لیے موجود اور مستعد تھی اور اس سے بھی بڑھ کر نجی صنعتیں، جو ان کے لیے اشتہارات کا ایک بڑا وسیلہ تھیں، اور ان کے خریداروں کا ایک بڑا حلقہ موجود تھا (میں نے بالقصد ''قارئین'' کے بجائے ''خریداروں'' کا لفظ استعمال کیا ہے کیونکہ اردو اخبارات خصوصاً مسلم اخبارات کے ''خریداروں'' کی تعداد قارئین کی تعداد کے آٹھویں دسویں حصہ کے برابر ہوتی ہے۔ یہ بھی ایک بڑا المیہ ہے جس کے اسباب ایک سے زیادہ ہیں جن کا تذکرہ کسی موقع سے کیا جاسکتا ہے۔) جوں جوں وقت گزرتا گیا اُن اخباروں کی حالت دیگر قومی اخبارات کی طرح مضبوط ہوتی گئی اور وہ ہندوستانی اخباروں کے اس حلقہ میں شامل ہوگئے جن کو واقعی پوری آزادی اور غیر مشروط آزادی ملی تھی۔ ان کا اپنا قلم تھا جو پوری طرح ان کی گرفت میں تھا۔

دوسری طرف ہمارے اخبارات تھے جن میں سے بیشتر آزادی کے پہلے سے نکلتے آ رہے تھے۔ ان میں سے بعضوں کی پالیسیاں شروع سے ہی نیشنلسٹ تھیں یعنی مسلم لیگ کے سیاسی نظریات کے بالکل مغائر، بعضوں کی پالیسیوں میں تبدیلی ملکیت کی تبدیلی کے ساتھ آئی جن میں 'عصرِ جدید'، کلکتہ بھی شامل تھا۔ بعض ایسے بھی تھے جو اپنی سابقہ پالیسیوں پر قائم رہے لیکن بدلے ہوئے حالات میں لب و لہجہ میں کچھ تبدیلی کر لی لیکن جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں اس وقت اِس زمرے کے تمام اخبارات کے ذمہ داروں کے ذہن پر ایک ناکردہ گناہ کا ذمہ دار قرار دیے جانے کا بوجھ ضرور شامل تھا۔ مثال کے طور پر 'عصرِ جدید' پر مسلم لیگ کی ترجمانی کا کلنک تھا، چنانچہ اس اخبار کا نام آتے ہی ہر کسی کا ذہن پہلے اسی طرف جاتا پھر یاد آتا یا یاد دلایا جاتا کہ وہ خان بہادر شیخ محمد جان کا اخبار ہے جو پکے کانگریسی رہے ہیں۔ ان اربابِ صحافت کے ضمیر صاف تھے لیکن ان کے پیچھے عوامی طاقت کا دباؤ اور وزن نہیں تھا اس لیے کہ ان کے قارئین بھی اسی ذہنی دباؤ کا شکار تھے اور ناکردہ گناہوں کی پاداش میں مبتلا تھے۔

غرض یہ کہ ایک سراسیمگی اور بے سمتی کا عالم تھا۔ ایسے میں نہ تو اخبارات صحیح رہنمائی کا فریضہ انجام ادا کر سکتے تھے نہ قارئین ان کو تقویت پہنچا سکتے تھے۔ آزاد ہندوستان کے آزاد اخبارات جب بھرپور زرگری کی دوڑ میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کر رہے تھے ہمارے زُمرے کے اخبارات کے حصے میں صرف دریوزہ گری آئی تھی، مالی اعتبار سے، سیاسی اعتبار سے اور دانشوری کے اعتبار سے بھی۔ کیونکہ دولت کی تقسیم میں مساوی حصہ کا مطالبہ کرنے کی ان میں جرأت نہیں تھی اور جب وہ خود اپنا حصہ نہیں پا رہے تھے تو دوسروں کو ان کا حصہ کہاں سے دیتے۔ یہ ہے پس منظر ہماری آپ بیتی کا۔ باایں ہمہ بہت کچھ ممکن تھا۔ آخر کاغذ کی قیمت دی جاتی تھی، نیوز ایجنسی کے واجبات اور بجلی کے بل ادا کیے جاتے تھے، ہاکر کا کمیشن دیا جاتا تھا اور بھی بہت سارے اخراجات پورے کیے جاتے تھے۔ کام کرنے والے اخبار نویسوں کے حصہ میں کچھ نہ آنے کی بات

دراصل بے شعوری کی تھی، ایک غیر ہمدردانہ بلکہ بے رحمانہ رویہ کی بات تھی۔

چنانچہ جب میں اپنی صحافتی زندگی کے ابتدائی دور کا تصور کرتا ہوں تو کانپ جاتا ہوں۔ حیران ہوکر سوچتا ہوں کہ مسلمان سرمایہ داروں نے اپنے ہونہار نوجوانوں کے ساتھ ایک ابتلا اور آزمائش کے دور میں جو سلوک روا رکھا کیا تاریخ میں کبھی کسی اور قوم کے صاحبِ ثروت طبقے نے ایسا کیا ہوگا! شاید نہیں! آزادی کے بعد سرزمین ہند پر برپا ہونے والے طوفانوں میں جڑوں سے اکھڑی ہوئی حیران و پریشان ملت کے افراد، سروں پر گرد سفر اٹی ہوئی، چہرے ملول، دماغوں میں خواب پریشاں کا بوس بن کر سارے وجود کو لرزہ براندام کیے ہوئے، مستقبل تاریکیوں میں گم۔ ان بھیڑوں کا اگر کوئی رکھوالا تھا تو بھیڑیے تھے، کچھ اپنے اصلی چہروں میں اور کچھ اپنے چہروں پر معصومیت کی نقابیں ڈالے ہوئے۔

اردو اخبار اور اردو صحافت خودغرضی کی علامت جسے نہ خود راستے کا پتہ، نہ منزل کی پہچان، رہنمائی کیا کرتی۔ کاش یہ اخبارات نہ ہوتے کہ ان کے چلتے جتنے نوجوانوں کا خون ہوا وہ تو بچ جاتے، کوئی اور راہِ زندگی اختیار کرتے، دونوں ہاتھوں سے کچھ کر دکھاتے۔ اگر مارے جاتے تو کم سے کم اپنوں کے ہاتھوں مارے جانے کا غم لے کر تو نہ جاتے غیروں نے مارا تو مار دیا۔

رئیس الدین فریدی، ایڈیٹر روزنامہ ہند، کلکتہ، اپنی اخبار نویسی کی کہانی میں لکھتے ہیں ''سچی بات صرف یہ ہے کہ اردو اخبار نویسی کو میں جو کچھ دینا چاہتا تھا وہ اس وجہ سے نہ دے سکا کہ اس کی باگ ڈور زیادہ تر ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں دیکھی جن کا ذہن تاجرانہ تھا اور جن سے علوئے اخلاق کی امید رکھنا بیکار تھا۔'' فریدی صاحب کے مضامین کا یہ سلسلہ ۱۹۸۶ء میں 'آزاد ہند'، کلکتہ میں شائع ہوا۔

۱۹۵۰ء اور ۱۹۶۰ء کے عشروں میں ایک اردو اخبار کے کالم میں 'اسٹیٹمین' کے اداریہ کا ترجمہ روز شائع ہوا کرتا تھا کیونکہ پروپرائٹر صاحب کو اسٹیٹمین کا اداریہ پڑھنے کا بڑا شوق تھا اور اسے پڑھنا چاہتے تھے اپنی زبان میں چنانچہ اس کا بلا ناغہ ترجمہ ہوا کرتا تھا۔ کیا

آج کوئی یقین کرسکتا ہے کہ اس اداریہ کے ترجمہ کا معاوضہ ایک روپیہ یومیہ تھا۔

کسی طرح کی باتنخواہ چھٹی کا کوئی دستور نہ تھا، چھٹی ہمیشہ بلاتنخواہ ہوا کرتی تھی۔

صحافیوں کو ہدایات جاری کرنے کے لیے کوئی ان پڑھ مامور کیا جاتا تھا تاکہ اس کو یہ اندازہ نہ ہوسکے کہ ایک دن میں چھ کالم یعنی اردو اخبار کے ایک صفحہ میں سمانے والے مواد کا (اس زمانے میں کلکتہ کے اردو اخباروں کے ایک صفحہ میں چھ کالم ہوتے تھے اور ہر کالم کی طوالت ۱۸ انچ ہوتی تھی) روز ترجمہ کرنے والے پر کیا گزرتی ہے وہ بھی ایسے میں کہ جب اسے تیسوں دن بارہ مہینے یہی کرنا پڑے۔ یہی نہیں—

سنا ہے کہ اگلے وقتوں میں زمیندار کھیت میں کام کرنے والے مزدوروں کو اجرت میں مٹر دیا کرتے تھے تاکہ وہ گھر لوٹتے وقت راستے میں کھاتے بھی جائیں اور کچھ ان کے پھٹے کپڑوں میں سے گرتی جائے اور اسی طرح ان کے گھر پہنچے پہنچتے مٹر آدھی رہ جائے تاکہ وہ اگلے دن کام پر ضرور آئیں۔

اسی طرح اردو اخبار نویس کو اجرت اتنی کم دینے کا دستور تھا کہ وہ اپنی کم سے کم ضرورتیں بھی پوری کرنے کے لیے صبح یا شام کے کسی اور اخبار کا دست نگر رہے، جزوی کام نسبتاً کم اجرت پر کرسکے اور نوکری بھی پکی نہ ہو، چنانچہ ہر اخبار نویس کی نوکری دونوں طرف ناپختہ، چادر سے سر اور پیر دونوں ڈھانپنے کے لیے کتنے جتن کرنے پڑتے تھے اس کا تذکرہ کسی طور ممکن نہیں۔ لیکن ابراہیم ہوش، ایڈیٹر ''آبشار'' کلکتہ کی یہ عبارت بھی قابلِ توجہ ہے جس کا اشارہ آزادی سے بہت پہلے اردو اخبار نویسوں کی کیفیت کی طرف ہے—

''اس زمانے میں اخبار میں کام کرنے والوں میں سب سے زیادہ خستہ اور قابلِ رحم حالت مترجمین کی ہوا کرتی تھی۔ وہ مترجم بڑا خوش نصیب سمجھا جاتا تھا جسے کبھی کبھی اپنی سر توڑ خدمات کے معاوضہ میں کچھ رقم مل جایا کرتی ورنہ عموماً انھیں زیادہ تر مفت کام کرنا پڑتا۔''

ہوش صاحب کے مضامین کا یہ سلسلہ ۱۹۸۳ء میں روزنامہ ''اقرأ'' کلکتہ میں شائع ہوا۔

فریدی صاحب اپنی اخبار نویسی کی کہانی میں کم وبیش اسی زمانے کے بارے میں

لکھتے ہیں: ''اخباروں کے مالک تو اس حالت میں بھی کافی کما لیتے تھے مگر اخبار نویسوں کی حالت قابلِ رحم تھی۔ کام کا کوئی وقت مقرر نہ تھا۔ ہر شخص کو زیادہ سے زیادہ کام کرنا پڑتا تھا جو اکثر آٹھ سے دس گھنٹے تک ہو جاتا تھا۔ اجرت روزانہ ملنے کا بھروسہ نہ تھا۔ بڑی منت سماجت کے بعد ہی ملتی تھی۔ کسی دن چھٹی ہوتی تو وہ بھی غائب۔ عید بقرعید کی چھٹی بھی یوم ماتم ہو جاتی تھی۔'' ''اچھے سے اچھے ایڈیٹر اور مترجم کی تنخواہ دو روپیہ ایک ایک روپیہ روز ہوتی تھی۔''

آغاز داستاں

گرمیوں کے دن تھے کہ ایک روز رفیق عابدی صاحب مجھے ساتھ لے کر اپنے مخصوص انداز میں مسکراتے ہوئے 'عصرِ جدید' کے دفتر میں داخل ہوئے۔ آفس میں ایک صاحب اوسط درجہ کی ایک میز کے سامنے دیوار کی طرف پشت کیے ہوئے کرسی نشین تھے۔ قمیص، سیدھا پائجامہ اور سیاہ رامپوری ٹوپی پہنے ہوئے اپنے مختصر قد وقامت اور معمولی جسامت کے ساتھ تن کر بیٹھے ہوئے تھے۔ عابدی صاحب نے ان کو منیجر صاحب کہہ کر مخاطب کیا اور سلام کلام کے بعد میرا تعارف کرایا۔ ''یہ میرے عزیز ہیں، بی۔اے۔ پاس ہیں، کام کی تلاش میں ہیں، انھیں 'عصرِ جدید' میں ترجمہ کا کچھ کام دے دیں۔'' کچھ ابتدائی باتوں کے بعد منیجر صاحب نے فرمایا: ہاں کہہ دیجیے کچھ کیا کریں میں خان بہادر صاحب سے اجازت لے لوں گا۔ یہ بات جون/ جولائی ۱۹۵۱ء کی ہے۔

اجازت مل گئی، یہ کہ روز آ کر تجربہ کے طور پر کچھ ترجمہ کیا کریں۔ حامد محمود نیازی صاحب نیوز ایڈیٹر تھے انہی کی نگرانی میں اس مشقت کی ابتدا ہوئی۔ بسنت کمار چٹرجی ان کے معاون تھے اور سید محمد مصطفیٰ صابری صاحب کا نام بطور ایڈیٹر اخبار کی پیشانی پر چھپتا تھا۔ جب میرے تجرباتی عمل پر ایک ماہ کی مدت گزر گئی تو میں نے دبتے دبتے منیجر صاحب سے دریافت کیا کہ کچھ پیسے ویسے کی بھی بات ہوگی تو انھوں نے فرمایا: ہاں خان بہادر صاحب سے وہ بھی پوچھ لوں گا۔

چنانچہ انھوں نے خان بہادر صاحب سے وہ بھی پوچھ لیا۔ حکم ہوا کہ گزشتہ مہینہ تو صرف تجربہ کا تھا اور فی حال کوئی جگہ نہیں ہے۔ لیکن (از راہِ کرم) کام سے لگائے رکھنا ہے لہٰذا اسٹیٹمین کے ایڈیٹوریل کا ترجمہ روز کر دیا کرو سو میں کرنے لگا جو 'عصرِ جدید' کے ''افکار و آراء'' کے کالم میں اگلے دس بارہ برس تک چلتا رہا۔ اس کی اجرت ایک روپیہ یومیہ یعنی تیس روپیہ ماہانہ طے پائی، جس میں امتدادِ زمانہ کے ساتھ کوئی فرق نہیں آیا۔

میرے کرم فرما اور بزرگ عابدی صاحب کا اسمِ گرامی محمد رفیق عابدؔ زاہدی تھا۔ دراصل عابدؔ تخلص تھا اور وطنی نسبت ضلع بلیا (یوپی) میں واقع ایک موضع زاہدی پور سے تھی۔ ان کی پیدائش قریب ہی واقع موضع شیخپور میں غالباً ۱۹۱۳ء میں ہوئی تھی۔ وہ نشورؔ واحدی صاحب کے ہم وطن، قریبی عزیز اور ہمعصر ہی نہ تھے بلکہ خود بقول عابدی صاحب (وہ اسی نام سے اخباری دنیا میں جانے پہچانے جاتے تھے) وہ اور نشورؔ صاحب ایک ہی گاؤں میں ایک ہی روز پیدا ہوئے تھے۔ اس زمانے کے دستور کے مطابق مدرسوں میں عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ خطاطی کے استاد تھے۔ کلکتہ اور بمبئی جیسے شہروں میں ان کے فن کا سکہ چلا۔ کتابیں لکھتے، اخباروں میں کالم لکھتے اور خود ہی کتابت کرتے، شعر و شاعری سے بھی خاصی دلچسپی تھی اور استادانہ قدرت کلام حاصل تھی۔

عابدی صاحب کے ابتدائی حالات مجھے زیادہ نہیں معلوم ہیں لیکن ۱۹۴۰ء کی دہائی کے اوائل میں بلیا میں ان کا چھاپہ خانہ تھا۔ اس زمانے میں جعفر علی خاں اثرؔ وہاں کے کلکٹر تھے چنانچہ ان کی محفلوں میں عابدی صاحب کی بھی رسائی تھی۔ انھوں نے اپنا مجموعہ کلام عابدی صاحب کے پریس میں طباعت کے لیے دیا جب وہ چھپ گیا اور انھیں پیش کیا گیا تو کہیں کہیں اپنے اشعار میں اصلاح دیکھ کر خان صاحب چراغ پا ہو گئے۔ سارے مطبوعہ کو اسی وقت نذرِ آتش کرنے کا حکم دیا اور عابدی صاحب کو سابقہ تعلقات کی بنا پر ضلع چھوڑ کر چلے جانے کے لیے ۲۴ گھنٹے کی مہلت دی۔ پریس وغیرہ سب بند ہو گیا۔

عابدی صاحب بلیا سے شہر بدر ہو کر گورکھپور میں فروکش ہوئے اور وہاں سے

''رفیق'' اخبار نکالا لیکن وہاں زیادہ عرصہ تک نہیں ٹھہرے اور کانپور آ گئے، وہاں سے ''رفیق'' کا اجرائے ثانی کیا غالباً وہ ۱۹۴۲ء کا زمانہ تھا، میں اسکول کا طالب علم تھا۔ اپنے ماموں جان مولوی حفیظ الرحمٰن صاحب ایمنؔ کے سایہ عاطفت میں پل بڑھ رہا تھا۔ ان کی سسرال موضع شیخپور میں تھی، اس طرح عابدی صاحب سے قربت اور قرابت تھی۔ دوسری قرابتیں بھی تھیں یعنی ان کی ہمشیرہ میرے والد کی ممانی تھیں۔ عابدی صاحب نے کانپور کب چھوڑا اور کہاں کہاں رہے مجھے نہیں معلوم، لیکن ۱۹۵۱ء میں وہ کلکتہ میں ملے تو پرانی شفقتوں کا مظاہرہ کیا جس کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہا۔

عابدی صاحب بلا کے ذہین تھے۔ غزلیں اور نظمیں فی الفور کہتے تھے۔ نثر نگاری پر قدرت کا یہ عالم تھا کہ شام کے ایک اخبار ''انگارہ'' میں جو غازیؔ اصلاحی نکالتے تھے عابدی صاحب نے ایک ناول قسط وار لکھنا شروع کیا تو بلا کسی مسودہ کے روز شام کو ''انگارہ'' کے دفتر میں جاتے اور کتابت والا کاغذ دو کالم اٹھاتے اور کتابت والی روشنائی سے لکھتے چلے جاتے۔ کہانی، پلاٹ، کردار سب کچھ ان کے ذہن میں محفوظ رہتا۔ بعد میں اس ناول کو ''معرکۂ شام'' کے نام سے کتابی شکل میں بھی شائع کیا۔

عابدی صاحب نے اپنے قیامِ کلکتہ کے دوران وہاں کے سارے معروف اخباروں میں کام کیا پھر ۶۰ء کے عشرہ میں بمبئی چلے گئے اور وہاں کے اخباروں اور طباعتی اداروں میں کام کرتے رہے تا آنکہ ۸۰ء کے عشرہ کے وسط میں ضعیفی اور ضعف بصر کی وجہ سے اپنے وطن زاہدی پور واپس چلے گئے۔ ان کے بڑے صاحبزادے محمد شفیق نے میراث سنبھالی وہ بحیثیت خوش نویس ''انقلاب'' بمبئی سے وابستہ رہے۔

ابراہیم ہوش، ایڈیٹر ''آبشار'' کی ایک تحریر جو ان کے سوانح کا حصہ ہے حال ہی میں میری نظر سے گزری جس میں یہ دیکھ کر میری حیرانی کی انتہا نہ رہی کہ ۱۹۳۲ء میں ایک طالب علم کی حیثیت سے اخباری تحریروں پر ان کی حوصلہ افزائی کرنے والی شخصیت بھی عابدی صاحب کی تھی۔ لکھتے ہیں:

''تلاش بسیار کے بعد میری نظر پھر ایک ہفتہ وار جریدے پر پڑی جس کا نام ''سروش'' تھا۔ اس کا دفتر چونا گلی یعنی فیرس لین اور سرینا تھ بابو لین کے نکّڑ پر ایک گلی کے اندر واقع مکان میں تھا۔ چنانچہ ایک روز میں ایک مضمون لکھ کر ''سروش'' کے دفتر میں پہنچ گیا۔ دفتر کیا تھا بس ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جو رہائش اور دفتر دونوں کا کام دیتا تھا۔ جب میں اپنا مضمون لے کر ''سروش'' کے دفتر میں پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک صاحب اکڑوں بیٹھے ہوئے پیلے رنگ کے کاغذ پر کچھ لکھ رہے ہیں۔ میں نے ان صاحب سے دریافت کیا کہ ''سروش'' کے ایڈیٹر صاحب کہاں ہیں؟ تو انھوں نے کہا کہ فرمایئے میں ہی ''سروش'' کا ایڈیٹر ہوں..... میں نے بلاتکلف اپنا مضمون ان کے ہاتھوں میں تھما دیا۔ ایڈیٹر صاحب نے وہ پیلا کاغذ جس پر وہ لکھ رہے تھے ایک طرف رکھ کر میرا مضمون پڑھنا شروع کیا اور کہا کہ بیٹھ جایئے .....اس کے ساتھ ہی انھوں نے کسی لڑکے کو آواز دی اور جب وہ آیا تو اس سے کہا کہ وہ دو پیالی چائے لائے۔ ایڈیٹر صاحب کی اس خوش اخلاقی سے میں بے حد خوش ہوا اور میرے دل میں ان کی بے پناہ عزت بڑھ گئی۔ میرا مضمون پڑھ لینے اور چائے پی لینے کے بعد انھوں نے مجھ سے مضمون کے بارے میں گفتگو شروع کی۔ ان کی یہ گفتگو میری بڑی حوصلہ افزائی کا باعث ہوئی۔

''سروش'' کے ان ایڈیٹر صاحب کا نام تھا 'رفیق عابدی زاہدی'۔ جب تک ''سروش'' نکلتا رہا میرے مضامین اس میں شائع ہوتے رہے اور زاہدی صاحب سے میرا ربط ضبط بڑھتا رہا۔ گو میں عمر میں ان سے بہت چھوٹا تھا بلکہ یہ کہیے کہ وہ جوان اور ان کے مقابلے میں میں طفلِ نادان تھا لیکن انھوں نے کبھی مجھ سے ایسا برتاؤ نہیں کیا جس سے میرے اندر یہ احساس پیدا ہو کہ بڑوں سے ملنے میں مجھے حفظِ مراتب کا خیال رکھنا اور بے تکلفانہ گفتگو سے احتراز کرنا چاہیے۔ ''سروش'' کچھ دنوں نکلنے کے بعد بند ہوگیا لیکن رفیق عابدی زاہدی صاحب کلکتہ کے آسمانِ صحافت سے غائب نہیں ہوئے بلکہ ان کا نام ہر جگہ لیا جاتا رہا۔''

لیکن مجھے لے کر جو صاحب عابدی صاحب کے پاس گئے تھے وہ جابر

فیروز پوری تھے جن کا نام عبدالجبار تھا۔ جابرؔ قلمی نام اور فیروز پور جو کہ ضلع سارن (بہار) میں ایک موضع ہے ان کا وطن تھا۔ وہ کلکتہ کے متعدد اخباروں کے شعبۂ اشتہارات سے وابستہ تھے اور میرے بہنوئی شاہ محمد امین الدین صاحب سے کچھ قرابت رکھتے تھے اور ان کو ''امین ماموں'' کہتے تھے۔ جابرؔ فیروز پوری نے خود بھی ایک پرچہ ''نباض'' کے نام سے نکالا تھا۔ یہ ۱۹۵۰ء کے عشرہ کے اوائل کی بات ہے وہ یونس نظری کے ہفتہ وار ''کندن''، ''کارواں'' اور ''ایشیا'' کے لیے بھی کام کرتے تھے۔

اس سلسلے کی ایک دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ کسی صاحب نے ''ایشیا'' ہفت روزہ نکالا تھا، لیکن جابرؔ فیروز پوری نے مجھ سے اس کا اداریہ لکھنے کے لیے کہا اور دس روپیہ فی اداریہ اجرت طے پائی۔ میری شرط یہ تھی کہ ہر اداریہ کی اجرت نقد لوں گا اور اس میں ناغہ ہوا تو لکھنا بند کردوں گا۔ چنانچہ کچھ عرصہ تک لکھتا رہا۔ جب کچھ پیسے باقی لگ گئے تو میں نے لکھنا بند کردیا اور جب پیسے کا تقاضہ کیا تو جابرؔ صاحب نے کہا کہ بھائی اشتہارات کی رقوم وصول نہیں ہورہی ہیں لیکن ایک کلاتھ اسٹور والے نے اشتہارات کی قیمت کے عوض کچھ کپڑے دیے ہیں اگر چاہو تو اس میں سے لے سکتے ہو۔ چنانچہ ایک شرٹ اور ایک پینٹ کا کپڑا میں نے لے لیا اور اس طرح حساب بے باق ہوگیا۔

تو میں نے 'عصرِ جدید' میں باقاعدہ ترجمہ کا کام شروع کردیا۔ اس اخبار سے ایک غیر شعوری انس تھا جس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ ۱۹۴۶ء کے فسادات کے زمانے میں 'عصرِ جدید' کے ایڈیٹر مولانا عبدالجبار وحیدی پولیس کی گولی سے شہید ہوئے۔ اس طرح 'عصرِ جدید' کے نام سے ایک ہمدردانہ لگاؤ ذہن کے کسی گوشے میں راسخ ہوگیا۔ اس وقت اخبار کے مالک مولانا شائق احمد عثمانی تھے اور اخبار کی پالیسی خالص مسلم لیگی تھی۔ آزادی کے بعد اس اخبار کے معاملے میں سب کچھ برعکس ہوگیا یعنی خان بہادر شیخ محمد جان صاحب نے اس کی ملکیت کے حقوق خرید لیے اور اخبار کی پالیسی کانگریسی ہوگئی۔ میں نے اسی اخبار میں قسمت آزمائی شروع کی۔

فریدی صاحب اپنی اخبار نویسی کی کہانی میں لکھتے ہیں:

''.....اب عصرِ جدید بند ہو چکا تھا۔ کافی دنوں بعد اس کے حقوق ملکیت کلکتہ کی ایک ممتاز سیاسی اور تجارتی ہستی خان بہادر شیخ محمد جان مرحوم نے حاصل کر لیے اور اسے کانگریس کا حامی بنانے کی کوشش کی مگر اس کام میں انھیں بڑی دشواری پیش آئی کیونکہ قوم پرستانہ خیالات کے لوگ مسلم لیگ کے سیلاب میں بہہ چکے تھے۔ انھوں نے ادارت کی پہلی ذمہ داری حکیم حسن احمد عباسی کو دی .....مگر انھوں نے قلم کی وہ جولانی دکھائی کہ خان بہادر کو پسینہ آ گیا اور بڑی مشکل سے ان سے چھٹکارا حاصل کیا اس کے بعد اس اخبار میں ایڈیٹروں کی بھرمار رہی۔ لوگ آتے تھے اور کسی نہ کسی وجہ سے نکال دیے جاتے تھے اسی لیے برسوں تک اخبار پر مولانا عطاء الرحمٰن قدسی کا نام ایڈیٹر کی حیثیت سے آتا رہا اگرچہ ان کا تعلق خان بہادر کے ادارہ دارالاشاعت اسلامیہ سے تھا۔''

میں نے ابتدا تو صرف ''افکار و آراء'' کے کالم کے لیے اسٹیٹمین کے اداریہ کے ترجمہ سے کی تھی جس کی اجرت ۳۰ روپیہ ماہانہ طے پائی تھی اس کو سن کر بھائی صاحب بے حد برافروختہ ہوئے کہنے لگے کہ تم وہاں بھیک لینے گئے ہو کیا گھر میں فاقہ ہو رہا تھا وغیرہ وغیرہ لیکن میں نے ان باتوں کی کوئی پروانہیں کی اور کام جاری رکھا۔ اس ترجمہ میں میرا کئی گھنٹہ وقت صرف ہو جاتا پھر حامد صاحب (نیوز ایڈیٹر) اس پر نظرِ ثانی کرتے ان کی قطع و برید کے بعد میں اس کو صاف نقل کرتا۔

جلد ہی گرمی کی چھٹیوں کے بعد یونیورسٹی کھل گئی مجھے اسی کا انتظار تھا کیونکہ میری سوچ بدل چکی تھی۔ میں ایم اے میں داخلہ کو پہلا مقصد سمجھتا تھا اور خالی وقت میں کام کی حیثیت ثانوی تھی۔ سائیکالوجی میرا پسندیدہ مضمون تھا، لیکن کلکتہ یونیورسٹی میں یہ سائنس کا مضمون شمار کیا جاتا تھا، چنانچہ ایم ایس سی میں داخلہ کے لیے سائنس کالج میں فارم داخل کر دیا۔ مگر داخلہ پانے والے امیدواروں کی فہرست میں میرا نام نہیں آیا۔ مجھے اس کا کوئی ملال نہ ہوا اور سوچا کہ چلو اگلے سال پھر کوشش کریں گے اس اثناء میں کام کرتے رہیں

گے۔ اس فرصت کے احساس نے اخبار میں کام کے ثانوی مقصد کو اولیں مقصد بنا دیا۔

اس وقت یہ احساس ہی نہ تھا کہ وقت کیسے دبے پاؤں گزرتا ہے۔ گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ ذمہ داریوں میں کیا اضافے ہوتے ہیں، سہاروں میں کیا کمی واقع ہوتی ہے۔ میری دوسری بے حسی یہ تھی کہ ملک کی آزادی اور تقسیم کی وجہ سے مسلمانوں کی عام بے سروسامانی اور بے سمتی کسمپرسی بہ الفاظ دیگران کے تیسرے درجے کا شہری اور ناقابلِ التفات فرقہ بلکہ مشکوک خلقت کی حیثیت کو تسلیم کرنا تو دور کی بات میں اس کو سمجھنے کے لیے بھی تیار نہ تھا۔ میرے داخلی اور خارجی رویہ میں نہ کوئی تشکیک تھی نہ بے اعتمادی نہ میں نے کوئی گناہ کیا تھا نہ احساسِ گناہ رکھتا تھا۔ اس لیے کیا مسلم اور کیا غیر مسلم، کیا بنگالی اور کیا غیر بنگالی سب سے ملاقات اور گفتگو میں میں بالکل بے خوف رہتا تھا۔ ایک خاص بات یہ ہے کہ اگر انسان کو خود اپنی ذات پر اعتماد ہو تو وہ دوسروں میں بھی اعتماد پیدا کرتا ہے اور متاثر کرتا ہے۔ براہ کلکتہ مشرقی پاکستان اور وہاں سے واپس ہندوستان آنے جانے والوں کا سلسلہ جاری تھا۔ ہم لوگوں کے دور نزدیک کے رشتہ دار ملاقاتی کلکتہ میں رات دو رات یا ضرورت کے تحت اس سے زیادہ بھی قیام کرتے لیکن یہ سب میرے لیے معمول کی بات تھی۔ مجھے تو پھر ایک سال انتظار کرنا تھا۔

چنانچہ میں نے پوری توجہ 'عصرِ جدید' میں کام پر صرف کی۔ میرے ذمہ پورا کام دے دیا گیا یعنی چھ کالم یومیہ۔ اس زمانے میں کلکتہ کے اردو اخباروں کے ایک صفحہ میں چھ کالم ہی ہوا کرتے تھے۔ مگر میرے چھ کالم میں دو کالم ''افکار و آراء'' کے شامل تھے۔ تنخواہ -/۹۰ روپیہ ماہانہ طے ہوئی۔ رفتہ رفتہ صرف افکار کا کالم دن کو رہا بقیہ کام رات کی شفٹ میں منتقل کر دیا گیا۔ مگر رات کے کام میں میرا سابقہ حامد صاحب کے بجائے بسنت کمار چٹرجی سے پڑا اس لیے کہ حامد صاحب کی جگہ انہی کو نیوز ایڈیٹر بنا دیا گیا تھا۔ اس کی کہانی بھی دلچسپ ہے۔

خان بہادر صاحب کا معمول یہ تھا کہ دن میں دس بجے کے قریب اپنے آفس

واقع ۸۰نمبر کولوٹولہ اسٹریٹ میں آجاتے اور وہیں اپنے سارے کاروباری معاملات سے نپٹتے نپٹاتے جو کہ بڑے متنوع تھے یعنی بنیائن کے کارخانے سے لے کر مکانات کے کرائے، محمد جان ہائی اسکول اور اخبارات کے معاملات۔ ''اخبارات'' اس لیے کہ نومبر ۱۹۵۱ء میں شام کا اخبار ''امروز'' بھی ان کی ملکیت میں نکلا۔ میں اور مصطفیٰ صابری اس کے بنیادی کارکن تھے۔ منیجر قاضی اقبال احمد کا نام ''اقبال اعظمی'' بطور مدیر ''امروز'' کی پیشانی پر چسپاں ہوا۔ یہ انتظام عارضی تھا پھر اقبال کلکتوی کی خدمات حاصل کی گئیں اور انہی کو سرکاری طور پر ''اقبال اعظمی'' قرار دیا گیا۔ کچھ عرصہ بعد ان کو سبکدوش کر دیا گیا اور اس خلا کو اقبال اکرامی نے پر کیا جو اس زمانے میں آزاد ہند میں پروف ریڈر تھے اور مزاحیہ کالم ''نمکدان'' بھی لکھا کرتے تھے۔

خان بہادر صاحب مغرب کی نماز کولوٹولہ کی مسجد میں ادا کرنے کے بعد مولانا حکیم محمد زماں حسینی صاحب کے مطب میں آجاتے اور کچھ دیر وہاں ٹھہرتے۔ ان کا مطب ۸۰نمبر کولوٹولہ کی لق دق بلڈنگ کی نچلی منزل کے ایک گوشہ میں واقع ہے اور اب بھی مرجع خلائق ہے جہاں مولانا حسین احمد مدنیؒ اور مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ جیسی جید شخصیات سے لے کر ہمارے جیسے ہماشما سب حاضر ہوتے اور حکیم صاحب ان سب کے ساتھ حسبِ حیثیت سلوک کرتے وہ مسجد کولوٹولہ میں نماز فجر کے بعد تفسیر قرآن بیان فرماتے۔ مجھے بڑی حیرت ہوتی کہ حکیم صاحب اپنے مطب کے اطراف میں غیر معمولی شوروشغب کے باوجود اپنے ذہن وفکر کو اس قدر مجتمع اور مرکوز کس طرح کرتے ہیں کہ مریضوں کے حالات، مطب کے معاملات اور درس کے سلسلے میں مطالعے پر پوری توجہ صرف کرتے ہیں اور ہمہ وقت موجود اصحاب سے مخاطب بھی رہتے ہیں۔

خان بہادر صاحب وہاں سے اٹھ کر 'عصرِ جدید' کے دفتر نمبر ۹-بی بولائی دت اسٹریٹ میں آتے۔ اس بلڈنگ کی زیریں منزل میں ایک طرف 'عصرِ جدید' کا دفتر تھا اور دوسری طرف ایک ہسپتال یا ڈسپنسری اور بالائی دو تین منزلوں میں محمد جان ہائی اسکول۔ اسی

عمارت کی پہلی منزل پر ایک کمرہ 'امروز' کے لیے وقف کر دیا گیا تھا لیکن سال دو سال بعد 'امروز' بھی 'عصرِ جدید' کے کمرے میں اتر آیا کیونکہ 'امروز' کا کام صبح کو ہوتا تھا اور 'عصرِ جدید' کا کاروبار دوپہر سے رات کے آخری حصہ تک ہوا کرتا تھا۔

خان بہادر صاحب کوئی آدھ گھنٹہ یہاں قیام کرتے۔ یہ ایک طرح سے ان کی تفریح تھی کیونکہ کاروباری معاملات تو دفتر میں دن ہی میں نپٹائے جاتے تھے۔ یہاں چائے آتی تھی اور ایک دربار کا سماں ہوتا جس میں منیجر اقبال صاحب، مصطفیٰ صابری صاحب، اقبال کرامی صاحب اور ایک آدھ ملنے ملانے والے موجود ہوتے۔ اس اثناء میں اخباروں کے موازنے ہوتے۔ اردو اخباروں نے کس خبر کو کس طرح پیش کیا، خبروں میں اسٹیٹمین کی کس حد تک نقل کی گئی یعنی انگریزی کے اس اخبار نے کس خبر کو لیڈ بنایا اور 'عصرِ جدید' کے نیوز ایڈیٹر نے اس کے مقابلے میں کیا کیا وغیرہ وغیرہ۔ اسی نشست میں 'عصرِ جدید' اور 'امروز' کے کارکنوں کی تقدیروں کی فیصلے بھی کیے جاتے، خطا کار صفائی کے لیے طلب کیے جاتے، کبھی ڈانٹ ڈپٹ کے ساتھ معافی پاتے اور خطا ناقابلِ معافی ہونے کی صورت میں فوری برطرفی کے احکام صادر ہوتے جس کی اپیل کے لیے زمین پر کوئی اور عدالت عالیہ نہیں تھی۔ اس کے باوجود میں اٹھارہ برس چپکا رہا۔ بڑے نشیب و فراز سے گزرا، بڑی اٹھا پٹک ہوئی لیکن شام کے اس دربار میں کبھی باریابی کا شرف نہیں حاصل ہوا نہ مجھے اس کی طلب ہوئی نہ میں کبھی کسی خطا پر طلب کیا گیا۔ معاملات ہوئے بلاشبہ سنگین ہوئے لیکن دونوں طرف سے انھیں معاملے کے طور پر نمٹا گیا۔

جن لوگوں کا سرسری سماعت والی اس عدالت میں جھٹکا کیا گیا ان کی فہرست لمبی ہے، کچھ نام اس طور ہیں:— یونس احمر، خلیل عباس صدیقی، اسرائیل احمد، ش مظفر پوری، ولی اللہ، محمد عثمانی، اختر ملیح آبادی، حامد محمود نیازی، بسنت کمار چٹرجی، محمود راہی، وہاب اشرفی، سید ظفیر الحسن، سید محمد مصطفیٰ صابری، فاتح فرخ، رئیس جعفری، ناظر الحسینی، جاوید نہال، شہزاد منظر، محمود ایوبی، اقبال کلکتوی، شہاب لکھنوی، راز عظیم، شفیع نشاط، نیاز اعظمی،

مطیع الرحمٰن، ادریس الحق، مشتاق احمد، سجاد نظر، بدر عالم نظامی وغیرہ۔ ان حضرات میں سے کئی ایسے ہیں جو ایک سے زیادہ بار 'عصرِ جدید' یا 'امروز' میں تقرر اور برطرفی کی لذتوں سے آشنا ہوئے، ان میں اپنے وقت کے جید صحافی، ادیب اور شاعر اور اساتذہ، کوئی خوش رو، کوئی خوش خو، خوش وضع شامل تھے ان سب قسمت کے ماروں کی مٹی پلید ہوئی۔ کسی کی جوانی میں کسی کی بوڑھاپے میں۔ یہ قسمت کے مارے ایک اخبار سے دوسرے میں جاتے پھر وہاں سے نکالے جانے پر پھر پہلے میں واپس آتے، کسی تیسرے میں قسمت آزمائی کرتے۔

یہ ایذا رسانی سے لذت کوشی کا ادنیٰ درجہ کا کھیل تھا، کبھی شیر کے پنجرے میں آدمی ڈالنے کا کھیل تھا، پھر آدمی کو سانڈ سے لڑانے کا، پھر کتوں کو کتوں سے، بھیڑوں کو بھیڑوں سے، مرغوں کو مرغوں سے، بٹیروں کو بٹیروں سے لڑا کر لہولہان کرنے اور ان کی اذیت سے لطف اندوز ہونے کے مشاغل تھے اب صرف ناکافی پیسوں بلکہ بھیک کے دام پر اپنی چربی سے چراغ روشن کرنے والوں کو اس سے بھی وقتاً فوقتاً محروم کر کے ان کے کرب سے لطف لینے کی گنجائش رہ گئی تھی۔

ٹریڈ یونین کی تحریک تو ہندوستان میں آزادی سے پہلے ہی اپنی جڑیں راسخ کر چکی تھی لیکن اس کے سائے سوتی ملوں اور کچھ دوسرے بڑے بڑے کارخانوں ہی تک پہنچے تھے۔ جنگ آزادی میں اخباروں کا جو ایک کلیدی رول تھا اس نے انھیں ایک خاص اعزاز و اعتبار بخشا تھا اس لیے ان کے دامن تک ٹریڈ یونین کے ہاتھ پہنچنے میں آزادی کے بعد مزید کئی برس لگ گئے۔ اس کی ایک الگ کہانی ہے۔

ذہنی عیاشی کی ایک قسم اور تھی۔ اردو اخباروں کے فکاہیہ کالموں میں جن کا مقصد ہلکا پھلکا طنز و مزاح پیش کرنا تھا، گالی گلوچ تک ہونے لگی تھی۔ 'عصر جدید' میں دو کالم 'فکاہات'' کے تھے جن میں بے حساب خرافات ہوتی تھی۔ 'روزانہ ہند' میں اسی طرح کے دو کالم 'کہنے کی باتیں' ہوا کرتے تھے جن میں ساری ناگفتنی باتیں ہوا کرتی تھیں۔ 'آزاد ہند' کے کالم ''نمکدان'' میں نمکپاشی کے ساتھ کچھ مرچیں بھی ملا دی جاتی تھیں لیکن اصل مقابلہ

'عصرِ جدید' اور 'روزانہ ہند' کے درمیان بہ الفاظ دیگر خان بہادر صاحب اور 'روزانہ ہند' کے اس وقت کے مالک طیب بھائی ظریف کے درمیان ہوتا تھا۔ سیاسی اعتبار سے دونوں ہی کانگریس پارٹی سے وابستہ تھے، اس لیے ان کی چشمک یا رقابت کاروباری تھی۔ ایک عرصہ تک ان دونوں فریقوں کی نمائندگی مصطفیٰ صابری اور ش مظفر پوری کرتے رہے جسے ''پراکسی وار'' کہا جاسکتا ہے یعنی بھاڑے کے لڑنے والوں کی نوک جھونک اور گالی گلوج تک۔ش صاحب 'روزانہ ہند' چھوڑ کر پٹنہ چلے گئے تو ان کی جگہ کسی اور نے سنبھالی اور اقبال اکرامی صاحب 'آزاد ہند' کے ''نمکدان'' سے فارغ ہوکر 'امروز' کی ادارت پر مامور ہوئے تو انھوں نے صابری صاحب سے ''فکاہات'' کا چارج لیا۔ چند سال بعد انھوں نے 'عصر جدید' کی اداریہ نگاری کا چارج بھی لے لیا اور صابری صاحب 'عصرِ جدید' سے سبکدوشی کے بعد 'آزاد ہند' میں چلے گئے۔

ابراہیم ہوش کی ایک تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ 'عصر جدید' اور 'روزانہ ہند' کی چشمک جوگالی گلوج کی حدوں تک پہنچ گئی تھی کچھ نئی نہ تھی بلکہ ان اخباروں کے نئے مالکوں کو ورثہ میں ملی تھی جب آزادی سے پہلے 'عصر جدید' کے مالک مولانا شائق احمد عثمانی تھے اور دوسری طرف 'روزانہ ہند' میں مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی، لیکن اس وقت ان دونوں اخباروں کا یا ان کے پسِ پشت قلمی جنگ کا بڑا سبب سیاسی تھا۔ ایک سراسر مسلم لیگی اور دوسرا سراسر کانگریسی۔ ہوش صاحب لکھتے ہیں:

''عصرِ جدید مسلم لیگ کا حامی اور ترجمان اور روزانہ ہند کٹر کانگریسی، قوم پرست اور مسلم لیگ کا جانی دشمن تھا اس لیے ان دونوں اخباروں کے درمیان چشمک، رقابت، اختلاف، عداوت اور نفرت ناگزیر تھی۔ مولانا ملیح آبادی ان تمام (شخصیات) کا مضحکہ اڑاتے اور ان کا ذکر استہزائیہ انداز میں کرتے جو کانگریس کی مخالف ہوتیں اور عصرِ جدید اس کا جواب دینے کے ساتھ خود مولانا ملیح آبادی کی ذات پر چوٹ کر جاتا اور انھیں نکو بنانے کی کوشش کرتا..... روزانہ ہند اور عصرِ جدید کی اس قلمی جنگ میں میں نے بھی

تھوڑا بہت حصہ لیا۔ ..... میں نے 'فریاد کی کوئی لے نہیں ہے'' کے عنوان سے روزانہ ہند میں فکاہیہ لکھنا شروع کر دیا۔ میں نے اس کالم کے ذریعہ اس جنگ میں اچھا خاصا حصہ لیا جو روزانہ ہند اور عصرِ جدید کے درمیان جاری تھی اور وہ ناشائستگی کی اس حد تک پہنچ گئی تھی کہ دونوں اخبارات یہ محسوس کر رہے تھے کہ کوئی باوقار شخصیت بیچ میں پڑ کر ذاتیات کی اس جنگ کو بند کرادے اور صلح کی طرح ڈالے ..... یہ صلح کرائی مولانا عبیداللہ سندھی نے ..... پہلے وہ شائق احمد عثمانی سے ملے اور انھیں زجر و تنبیہ کی اور اس کے بعد مولانا ملیح آبادی کو پھٹکارا کہ یہ لغویت بند ہونی چاہیے۔ غلط یا صحیح میں نے یہ بھی سنا کہ مولانا عبیداللہ سندھی ان دونوں اخبارات کے مالکوں کے استاد رہ چکے ہیں اور دونوں ہی ان کا بے حد احترام کرتے ہیں۔''

(رئیس الدین فریدی ایڈیٹر روزانہ ہند اپنی ''اخبار نویسی کی کہانی'' میں لکھتے ہیں کہ مولانا شائق احمد عثمانی ''مجاہد حریت مولانا عبیداللہ سندھی کے خاص شاگرد تھے۔'')

ابراہیم ہوش نے ۱۹۳۸ء کا وہ واقعہ نقل کیا ہے جب انھوں نے خود ''روزانہ ہند کے دفتر میں دیکھا کہ مولانا عبیداللہ سندھی ایڈیٹر کی کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے اور سامنے کی کرسی پر گردن جھکائے بیٹھے ہوئے مولانا ملیح آبادی کو بلند آواز سے سخت سست کہہ رہے تھے یہ دیکھ کر میں الٹے پاؤں بھاگا۔''

فریدی صاحب لکھتے ہیں: ''جس زمانے میں میں اخبار نویسی میں داخل ہوا اس زمانے میں اخباروں کا معیار زیادہ بلند نہ تھا۔ آپس میں گالی گلوچ عام تھی جس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ اخبار نویس ایک دوسرے کی صورت سے بیزار تھے۔''

ایک زمانے تک اقبال اکرامی صاحب صبح کو 'عصرِ جدید' کا اداریہ اور فکاہات ایک سلسلہ سے لکھ دیا کرتے اور شام کو آ کر اگلے دن کے 'امروز' کا اداریہ لکھ دیتے۔ میں کبھی کبھی ازراہِ مذاق کہتا تھا کہ اکرامی صاحب کا کمال ہے کہ ایک ہی نشست میں اداریہ اور فکاہیہ سب لکھ دیتے ہیں اس سے بحث نہیں کہ کیا لکھتے ہیں کالم تو پُر کر دیتے ہیں وہ بھی

اس خوبصورتی کے ساتھ کہ جو عبارت جس کالم میں چاہو چسپاں کر دو۔

خیر! میں نے 'عصرِ جدید' میں اور 'امروز' میں بھی ملا کر ایک سال پورا کر لیا تو یونیورسٹی کا نیا سیشن شروع ہونے پر پھر داخلہ کی طرف مائل ہوا۔ مچھوا بازار پھل منڈی کے عقب میں ۱۶ نمبر سید صالح لین میں رہتا تھا، وہاں سے دس منٹ کا راستہ 'عصرِ جدید' کے دفتر کا تھا تو دوسری طرف دس ہی منٹ کا راستہ کلکتہ یونیورسٹی کا بھی تھی لیکن ایڈمیشن سائنس کالج میں لینا تھا وہ دور تھا۔ بہرحال ایک سال اخباروں میں گزار کر بہت کچھ دیکھ سن چکا تھا اس لیے خیال ہوا کہ پوری تیاری کے ساتھ داخلہ کی کوشش کرنی چاہیے یعنی فارم کو کسی سفارش کے ساتھ پیش کرنا چاہیے۔ اب سفارش کہاں سے لاؤں، ایسے کسی شخص سے دید شنید نہ تھی۔ ایک نام ذہن میں آیا وہ شخصیت تھی مولانا سعید احمد اکبرآبادی کی جو اس وقت مدرسہ عالیہ، کلکتہ کے پرنسپل تھے۔ ان سے ایک سرسری ملاقات تھی۔ میں ان کے پاس حاضر ہوا اور اپنی روداد اور مدعا بیان کیا۔ انھوں نے نہایت بے مہری سے ایک جملہ میں جواب دیا۔ ''میاں اس وقت مولانا آزاد بھی مسلمانوں کے لیے کچھ نہیں کر سکتے میں کس شمار میں ہوں۔'' ایک زمانہ گزر جانے کے بعد آج بھی ان کا وہ جملہ میرے ذہن پر نقش ہے اور اس اثناء میں اکثر یاد کرتا رہا ہوں۔

یہ درست ہے کہ میرا سیاسی شعور تیز نہ تھا لیکن یہ بھی درست ہے کہ میں مسلمان ہونے کی وجہ سے کسی کمتر حیثیت کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھا اس لیے میں آج تک اپنی اس رائے پر قائم ہوں کہ اُس وقت حالات خواہ کچھ بھی رہے ہوں ایک پختہ کار شخص کو ایک حوصلہ مند نوجوان کے حوصلوں کو اس طرح نہیں توڑنا چاہیے تھا۔

میں ان کے دفتر سے سیدھا سائنس کالج گیا اور اپنا داخلہ فارم جمع کر دیا اور پھر نتیجہ کا انتظار کرنے لگا۔ نتیجہ سامنے آیا۔ فہرست میں میرا نام نہیں تھا۔ میں سائیکالوجی کے ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ کے دفتر میں پہنچا اور دوبارا اپنی ناکامی بیان کی، انھوں نے نہایت ملائمیت سے سمجھایا کہ اس میں ہماری مجبوریاں یہ ہیں کہ نشستیں محدود ہیں ہم اولیں ترجیح

کلکتہ یونیورسٹی کے طلبہ کو دیتے ہیں پھر لا کالج کے ان طالب علموں کو جن کا مضمون سائیکالوجی ہوتا ہے اس کے بعد دوسری یونیورسٹیوں کے طلبہ کے لیے گنجائش نہیں رہ جاتی۔

میں یونیورسٹی سے واپس چلا آیا اور دل شکستگی کے سبب طے کرلیا کہ کسی اور مضمون میں آئندہ تعلیم نہیں حاصل کروں گا حالانکہ آگے چل کر فارسی کے صدر شعبہ ڈاکٹر محمد اسحاق صاحب سے ملاقات ہوگئی تھی اور وہ نہایت شفقت کا اظہار کرتے تھے۔ ایک دو بار انھوں نے فارسی میں ایم اے کر لینے کا مشورہ بھی دیا لیکن طبیعت اس طرف نہیں آئی، ہاں ایران سوسائٹی میں کچھ دنوں جدید فارسی سیکھنے کے لیے جایا کرتا تھا۔ غرض کہ 'عصرِ جدید' کی مشقتیں جاری رکھتے ہوئے کسی معقول ملازمت کی تلاش شروع کر دی۔

اسی اثناء میں خیال ہوا کہ کیوں نہ ایک سفر ڈھاکہ کا کر کے اس طرف بھی حالات کا جائزہ لوں۔ پاسپورٹ ویزا وغیرہ کی قید نہ تھی چنانچہ ایک دن شام کی ٹرین سے ڈھاکہ کے لیے روانہ ہوگیا۔ وہاں میرے نانیہالی گاؤں سمبھی کے اعجاز احمد صاحب تھے جنھیں میں ماموں کہتا تھا نیشنل کاربن کمپنی، کلکتہ سے ٹرانسفر ہوکر گئے تھے انہی کے ہاں پہنچ کر دو روز قیام کیا۔ وہیں شبیر ماموں سے بھی ملاقات ہوئی جو اس وقت غفار گاؤں کالج کے پرنسپل تھے بعد میں سندھ یونیورسٹی، حیدرآباد میں چلے گئے۔ شبیر ماموں نے مشورہ دیا کہ ڈھاکہ چلے آؤ۔ اگر تعلیم جاری رکھنا چاہو گے تو یونیورسٹی میں داخلہ کرادوں گا اور کام کا بھی کچھ بندوبست ہوجائے گا لیکن نہ معلوم کیوں میں اس شہر کو پسند نہیں کرسکا اور تیسرے ہی دن کلکتہ واپس چلا آیا۔

ادھر ہمارے والدین بالخصوص بڑی بہن کو یہ خوش فہمی ہوگئی کہ لڑکا کام سے لگ گیا ہے اب جو دوسرا ضروری کام ہے وہ اس کی شادی کرنا ہے۔ رشتے تو اِدھر اُدھر سے آ ہی رہے تھے صرف طے کرنے کی بات تھی۔ ضلع بلیا کے موضع چندائر میں بڑی پھوپھی کی پوتی کا رشتہ بھی زیرِ غور تھا۔ وہ ان کی تین یتیم پوتیوں میں سے سب سے بڑی تھیں۔ آپا کلکتہ سے کوئر یا پار آئیں اور بلا کسی قیل قال کے وہاں مٹھائی بھیج دی جو کہ رشتہ کی منظوری کا

سگنل تھا۔ اتنا ہی نہیں، ابا سے تاریخ وغیرہ طے کرا کے بھائی صاحب کو لکھ دیا کہ وہ مجھے لے کر کوئر یا پار آ جائیں۔ چنانچہ ۳؍جولائی ۱۹۵۲ء کو میں اس رشتہ میں بھی جکڑ گیا اور شادی کے کوئی آٹھ دس روز بعد کلکتہ واپس آ گیا۔

اس طرح میری ذمہ داریوں میں اضافہ ہو گیا لیکن اس حقیقی اضافہ سے زیادہ اس کا احساس ہو گیا کہ اب سو ڈیڑھ سو روپیہ میں کچھ ہونے ہوانے کا نہیں۔ آمدنی میں کچھ اضافے کی ایک صورت ٹیوشن کی تھی چنانچہ جابر فیروز پوری کی وساطت سے ڈاکٹر غزنی تک رسائی ہوئی جن کی غزنی فارمیسی کولوٹولہ اسٹریٹ میں تھی ان کے دونوں بیٹوں کو شام کو ایک گھنٹہ پڑھانے لگا۔ پھر اسی سڑک پر انگریزی دواؤں کی دکان امین اینڈ اسماعیل کمپنی میں امین صاحب کے دو لڑکوں کو صبح کے وقت پڑھانے لگا۔ یہ دونوں ٹیوشن کچھ عرصہ تک جاری رہے۔ تھوڑے دنوں مرغی ہٹہ میں سلیمان واؤڈا صاحب کے دو بیٹوں کو بھی پڑھایا۔ ان ٹیوشنوں سے مجھے اخبار کی بہ نسبت کچھ زیادہ ہی پیسے مل جاتے تھے۔

شہر کے مرکزی علاقے میں رہنے کی وجہ سے یہ ساری بھاگ دوڑ ممکن ہو سکی تھی۔ کہیں پہنچنے کے لیے زیادہ سے زیادہ دس منٹ وقت درکار ہوتا تھا۔ میرا رہائشی کمرہ ۹ فٹ لمبا اور ۷ فٹ چوڑا اور نہایت بوسیدہ تھا اس میں پہلے پہل تو ۱۹۴۶ء کے فسادات کے دوران وارد ہوا تھا۔ وہ قیام عارضی تھا۔ تب نہیں معلوم تھا کہ میری کلکتہ کی ساری عملی زندگی اسی میں بسر ہو گی۔ سفیدی اور پالش وغیرہ کرا کے صاف ستھرا کیے رہتا تھا۔

سب سے پہلے ایک بنس کھٹ لا کر اس میں ڈالا اسی پر بستر وغیرہ رہتا پھر ایک دن دیوار میں کیل گاڑ کر چھوٹا سا لیمپ اس میں لگایا۔ اس مکان میں بجلی نہیں تھی (سابقہ مکینوں کی کسی خطا پر بجلی کا رشتہ منقطع کر دیا گیا تھا پھر ۱۹۵۷ء میں ہم لوگوں نے اس سلسلہ کو بحال کرایا) پھر کتابیں وغیرہ رکھنے کے لیے ایک چھوٹی سی الماری لایا اور اس کو سرہانے فٹ کیا پھر ایک چھوٹی سی گول میز لایا۔ یہ دونوں فرنیچر معمولی لکڑی کے سادہ سے تھے۔ پھیری کرنے والے کاری گروں سے سستے دام پر خرید لیا تھا۔ اسپرٹ اور چپڑا لا کر وارنش

بنائی۔ ریگ مال سے رگڑ کر صاف کر کے ان پر پالش کی۔ یہ کلکتہ میں میری خانہ سازی اور خانہ آبادی کی ابتدا تھی۔ یہ دونوں فرنیچر میرے قیام کلکتہ میں آخر وقت تک یعنی کوئی ربع صدی میرے شریکِ حال رہے۔ سات فٹ چوڑے کمرے میں میری چارپائی کے سرہانے صرف اس الماری کی گنجائش تھی جو رفتہ رفتہ کاغذی کوڑے سے بھرتی گئی۔ اس کا اصل فائدہ کھٹملوں نے اٹھایا۔ جب چارپائی میں دوا وغیرہ ڈالی جاتی یا دھوپ دکھائی جاتی تو وہ فوراً بھاگ کر الماری میں بھری آلائشوں میں پناہ لے لیتے اور پہلی فرصت میں بلا کسی خاص زحمت کے اپنی شکارگاہ میں واپس آجاتے۔ اس کمرے میں ایک دروازے کے علاوہ اس کے بالمقابل دیوار میں ایک کھڑکی بھی تھی تاکہ اس طرف کی گلی میں بہنے والی ساری غلاظت سے مشام جان بلاکدوکاوش معطر ہوتی رہے اور صبح و شام کے دھوئیں سے بھی۔ نیچے اور دائیں بائیں کے چولہوں سے بلند ہوکر کمرے کو دھونی دیتے رہیں جس کا ایک فائدہ یہ تھا کہ مچھر اس میں پناہ گزیں ہونے سے گریز کرتے تھے یوں بھی کھٹمل کی کثرت اور بچھوؤں کی آمدورفت کے بعد مچھروں کے لیے گنجائش کم ہی رہ گئی تھی۔

بہت پرانی بلڈنگ ہونے کی وجہ سے اس کی چھت میں بچھوؤں نے گھر کرلیا تھا اور اکثر نکلا کرتے تھے تین چار بار ایسا ہوا کہ رات کو سوتے ہوئے بستر پر بچھو گرے موٹے موٹے سیاہ لیکن شکر ہے کہ ہر بار میری آنکھ کھل گئی اور میں ان کی زد سے محفوظ رہا صرف ایک بار ایسا ہوا کہ کافی بارش ہوئی تھی نیچے صحن میں گھٹنے تک پانی لگا ہوا تھا میں رات کو ڈیڑھ بجے کے قریب بھیگتا بھاگتا پہنچا اور کمرے سے باہر ہی پاؤں سے چپل ٹٹول رہا تھا کہ انگلی میں بچھو نے ڈنک مارا۔ میں بے طرح تڑپ رہا تھا پھر پانی میں پاؤں ڈالنے کے قابل نہ تھا ہمارے پڑوسی کریم بھائی نے واقعی مجھے پیٹھ پر لادا اور نیچے صحن میں لگے ہوئے پانی سے گزار کر رکشے پر لے کر مارواڑی ریلیف سوسائٹی گئے وہاں مجھے انجکشن لگائے گئے۔ بچھو کے کاٹنے کی تکلیف تو صبح ہوتے ہوتے کم ہوگئی لیکن ان انجکشنوں کی تکلیف کئی دن تک رہی۔ اس بلڈنگ میں دوسروں کو بھی بچھو کے کاٹنے کے واقعات برابر ہی ہوا کرتے تھے۔

۱۶، سید صالح لین کی اس بلڈنگ کی زیریں اور پہلی منزل پر بہت سے کا بک نما کمرے تھے جن میں کبوتروں کے بجائے انسان بستے تھے بلکہ ان کے بچے بلکتے تھے اور عورتیں کھانے پکانے سے فراغت کے بعد اپنی اپنی چوکھٹوں پر جنھیں وہ دہلی کہتی تھیں (دہلیز کا مخفف) بیٹھ جاتیں کوئی اپنے آنچل میں کسی شیر خوار کو چھپا لیتی اور پنکھے جھل جھل کر پسینے سے شرابور ملگجے متعفن کپڑوں کو سکھاتی اور ان میں سے کوئی ایک دوسری کی طرف کوئی جملہ اچھال دیتی گویا یہ مصرعہ طرح دے دیا اور پھر آوازیں تیز ہونے لگتیں اور دونوں طرف شرکاء کی تعداد بڑھتی جاتی تا آنکہ مکمل معرکہ نہ برپا ہو جائے پھر لفظیات کا ایسا غلیظ سیلاب آتا اور بیان میں ایسی ایسی موشگافیاں ہوتیں کہ معاذ اللہ۔ جب یہ طوفان گھنٹے دو گھنٹے چل چکا ہوتا تو باہر سے کوئی ایک دو مرد آجاتے جن کی زندگی سڑک پر ہی گزرتی تھی صرف کھانا کھانے یا دیگر کسی ضرورت سے ہی اپنے کابکوں میں آتے جاتے تھے۔ وہ ان عورتوں کو ڈانٹ ڈپٹ کر الگ کرتے اور وہ پھر اپنی اپنی دہلی پر بیٹھ کر پسینہ پوچھنے لگتیں۔

اسی مکان کی دوسری منزل پر تین کمرے تھے۔ ایک بڑے کمرے میں آپا رہتی تھیں جو سیڑھی سے ملحق پہلا کمرہ تھا اس کے بعد اسی سے جوڑا ہوا ایک چھوٹا کمرہ تھا جس میں میں فروکش تھا، تیسرا کمرہ قدرے بڑا سائیڈ میں تھا، جس میں ایک پشاوری خاندان آباد تھا اور ہم لوگوں کے ساتھ عزیزوں جیسے تعلقات رکھتا تھا۔ میرے بننے بگڑنے میں اس مکان، اس کے محل وقوع اور اس میں بہن بہنوئی کے ساتھ میری یکجائی بلکہ شروع سے آخر تک ان کی محبت اور شفقت کو بڑا دخل تھا۔

کام کے معاملے میں ہر طرف میری تاک جھانک تو جاری ہی تھی۔ ایک دن حامد صاحب (نیوز ایڈیٹر عصرِ جدید) نے مجھ سے کہا کہ ''نافین'' والوں کو ایک اردو مترجم کی ضرورت ہے اس کے منیجر سے میری بات ہوئی ہے میں نے تمہارا نام تجویز کیا ہے وہاں جا کر مل لو۔ ایک خبر ایجنسی گلوب نام کی تھی جس کا دفتر ڈلہوزی اسکوائر میں تھا اسی نے نام تبدیل کر کے نیا نام ''نافین'' اختیار کیا تھا جو 'نیر اینڈ فار ایسٹ نیوز'' کا مخفف تھا۔ پہلے

وہ ایجنسی صرف انگریزی میں خبریں فراہم کیا کرتی تھی پھر اردو میں بھی خبریں دینے کا فیصلہ کیا تو مترجموں کی ضرورت ہوئی چنانچہ دوسرے دن صبح کو میں وہاں پہنچا۔ منیجر سے ملا تو اس نے کہا کہ حامد صاحب کا بھیجا ہوا تو ایک شخص آیا تھا اس سے ہماری بات ہوگئی ہے۔ اس پر مجھے بڑی خفت کا احساس ہوا کہ یہ شخص مجھے جھوٹا سمجھتا ہے چنانچہ میں نے اس سے کہا کہ میں کسی اور شخص کے بارے میں کچھ نہیں جانتا حامد صاحب نے مجھے بھیجا ہے آپ ابھی ٹیلیفون کر کے میرے بارے میں دریافت کرلیں تا کہ آپ کو میرے بارے میں یقین ہوجائے کام چاہے دیں یا نہ دیں۔ اس نے مجھے سمجھا بجھا کر واپس کیا لیکن میں سخت غصہ میں تھا، سیدھا 'عصر جدید' کے دفتر میں آیا تو حامد صاحب موجود تھے میں ان پر برس پڑا کہ مجھے اس طرح شرمندہ کیوں کیا، انھوں نے مجھے سمجھایا کہ بھائی تم تو ابھی تنہا ہو کوئی ذمہ داری تم پر نہیں ہے ایک شخص زیادہ ضرورت مند معلوم ہوا تو میں نے اس کو بھیج دیا اور پھر تم سے ملاقات نہیں ہوئی ورنہ تمہیں منع کر دیتا۔ میرا غصہ ٹھنڈا ہوگیا۔ لیکن میں نے دیکھا کہ جب ہم لوگ یہ گفتگو کر رہے تھے اس وقت کوئی شخص باہر دروازے کی دیوار سے چپکا ہوا ہماری باتیں سن رہا تھا۔ میں نے سانولی سے شکل کی جھلک دیکھی پھر وہ صاحب وہاں سے چلتے بنے۔ حامد صاحب نے بتایا کہ یہی صاحب نافین میں لیے گئے ہیں۔ ناظر الحسینی سے یہ میرا پہلا تعارف تھا۔

''نافین'' کی اردو سروس تھوڑے ہی عرصہ تک جاری رہی پھر بند ہوگئی۔ ادھر 'عصرِ جدید' میں حامد صاحب خان بہادر صاحب کے عتاب کا شکار ہوئے تو ان کو نہ صرف اخبار سے نکالا گیا بلکہ بالائی منزل پر ایک کمرہ جو ان کی فیملی کی رہائش کے لیے دیا گیا تھا اس سے بھی انھیں بے دخل کیا گیا پھر بے سروسامانی کے عالم میں انھوں نے کچھ عرصہ کلکتہ میں گزارا۔ یونس نظری کے ''کارواں'' اور ''کندن'' وغیرہ میں کام کرتے رہے اور چند ماہ 'امروز'' میں بھی کام کیا۔ ان کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ ایک نفاست پسند بھلا آدمی میلے کچیلے کپڑوں میں نظر آنے لگا۔ غذا اور ماحول کی خرابی نے پیچش اور ملیریا وغیرہ میں مبتلا کر دیا

اپنے وطن لکھنؤ تک واپس جانا بھی ان کے لیے ممکن نہیں رہا۔

۵۲ء، ۵۳ء کی بات ہوگی کہ ابراہیم ہوش اور بسنت کمار چٹرجی کی تحریک پر اردو صحافیوں کی ایک چھوٹی سی تنظیم قائم کی گئی تھی جس کا مقصد صرف ملنا ملانا اور اپنا دکھ سکھ کہہ سن لینا تھا، اس کے لیے ہم لوگوں نے ابتدائی چندہ اور ماہانہ چندہ کے ذریعہ کچھ رقم اکٹھا کرلی تھی۔ چٹرجی کی تجویز پر اسی رقم میں سے ایک سو پچاس روپیہ حامد صاحب کو دیا گیا تاکہ وطن واپسی کے لیے کرائے کا بندوبست ہوسکے۔ حامد صاحب چلے گئے۔ لیکن یہ بتانا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے قیام کلکتہ کے دوران ایک ہفت روزہ ''کھلاڑی'' نکالا تھا جس میں کھیلوں کے متعلق عام خبروں کے علاوہ خاص بات یہ تھی کہ کلکتہ ریس کے بارے میں ٹپس بھی ہوا کرتی تھیں۔ چنانچہ ریس کے شائقین کے حلقے میں ان کا پرچہ خاصا مقبول تھا۔ اس سے ان کی اس جہت میں مہارت کا بھی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ ۵۶ء میں ایک شام کیا دیکھتے ہیں کہ حامد صاحب پہلے سے بھی زیادہ چمک دمک کے ساتھ مسکراتے ہوئے چلے آرہے ہیں۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ کراچی چلے گئے تھے اور وہ اصلاً ایرو ناٹیکل انجینئر تھے ان کی اسی صلاحیت کی بنا پر انھیں کراچی ہوائی اڈہ پر ملازمت مل گئی تھی اور وہ کراچی سے ڈھاکہ جاتے ہوئے کلکتہ میں ٹھہرے تھے۔ بغرض ملاقات ہم لوگوں کے ہاں آگئے تھے۔

اس تفصیل کو بیان کرنے کی غرض و غایت یہ بتانا ہے کہ جو شخص شریف، نوجوان، وجیہہ اور ہمہ جہت صلاحیتوں کا مالک تھا، مذہبیات اور سیاسیات سے لے کر کھیلوں کی خرافات تک پر قلمرانی کرسکتا تھا اور تربیت کے اعتبار سے انجینئر تھا اس کو 'عصرِ جدید' میں کس قدر رسوائیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ مجھے اپنے ایک ریمارک پر اب تک افسوس ہے۔ حامد صاحب نے 'عصرِ جدید' سے نکالے جانے پر کچھ عرصہ کی پریشانی کے بعد 'امروز' میں ایک سو روپیہ ماہوار پر کام منظور کرلیا تو میں نے ایک دن دورانِ گفتگو ان سے کہا کہ ''حامد صاحب آپ نے تھوک کر چاٹ لیا۔'' تو انھوں نے نہایت متانت سے جواب دیا کہ

''انسان کبھی ایسا کرنے پر بھی مجبور ہو جاتا ہے۔'' میرا وہ جملہ تضحیک یا طنز کی غرض سے نہ تھا بلکہ حامد صاحب کے تئیں میرے احترام اور ان کی تنگ دستی پر دلی تکلیف کا نتیجہ تھا۔ غالباً وہ اس بات کو اچھی طرح سمجھتے تھے، ایک بار میں نے ان کے میلے کچیلے کپڑوں پر اعتراض کیا جو ان کی سنہری کمانی کی عینک کو منہ چڑا رہے تھے تو انھوں نے کہا کہ میں نے سوٹ رکھ دیے ہیں کیونکہ ان کی دھلائی کے لیے میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔

بہرحال ہمارا کارواں چلتا رہا۔ صبح کو امروز میں مصطفیٰ صابری کے ساتھ اور شام سے رات تک 'عصرِ جدید' میں۔ رات کو نو بجے سے ڈیڑھ بجے تک میرا اور چڑ جی کا ساتھ رہتا۔ ہم لوگ ٹھیک ۱۲ر بجے رات میں امجدیہ ہوٹل بند ہونے سے پہلے چائے کی آخری چسکی لینے کے لیے وہاں جاتے، اس وقت تک کام بڑی حد تک ختم ہو چکا ہوتا تھا لیکن ایک بج کر پندرہ منٹ تک پی ٹی آئی کی آخری سروس کا انتظار کرتے۔ اس وقت تک 'عصرِ جدید' میں ٹیلی پرنٹر نہیں تھا بلکہ پی ٹی آئی کا آدمی ہر گھنٹہ خبروں کا بنڈل لے کر آیا کرتا تھا۔

میں عام طور سے ایک بج کر بیس منٹ پر اٹھتا اور کوئی دس منٹ میں گھر پہنچ جاتا۔ جاڑا، گرمی، برسات، ہفتہ میں سات دن اور مہینے میں تیس دن۔ بھائی صاحب دروازہ کھولتے۔ شادی کے بعد جب بیوی آ گئی تو وہ اندر سے بند اپنے کمرے کا دروازہ کھولتی۔ چڑ جی 'عصرِ جدید' کی بلڈنگ میں ہی اوپر ایک کمرے میں رہتے تھے وہ عام طور سے 'عصرِ جدید' کا کام ختم کرنے کے بعد اپنے افسانے اور مضمون وغیرہ لکھتے صبح کو چار بجے کے قریب اوپر جا کر سو رہتے اور دن بھر سوتے اسکول کے لڑکوں کا شور بھی ان کی نیند میں مخل نہیں ہوتا پھر چار بجے شام کو چکنے مکنے نہائے دھوئے چمچم نظر آتے۔ لمبا کرتا، ڈھیلا ڈھالا چوڑی موری کا پائجامہ اور سلگتی ہوئی بیڑی کبھی انگلیوں میں کبھی دانتوں میں دبی، پاؤں میں چپل، زلفیں سر پر چپکی ہوئی جنھیں چڑ جی کام کے دوران نوچتے رہتے تھے۔ وہ دائیں ہاتھ سے لکھتے اور بائیں ہاتھ سے لٹوں کو اینٹھتے، نوچتے اور پھر سلجھاتے۔ جس قدر تیزی سے لکھتے اتنی ہی تیزی سے یہ عمل بھی جاری رکھتے۔ ان کے بے تکلف دوستوں میں

ش مظفر پوری اور ابراہیم ہوش کے علاوہ طاہر صدیقی بھی تھے جو روزانہ ہند سے وابستہ تھے اور کسی کسی دن رات کو کام ختم کرنے کے بعد 'عصرِ جدید' بھی آجایا کرتے تھے اب دہلی میں سینئر ایڈوکیٹ ہیں۔ میرے اور چڑ جی کے ساتھ رات کو شرکائے کار میں کچھ عرصہ تک محمود راہی بھی شامل رہے جن سے آخری ملاقات ۹۰ء میں ''انقلاب'' بمبئی میں ہوئی تھی۔

وسط اگست ۱۹۵۳ء میں بسنت کمار چڑ جی کا دور 'عصرِ جدید' میں ختم ہوا۔ بات یوں ہوئی کہ کشمیر میں شیخ محمد عبداللہ کے زوال اور گرفتاری کی خبر آئی۔ خبر ایجنسیوں نے جس طرح خبریں بتائی تھیں جن میں ان کو غدار وغیرہ کہا گیا تھا چڑ جی نے ان خبروں کو اسی طرح دے دیا اور کچھ چٹ پٹی سرخیاں بھی لگا دیں۔ صبح کو خان بہادر صاحب نے اخبار دیکھا تو آپے سے باہر ہوگئے۔ شام کو جب دربار لگا تو چڑ جی کی پیشی ہوئی۔ خبر کے معاملے میں تو بے بسی تھی لیکن فرد جرم یہ تھی کہ سرخیاں اتنی تیز کیوں لگائیں۔ چڑ جی حیران تھے کہ یہ ہنر عیب کیسے بن گیا۔ ان کا کہنا تھا کہ جیسی خبر تھی میں نے ویسی ہی سرخیاں لگا دیں۔ خان بہادر صاحب کا کہنا تھا کہ تم کو میرے اور شیخ صاحب کے تعلقات کا تو کچھ خیال کرنا تھا۔ بہرحال کچھ نوک جھونک کے بعد خان بہادر صاحب نے اپنا قطعی فیصلہ صادر کر دیا۔ ''آپ ابھی چلے جایئے۔'' ''اقبال! (منیجر قاضی اقبال احمد صاحب) دیکھو یہ دفتر میں نہ آنے پائیں صابری صاحب سے کہہ دو رات کو کام کریں۔''

صابری صاحب کا قلمدان (واقعی قلم دان تھا) اوپر 'امروز' کے کمرے سے لاکر 'عصر جدید' کی میز پر رکھ دیا گیا۔ اس روز سے رات کی شفٹ میں وہ میرے شریکِ کار ہوگئے۔

دراصل چڑ جی کے خلاف لاوا کچھ دنوں سے پک رہا تھا اس روز بس ابل پڑا۔ ایک تو یہی کہ بہت دنوں سے ان کی شکل دیکھتے دیکھتے بوریت ہوتی رہی ہوگی دوسرے یہ کہ چڑ جی انڈین جرنلسٹس ایسوی ایشن کے جراثیم پھیلا رہے تھے۔ یوں تو یہ اخبار نویسوں کی پرانی تنظیم تھا لیکن پریس کمیشن کے قیام کے ساتھ ہی اس کی سرگرمیاں تیز ہوگئی تھیں ایک طرف تو کمیشن کے سامنے اخبار نویسوں کی نمائندگی دوسری طرف رکنیت کو بڑھا کر

ایسوسی ایشن کے دائرہ کار میں توسیع کی کوششیں۔ اردو صحافیوں کا حلقہ اس سے بالکل نا آشنا تھا۔ چٹر جی نے مجھے ایسوسی ایشن سے روشناس کرایا اور ۱۹۵۳ء کے اوائل میں اس تنظیم کا ممبر بنوایا پھر اگلے بیس بائیس برس کے دوران تین بار مجھے ایسوسی ایشن کی ایگزیکٹیو کمیٹی میں شامل کیا گیا۔ چٹر جی کی یہ ساری قابل اعتراض سرگرمیاں نوٹ کی جارہی تھیں۔ چنانچہ ان کی سرخیوں پر تنقید سے ناپسندیدگی کے اظہار کا آغاز ہوا۔ ایک روز ان کو حکم ہوا کہ لیڈ کی سرخیاں لکھ کر رات کو خان بہادر صاحب کے ہاں بھیج دیا کریں اور ان کی منظوری کے بعد کتابت کروایا کریں۔ اس زمانے میں خان بہادر صاحب کولوٹولہ مسجد کے سامنے والی گلی میں رہا کرتے تھے بعد میں پارک سرکس کے علاقہ جھاؤتلہ میں منتقل ہوگئے۔

چنانچہ رات میں گیارہ بجے تک چٹر جی دو تین خبروں کا انتخاب کر کے ان کی سرخیاں تجویز کر کے ان کی منظوری کے لیے بھیج دیا کرتے۔ ایک روز اتفاق سے اس منظوری کے بعد کسی اہم خبر کے آجانے کی وجہ سے خبروں کا نقشہ بدل گیا تو چٹر جی نے دوبارہ ہدایت حاصل کرنے کے لیے ایک بجے کے قریب دوبارہ آدمی بھیج دیا۔ اگلے دن انھیں سخت ڈانٹ پڑی اور حکم ہوا کہ آئندہ سے خبریں اور سرخیاں وغیرہ منظوری کے لیے نہ بھیجا کریں اس طرح وہ سپر نیوز ایڈیٹنگ تو بند ہوئی مگر چٹر جی کی شامت تھی کہ اس کے چند دنوں بعد ہی شیخ عبداللہ کی گرفتاری کی خبر آئی جس کا ذکر ابھی آچکا ہے بس وہ بار برداری کے اونٹ پر بوجھ کا آخری تنکا ثابت ہوا۔ دفتر سے اخراج کے ساتھ ہی ان کو کمرہ بھی چھوڑ دینے کا حکم ہوا۔ بالائی منزل کے ایک کمرہ میں وہ اور مولانا عطاء الرحمٰن قدسی دونوں رہا کرتے تھے۔ مولانا عطاء الرحمٰن قدسی 'عصر جدید' میں بنیادی طور پر کاتب تھے لیکن اخبار کے کالم ''ارشاداتِ نبوی'' میں احادیث بھی لکھا کرتے تھے۔ وہ بھی رات میں ایک ڈیڑھ بجے فارغ ہوتے تھے مجرد تھے اوپر ہی رہائش تھی جا کر سو رہتے تھے۔

کچھ عرصہ بعد مولانا کی بھی شادی ہوگئی ان کو علیٰحدہ رہائش کی ضرورت ہوئی۔ پھر ۱۹۵۶ء میں خان بہادر صاحب نے کولوٹولہ میں دارالاشاعت اسلامیہ قائم کیا تو مولانا

کو اس کا نگراں اور منیجر مامور کیا جہاں انھوں نے واقعی اپنی انتظامی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا اور اس ادارہ کو دینی کتب اور قرآن شریف کی طباعت کا ایک بڑا اور قابلِ ذکر اشاعتی ادارہ بنادیا۔ انہی کی فرمائش پر میں نے جانسن پرائمر لکھی جو کافی مقبول ہوئی اور اس کے نہ معلوم کتنے ایڈیشن شائع ہوتے رہے ہیں اس کی اجرت میں نے مبلغ ایک صد روپیہ قبول کی اس کے بعد اسی معین اجرت پر جانسن ریڈ I اور جانسن ریڈ II بھی لکھی۔

چٹر جی کے ساتھ یہ ماجرا ہوا کہ انھوں نے سکریٹریٹ اور ایسوسی ایشن کے بڑے چکر لگائے لیکن بات کچھ نہیں بنی اور انھوں نے کلکتہ کو بالآخر ہمیشہ کے لیے خیر باد کہا اور دہلی واپس چلے گئے جہاں سے آئے تھے۔ وہاں جا کر پرتاپ میں کام کرنے لگے۔ ۱۹۶۲ء میں دو روز کے لیے میرا دہلی جانا ہوا تو وہاں پرتاپ کے دفتر میں چٹر جی سے ملاقات ہوئی۔ ۱۹۷۱ء میں امریکن رپورٹر کا اردو ایڈیشن جاری ہوا تو چٹر جی کا نام اس کے ایڈیٹر کی حیثیت سے نظر آیا۔ یہ بات میرے لیے حیرت انگیز تھی کیونکہ میں چٹر جی کے ترقی پسندانہ اور بائیں بازو کے نظریات سے باخبر تھا لیکن ۱۹۷۲ء میں امریکن رپورٹر کے سارے ایڈیشن بند ہوگئے تو چٹر جی پھر تلاشِ معاش میں نکلے اور پہلے سے بھی زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہوئی کہ انھیں سوویٹ انفارمیشن سروس میں جگہ مل گئی جہاں وہ ۸۰ء کے عشرہ کے وسط تک آخر عمر تک کام کرتے رہے۔

چٹر جی کے والد کلکتہ کے قریب سیرامپور کے رہنے والے تھے ریلوے میں ملازم تھے اور جالندھر میں ان کی پوسٹنگ تھی۔ چٹر جی وہیں خالص پنجابی ماحول میں پلے بڑھے تھے، نہایت صاف کھڑی بولی بولتے تھے۔ ترجمہ کے فن میں بلاشبہ طاق تھے اور افسانے وغیرہ بھی لکھتے تھے۔ دوسری جنگِ عظیم کے دوران دہلی کے اردو اخباروں میں کام کر چکے تھے نہ معلوم کیا افتاد پڑی کہ آزادی کے بعد کلکتہ چلے آئے۔

ان کے قیام 'عصرِ جدید' کے دوران ایک واقعہ کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ رات کو ہم دونوں کام میں مصروف تھے کہ مجاز صاحب کہیں سے جھومتے جھامتے آ پہنچے۔ وہ

کئی روز سے کلکتہ میں گھومتے پھر رہے تھے وہی ان کا کلکتہ کا آخری سفر تھا۔ انھوں نے آتے ہی چٹر جی سے کہا ''پلا۔''

انھوں نے کہا ذرا ٹھہریے ابھی کچھ خبریں دے کر اٹھتے ہیں اتنے میں ایک آدھ غزل ہی سنا دیجیے۔ ہم لوگوں کے بڑے اصرار پر انھوں نے صرف چند اشعار اِدھر اُدھر سے سنائے تب تک ہم لوگوں کی چائے کا وقت بھی قریب آ گیا اور ہم لوگ اٹھ کر امجدیہ ہوٹل کی طرف چل پڑے۔ وہاں پہنچ کر چٹر جی نے تین چائے کا آرڈر دیا۔ چائے کا نام سنتے ہی مجاز صاحب ابل پڑے۔ کہنے لگے چائے کون کافر پیتا ہے! پھر اٹھ کر کھڑے ہوئے اور بگڑ کر چٹر جی سے کہا: ''سالے! اب معلوم ہوا تو چٹر جی نہیں مکر جی ہے۔'' اور پاؤں پٹکتے ہوئے باہر نکل گئے۔

چٹر جی کے چلے جانے کے بعد میرا اور صابری صاحب کا دن رات کا ساتھ ہوگیا۔ صبح ۷/بجے سے ۱۰/بجے تک 'امروز' میں اور رات ۹/بجے سے ایک ڈیڑھ بجے تک 'عصرِ جدید' میں۔ یہ سلسلہ کچھ عرصہ تک چلا لیکن اس اثناء میں دیگر حضرات بھی ہم لوگوں سے ملتے بچھڑتے رہے مثلاً اقبال کلکتوی، جو بعد میں اقبال اعظمی کہلائے اور اقبال اکرامی 'امروز' میں اور فاتح فرخ وغیرہ 'عصر جدید' میں۔ چونکہ کئی حضرات نے 'عصرِ جدید' اور 'آزاد ہند' کے درمیان کئی پھیرے کیے اس لیے ان کی ترتیب بیان کرنا مشکل ہے۔

۱۹۵۴ء کے دو واقعات خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں اول یہ کہ کلکتہ یونیورسٹی میں جرنلزم کا پوسٹ گریجویٹ کورس جو ایک سال پہلے شروع ہو چکا تھا اس کی تشہیر ہوئی تو میں ایک بار پھر یونیورسٹی کی طرف راغب ہوا اس میں داخلہ کے لیے درخواست دی اور انٹرویو کے بعد منظوری بھی مل گئی۔ اس موقع پر میں نے مسٹر بی بی سین گپتا کو خاص طور سے مہربان پایا جو یو پی آئی کے بانی اور ڈائریکٹر تھے اس خبر ایجنسی کا دفتر لنگٹن اسکوائر کے قریب تھا۔ خبر ایجنسیوں کے طریقہ کار اور رپورٹنگ کے موضوع پر انہی کے لکچر ہوا کرتے تھے۔ آگے چل کر انھوں نے یہ کیا کہ اپنے دفتر میں بلا کر خبروں کی تیاری اور ترسیل کو دیکھنے

کا موقع بھی دیا۔ میں نے کچھ کام کی درخواست کی تو انھوں نے اس کو بھی منظور کرلیا اور اپنے نیوز ایڈیٹر کو بلا کر تاکید کی ان کو کام دو۔ میں دن میں پابندی سے وہاں جانے لگا لیکن میں نے دیکھا کہ میں کئی کئی گھنٹے بیٹھا رہتا پھر بھی اس بندے نے برائے نام کام بھی مجھے نہیں دیا نہ کچھ بتایا لیکن میرے ہی ایک ہم سبق باکچی کو بڑی توجہ سے کام بتاتے اور ان کو کام دینے بھی لگے وہی باکچی صاحب آگے چل کر آنند بازار پتریکا میں، جو برسوں تک ہندوستان میں سب سے زیادہ اشاعت کا دعویدار روزنامہ رہا ہے، کسی ذمہ دار عہدہ تک پہنچے۔ آخر وہاں جانے کو تضیع اوقات سمجھ کر میں نے وہاں جانا ترک کردیا۔

دیگر اساتذہ میں ایک مسٹر داس گپتا تھے جو ہندوستان اسٹینڈرڈ کے ایڈیٹر تھے وہ اداریہ اور فیچر وغیرہ لکھنے کی تکنیک پر لکچر دیا کرتے تھے آگے چل کر انھوں نے ہندوستان اسٹینڈرڈ میں ایک ہفتہ وار کالم Hospitable Calcutta لکھنے میں بھی میری مدد کی یہ کالم کوئی دو سال سے زیادہ جاری رہا۔ اس کالم کے لیے رپورٹوں کے تراشے وغیرہ اکٹھا کرنے کا کام ادریس الحق انجام دیتے جو شام کا اخبار ''الحق'' بند ہوجانے کے بعد ۱۹۵۷ء میں بحیثیت رپورٹر آگئے تھے۔ میں انہی کی فراہم کردہ اردو حلقہ سے متعلق رپورٹوں پر مبنی مذکورہ کالم تیار کرکے ان کو دے دیتا اور وہی لے جاکر ہندوستان اسٹینڈرڈ میں دے آتے۔ ایک سو روپیہ ماہانہ اس کی اجرت تھی، اس کو بھی وہی وصول کرکے مجھے دے دیتے ہم لوگ اس رقم کو نصفا نصف بانٹ لیتے۔ دیگر اساتذہ میں سے ایک مسٹر چٹرجی ''ماڈرن ریویو'' کے ایڈیٹر تھے انھیں یہ ادارت اپنے والد سے بطور میراث ملی تھی۔ جرائد کی کارکردگی ان کا موضوع اور مضمون تھا۔ دستور ہند اور قانون صحافت کے استاد ڈاکٹر سین تھے جو لا کالج کے پروفیسر تھے ہفتہ میں ایک پیریڈ لیتے تھے۔ ماسکو کے قصیدہ خواں تھے اور بڑے بذلہ سنج تھے سارے خشک اور سن رسیدہ اساتذہ اور خشک موضوعات و مضامین کی دھند میں وہ ذرا روشنی کی جھلک کی حیثیت رکھتے تھے۔

ان کے برعکس مسٹر ہمیندر پرشاد گھوش تھے جو بنگلہ روزنامہ ''باسومتی'' کے بانی اور

مدیر تھے۔ وہ ضعف پیری کی وجہ سے بدقت تمام ہفتہ میں ایک دن کلاس لینے آتے تھے ان پر بنگلہ قوم پرستی کا غلبہ تھا وہ کہتے ''گاندھی'' کو ہندوستان کا بابائے قوم کہنا نہ صرف غلط ہے بلکہ افترا ہے۔ ہندوستان کے اصل بابائے قوم ''بنکم چندر چٹر جی'' تھے انھوں نے ہی سب سے پہلے ہندوستانی قوم پرستی کا تصور دیا۔ اس پیر ہشتاد سالہ نے شاید زندگی بھر اخباری تراشے اکٹھا کیے تھے جسے دیکھنے کے لیے انھوں نے ہمیں اپنے گھر بلایا۔ اس عمر میں بھی اخباروں کو پابندی سے دیکھنا اور مطلوبہ تراشوں کے لیے انھیں نشان زد کرنا انھوں نے خود پر لازم کرلیا تھا پھر ان کی بیٹی انھیں تراش کر متعلقہ فائلوں میں لگاتیں۔ ان فائلوں کو موضوعات کے اعتبار سے سال بہ سال مرتب کیا گیا تھا کہ جس موضوع پر مواد چاہیے نکال لیں۔ ایک بڑے سے کمرے میں رکھی ہوئی الماریاں ان فائلوں سے بھری ہوئی تھیں جن پر گرد جمی ہونی چاہیے تھی لیکن ایسا نہیں تھا جس سے ان کی احتیاط و اہتمام اور اس کام میں انتہائی سنجیدگی کا پتہ چلتا تھا۔ میرے یہ دریافت کرنے پر کہ آپ کے بعد ان فائلوں کا کیا ہوگا انھوں نے فرمایا کہ انھیں نیشنل لائبریری کے حوالے کردیا جائے گا۔

اخباری تراشوں کی فائل کے اہتمام کا مقصد اور اس کے پس پشت کارفرما یہ نظریہ تھا کہ ایڈیٹر کو اپنے ادارتی مضامین لکھنے کے لیے خام مواد اور پس منظر کے معاملے میں پوری طرح خود کفیل ہونا چاہیے۔ دراصل اس زمانے میں یعنی جب سے گھوش بابو فائلیں مرتب کررہے تھے قابلِ بھروسہ حوالوں کا کوئی بندوبست نہ تھا نہ ایسی لائبریریاں تھیں اس لیے لکھنے والوں کو یا تو اپنی یادداشت پر بھروسا کرنا پڑتا تھا یا اخباروں کی فائلیں الٹنی پڑتی تھیں جو دقت طلب اور وقت طلب عمل تھا ہر تحریر کے لیے ایسا کرنا مشکل بلکہ ناممکن تھا۔ (اب انٹرنیٹ پر ہر ممکن اطلاع اور معلومات موجود ہیں)

چنانچہ میں نے بھی تراشوں کو مرتب کرنے کا سلسلہ تو شروع کیا لیکن اس بزرگ صحافی جیسا نہ حوصلہ تھا نہ عزم نہ استقامت نہ انھیں محفوظ رکھنے کے لیے کافی گنجائش چنانچہ میں نے جو کچھ اکٹھا بھی کیا کلکتہ کی برساتوں کے طفیل ہمارے بوسیدہ کمرے کی چھتوں

سے تقاطر کی نذر ہوگئیں۔ آج حوالوں کے لیے ساری دیگر سہولتوں کی دستیابی کے باوجود میں سمجھتا ہوں کہ لکھنے والوں کے لیے اپنے حوالوں کا کس قدر اہتمام ضروری ہے۔

کلکتہ یونیورسٹی میں جرنلزم کا پوسٹ گریجویٹ کورس نیا تھا۔ اس کے آٹھ پرچے تھے تعلیم کا دستور بھی ایم اے کے طرز پر تھا لیکن اس کو درجہ ڈپلوما کورس کا دیا گیا تھا آگے چل کر وہی کورس ایم اے کا کر دیا گیا۔ اس وقت نصابی کتابیں وغیرہ بھی دستیاب نہیں تھیں انہیں اساتذہ کی تصانیف جوں توں داخل نصاب تھیں۔ اصل نصاب تو ان کے لکچر تھے جو بلاشبہ بڑے مبسوط ہوتے تھے اگر انھیں قلم بند کیا جاتا تو کتابوں سے کم نہ تھے۔ میں شارٹ ہینڈ جانتا تھا اس لیے اکثر لکچر نوٹ کرلیا کرتا تھا لیکن اس کے بعد میرے پاس نہ اتنا وقت تھا نہ اتنی مہلت کہ میں انھیں صاف صاف لکھ لوں نتیجہ کے طور پر ان نوٹس کی حیثیت ردی سے زیادہ نہ رہ گئی جس کے بنڈل دیکھ کر میں خود گھبرا جاتا۔ ایک نقصان اور ہوا۔ نوٹس نہ لینے کی صورت میں تو لکچروں پر زیادہ توجہ دیتا وہ بھی نہ دے سکا۔ سیشن دو سال سے بھی کئی ماہ آگے تک طول کھنچا یعنی مارچ اپریل کے بجائے ستمبر اکتوبر آ گیا۔ اکتوبر میں امتحانات ہونے والے تھے اس لیے ایک ماہ قبل ستمبر کی کسی تاریخ کو کلاس ختم ہونے کا اعلان کیا گیا۔ اسی روز شام کو جونیئر طلبہ کی طرف سے ہم لوگوں کو فیئر ویل پارٹی دی گئی۔ یہ بات ستمبر ۱۹۵۶ء کی ہے۔

اسی رات کو میں کام کرتے کرتے 'عصرِ جدید' کی میز پر بے ہوش ہوگیا جس میز پر برسہا برس آدھی رات کے بعد تک کام کے دوران کبھی میری پلک بھی نہیں جھپکی تھی۔ اس واقعہ کے بعد میں اتنا کمزور ہوگیا کہ اگلے مہینے امتحان میں نہیں شریک ہوسکا پھر کبھی زندگی کی بھاگ دوڑ نے اتنی مہلت نہ دی۔ مگر یونیورسٹی کے جرنلزم ڈیپارٹمنٹ نے ایک ضرورت کے وقت میری درخواست پر یہ سرٹیفیکٹ دے دیا کہ انھوں نے جرنلزم کا دو سالہ سیشن ۵۶-۱۹۵۴ء مکمل کیا ہے مگر امتحان میں نہیں شریک ہوئے۔

میری اس غشی کا سبب بے انتہا کام تھا جس پر میں مجبور تھا۔ دو ڈھائی سال تک

یونیورسٹی سے وابستگی کے دوران میرا معمول یہ تھا کہ صبح ۷/بجے سے ۱۰/بجے تک 'امروز' میں کام کرتا اور وہیں سے بغرض مطالعہ نیشنل لائبریری چلا جاتا جو فروری ۱۹۵۲ء میں دھرمتلہ سے بلویڈیر، علی پور میں منتقل ہوگئی تھی اور میں اسی وقت سے اس لائبریری کا ممبر ہوں۔ دو بجے کے قریب گھر واپس آتا۔ کھانا کھا کر کچھ دیر آرام کرتا پھر 'عصرِ جدید' کے دفتر آتا۔ وہاں چٹرجی کے چلے جانے کے بعد میں نیوز ایڈیٹر ہوگیا تھا اس لیے شام کو آنے والے مترجمین کے لیے خبریں کچھ پی ٹی آئی کی درست کر کے اور کچھ انگریزی اخباروں پر نشان بنا کر رکھ دیتا اور وہیں سے یونیورسٹی چلا جاتا جہاں ۴/بجے شام سے ۸/بجے تک جرنلزم کے کلاس ہوتے۔ وہاں سے گھر آ کر کھانا کھا کر ۹/بجے رات کی ڈیوٹی پر 'عصرِ جدید' میں حاضر ہوجاتا جو تقریباً ڈیڑھ بجے تک جاری رہتی۔ اس دوران خود ترجمہ کرنا، دوسرے مترجموں کو ترجمہ کے لیے خبریں دینا اور کاتبوں کو دی جانے والی خبروں کا اندازہ اور حساب رکھنا سب ایک ساتھ جاری رہتا۔ اتنی مصروفیات کو جاری رکھنا ممکن اس وجہ سے ہوسکا کہ میری قیام گاہ سے صرف پانچ سات منٹ کی مسافت پر 'عصرِ جدید' کا دفتر تھا اور وہاں سے تقریباً اتنے ہی فاصلے پر یونیورسٹی کا آرٹس کالج جہاں میرے کلاس ہوا کرتے تھے۔

اتنی سخت مصروفیات کے باوجود کام میں پورا لطف آتا تھا اس کی بنیادی وجہ تو یہ تھی کہ میں جو کچھ بھی کر رہا تھا وہ خود میرا اختیار کردہ تھا کسی نے میرے سر کچھ تھوپا نہیں تھا دوسری وجہ یہ تھی کہ میرے شرکائے کار بڑے دلچسپ، خوش مزاج اور ہم مذاق تھے۔ کاتبوں میں بھی 'عصرِ جدید' کی خوش قسمتی سے بڑے اچھے اور لائق اساتذۂ فن موجود تھے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ کلکتہ کے بہترین خطاط 'عصرِ جدید' میں بیک وقت موجود تھے جیسے کہ رفیق عابدی صاحب جن کا تفصیل کے ساتھ ذکر آچکا ہے۔ اقبال احمد خاں جن کا کمال یہ تھا کہ ۲۴/گھنٹے میں ۱۸/گھنٹے لکھتے رہتے لیکن نہ شانِ خط میں فرق آتا نہ کتابت میں غلطیاں ہوتیں، استاد محمد رفیع جنھیں میں نے خود دیکھا کہ انھوں نے کاغذ کو جوڑ جوڑ کر کوئی تین فٹ چوڑی اور ۱۲-۱۴ فٹ لمبی پٹی بنائی اور دو پنسلوں کو بیک وقت انگلیوں میں دبا کر ان کی

نوکوں کے درمیان اتنا فاصلہ رکھا جتنا چوڑا خط وہ رکھنا چاہتے تھے اور پھر بلا تکلف مطلوبہ عبارت اس طومار پر رقم کردی۔ اس کے بعد پنسل کی لکیروں کے درمیان صرف برش سے روشنائی بھرنے کا کام رہ گیا۔ اسی طرح منشی محمد یحییٰ صاحب، منشی محمد صدیق صاحب شیر گھاٹی جن کی داڑھی، کرتا اور شاعری سب اتھاہ تھا اور مولانا عطاء الرحمٰن قدسی تھے۔

۱۹۵۴ء میں دوسرا واقعہ یہ ہوا کہ ایک روز میں 'عصرِ جدید' میں اپنے کمرے میں تنہا بیٹھا کچھ کام کر رہا تھا کہ ایک نوجوان طالب علم نما شخص مختصر قد و قامت کا بڑی متانت کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا اور اپنا تعارف کرایا— سید ظفیر الحسن میرا نام ہے پٹنہ سے آرہا ہوں۔ میں نے بیٹھنے کے لیے کہا اور گفتگو کا سلسلہ جاری رکھا۔ یہ حضرت زمانے کی ناسازگاری کے مارے ہوئے کچھ عالم بیزاری میں کچھ فکر معاش میں نکل پڑے تھے اور کلکتہ تک چلے آئے۔ ان کے اس سفر میں ان کے جسم پر قمیض اور پائجامہ کے علاوہ پاؤں میں چپل بھی تھی۔ زادِ راہ کے طور پر کپڑے کے ایک تھیلے میں مرحومہ ماں کی جانماز کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ اپنے ایک سابقہ دوست جمیل صاحب کے ہاں جو کہ نیشنل لائبریری کے اردو سیکشن میں تھے فروکش ہوئے اور تلاشِ معاش میں نکلے تو سب سے پہلے 'عصرِ جدید' میں آئے کہ شاید ترجمہ کا کچھ کام مل جائے۔ انھوں نے پٹنہ میں اس اخبار کا نام سن رکھا تھا۔ انھوں نے مجھ سے اظہارِ مدعا کیا میں بھی نہ معلوم کیوں ان کی شخصیت میں ایک کشش محسوس کر رہا تھا۔

میں ظفیر صاحب کو لے کر منیجر اقبال صاحب کے پاس گیا اور ان مرحلوں سے گزرنے کے بعد خان بہادر صاحب نے ان کے ترجمہ کی آزمائش کا حکم دیا۔ جو بات مجھے یاد بھی نہ تھی ظفیر صاحب نے ۳۵ برس بعد دہلی میں یاد دلائی وہ یہ تھی کہ میں نے ان کے ترجمہ کو جانچنے کے بعد درست قرار دیا اس کے بعد ان کے ذمہ بھی کچھ کام دے دیا گیا۔ پھر کچھ عرصہ بعد انھوں نے محمد جان ہائی اسکول میں جو اسی عمارت کی بالائی منزلوں میں تھا بطورِ ٹیچر ملازمت حاصل کرلی تو خان بہادر صاحب نے اپنے دونوں بیٹوں کو انگریزی

پڑھانے کے لیے بھی ان کو مامور کیا اس طرح ان کو دن رات محنت کر کے اتنے پیسے ملنے لگے کہ اگلے برس جب شادی کا مژدہ ان کے کانوں تک پہنچا تو انھوں نے کانوں پر ہاتھ رکھنے کے بجائے دل تھام لیا کیونکہ بلقیس صاحبہ جو بعد میں بلقیس ظفیر الحسن کے نام سے اردو افسانہ نگاری کی دنیا میں متعارف ہوئیں پٹنہ کے ایک جج عنایت الرحمٰن صاحب کی صاحبزادی تھیں اور غالباً ظفیر صاحب ان کے اتالیق بھی رہ چکے تھے۔

اس واقعہ کے ایک پہلو کا میں بالخصوص ذکر کرنا چاہتا ہوں کہ آج ایک طرف مذہبی غلبہ اور دوسری طرف شادی کے نام پر سوداگری کے اس پرآشوب دور میں وہ واقعہ مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ تصنع سے عاری، سادگی کی ایک مثال۔

ظفیر صاحب کو اپنی ہونے والی سسرال سے ہدایت ملی تھی کہ کوئی اہتمام نہ کرو بس چلے آؤ۔ بہرحال ظفیر صاحب نے اتنا ہی اہتمام کیا جتنا ان کی بساط اجازت دیتی تھی کوئی قرض ادھار نہیں کیا اور جب پٹنہ کے لیے عازمِ سفر ہوئے تو ریل کے کرائے وغیرہ کے بعد ان کے پاس بہت تھوڑے پیسے بچ رہے تھے۔ سوال یہ تھا کہ بیوی کے لیے کوئی گفٹ تو لے جانا چاہیے۔ ہم دونوں مرغی ہٹہ گئے اور پانچ روپیہ میں ایک لیڈیز پرس خریدا اور بس۔ جو پیسے ظفیر صاحب کے پاس بچ رہے تھے وہ کسی جج جیسی شخصیت کی خدمت گزاروں کو دیے جانے والے ٹپ کے لیے بھی ناکافی تھے۔ میں اب بھی سوچتا ہوں کہ ظفیر صاحب نے نہ تو کسی سے قرض لیا نہ بےتکلفیوں کے باوجود میرے ذہن میں یہ خیال گزرا کہ کچھ رقم ان کی جیب میں ڈال دوں۔ شاید ہم دونوں کے ذہنوں میں قرض کا تصور نہ تھا۔

'عصرِ جدید' میں ظفیر صاحب کے آجانے کے بعد اخبار کا دفتر گل وگلزار ہوگیا۔ ان کے قہقہے دوسرے کمروں تک سنائی دیتے ان کا قیام بھی اسی عمارت کی بالائی منزل کے ایک کمرے میں تھا۔ وہ عموماً شام کی شفٹ میں کام کرتے تھے لیکن ایک دن ایسا ہوا کہ میں رات کو ۹ بجے حسبِ معمول آیا تو دیکھا کہ ایڈٹ کی ہوئی خبریں ظفیر صاحب کی میز پر رکھی ہوئی ہیں۔ میں حیران اور خاموش اپنی میز پر بیٹھ گیا اور سمجھ گیا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔

معلوم ہوا کہ ظفیر صاحب کو آج سے نیوز ایڈیٹنگ کی ہدایت کی گئی ہے۔ کچھ دیر میں ظفیر صاحب بھی آ گئے۔ میں نے ان سے صرف اتنا کہا کہ ''اب میرے آپ کے درمیان یہی ہوگا؟'' وہ نظر نہیں ملا سکے انھوں نے ساری خبریں میری میز پر بڑھا دیں اور خود واپس چلے گئے۔ 'عصرِ جدید' کے منتظمین کے لیے یہ بڑی نافرمانی کی بات تھی جس کی سزائیں متعین تھیں۔ پھر واقعات بڑی تیزی کے ساتھ وقوع پذیر ہوتے گئے۔ ان کو کام سے ہٹایا گیا۔ پھر کمرے سے ہٹایا گیا تو وہ دو منزل اور اوپر جا کر رحمٰن برادران کے کمرے میں براجمان ہوئے۔

بڑے بھائی عبدالرحمٰن صاحب سب انسپکٹر پولیس تھے اور محلے میں انسپکٹر صاحب کے نام سے جانے جاتے تھے خوش مزاج اور دوست دار آدمی تھے مزاج کے اعتبار سے غلط محکمہ میں چلے گئے تھے۔ ان کے چھوٹے بھائی عبدالمنان تھے جنھوں نے ہومیوپیتھی کی تعلیم کے بعد پریکٹس نہیں شروع کی وہ ظفیر صاحب کے ہم عمر تھے۔ میری حیثیت ایک مثلث کے تیسرے سرے کی تھی یعنی ان دونوں بھائیوں سے برابر کا فاصلہ تھا دونوں سے بے تکلف تھا۔ یہ دونوں بھائی اس عمارت کی سب سے اوپری منزل پر کرائے کے ایک کمرے میں رہتے تھے خان بہادر صاحب ہی کے کرایہ دار تھے۔

خیر، ظفیر صاحب کو پھر اسکول سے بھی برخواست کیا گیا۔ منیجر اقبال صاحب سے ان کی ہاتھا پائی کی نوبت آتے آتے رہ گئی بعض اصحاب نے معاملے کی نزاکت کو سمجھ کر بیچ بچاؤ کرادیا۔ اس کے بعد کچھ دنوں تک ظفیر صاحب پریشان رہے۔ ٹیوشنوں کا سہارا لیے رہے ایسے میں ان کے ایک دوست مظاہر حسین صاحب نے ان کی دست رسی کی جو ڈک پر جہازوں کے مال کی لوڈنگ اَن لوڈنگ کے کاروبار میں کافی ترقی کر گئے تھے اور زکریا اسٹریٹ میں ایک دفتر قائم کر رکھا تھا۔

ان واقعات کا تسلسل ۱۹۵۷ء تک جاری رہا اس سال ایسا ہوا کہ حکومت مغربی بنگال کے پندرہ روزہ اردو جریدہ ''مغربی بنگال'' کی ادارت کے لیے اشتہار نکلا۔ ایک

سال پہلے بھی اس جگہ کے لیے اشتہار نکلا تھا اور پانچ سات امیدواروں میں ظفیر صاحب اور میں ہم دونوں شامل تھے لیکن آگرہ سے آئے ہوئے ایک امیدوار چرن سرن ناز کا انتخاب ہوا مگر کلکتہ ان کو راس نہیں آیا اور وہ ایک سال کے اندر ہی وطن واپس چلے گئے۔ پھر جگہ خالی ہوئی ظفیر صاحب نے درخواست دی اور کامیاب ہوئے۔

ظفیر صاحب ۱۹۶۲ء تک اردو کے معاملات میں حکومت مغربی بنگال کے مشیر رہے اور ایڈیٹر ''مغربی بنگال'' کے طور پر کام کرتے رہے۔ اس اثناء میں انھوں نے 'عصرِ جدید' کے لیے ریاستی حکومت کے اشتہارات بند کرنے کی سفارش کی وہ بند ہوئے تو مرکزی حکومت کے اشتہارات بھی بند ہوگئے جو میرے علم کی حد تک پھر نہیں جاری ہوئے اس طرح ظفیر صاحب نے 'عصرِ جدید' کو بے قیاس انتقامی نقصان پہنچایا۔ اس کے بعد وہ حکومت ہند کے فلمز ڈیویزن میں اردو کمنٹری رائٹر کی حیثیت سے تقرر نامہ پاکر بمبئی چلے گئے کچھ عرصہ بعد وزارت دفاع نے سدرن کمانڈ کے پی آر او کی حیثیت سے انھیں لے لیا اور وہ میجر حسن ہوگئے۔ وہاں سے سبکدوشی کے بعد ۸۰ء کے عشرہ میں ڈی اے وی پی کے ڈپٹی ڈائریکٹر کی حیثیت سے دہلی آئے تو تقریباً ۱۸ برس بعد ہماری ملاقات ہوئی لیکن ہم لوگ اس طرح ملے گویا یہ فاصلہ حائل ہی نہیں ہوا تھا۔ میں بہت کچھ بجھ گیا تھا ٹوٹ گیا تھا لیکن وہ اسی طرح سدا بہار تھے۔ مگر ایک بات تھی اس فصل زمانی کے دوران ہم لوگوں کے درمیان مراسلت جاری رہی تھی۔ ظفیر صاحب پلاننگ کمیشن کے گیارہ زبانوں میں شائع ہونے والے ماہنامہ ''یوجنا'' کے چیف ایڈیٹر کی حیثیت سے ۱۹۹۰ء میں ریٹائر ہوئے۔

لیکن آگے بڑھنے سے پہلے پلٹ کر اپنے نجی حالات کا ایک جائزہ لینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے۔

میرے چھوٹے بھائی مطیع اللہ جو ہائی اسکول پاس کر چکے تھے نومبر ۱۹۵۲ء میں کلکتہ آئے انہی کے ہمراہ میری بیوی بھی آئیں اس کے بعد گھر کا نقشہ بدلنا شروع ہوا۔ سوال یہ تھا کہ بھائی کو کس کام سے لگایا جائے۔ طبعی مہم پسندی کی وجہ سے مجھے فوج میں

نوکری کا شوق تھا جو پورا نہ ہوسکا تھا سوچا کہ لاؤ بھائی کو بھرتی کرادوں چنانچہ انھیں لے کر ملٹری رکروٹ منٹ آفس گیا جہاں صبح سویرے امیدواروں کی لائن لگتی تھی۔ پہلی ہی نظر میں رکروٹ منٹ افسر نے ان کو لائن باہر کردیا کہ قد کی مناسبت سے ان کا وزن کم تھا۔ پھر غوروفکر کیا گیا۔ اس زمانے میں ریڈیو کا بازار گرم تھا جیسے کہ آج کل موبائل کا۔ بس اسی انجینئرنگ کی ٹریننگ کے لیے جارج ٹیلیگراف میں ان کا داخلہ کرادیا اور ان کی طرف سے آئندہ ڈیڑھ سال کے لیے فرصت کرلی۔

جب وہ وہاں سے فارغ ہوئے تو پھر سوال ہوا کہ اب کیا کیا جائے۔ اسی ادھیڑ بن میں تھے کہ ویلسلی اسٹریٹ (موجودہ رفیع احمد قدوائی روڈ) پر جہاں رپن اسٹریٹ ملتی ہے ایک دکان کا بندوبست ہوگیا۔ اللہ کا نام لے کر ان کو وہاں بٹھا دیا۔ ایک پرانی میز سروسنگ کے کام کی اور دو تین کرسیاں رکھ دیں ہند الکٹرانکس کے نام سے دکان قائم ہوگئی۔ اس وقت تک ۱۹۵۵ء آ گیا۔ ابتداً دکان میں ریڈیو کی مرمت کا کام ہوا کرتا تھا رفتہ رفتہ امپلی فائر کا اضافہ ہوا جو جلسوں وغیرہ میں کرائے پر جانے لگے۔ پھر شوکیس خریدے گئے اور ان میں بجلی کے متفرق سامان جیسے بلب سوئچ وغیرہ برائے فروخت رکھے گئے گویا دکان باقاعدہ ہوگئی۔

اس وقت تک ٹرانسسٹر عام نہیں ہوئے تھے چنانچہ بالعموم بجلی یا بیٹری سے چلنے والے بڑے اور درمیانی سائز کے ریڈیو سٹ ہوتے تھے جن کے اندر بہ اعتبار قیمت خاص قسم کے تین، پانچ، سات بلب لگے ہوتے تھے۔ یہ سالڈ اسٹیٹ نہیں ہوتے تھے یعنی ان کے پرزے پیوستہ نہیں تھے بلکہ تاروں سے جڑے ہوئے ہوتے تھے لہٰذا حرکت سے جوڑ کھلنے اور ریڈیو خراب ہونے کا خدشہ رہتا تھا کچھ اس وجہ سے اور کچھ بڑے سٹ ہونے کی وجہ سے بہتیرے لوگ اپنے سٹوں کی مرمت یا سروسنگ اپنی قیام گاہ پر ہی کرانا چاہتے تھے ان کی آسانی کے لیے اور کچھ امپلی فائر کے لیے آدمی کی ضرورت کے پیش نظر دو میکانک ملازم رکھے گئے اور ٹیلیفون بھی لے لیا گیا تاکہ لوگ بذریعہ ٹیلیفون بھی ہماری خدمات

طلب کر سکیں۔ یہ سب کچھ تو ہوا لیکن دکان منفعت بخش نہیں ہو سکی کیونکہ اس کے فروغ اور لوازمات کے اضافے کے لیے میں کوئی بڑا سرمایہ نہیں فراہم کر سکا چنانچہ اس کی آمدنی اسی پر صرف ہوتی رہی مزید براں ہر ماہ دکان کے کرایہ کے علاوہ کچھ اور رقم میری جیب سے جاتی رہی حالانکہ ایک قدم اور آگے بڑھ کر ہم لوگ ریڈیو اسمبل بھی کرنے لگے یعنی آرڈر ملنے پر گاہک کی پسندیدہ ڈیزائن اور سائز کے ریڈیو پرزے جوڑ کر تیار کر دیتے۔

اس دکان کے آگے نہ بڑھنے میں ہم لوگوں کی طبعی شرافت اور مروت کو بھی بڑا دخل تھا غالباً ہندوستانی حالات میں کوئی کاروبار سرمایہ کار کے لیے اس وقت تک منفعت بخش نہیں ہو سکتا جب تک گاہک کی جیب نہ تراشی جائے اور کام کرنے والوں کی اجرت نہ ماری جائے۔ ہم دونوں بھائیوں نے روزِ اول سے ایسا کچھ بھی نہیں کیا بلکہ کر ہی نہیں سکتے تھے۔ مزید براں دکان پر دوستی بھی پھلتی پھولتی رہی۔ بالآخر یہ تجویز طے پائی کہ مطیع اللہ میاں کے لیے کوئی کام تلاش کیا جائے اور دکان کو کاریگروں کے سہارے چلنے دیا جائے۔ غرض یہ کہ انھیں نیو انڈیا ربر ورکس میں اکاؤنٹس کا کام مل گیا آگے چل کر وہ وہاں پر چیزنگ آفیسر ہو گئے۔ اِدھر ہمارے تیسرے بھائی امان اللہ جو ہائی اسکول پاس کر چکے تھے کلکتہ آ گئے اور انھوں نے رفتہ رفتہ دکان کے معاملات کو اپنے ہاتھ میں لیا۔

اُدھر نومبر ۱۹۵۳ء میں میری پہلی بیٹی قمر جبیں کی ولادت ہوئی۔ اس سے پہلے میں پریشان تھا کہ بیوی کی دوا درمن اور اس اثناء میں بڑھے ہوئے اخراجات کیسے پورے کروں گا لیکن اتفاق ایسا ہوا کہ اکتوبر کے مہینے میں مصطفیٰ صابری صاحب ایک ماہ کی رخصت پر گھر چلے گئے تھے۔ وہ ہر سال ایک ماہ کی رخصت پر جایا کرتے تھے اور چونکہ چھٹیاں بلا تنخواہ ہوا کرتی تھیں اس لیے وہ تنخواہ سے محروم رہتے۔ اس کا دوسرا پہلو یہ تھا کہ جو شخص اتنا سخت جان ہوتا کہ اپنے معین یومیہ کام سے فاضل کر لیتا اس کو فاضل کام کی اجرت شرح معین کے مطابق اس کی تنخواہ کے علاوہ مل جاتی۔ صابری صاحب کے ساتھ معاملہ یوں تھا کہ جو کام بھی ان کے ذمہ کیا جائے گا کریں گے اور انھیں دو سو روپیہ ماہانہ ملتا

رہے گا۔ میں نے اکتوبر کے مہینے میں اپنے کام کے علاوہ صابری صاحب کی ذمہ داریاں بھی قبول کرلیں اور نبھا دیا۔ چنانچہ نومبر کے اوائل میں مجھے اپنی تنخواہ کے علاوہ وہ رقم بھی مل گئی جو میری بیٹی کی ولادت کے موقع پر زائد اخراجات کی تکمیل میں معاون ہوئی اور میں نے اپنی پیشانی سے پسینہ پونچھ کر اطمینان کا سانس لیا۔

☆☆☆

صحافت کا ایک نیا باب

میں جس نئے باب کا ذکر کرنے جارہا ہوں اس کا تعلق محض اردو صحافت سے نہیں بلکہ بحیثیت مجموعی ہندوستانی صحافت سے ہے جو آزادی کے دوسرے ہی دن سے آہستہ آہستہ کروٹیں بدلتی ہوئی ایک صنعت اور نفع بخش صنعت کی شکل اختیار کرتی جارہی تھی اور دوسری تمام صنعتوں کے مقابلے میں اس اعتبار سے ممیّز اور ممتاز تھی کہ اس کے ہاتھ میں قومی سیاست کی کلید بھی تھی لیکن یہ نوزائیدہ یا ابھرتی ہوئی صنعت بذات خود دو حصوں میں تقسیم ہورہی تھی ایک حصہ وہ تھا جس کے ہاتھ میں سرمایہ اور مالکان استحقاق تھا اور دوسرا حصہ وہ تھا جس کے ہاتھ میں قلم تھا اور جس کی دانشوری سرمایہ کے ہاتھ میں گروی تھی۔ دو کلیدی سوالات زیر بحث تھے اول یہ کہ پالیسی کی لگام کس کے ہاتھ میں ہو۔ یہ سوال بلا کسی مخمصہ اور خدشہ کے طے ہوگیا یعنی جس کا سرمایہ اسی کی پالیسی ہو اور زرخرید قلم محض اس کا ترجمان ہو۔ اس تصفیہ میں اس معاملہ میں اردو صحافیوں کو کوئی خاص دشواری نہیں پیش آئی کیونکہ بیشتر مالکان بذات خود ایڈیٹر تھے اور صحافت میں عملی حصہ لیتے تھے۔

دوسرا سوال یہ تھا کہ قلمی ترجمانی کرنے والوں کا معاوضہ کیا ہو اور اس کا تصفیہ کیونکر کیا جائے۔ یہ کام کچھ آسان نہ تھا۔ اس کا تصفیہ کرنے سے پہلے معاوضے کے طلب گاروں کو یہ بتانا ضروری تھا کہ آج اس صنعت میں جو سرمایہ کار ہے وہ کل بڑے خطرے

مول لے چکا ہے اور قربانیاں دے چکا ہے ان حقائق کو یک لخت نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ طے پا جانا اس قبیلے کی دور رس سیاسی جیت تھی اور ہونی بھی چاہیے تھی کیونکہ خواہ نہرو کا حکمراں گھرانا ہو خواہ برلا اور ڈالمیا جیسے خالص سیاسی سرمایہ دار اور کانگریس راج کے پشت پناہ ہوں سب اسی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔

چنانچہ طے پایا کہ ایک پریس کمیشن قائم کر دیا جائے جو ہندوستانی صحافت کی تاریخ مرتب کرے اور مستقبل میں رہنمائی کے لیے راستہ ہموار کرے۔ مسٹر جے نٹراجن کی سربراہی میں اس کمیشن نے بلا شبہ بڑا مبسوط اور بنیادی کام کیا اور ہندوستان میں صحافت کی ابتدا سے لے کر اس وقت تک وجود میں آنے والے تقریباً سارے اخباروں کی فہرست مرتب کر دی۔ مختصر حوالوں میں ان اخباروں کی ملکیت، ادارت اور پالیسی وغیرہ پر بھی روشنی ڈالی گئی۔

اسی کمیشن کی رپورٹ کے نتیجے میں دو ادارے بھی راسخ ہوئے ایک تو پریس رجسٹرار کا دفتر جس کے ذمہ یہ کام ہوا کہ اخبارات کی جملہ کیفیات پر مستقل نظر رکھے اور سالانہ رپورٹ پیش کرتا رہے دوسری سفارش ایک اجرتی بورڈ کے تقرر کے بارے میں تھی جو اخبارات کی تعداد اشاعت اور مالی حیثیت کو مدنظر رکھ کر ان کی درجہ بندی کرے اور اس کے ساتھ ہی ان اخباروں اور خبر رساں ایجنسیوں میں کام کرنے والے صحافیوں کی بھی ان کی ذمہ داریوں کے اعتبار سے درجہ بندی کرے اور ان دونوں درجہ بندیوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہر درجہ کے اخباری کارکنوں کی اجرتوں کا تعین کرے۔

چنانچہ ۱۹۵۶ء میں پہلے اجرتی بورڈ نے اپنی رپورٹ پیش کی جس میں اخباروں اور اخبار نویسوں کی درجہ بندی کے بعد ان کی اجرتوں کا تعین کیا گیا تھا۔ ان سفارشوں نے ایک طرف اخبار کے مالکوں اور ان کی انجمنوں اور دوسری طرف اخبار نویسوں اور ان کی تنظیموں کے درمیان گونا گوں کشیدگیوں کے دروازے کھول دیے اور ٹریڈ یونین کی تحریک پوری آن بان کے ساتھ پیشۂ صحافت میں داخل ہوگئی۔ بنگال کا مزاج اس طرح کی تحریکات کے لیے یوں بھی بڑا سازگار رہا ہے۔

دیسی زبانوں کی صحافت، بالخصوص اردو صحافت، اس وقت دو خاص حصوں پر مشتمل ہوا کرتی تھی ایک ادارتی مضامین اور دوسرے ترجمہ۔ ترجمہ کا حصہ زیادہ اور بلاشبہ ناگزیر ہوا کرتا تھا لیکن ادارتی مضامین اور یہ مضامین لکھنے والوں کو زیادہ وقیع تصور کیا جاتا تھا۔ پریس کمیشن کی سفارش کے مطابق قائم کیے جانے والے اجرتی بورڈ نے اپنی سفارشوں میں صحافیوں کی جو گروپ بندی کی اور ان کے لیے جو اصطلاحات استعمال کیں ان کا رواج اردو صحافت میں سرسری اور غیر ارادی تھا لیکن اجرتی بورڈ کی سفارشوں نے نیوز ایڈیٹر، سب ایڈیٹر، پروف ریڈر وغیرہ جیسی اصطلاحات کو خاص معنوں اور مفہوم میں استعمال کیا تو ہر متعلق اور غیر متعلق شخص نے جائزہ اور احتساب شروع کیا۔ اس طرح ایک طرف ساتھی کارکنوں کے درمیان باہمی رقابت اور دوسری طرف مالکان اخبار اور ملازمین کے درمیان سودے بازی کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہوا جس میں شکوک، بے اعتمادی، بے وفائی اور غداری تک کی فضا بن گئی۔ یہ بات پوری ایمانداری کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ ان حالات میں کسی شخص کے لیے بھی خواہ وہ کسی گروہ سے تعلق رکھتا ہو دیانتداری کا دامن تھامے رہنا ایک داخلی قیامت سے گزرنے کے مترادف تھا۔ میرے جیسے لوگوں کے لیے جنھوں نے پیشے سے وفاداری کو جزوِ ایمان سمجھا تھا اور اسی میں جی جان کی بازی لگادی تھی لوہے کے چنے چبانے پڑے۔

میں نے اپنا شعوری احتساب کیا اور آنے والے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے کچھ اصول متعین کر لیے جن پر ہمیشہ قائم رہا وہ اصول یہ تھے کے ضابطوں کے مطابق اپنے استحقاقات کا مطالبہ کرتا رہوں گا، کام پر اور اخبار پر کبھی حرف نہ آنے دوں گا، مالک اخبار سے اتنی ہی اجرت کی توقع رکھوں گا جتنی اس کی استطاعت ہوگی نہ کہ جس کی سفارش اجرتی بورڈ نے کی ہوگی لیکن متوقع اجرت پر اصرار جاری رکھوں گا، کسی ساتھی کارکن کے خلاف سازش میں کبھی حصہ نہیں لوں گا نہ اس میں معاونت کروں گا اسی طرح اخبار کو نقصان پہنچانے کی کسی کوشش یا سازش میں بھی شریک نہیں ہوں گا۔ میں ان آدرش اصولوں کی بات

آج نہیں کر رہا ہوں بلکہ میری پوری صحافتی زندگی اس کی گواہ ہے۔ میرے ان اصولوں نے ایسی ایسی غلط فہمیاں پیدا کیں کہ میرے ساتھیوں نے مجھے مالک کا آدمی سمجھا اور مالک مجھے باغی سمجھتا رہا۔

زاہدِ تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلماں ہوں میں

بہرحال میں نے ان حالات میں جولائی ۱۹۵۶ء میں باتنخواہ ایک ماہ کی چھٹی کی درخواست دے ڈالی۔ اردو اخبار میں سب سے پہلے میں نے یہ جسارت کی تھی۔ ظاہر ہے اسے مسترد کر دیا گیا۔ فاتح فرخ اور ظفیر الحسن نے جو اس وقت میرے شرکائے کار تھے کہا کہ تم ایک ماہ کی چھٹی کیوں جاتے ہو دو ہفتے کے لیے چلے جاؤ چھٹی لینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے ہم دونوں ایک ایک ہفتہ تمہارا کام کر دیں گے پھر کسی موقع پر تم ہم لوگوں کے عوض کام کر دینا۔ میں نے یہ تجویز مان لی اور دو ہفتے کے لیے گھر چلا گیا۔

اگست میں فاتح فرخ نے ایک ہفتہ کی عوضی چھٹی لے لی اور میں اپنے کام کے علاوہ ان کے حصہ کا کام بھی کرنے لگا۔ چند روز گزرے ہوں گے کہ ظفیر صاحب کی بیوی کی علالت کا تار آیا اور وہ بکٹٹ پٹنہ روانہ ہو گئے۔ بس ان کے حصہ کا کام بھی میں نے کھینچ لیا اب میں تھا اور 'عصر جدید' کا جان لیوا کام اس میں شریک حال نہیں بلکہ شریک سفر مصطفیٰ صابری تھے بسی انہی دنوں میں سے یا انہی راتوں میں سے ایک رات وہ بھی تھی جب کام کرتے کرتے 'عصرِ جدید' کی میز پر مجھے غش آ گیا لیکن اتفاق سے اسی شام ظفیر صاحب پٹنہ سے واپس آ چکے تھے۔ میری کیفیت کی خبر پاتے ہی آ کر انھوں نے کام سنبھال لیا۔

یہ شب و روز جب ۱۹۵۷ء میں داخل ہوئے تو دو واقعات پیش آئے اول تو وہی جس کا ذکر آ چکا ہے یعنی ظفیر صاحب 'عصرِ جدید' سے سبکدوش کیے گئے۔ دوسرا واقعہ یہ ہوا کہ صابری صاحب نے بحیثیت ایڈیٹر ضابطوں کے مطابق تنخواہ کا مطالبہ پیش کیا۔ خان بہادر صاحب ان سے ایسی توقع کر ہی نہیں سکتے تھے کیونکہ وہ واحد شخص تھے جو روزانہ نمازِ

عصر کے بعد خان بہادر صاحب کے دفتر ۸۰، کولوٹولہ اسٹریٹ میں ان کے ساتھ چائے نوش کیا کرتے تھے پھر دوسری چائے مغرب بعد 'عصرِ جدید' کے دفتر میں چلتی تو اس میں بھی منیجر اقبال صاحب اور دیگر مصاحبین کے ساتھ صابری صاحب شریک ہوتے۔ چونکہ کئی برس سے ان کا نام 'عصرِ جدید' کے ایڈیٹر کی حیثیت سے چھپ رہا تھا اس لیے ان کو یقین تھا کہ خان بہادر صاحب ان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کرسکیں گے۔

لیکن ان کے خلاف کارروائی شروع ہوگئی وہ اس طرح کہ صابری صاحب دن میں جو ایڈیٹوریل لکھ کر رکھ جاتے اسے منیجر صاحب اٹھالے جاتے اور کوئی دوسرا ایڈیٹوریل کسی سے لکھوا کر کتابت کے لیے دے دیتے۔ بعد کے واقعات سے اس قیاس کو تقویت ملتی ہے کہ وہ ایڈیٹوریل اقبال اکرامی لکھتے تھے اور یہ کہ یہ سب کچھ خان بہادر صاحب کی ہدایت کے مطابق ہورہا تھا۔ صابری صاحب یہ سب دیکھ تو رہے تھے لیکن کچھ کرنہیں سکتے تھے بالآخر ایک دن ان کا نام اخبار کی پیشانی سے ہٹادیا گیا اور مولانا عطاء الرحمٰن قدسی کا نام چھپنے لگا۔ صابری صاحب کو اس بات کا رنج ہوا کہ مولانا ان کے ہم وطن تھے انھیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا لیکن مولانا کا ذہن بالکل صاف تھا وہ دارالاشاعت اسلامیہ کے مہتمم کی حیثیت سے خود کو پوری طرح خان بہادر صاحب کے تابع فرمان اور وفادار سمجھتے تھے اور بات جب صرف نام چھپنے کی آئی تو وہ اس سے انکار نہ کرسکے۔

صابری صاحب سے کہا گیا کہ وہ صرف ترجمہ کرسکتے ہیں لیکن ان کی غیرت نے یہ بات گوارہ نہیں کی اور وہ بالفعل 'عصرِ جدید' سے کنارہ کش ہوگئے یا الگ کردیے گئے اور اس کے بعد ان کو 'آزاد ہند' میں کام مل گیا لیکن ان کا اگلا اقدام یہ تھا کہ انھوں نے جرنلسٹ ایسوسی ایشن سے رجوع کیا۔ ایسوسی ایشن نے ان کی طرف سے پیروی کرتے ہوئے لیبر ڈسپیوٹ کا ایک کیس تیار کرکے ٹریبونل میں پیش کیا کچھ عرصہ تک یہ معاملہ چلا پھر کسی باہمی تصفیہ کی بات چلی اور بالآخر صابری صاحب غالباً -/۱۸۰۰ روپیہ بطور معاوضہ لینے پر راضی ہوگئے جسے خان بہادر صاحب نے ادا کردیا۔ خود صابری صاحب کے بقول

وہ اس پیسے میں سے سب سے پہلے ایک ہارمونیم غالباً دو سو روپیہ کا خرید کر لائے۔ وہ ہارمونیم بجانا جانتے تھے خالی وقت میں اپنے کمرے میں اس سے شغل فرماتے جس سے خود ان کے بقول پڑوسی بھی محظوظ ہوا کرتے تھے۔

صابری صاحب کے مقدمہ کی کچھ چھینٹیں مجھ پر بھی پڑیں وہ یوں کہ نیوز ایڈیٹر کی حیثیت سے میں کسی فریق کے لیے ایک مضبوط گواہ بن سکتا تھا، چنانچہ مجھے خان بہادر صاحب نے اپنے ہیڈ آفس میں طلب کیا اور بتایا کہ صابری صاحب نے ایڈیٹوریل لکھنا چھوڑ دیا ہے اس لیے ان کو برطرفی کی نوٹس دی گئی ہے آپ کو یہ گواہی دینی ہوگی۔ میں نے یہ کہہ کر اس سے معذرت کر لی کہ وہ تو میرے سامنے ایڈیٹوریل لکھا کرتے تھے میں غلط بیانی نہیں کرسکتا۔ اس واقعہ سے ہمارے تعلقات میں بدمزگی کا اضافہ ہوا۔

'عصرِ جدید' میں صابری صاحب کا خلا شہاب لکھنوی نے اور ظفیر صاحب کا خلا بدر عالم نظامی نے پُر کیا اس کے بعد کئی برس کا عرصہ ایسا گزرا کہ نیاز اعظمی 'عصرِ جدید' اور 'آزاد ہند' کے درمیان پھیرے کرتے رہے۔ اس اثناء میں کلکتہ کی اردو صحافت کے دیگر حالات کم و بیش یہ تھے کہ شین مظفر پوری کلکتہ کو خیر باد کہہ کر پٹنہ جا چکے تھے۔ شام کے اخبارات ''امروز'' اور ''آبشار'' کے درمیان رقابت زوروں پر تھی۔ ''آبشار'' سالک لکھنوی کی ملکیت میں ابراہیم ہوش کی زیرِ ادارت شائع ہو رہا تھا اور عام طور سے کمیونسٹ پارٹی کا ترجمان خیال کیا جاتا تھا۔ مولوی معز الدین اپنا ''الحق'' بند کر کے ڈھاکہ چلے گئے اور اس کے روح و رواں محمد اسرائیل کراچی چلے جانے پر مجبور ہوئے۔ ان کے علاوہ مطیع الرحمٰن بطور مترجم اور ادریس الحق بطور رپورٹر 'عصرِ جدید' میں آ گئے۔

شیخ انور علی کی ملکیت میں اور ناظر الحسینی کی زیرِ ادارت ''اخوت'' ایک اچھے اخبار کے طور پر چل نکلا تھا۔ میں نے ناظر صاحب کو ہمیشہ سے زیادہ صحتمند، خوش اور خوشحال اخوت کی ادارت کے زمانے میں دیکھا لیکن افسوس کہ وہ بہار زیادہ دنوں نہیں رہی۔ وقار مشرقی کا عمل دخل اخوت میں بڑھ گیا۔ پھر اسی اخبار کے کھنڈر پر شام کا ایک اخبار ''غازی''

جاری ہوا جو شیخ انور علی کی ملکیت میں وقار مشرقی کی زیرِ ادارت تھا اور ہنوز جاری ہے۔ غلام سرور فگار 'روزانہ ہند' کی ادارت سے سبکدوش کیے گئے اور ان کی جگہ رئیس الدین فریدی نے لی جو حیدرآباد اور بمبئی میں قسمت آزمائی کے بعد کلکتہ آئے تھے یا بقول خود ان کے بھیج دیے گئے تھے۔

۱۹۵۶ء میں دو قابلِ ذکر واقعات ہوئے۔ ایک تو 'عصرِ جدید' کے ہیڈ کاتب حسن صاحب کا طویل علالت کے بعد انتقال۔ ان کا پورا نام علی حسن تھا لیکن ہم لوگ صرف حسن صاحب کہتے تھے۔ میں ۱۹۵۱ء میں جب 'عصرِ جدید' میں داخل ہوا اس وقت وہی ہیڈ کاتب تھے۔ یہی کوئی ۳۵-۳۷ کی عمر رہی ہوگی۔ اعظم گڑھ کے رہنے والے تھے۔ نہایت خاموش، دن کو ٹھیک دو بجے آ کر اپنی جگہ بیٹھ جاتے پھر رات کو دو بجے تک بیٹھے رہتے۔ رات کو کھانا کھانے تھوڑی دیر کے لیے جاتے قریب ہی چونا گلی میں رہتے تھے لیکن اگر کام زیادہ ہوتا تو پان اور چائے کے سہارے بیٹھے رہ جاتے۔ کسی کاتب سے فاضل کام کے لیے اصرار نہیں کرتے بس خود ہی کر ڈالتے اس لیے ہر کوئی ان کی بات مانتا تھا۔ اس شدت سے کام کا جو انجام ہونا چاہیے تھا سو ہوا۔ بخار رہنے لگا اسی عالم میں بیٹھے تپتے رہتے۔ جب بہت بیمار رہنے لگے تو ہم لوگوں کے اصرار پر چھٹی لے کر گھر گئے اور مہینے دو مہینے بعد داعیِ اجل کو لبیک کہا۔

ان کی بات بطور خاص قابلِ ذکر یوں ہے کہ وہ دوسری عالمی جنگ کے دوران اپنے ماموں کے ساتھ رنگون میں پھنس گئے تھے۔ دراصل برما، ملایا اور سنگاپور میں اعظم گڑھ کے بہت سے لوگ پہنچے ہوئے تھے۔ جس طرح آج لوگوں کا سیلاب مغربی ایشیا اور مشرقِ وسطیٰ کی طرف ہے، دوسری جنگ عظیم سے پہلے مشرقی ایشیا کی طرف ہوا کرتا تھا۔ لوگ وہاں جا کر دو-تین-پانچ سال کام دھندھا کرنے کے بعد چند مہینوں کے لیے وطن آتے۔ اعظم گڑھ کے مردم خیز خطے کی کارآمد آبادی کو کام اور ذریعہ معاش فراہم کرنے کے لیے زیرِ کاشت زمین ناکافی تھی۔ صنعتیں، بہ استثنائے پارچہ بافی، نہیں کے برابر تھیں

اس لیے لوگ مشرق یا مغرب کہیں نہ کہیں مقدر آزمائی کے لیے جانے پر مجبور تھے اور اس میں تقدیر نے ان کی یاوری بھی کی۔ جاپان نے جب مشرقی ایشیا کے اس خطے کو نرغے میں لیا تو وسائل آمدورفت نہ ہونے کی وجہ سے بہت سے ہندوستانی اس علاقے میں پھنس گئے۔ جنگ ختم ہونے کے بعد بھی بہت عرصہ تک ان کی واپسی کی کوئی صورت نہ تھی لیکن اس جنگ زدہ علاقے کے حالات بھی ناقابلِ برداشت تھے۔

چنانچہ ہندوستانیوں کے قافلے برما کے جنگلوں سے گزرتے ہوئے جان ہتھیلی پر لیے کاروان درکارواں چلے آتے لیکن بڑے بڑے قافلوں کے بہت کم افراد ان جنگلوں سے زندہ وسلامت گزر کر بنگال اور آسام کی حدوں میں داخل ہوتے، پھر ان کو ہندوستانی رسل ورسائل کی جو سہولتیں دستیاب ہوتیں وہ بھی بہت ناکافی تھیں۔ بقول حسن صاحب ہم لوگوں کے قافلوں میں چلتے چلتے جو آدمی بیٹھ جاتا اس کو چھوڑ کر لوگ آگے بڑھ جاتے پھر وہ اٹھ نہیں سکتا تھا اور جنگلی جانوروں کا لقمہ بن جاتا چنانچہ ان جنگلی گزرگاہوں کے دونوں طرف جابجا آدمیوں کے پنجر پڑے نظر آتے۔ پانی کی نایابی کا بڑا مسئلہ تھا راستے میں کہیں کہیں گندا پانی جمع نظر آتا کوئی پیاس سے بدحواس اس کو پی لیتا تو جلد ہی قے دست میں مبتلا ہوجاتا اور پھر اس کے بچنے کا کوئی سوال نہ تھا۔

حسن صاحب بھی اپنے ماموں کے ساتھ اسی طرح کے ایک قافلے میں اس ہفت خواں کو طے کرکے ہندوستان آگئے اور اپنے وطن تک سلامت پہنچے۔ ایسا جری اور سخت جان شخص 'عصر جدید' میں تخت پر بیٹھا بیٹھا اندرونی تپش میں جل کر مرگیا۔ اس موت بلکہ جوانمرگی سے بھی زیادہ المناک بات یہ تھی کہ اتنی محنت، جانفشانی اور بے داغ وفاداری کے ساتھ کام کرنے کے باوجود اس کو اتنے پیسے نہیں ملتے تھے کہ اپنی بیوی اور بچوں کی کفالت کے بعد علاج معالجہ کے لیے بھی کچھ پیسے نکال سکے اور ہم سب لوگ جانتے تھے کہ جب وہ شخص آخری بار گھر جانے لگا تو اس کو حساب سے اس کی اجرت کے سوا کوئی اور رقم نہیں دی گئی اور جو رقم اس کو ملی وہ سفری اخراجات ہی کے لیے کافی ہوسکتی تھی۔

۱۹۵۶ء کا دوسرا قابلِ ذکر واقعہ بیان کرنے سے پہلے ایک اور واقعہ کا تذکرہ مناسب معلوم ہوتا ہے جس کا تعلق اعظم گڑھ کے ہی ایک شخص سے ہے جو دوسری جنگ عظیم کے دوران برما یا ملایا میں پھنس گیا تھا اور وہ واقعہ کلکتہ کے انگریزی روزنامہ اسٹیٹمین کے ادارتی صفحہ پر شائع ہوا تھا۔ وہ کسی انگریز افسر کا لکھا ہوا مضمون تھا جو دوسری جنگ عظیم کے اختتام پر برما اور ملایا میں پھنسے ہوئے ہندوستانیوں کی واپسی کا انتظام کرنے کے لیے رنگون میں مامور کیا گیا تھا۔ وہ لکھتا ہے:

''شمالی اور جنوبی ہند کے ہندوستانیوں کو الگ الگ کیمپوں میں اکٹھا کیا گیا۔ جنوبی ہند والوں کو لے جانے والے جہاز مدراس کے لیے اور شمالی ہند والوں کو لے جانے والے جہاز کلکتہ کے لیے روانہ ہونے والے تھے۔ کیمپوں میں اکٹھا ہندوستانیوں کی فہرستیں تیار کی گئیں۔ شمالی ہند کے لوگوں کی فہرست میں ایک شخص کے نام کے سامنے اس کی عمر ایک سو بیس برس لکھی ہوئی تھی۔ اس کو دیکھ کر میں چونکا۔ متعلقہ کیمپ کلرک کو بلا کر پوچھا کہ اس کی عمر کے اندراج میں غلطی تو نہیں ہوگئی ہے۔ کلرک نے بہ اصرار کہا کہ اس شخص کی عمر صحیح درج کی گئی ہے۔ چنانچہ مجھے اشتیاق ہوا کہ چل کر ایک سو بیس برس کے آدمی کو دیکھنا چاہیے۔ میں متعلقہ کیمپ میں گیا اور محمد عمر نام کے اس شخص کو دیکھا کہ بیٹھا قرآن پڑھ رہا ہے۔ وہ کافی بوڑھا تو معلوم ہو رہا تھا لیکن بلا چشمہ کے ہی قرآن پڑھ رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کیا تمہاری عمر ایک سو بیس برس ہے تو اس نے اثبات میں جواب دیا۔ پھر میں نے ایک مقامی بوڑھی عورت سے پوچھا کہ کیا تم اس شخص کو جانتی ہو اسنے جواب دیا کہ ہم تو ہمیشہ سے اس آدمی کو ایسا ہی بوڑھا دیکھ رہے ہیں۔ اس کی عمر پانچ ربڑ کے درخت کے برابر ضرور ہوگی۔ وہاں مقامی لوگ ایک ربڑ کے پیڑ کی عمر بیس برس شمار کرتے ہیں۔ چنانچہ اس بڑھیا کے کہنے کے مطابق بڑے میاں کی عمر بہرحال سو برس سے زیادہ تھی۔ پھر میں نے ڈاکٹر کو طلب کر کے اس شخص کا معائنہ کرنے اور اس کی عمر تجویز کرنے کی ہدایت کی۔ ڈاکٹر نے اپنی رپورٹ میں لکھا کہ اس شخص کے دانتوں کا تیسرا سٹ بن رہا ہے اور اس کی

عمر بہر حال سو برس سے اوپر ہے۔''

''اس کے بعد مجھ کو اس شخص سے بڑی ہمدردی ہوگئی اور میں نے اس سے کہا کہ تمہارے وطن اعظم گڑھ کی طرف کے لوگ جس جہاز میں جارہے ہوں وہ بتاؤ تا کہ ان لوگوں کے ساتھ ہی تمہیں بھیجا جائے۔ اس نے ایک جہاز کے بارے میں بتایا کہ فلاں تاریخ کو جانے والا ہے اسی سے میں جاؤں گا کیونکہ اس میں ہماری طرف جانے والا ایک شخص بیمار ہے میں سفر کے دوران اس کی دیکھ بھال کرلوں گا۔ اس کی اس بات نے مجھے اور بھی حیران کر دیا۔''

''محمد عمر کی روانگی سے پہلے میں نے اس سے پوچھا اگر کوئی پریشانی ہو تو بتانا۔ اس نے کہا صاحب بس ایک بات کی فکر ہے وہ یہ کہ یہاں میرا کاروبار تھا جسے چھوڑ کر جارہا ہوں معلوم نہیں میرے جانے کے بعد میرے بیٹے کاروبار سنبھال سکیں گے یا نہیں۔ اس کی یہ بات اور بھی حیران کن تھی کہ اس کے بچے اتنے چھوٹے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ تمہارے بیٹوں کی کیا عمر ہے تو اس نے بتایا کہ چھوٹے کی عمر اناسی برس اور بڑے کی بیاسی برس۔''

۱۹۵۶ء کا دوسرا قابلِ ذکر واقعہ وہ ہوا جو آگے چل کر میری زندگی میں ایک نئے اور فیصلہ کن موڑ کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ میں ایک روز 'عصرِ جدید' میں کام کررہا تھا کہ ایک صاحب شیروانی اور چوڑی دار پائجامے میں ملبوس وارد ہوئے اور اپنا تعارف اس طرح کرایا مجھے ''بھارتی'' کہتے ہیں۔ میں پٹنہ سے آیا ہوں۔ اشتہارات کی لائن میں کام کرتا ہوں اب تک صرف ہندی اخباروں کے لیے کام کرتا رہا ہوں اب اردو اخبار کے لیے بھی کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے موقع دے کر دیکھئے۔ میں نے بھارتی جی کا تعارف منیجر اقبال صاحب سے کرایا پھر انھیں خان بہادر صاحب کے دربار میں شرف باریابی حاصل ہوئی اور انھیں آزمائش کا موقع دیا جانا طے پایا۔

اس کے بعد وہ زیادہ تر منیجر صاحب کے کمرے میں بیٹھنے لگے یوں زیادہ وقت تو باہر ہی گزارتے کسی کسی وقت آتے۔ کبھی شام کو خان بہادر صاحب کی موجودگی میں بھی

آجاتے۔انھوں نے رفتہ رفتہ خاں بہادر صاحب کو ایسا شیشے میں اتارا کہ دن میں جہاں چاہتے انہی کی گاڑی سے آنے جانے لگے۔ عذر یہ تھا کہ پارٹی پر اچھا تاثر دینا ضروری ہے۔ پینے پلانے کا بھی اچھا شوق رکھتے تھے۔اس کے لیے انھوں نے خان بہادر صاحب سے فنڈ منظور کرالیا تھا۔عذر یہ تھا کہ پارٹی کو جب تک کھلایا پلایا نہیں جائے گا قیمتی اشتہارات نہیں مل سکتے۔ جب چھ مہینے تک سناٹا رہا تو چہ میگوئیاں شروع ہوئیں اور کچھ بھارتی جی سے بھی پرسشِ احوال ہوئی۔ انھوں نے بڑے اطمینان سے فرمایا کہ ابھی تو فیلڈ بنا رہا ہوں اس میں کافی وقت لگتا ہے لیکن ایک بار گاڑی چل پڑتی ہے تو بس چلتی رہتی ہے۔خیر، ان کی معرفت کچھ کمرشیل اشتہارات آنے لگے۔ یہ تو نہیں معلوم کے ان کی تنخواہ کیا طے پائی تھی لیکن یہ معلوم ہوا کہ اشتہارات کی آمدنی میں سے ۲۵ رفیصد کمیشن طے ہوا تھا۔

بھارتی جی کم وبیش دو برس 'عصرِ جدید' میں رہے ہوں گے لیکن ان کا جانا اس طرح ہوا کہ انھوں نے خان بہادر صاحب کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ 'عصرِ جدید' کا عید نمبر ماہوار رسالوں کے سائز کا دوسو صفحوں پر مشتمل نکالا جائے۔شعبہ اشتہارات کے لوگ بھی زیادہ سے زیادہ اشتہارات لانے کی کوشش کریں ہم بھی پوری کوشش کریں گے۔خان بہادر صاحب راضی ہوگئے۔ایسا ہی عید نمبر نکالا گیا یا دنہیں صفحات کتنے تھے لیکن بھارتی جی شاید آٹھ ہزار کے اشتہارات لاسکے اور شرائط کے مطابق دو ہزار روپیہ کمیشن کے طلبگار ہوئے۔خان بہادر صاحب نے کہا کہ بھائی دو ہزار روپئے بہت ہوتے ہیں۔ 12½ فیصد کے حساب سے ایک ہزار روپیہ لے لو۔ بھارتی جی خاموش ہوگئے۔ چونکہ مشتہرین تو انہی کو جانتے تھے اس لیے انھوں نے خاموشی سے بل تیار کیے اور آٹھ ہزار کی ساری رقم وصول کرکے چمپت ہوگئے اور 'عصرِ جدید' والے لکیر پیٹتے رہ گئے۔

لیکن بھارتی جی نے اپنے قیامِ 'عصرِ جدید' کے دوران ایک کام کیا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب خان بہادر صاحب کی کار ان کی خدمت کے لیے حاضر رہتی تھی۔ مجھ سے بھارتی جی کی بے تکلفی تھی اس لیے وہ مجھے بھی دو ایک بار کار میں بٹھا لے گئے۔اسی

اثناء میں امریکی دفتر اطلاعات (یو ایس آئی ایس- موجودہ امریکن سینٹر) میں بھی ان کا آنا جانا تھا۔ وہاں ایک مسٹر گپتا ہوا کرتے تھے ان کا تعلق دیسی زبانوں کے اخبارات سے تھا۔ یو ایس آئی ایس میں بنگلہ اور ہندی کے ایڈیٹر اور ٹرانسلیٹر تھے۔ بھارتی جی نے گپتا جی کو مشورہ دیا کہ اردو کا بھی کچھ کام کیوں نہیں کرتے اور اس سلسلے میں انھوں نے اردو اخباروں کی اہمیت بیان کی ہوگی۔ پھر ایک دن مجھے بھی اپنے ساتھ یو ایس آئی ایس لے گئے اور 'عصر جدید' کے نیوز ایڈیٹر کے طور پر تعارف کرایا۔ اس کے بعد اگلا قدم یہ تھا کہ گپتا جی کو 'عصرِ جدید' کے دفتر میں لے آئے اور ہم لوگوں سے ملاقات کرائی۔ عمارت تو بڑی تھی ہی اس غریب کو کیا معلوم کہ اس عمارت میں 'عصرِ جدید' کے علاوہ اور کیا کیا بکھیڑے ہیں۔ پہلی نظر میں سمجھا کہ واقعی ایک بڑے اخبار کا دفتر ہے۔

غرض کہ یو ایس آئی ایس میں میری آمدورفت شروع ہوگئی۔ جولائی اگست ۱۹۵۷ء میں کسی وقت مسٹر ہیرن موئے گپتا نے یہ خیال ظاہر کیا کہ اردو میں بھی یو ایس آئی ایس کی خبروں کے ترجمہ کا کچھ کام ہو لیکن اس سے پہلے ضابطے کی کارروائی ہوگی یعنی ٹسٹ اور انٹرویو کے بعد ہی امیدوار کا انتخاب کیا جائے گا۔ چنانچہ مجھے بھی ان مرحلوں سے گزرنا پڑا۔ غالباً پانچ امیدوار تھے جو باری باری الگ الگ ٹسٹ کے لیے بلائے گئے لیکن بالآخر میرا انتخاب ہوا۔ غالباً اس کی بڑی وجہ کلکتہ یونیورسٹی سے جرنلزم کا کورس کرنے کی ایک اضافی لیاقت میرے حصے میں تھی۔ بس وہی امریکی دفتر اطلاعات سے میری وابستگی کا نقطۂ آغاز تھا۔ میں نے ستمبر ۱۹۵۷ء کی ابتدائی تاریخوں سے کام شروع کیا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ شہاب لکھنوی بھی امیدواروں میں شامل تھے۔ ان کے پس منظر کے بارے میں رئیس الدین فریدی ایڈیٹر 'روزانہ ہند' اپنی ''اخبار نویسی کی کہانی'' میں لکھتے ہیں:

''محمد علی شہاب اگرچہ لکھنوی کہلاتے تھے لیکن کسی پہلو سے بھی لکھنوی نظر نہ آتے تھے۔ پہاڑ جیسا قد وقامت، گھوڑ دوڑ کے بڑے شوقین، سرکاری ملازم تھے، بنگلہ دیش (سابق مشرقی پاکستان- ڈھاکہ) کو تبادلہ کرالیا تھا مگر ریس کھیلنے ہوائی جہاز سے کلکتہ آتے

رہتے تھے۔ آخر کلکتہ ہی واپس آ گئے تھے..... یہ معلوم نہیں کہ وہ خود شعر کہتے تھے یا کسی سے کہلوا لیتے مگر آواز بڑی پاٹ دار تھی اور ترنم فلک شگاف اس لیے مشاعروں میں بڑی مانگ تھی۔''

شہاب صاحب کی ریس کے بارے میں ایک واقعہ یاد آیا۔ ایک روز وہ ریس میں چھ سو روپیہ جیت کر آئے تھے اور خوشی میں آپے سے باہر ہو رہے تھے۔ رات کو ڈیڑھ بجے کے قریب پی ٹی آئی کا چپراسی جو ڈیل ڈول میں شہاب صاحب کا بھی سوایا تھا حسبِ معمول آخری سروس لے کر آیا۔ اس کا رنگ روپ ایسا کہ اندھیرے میں ہرگز نظر نہ آئے۔ وہ بھی ریس کا شوقین تھا اور شہاب صاحب کبھی کبھار اس سے ریس پر باتیں بھی کر لیتے۔ اس کو دیکھتے ہی شہاب صاحب نے کہا کہ آؤ دیکھیں کس کی جیب میں زیادہ رقم ہے اس نے نہایت سادگی سے کہا کہ صاحب جانے دیجیے۔ لیکن جب شہاب صاحب کا اصرار جاری رہا تو اس نے کہا کہ پہلے آپ ہی دکھایئے۔ انھوں نے فوراً جیب سے سو سو کے چھ نوٹ نکال کر گن دیئے۔ تب اس نے کہا کہ بس! پھر شہاب صاحب کا اصرار تھا کہ تم بھی دکھاؤ، اس نے بالآخر جیب میں ہاتھ ڈالا اور سو سو کے اٹھارہ نوٹ گن دیے اور کہنے لگا کہ صاحب یہ میری دن بھر کی آمدنی ہے ہوڑہ میں چائے خانہ بند کر کے آتا ہوں۔ پی ٹی آئی میں نوکری ہے تو اس کو کیوں چھوڑ دوں۔

فریدی صاحب آگے چل کر میرے بارے میں لکھتے ہیں:

''رضوان اللہ علمی (ابتداً علمی تخلص کرتا تھا بعد میں چھوڑ دیا) جنھوں نے 'عصرِ جدید' کے علاوہ 'آزاد ہند' میں بھی کام کیا اعظم گڑھ کے رہنے والے اور بی اے تک تعلیم یافتہ تھے، اردو کے علاوہ انگریزی بھی اچھی لکھ لیتے تھے۔ خبروں کے ترجمہ اور انتخاب کے علاوہ ایڈیٹوریل بھی لکھ لیتے تھے۔ شاعری کا بھی شوق تھا لیکن مشاعروں سے دور رہتے تھے۔ وہ اردو صحافت میں تنگی ترشی سے بسر کر رہے تھے کہ کلکتہ کے امریکی دفتر اطلاعات میں ایک اردو داں آدمی کے تقرر کا اعلان ہوا۔ شہاب لکھنوی کی طرح انھوں نے بھی درخواست

دی اور کامیاب ہوگئے۔ کئی سال (۱۸سال) کلکتہ میں رہ کر کام کیا پھر دہلی کو تبادلہ ہوگیا اور اب وہی امریکی دفتر اطلاعات کے اردو کے شعبے کے مختار ہیں۔ معقول تنخواہ ملتی ہے۔ جامعہ نگر (ابوالفضل انکلیو) میں قیام ہے اور کام سے سبکدوش ہوں گے تو حق الخدمت کے طور پر خاصی رقم پالیں گے اردو کے کسی اخبار میں پڑے رہتے تو روٹیوں کے محتاج رہتے۔''

ابھی یو ایس آئی ایس میں میرے کام کے آغاز کو کوئی دو ہفتے گزرے ہوں گے کہ گھر سے میری چھوٹی بہن حسنہ کے انتقال کی خبر ملی وہ کچھ عرصہ سے بیمار تھی ہماری تنگ دستی اس کے معقول علاج معالجہ میں بھی ایک رکاوٹ تھی۔ میں مہینہ دو مہینہ پہلے گھر گیا تھا تو والدہ نے اس کے مناسب علاج کی بات کی تھی۔ ظاہر ہے وہ گاؤں میں رہتی ہوئی سمجھ رہی تھیں کہ بیٹا کلکتہ میں نوکری کرتا ہے تو بڑا پیسہ کماتا ہوگا لیکن میرا جواب سن کر وہ ششدر رہ گئیں۔ میں نے کہا تھا کہ اگر آپ کو میرے مرنے کی خبر ملے تو یہ نہ سمجھئے گا کہ کسی بیماری سے مرگیا بلکہ یہ سمجھ لیجیے گا کہ کام کرتے کرتے بھوکا مرگیا۔

یو ایس آئی ایس میں کام شروع کیا تو ہفتہ وار پیسے ملتے تھے چنانچہ وہاں سے پہلا پیسے ملتے ہی میں نے گھر بھیجا لیکن اس وقت تک میری بہن راہیِ ملک عدم ہوچکی تھی۔

اسی ماہ ستمبر کے اواخر میں میری دوسری بیٹی عائشہ پیدا ہوئی۔ اس کے کچھ دنوں بعد میرے تیسرے بھائی امان اللہ بھی کلکتہ آکر ہماری برادری میں شامل ہوگئے۔ رفتہ رفتہ دکان کی ساری ذمہ داری ان کو منتقل کی گئی۔ گھر اور دفتر کی گاڑی اسی ڈگر پر چلتی رہی۔ امان اللہ جنھیں ہم لوگ ''اتّن'' کہتے تھے اچھے منتظم تھے۔ دکان میں ترقی کے آثار نمودار ہوئے اور اس دہائی کے اختتام تک یعنی ۶۰ء کے آخر تک دکان بڑی حد تک خود کفیل ہوگئی۔ یعنی کرایہ بجلی اور ٹیلیفون کے بل اور کاریگروں کی تنخواہ اور کچھ امان اللہ کا جیب خرچ بھی اس سے نکلنے لگا۔

۵۸ء تا ۶۲ء چار پانچ سال ہمارے قیام کلکتہ کا سنہرہ دور تھا۔ ہم لوگ خوش تھے اپنے اپنے کام کی دھن میں تھے اور مستقبل کے منصوبے بنا رہے تھے۔ ۱۹۵۸ء میں چھوٹے

بھائی مطیع اللہ اور ان سے چھوٹی بہن نجمہ کی شادیاں ہوگئیں۔ چوتھے بھائی ثناء اللہ کلکتہ میں ہی پریسیڈنسی ہائی اسکول میں زیرِ تعلیم تھے اور سب سے چھوٹے بھائی فیضان اللہ کو ابا کی خواہش کے مطابق عربی تعلیم کے لیے مدرسے میں داخل کردیا گیا تھا۔ لیکن گردشِ دوراں کو یہ بات کہاں گوارہ ہوتی کہ کوئی شخص بےفکری کی زندگی گزارے۔

ہماری مصروفیات بالعموم کچھ اس طرح کی تھیں کہ صبح سویرے بھائی مطیع اللہ اور ہم دھرمتلہ میدان چلے جاتے اور رِنگ کھیلتے تھے جس میں جھنجھٹ کچھ نہیں تھا اور بھاگ دوڑ اچھی خاصی ہوجاتی تھی۔ وہاں سے آکر نہا دھوکر ناشتہ کرکے وہ نیو انڈیا ربر ورکس کام پر چلے جاتے اور میں یو ایس آئی ایس۔ وہاں وقت کی شرط تو تھی نہیں کام کی بات تھی کہ جب ترجمہ کے لیے کچھ ہو تو کردینا، نہ ہو تو کچھ نہیں، پیسے جوڑ کر ہفتہ وار مل جائیں گے۔ میرا فلسفہ یہ تھا کہ یومیہ اجرت والے مزدور کو کام ملے یا نہ ملے کام کی جگہ پر وقت کی پابندی کے ساتھ ضرور پہنچنا چاہیے۔ اس پابندی سے ہی کام کے امکانات بڑھ جاتے ہیں، چنانچہ حقیقت یہ ہے کہ میں کبھی خالی نہیں رہا۔ عام طور سے صبح ۹/بجے سے ایک بجے تک وہاں رہتا پھر گھر آکر کھا پی کر کچھ دیر آرام کرتا۔ شام کو ۴/بجے سے ۸/بجے تک پھر رات کو ۹/بجے سے گیارہ بارہ بجے تک 'عصرِ جدید' میں کام کرتا۔ وہاں شہاب لکھنوی آگئے تھے اور انھوں نے مصطفیٰ صابری کی جگہ ادارت یعنی ایڈیٹوریل لکھنے کی ذمہ داری باضابطہ سنبھال لی تھی اور بےضابطہ طور پر میری جگہ نیوز ایڈیٹر بھی انہی کو قرار دیا گیا تھا گو اس کے اظہار میں ہر کسی کو عار ہوتا تھا اس لیے کہ میں وہاں موجود تھا لیکن مینجمنٹ سے میرے تعلقات کشیدہ ہوگئے تھے۔

جیسا کہ پہلے بھی لکھ چکا ہوں کلکتہ میں کئی اچھے اور تجربہ کار اخبار نویس ایسے تھے جو 'عصرِ جدید' اور 'آزاد ہند' کے درمیان یا کسی اور اخبار کے درمیان آتے جاتے رہے اور یہ پھیرے کئی کئی بار ہوئے کسی تحریری ریکارڈ کی عدم موجودگی میں یہ بتانا ممکن نہیں ہے کہ ناظر الحسینی، رئیس جعفری، فاتح فرخ اور نیاز اعظمی وغیرہ کب کب کس کس اخبار میں رہے۔

میرے قیام 'عصرِ جدید' کے دوران کم سے کم دو بار یہ حضرات اس اخبار میں آئے گئے۔

اس آمدورفت کے اسباب اقتصادی، سیاسی اور مالکوں کے درمیان گھٹیا قسم کی رقابت تھی۔ مثال کے طور پر 'آزاد ہند' میں جو آدمی کام کرتا تھا وہ 'عصرِ جدید' کے مالک خان بہادر صاحب کی نظر میں قابلِ ستائش ہوتا تھا اس کو 'عصرِ جدید' میں کھینچنے کی ہر ممکن کوشش کی جاتی تھی، چنانچہ جہاں 'آزاد ہند' کے منتظمین سے اس کے تعلقات کشیدہ ہوئے 'عصرِ جدید' کی طرف سے چارہ ڈال دیا جاتا اور وہ روزی کا مارا ادھر آجاتا پھر 'عصرِ جدید' میں اس کی مٹی پلید ہوتی۔ 'آزاد ہند' کی طرف سے بھی ایسا ہی ہوتا تھا یا نہیں میں وثوق کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کیونکہ اس طرف کی داخلی کہانی میرے علم میں نہیں ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ سعید صاحب (احمد سعید ملیح آباد، ایڈیٹر آزاد ہند) نے کئی بار 'آزاد ہند' میں چلے آنے کا پیغام میرے پاس بھیجا اور ایک بار تو رفیق عابدی صاحب جیسے ثقہ شخص کی معرفت مجھے ان کا پیغام ملا لیکن ہر بار میں نے شکریہ کے ساتھ انھیں یہی جواب دیا کہ میں جہاں ہوں مطمئن ہوں۔ اس کی ایک وجہ میرا یہ احساس تھا کہ ہر جگہ کچھ نہ کچھ جھگڑے جھمیلے ہوتے ہی ہیں اس سے مفر نہیں ہے تو پھر کیوں مارے مارے پھرو۔ دوسرے میرا یہ اندازہ بھی تھا کہ خان بہادر صاحب اپنی تمام کمزوریوں کے باوجود اور میری انانیت کے باوجود بھی محض سطحی اسباب کی بنا پر مجھے ہٹانے کو تیار نہ تھے اور حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے مجھے کافی برداشت کیا ورنہ کان بھرنے والوں کی کمی نہ تھی۔

بہرحال شہاب صاحب کا سایہ ڈال کر مجھے گہنا دیا گیا پھر چند برسوں بعد جب وہ کلکتہ کارپوریشن کے کونسلر ہوگئے تو 'آزاد ہند' سے رئیس جعفری آگئے۔ کچھ عرصہ بعد جب سعید صاحب سے ان کی مفاہمت ہوگئی اور 'عصرِ جدید' کے ماحول کو برداشت کرنا ان کے لیے ممکن نہ رہا اور وہ پھر 'آزاد ہند' میں مراجعت کر گئے تو ناظر الحسینی آگئے اور اس طرح 'عصرِ جدید' میں میرے لیے منحوس ترین دور کا آغاز ہوا۔

میری بہن نجمہ بہت سخت بیمار ہوگئی تھی لیکن اب میں اس کو کلکتہ لاکر علاج معالجہ

کرانے کے قابل ہوگیا تھا۔ کوئی آٹھ دس مہینے اس کا علاج ہوتا رہا۔ ڈاکٹروں نے ٹی بی تشخیص کیا تھا لیکن اللہ سلامت رکھے حکیم محمد زماں حسینی صاحب کو جن کی شفقتیں شروع سے مجھ پر رہیں ان سے جب ملاقات ہوتی تو وہ میری بہن کے احوال بھی دریافت کرتے ایک دن میری مایوسی دیکھ کر انھوں نے کہا کہ بھائی ایک بار مجھے بھی دیکھنے کا موقع دو۔ انھوں نے دیکھا اور پوری قطعیت کے ساتھ کہا کہ اس کو ٹی بی نہیں ہے۔ آپ نے اتنا علاج کیا ہے، مجھے صرف ۳۰ دن کا موقع دیجیے۔ انھوں نے ایک دوا لکھ دی وہ کوئی کشتہ تھا اور کہا کہ نیشنل دوا خانے سے ایک تولہ لاکر اس کی تیس خوراکیں بنالو اور روزانہ ملائی میں لپیٹ کر ایک خوراک کھلا دو۔ کوئی پرہیز نہیں ہے۔ اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ اسی دوا سے اس کی حالت میں نمایاں فرق آیا۔ بس ایک ماہ بعد حکیم صاحب نے فرمایا کہ اسی طرح ایک تولہ اور اس کو دے کر گھر بھیج دو..... اب ماشاء اللہ وہ اپنے بال بچوں میں خوش اور مطمئن ہے۔

دسمبر ۶۲ء میں اس کو میں نے گھر بھیج دیا اور اسی کے ساتھ میری بیوی بچے اور بہن سب گھر چلے گئے کیونکہ بہت عرصہ سے یہ لوگ نہیں جاسکے تھے۔ مطیع اللہ ان لوگوں کو لے کر گئے۔ میں میرے بہنوئی، بھائی امان اللہ اور ثناء اللہ رہ گئے۔ جنوری ۶۳ء میں امان اللہ کو زبردست چیچک نکلی جس سے وہ جانبر نہ ہوسکے۔ اس سال کلکتہ میں بڑی چیچک وبائی شکل میں پھیلی تھی اور سنا گیا کہ بیشتر حالتوں میں نوجوان اس کا شکار ہوئے۔ بہرحال ہمارے سارے خواب ریت کے گھروندوں کی طرح ڈھیر ہوگئے۔ تھوڑے ہی دنوں بعد ہماری تیسری چھوٹی بہن سلمہ کا، جس کی شادی ڈیڑھ دو سال قبل ہوئی تھی، بچی کی ولادت کے بعد انتقال ہوگیا اور ہفتہ عشرہ بعد وہ بچی بھی اس مرحومہ سے جاملی۔ وہ عرصہ ہمارے پورے خاندان پر بڑا سخت اور پُر آزمائش گزرا۔ فروری ۶۳ء میں میری چوتھی بیٹی زبیدہ کی ولادت ہوئی۔ اس سے پہلے ۶۰ء میں میری تیسری بیٹی شگفتہ اس دنیا میں آنکھ کھول چکی تھی۔

مجھے ابتداً یو ایس آئی ایس سے کوئی یہی ڈھائی تین سو روپیہ ماہانہ مل جاتے تھے جس کا انحصار ترجمہ کی مقدار پر ہوا کرتا تھا لیکن یہ کوئی مستقل آمدنی نہیں تھی۔ چھٹیوں میں

بالکل ہی صاف ہوجاتی تھی تاہم میرے اصل پیشہ کی آمدنی سے بہرحال زیادہ تھی۔ ۶۰ء میں کسی وقت یہ فیصلہ کیا گیا کہ مجھے پارٹ ٹائم یعنی جزوقتی ملازم کی حیثیت دی جائے چنانچہ چار گھنٹہ یومیہ میرے کام کا وقت معین ہوا اور کوئی ساڑھے چار سو روپیہ ماہانہ تنخواہ جو دیگر ملازمین کی طرح پندرہ واڑے کے حساب سے ملنے لگی۔ یوں بھی میں تقریباً ۹/بجے سے ایک دو بجے دن تک کام کیا کرتا تھا۔ یہ سلسلہ ۶۴ء میں کسی وقت تک چلا پھر جزوقتی ملازمین کا سلسلہ باضابطہ ختم کیا گیا تو میری ملازمت بھی ختم ہوگئی لیکن مجھے پھر پہلے کی طرح رکھ لیا گیا اور ترجمہ کی اجرت کی شرح میں کچھ اس طرح ترمیم کردی گئی کہ بحیثیت ملازم مجھے جو اجرت مل رہی تھی کم وبیش اتنی ہی ملتی رہے۔

۵۰ء اور ۶۰ء کی دہائیوں کے دوران مشرقی ہند کی ریاستوں میں امریکی امداد سے قائم ہونے والے یا چلنے والے بہتیرے پروجکٹ تھے۔ ان پروجکٹوں کے افتتاح یا کسی اور خاص مرحلے پر یو ایس آئی ایس کلکتہ کی طرف سے اخباری نمائندوں کو لے جانے کا اہتمام کیا جاتا۔ ظاہر ہے ان پارٹیوں میں انگریزی اور بنگلہ کے بڑے بڑے اخباروں اور خبر ایجنسیوں کے نمائندوں کو شریک کیا جاتا تھا۔ ہندی روزنامہ سن مارگ یا وشوامتر کے رام اوتار سنگھ نے بھی راہ و رسم بڑھالی تھی اس لیے انھیں اس طرح کے پریس ٹور میں بالعموم شامل کرلیا جاتا تھا لیکن اردو اخبار کی طرف سے کوئی نہیں آتا تھا۔ بے تعلقی کی اسی افسوسناک کیفیت پر آئندہ تفصیل کے ساتھ کچھ لکھنا چاہتا ہوں۔ بہرحال یہ کیفیت دیکھ کر میں نے یہ تجویز پیش کی کہ مجھے ہی اس طرح کے ٹور میں شریک کرلیا جائے تو میں نہ صرف اپنے اخبار کے لیے یعنی 'عصرِ جدید' کے لیے جس سے میں وابستہ تھا لکھوں گا بلکہ یو ایس آئی ایس کی طرف سے مشرقی ہند کے ان سب اخباروں کے لیے لکھوں گا جنھیں یو ایس آئی ایس کا اردو پریس میٹر بھیجا جاتا تھا۔ میری یہ تجویز مان لی گئی اور نومبر ۱۹۶۳ء میں اس طرح کے پہلے پریس ٹور میں مجھے شریک کیا گیا جو امیام ہائیڈرو الکٹرک پروجکٹ دیکھنے کے لیے شیلانگ گیا اور وہاں سے واپس آکر بہار کے صنعتی علاقے کے کئی پروجکٹوں کو

دیکھتے ہوئے بنارس میں منڈواڈیہہ ڈیزل لوکوموٹیو فیکٹری کو دیکھنے کے لیے جس کا پہلا ڈیزل انجن تیار ہوکر نکلنے والا تھا اور پھر وہاں سے ریہانڈ ڈیم کو دیکھنے کے لیے مرزا پور جانا تھا۔ میں نے اسی موقع پر ہوائی جہاز کا پہلا سفر کلکتہ اور گوہاٹی کے درمیان کیا۔ ہم لوگ بنارس کے ایک ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے کہ وہیں صدر کینڈی کے قتل کی خبر ملی اور ہم لوگ اسی دن شام کو کلکتہ واپسی کے لیے روانہ ہوگئے۔ ایک اسپیشل ایئر کنڈیشنڈ کوچ دہرہ دون ایکسپریس میں جوڑ دی گئی جس نے اگلی صبح کلکتہ پہنچا دیا۔

اس سفر کے دوران مجھے امریکوں سے بے تکلفانہ ربط کا پہلا موقع ملا جن میں میرے افسر اور پروجکٹوں میں کام کرنے والے انجینئر بھی شامل تھے جو مزدوروں کے دوش بدوش انہی کی طرح کام کر رہے تھے۔ ایک طرف تو کام سے ان کی لگن کو میں نے دیکھا دوسری طرف ایک قومی سانحہ یعنی صدر کینڈی کے قتل پر دو امریکی افسروں کا ردِعمل دیکھا لگتا تھا کہ وہ سوگواری کے بجائے ہر ضروری کارروائی اور ذمہ داری کی انجام دہی کے لیے مستعد ہوں۔

یہ دورہ تو کافی طویل تھا ایک ہفتہ جاری رہا جس میں ہوائی جہاز، کار اور ٹرین سے ہر طرح کا سفر کیا گیا لیکن اس کے بعد متعدد مختصر دوروں میں بھی مجھے شریک کیا گیا۔ میں واپسی کے بعد رپورٹیں اردو اخباروں کے لیے لکھ دیتا کچھ چھاپتے کچھ نہیں چھاپتے اس سے مجھے غرض بھی نہیں تھی نہ میرے کام کی شرائط کے مطابق ان کو شائع کرانا لازمی تھا لیکن اپنی تحریر کی اشاعت کی خواہش فطری ہوتی ہے، وہ تھی، جس سے میں نے ضمنی فائدہ بھی اٹھایا وہ یوں کہ جب ہمارے انچارج افسر کو یہ جاننے کی ضرورت ہوتی کہ کسی پروجکٹ کے بارے میں اردو اخباروں میں کیا رپورٹ چھپی ہے تو میں اپنی رپورٹوں کا مختصر ترجمہ کرکے دے دیتا اور ترجمہ کی شرح کے مطابق اس کا معاوضہ وصول کرتا۔ جب انھیں دینے میں کوئی اعتراض نہ تھا تو مجھے لینے میں کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔

اب میرے انچارج گپتا صاحب تو نہیں رہے تھے جن کے ذمہ دوسرے شعبہ کا کام دے دیا گیا تھا ان کی جگہ رائے صاحب پھر گنگولی صاحب میرے انچارج ہوئے

لیکن سچ یہ ہے کہ ان سب نے میرے ساتھ نہایت شائستگی اور ہمدردی کا سلوک کیا۔ ان لوگوں نے کبھی یہ احساس ہی نہیں ہونے دیا کہ میں یومیہ اجرت پر کام کرنے والا بے جڑ کا کارکن ہوں۔ وہاں آنے جانے والے جن دوستوں اور ساتھیوں نے مجھے دیکھا ہوگا انھوں نے بھی کسی امتیاز کا احساس نہیں کیا ہوگا۔ دوسری طرف ہمارے اخبار کے دفتر میں سب کچھ اس کے برعکس تھا۔ ہمدردی کی جگہ بیدردی، رواداری کے بجائے سب کچھ ناروا۔ میری زندگی کے روز وشب انہی تضادات کے درمیان گزرتے رہے۔

اس کا اندازہ ایک واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے۔ ایک روز یو ایس آئی ایس، کلکتہ کے ڈائریکٹر کو 'عصرِ جدید' کے پروپرائٹر خان بہادر صاحب کے دستخط کے ساتھ ایک خط ملا جس میں لکھا گیا تھا کہ رضوان اللہ ہمارے اخبار میں مترجم کی حیثیت سے کام کرتے ہیں اس لیے ہم جاننا چاہتے ہیں کہ وہ آپ کے دفتر میں کس حیثیت سے کام کرتے ہیں اور ان کو کیا مشاہرہ ملتا ہے؟ ڈائریکٹر نے وہ خط ہمارے انچارج گنگولی صاحب کے حوالے کردیا۔ گنگولی صاحب نے بلا کر مجھ سے پوچھا کہ یہ سب کیا معاملہ ہے اور وہ خط میرے سامنے رکھ دیا۔ میں نے صاف صاف بتادیا کہ یہ لوگ ویج بورڈ کی سفارشوں پر عمل درآمد نہیں کرتے ہیں اور طرح طرح سے ہراساں کرتے ہیں۔ یہاں میری حیثیت اور مشاہرہ اس غرض سے دریافت کیا ہے کہ اگر یہاں کی تنخواہ اخبار کی تنخواہ سے زیادہ ہوئی تو وہ مجھے 'عصرِ جدید' کا پارٹ ٹائم یعنی جزوقتی ملازم قرار دے کر میرے استحقاقات کو سلب کرلیں گے بلکہ نکال باہر بھی کرسکتے ہیں۔ گنگولی صاحب نے کہا کہ تم ڈائریکٹر کی سکریٹری کے پاس جاکر انھیں یہی بات بتادو کیونکہ جواب وہی لکھیں گے۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ میری باتیں سن کر ان کے چہرے پر برافروختگی کے آثار نمایاں ہوئے اور مجھ سے صرف اتنا کہا کہ تم جاؤ اپنا کام کرو۔

انھوں نے اگلے روز خان بہادر صاحب کے اس رازدارانہ خط کا جو جواب بھیجا اس کی ایک نقل مجھے بھی دے دی۔ اس میں انھوں نے صرف دو جملے لکھ کر سارے حربے

کند کر دیے:

''رضوان اللہ ہمارے دفتر میں پارٹ ٹائم اردو مترجم کی حیثیت سے کام کرتے ہیں۔ یہ ادارہ اپنے کارکنوں کا مشاہرہ کسی پر ظاہر نہیں کرتا۔''

ورکنگ جرنلسٹس ایکٹ کے مطابق صحافیوں کو اپنی اصل ملازمت کے علاوہ کوئی پارٹ ٹائم کام کرنے کا استحقاق تھا اس لیے میں 'عصرِ جدید' میں کام کرتے ہوئے ایسا کرنے میں حق بجانب تھا۔

لیکن اس مراسلت کے دونوں طرف دو مختلف ردِعمل ہوئے۔ یو ایس آئی ایس میں مجھ سے باضابطہ استفسار کیا گیا کہ تم نے اپنی حیثیت 'عصرِ جدید' کے نیوز ایڈیٹر کی بیان کی تھی لیکن تمہارا پروپرائٹر تم کو مترجم لکھتا ہے۔ اب مجھ پر اپنا بیان درست اور پروپرائٹر کا بیان غلط ثابت کرنا لازم آ گیا ورنہ دروغ بیانی کے الزام میں جو کسی امریکی ادارہ میں ملازم کے لیے ناقابلِ معافی سمجھا جاتا ہے میں ملازمت کے لیے نااہل قرار دیا جاتا۔

چنانچہ پروپرائٹر کے بیان کی تردید میں میں نے فوری بات تو یہی کہی کہ قانون کی رو سے اخبار کے دفتر میں مترجم نام کا کوئی منصب نہیں ہوتا اس لیے ایسا کہنے والا شخص دروغ بیانی سے کام لے رہا ہے اور ملک کے قانون کے خلاف بات کرنے کا مرتکب ہے۔ لیکن اس کے بعد بھی مجھے یہ ثابت کرنا تھا کہ میں اخبار میں نیوز ایڈیٹر ہی تھا۔ اس سلسلہ میں ایک پڑا ہوا کاغذ اسی طرح کام آ گیا جیسے کسی بنئے کی ردی کی طرح پڑی ہوئی بہی میں کوئی حساب۔

جرنلزم کے کورس میں داخلہ سے پہلے انٹرویو بھی تھا جس میں مجھے اخبار سے اپنی وابستگی کا ثبوت بھی پیش کرنا تھا۔ میں نے خان بہادر صاحب سے گزارش کی تو انھوں نے ایک سرٹیفکیٹ 'عصرِ جدید' کے لیٹر ہیڈ پر دے دیا تھا کہ رضوان اللہ ہمارے یہاں نیوز ایڈیٹر کے طور پر کام کرتے ہیں۔ میں نے اس سرٹیفکیٹ کو انٹرویو میں پیش کرنے کے بعد اپنے سرٹیفکٹوں کی فائل میں رکھ دیا تھا۔ وہی سرٹیفکیٹ میں نے یو ایس آئی ایس میں پیش

کر دیا اور جو شخص آج مجھے مترجم کہتا ہے وہی دس برس پہلے مجھے نیوز ایڈیٹر تسلیم کر چکا ہے تو کوئی بھی اخبار نویس اپنے کیریئر میں آگے جائے گا یا پیچھے آئے گا۔ خدا خدا کر کے میرے دامن سے یہ داغ صاف ہوا۔

دوسری طرف 'عصرِ جدید' میں جوابی کارروائی یہ کی گئی کہ میرے یو ایس آئی ایس کے اوقات کار میں روڑے اٹکانے کی غرض سے ایک دن منیجر صاحب نے اپنے دفتر میں بلا کر خان بہادر صاحب کا ایک حکم نامہ پیش کیا اور دستخط کر کے اسے موصول کرنے کی فہمائش کی۔ اس میں ہدایت یہ تھی کہ میں دن میں ۹/بجے سے ایک بجے تک اور شام کو ۴/بجے سے ۸/بجے تک کام کیا کروں۔

میں نے بلا تکلف اس حکمنامے کو موصول کرنے سے انکار کر دیا اور کہہ دیا کہ آپ از روئے قانون دن اور رات کی دونوں شفٹوں میں مجھ سے کام نہیں لے سکتے۔ ایک سلسلہ میں جب چاہیں ۶-۷-۸ گھنٹے کام لے لیجیے لیکن اس صورت میں کالم پورے کرنے کی ذمہ داری نہیں قبول کروں گا۔ میں اچھی طرح سمجھتا تھا کہ 'عصرِ جدید' میں جہاں کم سے کم کارکن ہیں یہ فارمولا نہیں چلے گا۔ چنانچہ منیجر صاحب خاموش ہو گئے۔

اس سے پہلے ایک اور وار ہوا تھا جو کسی جانکار ساتھی کی کارفرمائی رہی ہوگی۔ یو ایس آئی ایس میں بتایا گیا کہ یہ شخص خود کو جرنلزم پاس کہتا ہے یہ غلط ہے۔ اس پر مجھ سے جواب طلب کیا گیا۔ میں نے کہا کہ میں نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ میں جرنلزم پاس ہوں بلکہ یہ کہ جرنلزم کا دو سالہ پوسٹ گریجویٹ کورس مکمل کر چکا ہوں۔ اس کے ثبوت کے طور پر میں نے جرنلزم کے ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ مسٹر چاپلا کانت بھٹاچاریہ سے جو اس وقت ممبر پارلیمنٹ بھی تھے سرٹیفکیٹ حاصل کر کے پیش کیا، گو اس سرٹیفکیٹ کے حصول میں مجھے بڑی پریشانی ہوئی۔ ڈیپارٹمنٹ کے کلرک نے کوئی ایک مہینہ دوڑایا پھر الٹے مجھ سے کاغذی ثبوت مانگنے لگا تو میں نے کالج کی فیس جمع کرنے کی رسید بک پیش کی۔ بہرحال میں بچ نکلا اور یہ وار بھی خالی گیا۔

مگر کوئی شخص پیچھے لگا ہوا تھا۔ ایک روز ہمارے آفس کے ڈائریکٹر نے جو سب سے بڑا امریکن افسر تھا اچانک مجھ سے کہا کہ میں نے سنا ہے کہ اردو اخباروں کی اشاعت مشکل سے دو دو سو ہے۔ میں نے فوراً سمجھ لیا کہ یہ سوال زندگی اور موت کا ہے۔ میں نے کہا کہ جناب یہاں نصف صدی پرانے اردو روزنامے ہیں مثلاً 'عصر جدید' ۱۹۱۹ء سے نکل رہا ہے روزانہ ہند ۱۹۲۹ء سے تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ کوئی اخبار دو سو چھپ کر پچاس برس جاری رہ سکتا ہے۔ اس نے فوراً کہا نہیں نہیں ایسا ممکن نہیں ہے۔ اس طرح بات آئی گئی ہوگئی۔

پریس کمیشن کی سفارشات کے مطابق قائم کیے جانے والے ویج بورڈ کی سفارشوں سے سب غیر مطمئن تھے اور دونوں طرف صف آرائی کا عمل جاری تھا۔ اخباری مالکوں کی نئی تنظیمیں قائم ہو رہی تھیں اور پرانی تنظیمیں اپنے حربوں کو صیقل کر رہی تھیں دوسری طرف اخباری ملازمین کا حال یہ تھا کہ اچھے اچھے دانشور اپنے ارفع مقامات سے کافی نیچے آ کر چھوٹے اخبار نویسوں کو گلے لگا رہے تھے وہ بھی مزدوروں کے شانہ بہ شانہ کھڑے ہونے لگے۔ پہلے ویج بورڈ کی سفارشوں کے چند برس بعد انھوں نے دوسرے ویج بورڈ کی تشکیل کا مطالعہ شروع کر دیا۔ وہ بھی مقرر ہوا۔ اس کی سفارشات آئیں تو اخباروں کی حیثیت کے اعتبار سے ان کے گروپ بڑھائے گئے اور اخباروں کی درجہ بندی میں بھی ان کے گروپوں کی تعداد بڑھائی گئی۔

اردو اخباروں کا معاملہ نازک اور زیادہ پیچیدہ تھا۔ ورکروں کی تعداد بالخصوص وہ جو ایسوسی ایشن کے ممبر بھی ہوں بہت کم بلکہ برائے نام تھی اس لیے طے پایا کہ کاتبوں کو بھی اخبار نویسوں میں شمار کیا جائے اور انھیں بھی ایسوسی ایشن کا ممبر بنایا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ بہت سست رفتار سے یہ عمل جاری رہا۔ ان سرکاری رپورٹوں کا ایک اثر یہ ضرور ہوا کہ ہمارے اخبار میں اسٹاف کا ایک حاضری رجسٹری مرتب ہوا۔ دوسرے دفاتر میں بھی ایسا ہی ہوا ہوگا۔ ریاستی حکومت کے لیبر ڈیپارٹمنٹ کے کچھ انسپکٹر بھی وقتاً فوقتاً ہمارے دفتر میں تاک جھانک کرنے لگے لیکن اس حاضری رجسٹر میں چند نام اصلی اور کچھ فرضی تھے اسی

طرح لوگوں کے مناصب بھی من مانے ڈھنگ سے درج کر دیے گئے تھے۔

یہ بات غالباً ۶۲ء کی ہے کہ منیجر صاحب نے مجھے دفتر میں طلب کیا اور میرے سامنے وہی رجسٹر حاضری رکھا کہ اس پر اپنے نام کے سامنے دستخط کر دو۔ عام طور سے ایسے کسی رجسٹر پر دستخط کرنے میں مجھے کیا عذر ہوسکتا تھا لیکن میں نے دیکھا کہ میرے نام سے پہلے دو نام ایڈیٹر اور نیوز ایڈیٹر کے ہیں اور میرے نام کے سامنے ٹرانسلیٹر لکھا ہوا ہے۔ میں نے کہا کہ یہ رجسٹر حاضری ہے اس پر منصب لکھنا غیر ضروری ہے یہ نہ لکھئے تو میں دستخط کر دوں گا لیکن ان کا اصرار تھا کہ مجھے اسی پر دستخط کرنا ہے۔ میں انکار پر قائم رہا۔ طبیعتوں میں ایک کھنچاؤ تو عرصہ سے پیدا تھا جو بدگمانیوں میں اضافہ کرتا جارہا تھا اس تازہ واقعہ نے خاصی تلخیاں بڑھا دیں لیکن پھر یہی ڈھرا بن گیا کہ سب لوگ روز شام کو اس رجسٹر پر دستخط کرتے۔ میرے نام کے سامنے کے خانے خالی رہتے۔ مہینے کے آخر میں منیجر صاحب ان خانوں میں حاضری کی علامت P بنا دیتے۔ شکر ہے کہ تنخواہ کے رجسٹر پر میرے نام کے سامنے منصب کی شق نہیں لگائی تھی ورنہ یہ گاڑی اسی جگہ رک جاتی۔

بدگمانیوں کی انتہا یہ تھی کہ جنوری ۶۴ء میں جب کلکتہ کے بدترین فسادات ہوئے تو کام پر میری حاضری کو تو پسندیدہ سمجھا گیا لیکن کرفیو پاس بنوا کر نہیں دیا گیا مبادا اس سرکاری کاغذ سے 'عصرِ جدید' سے میری وابستگی ثابت ہو، چنانچہ جب تک حالات زیادہ خراب نہیں ہوئے تھے میں جان ہتھیلی پر لے کر دبتا دباتا آتا جاتا رہا لیکن جب حالات بہت سنگین ہوگئے تو بچوں کو اللہ کی حفظ و امان میں چھوڑا اور خود بستر لے کر 'عصرِ جدید' کے دفتر میں آ گیا رات کا کام ختم کر کے وہیں سو رہتا۔ کرفیو کھلنے کے اوقات میں جا کر بچوں کو دیکھ آتا۔

فسادات پہلے کلکتہ شہر کے حاشیائی علاقوں میں جیسے کہ راجہ بازار، بلگچھیا وغیرہ میں شروع ہوئے اور جوں جوں پھیلتے گئے متاثرہ علاقوں کے مسلمان اپنے گھر بار چھوڑ کر زکریا اسٹریٹ اور اطراف کے مرکزی علاقوں میں بڑی تعداد میں آتے جارہے تھے اس طرح ان علاقوں میں بھی سنسنی بڑھتی جارہی تھی یہاں تک کہ کیلا بگان کی گھنی بستی بھی شعلوں کی

لپیٹ میں آ گئی۔ اس طرف سے اجڑ کر آنے والے لوگوں کا تانتا بندھا ہوا تھا جو ہماری گلی سید صالح لین سے گزر کر پھل منڈی ہوتے ہوئے زکریا اسٹریٹ، کولوٹولہ اور چونا گلی کی طرف چلے جا رہے تھے اس علاقے کی ساری سڑکیں، فٹ پاتھ اور مکانات ان لوگوں سے بھر گئے جو سخت سردی میں بے پناہ ہو رہے تھے۔ 'عصرِ جدید' کی عمارت کی اوپری تین منزلوں میں محمد جان ہائی اسکول کے کمرے تھے وہ سب بھی نیچے سے اوپر تک بھر گئے۔

جب کیلا بگان خالی ہوگیا تو سنٹرل ایونیو کے اس پار ہماری گلی سے بھی لوگ اپنے گھروں سے خوف و ہراس کے عالم میں بھاگنے لگے۔ لوگوں کو اندیشہ تھا کہ رات کو بلوائی ادھر بھی بڑھ آئیں گے۔ تب میں نے اور بھائی مطیع اللہ نے طے کیا کہ بچوں کو کسی محفوظ مقام پر منتقل کیا جائے مبادا یہ پھنس جائیں۔ میرے ساتھ میری بیوی اور تین بیٹیاں عائشہ، شگفتہ اور زبیدہ تھیں۔ آخر الذکر نوزائیدہ تھی۔ ہمارے چھوٹے بھائی ثناء اللہ کے ایک دوست اور کلاس فیلو سہراب تھے جو مسجد ناخدا کی عقبی سڑک راجموہن اسٹریٹ پر واقع اپنے لق و دق مکان میں رہتے تھے وہ بھی پناہ گزینوں سے کچھا کھچ بھرا ہوا تھا۔ ہم لوگوں سے ان کا اصرار تھا کہ بچوں کو وہیں پہنچا دیجئے۔ چنانچہ ہم لوگوں نے مختصر سامان کے ساتھ بچوں کو ان کے مکان کے ایک کمرے میں منتقل کر دیا۔ بھائی مطیع اللہ اور بہنوئی شاہ محمد امین الدین صاحب مکان میں رہ گئے۔ ایک ملازم کھانا پکانے کے لیے تھا وہ بھی رہ گیا۔ میں نے 'عصرِ جدید' میں بستر ڈال دیا۔ وہ لڑکا کرفیو میں نرمی کے اوقات میں کھانا اور بچوں کے لیے دودھ گرم کر کے پہنچاتا۔ وہ واقعی بڑا مخلص تھا بلا کہے ہر کام بروقت دوڑ دوڑ کر کیا کرتا تھا۔ بعد میں جب وہ کافی بڑا ہوگیا تو بھی جب تک کلکتہ میں رہا کبھی کبھی آ کر ملتا رہا۔ برے وقتوں کا جو شریک تھا۔ بہرحال اس پر آشوب دور میں ہم لوگ بفضلہٖ تعالیٰ پوری طرح محفوظ و مامون رہے۔ میں نے کلکتہ میں یہ دوسرا فساد دیکھا۔ پہلا ۱۹۴۶ء میں۔

لیکن ۱۹۶۴ء کے فساد میں ایک بالواسطہ نقصان ایسا ہوا کہ اس نے ہم لوگوں کی اجتماعی زندگی ہی کو درہم برہم کر دیا جس پر ایک ضرب شدید جنوری ۱۹۶۳ء میں بھائی امان

اللہ کے انتقال کی وجہ سے پڑ چکی تھی۔ ہوا یوں کہ بلوائیوں نے نیو انڈیا ربر ورکس کو آگ لگادی اور اس کو پوری طرح برباد کردیا۔ یہ ربر کے جوتے چپل اور دیگر سامان تیار کرنے والا بہت بڑا کارخانہ تھا۔ بھائی مطیع اللہ اسی فیکٹری سے وابستہ تھے اور لورچیت پور روڈ پر اس فیکٹری کے سٹی آفس میں ایک ذمہ دار کی حیثیت سے کام کررہے تھے۔ کارخانے کی بربادی کے بعد سیکڑوں ملازمین جن میں سے بیشتر مسلمان ہی تھے بیکار ہوگئے لیکن فیکٹری کے پروپرائٹر محمد رفیع صاحب نے جن دو معتمدین کو روک لیا ان میں سے ایک مطیع اللہ تھے۔ ان سے کہا کہ تم جس تنخواہ پر کام کررہے تھے وہ تمہیں ملتی رہے گی آخر ہمیں کبھی نہ کبھی کام تو شروع ہی کرنا ہے۔ جب چند مہینے اس طرح گزر گئے تو مجھے اس طرح کسی کے زیرِ احسان رہنا اچھا نہیں لگا اور بھائی کو مشورہ دیا کہ وہ گھر چلے جائیں جہاں والد کی ضعیفی اور تنہائی کی وجہ سے زمینوں کی لوٹ کھسوٹ مچی ہوئی تھی وہیں جاکر کوئی کاروبار کریں۔ انھوں نے ایسا ہی کیا اور گاؤں کے قریب ہی واقع قصبہ ندواسرائے میں ایک جنرل اسٹور کھول دیا۔ کچھ عرصہ بعد جب نیو انڈیا ربر ورکس پھر قائم ہوا تو رفیع صاحب نے ان کو بلا بھیجا لیکن مطیع اللہ نے ان سے معذرت کرلی لیکن ایک نیا رشتہ قائم ہوگیا یعنی رفیع صاحب نے یہ کہ تم ہماری فیکٹری کا مال جس قدر چاہے لے جاؤ پیسے دیتے رہنا گویا ایک کاروباری رشتہ قائم ہوگیا جو اگلے چند برس رفیع صاحب کی حیات تک قائم رہا۔

۱۹۶۴ء میں کلکتہ کے فساد کے بعد ایک خاص طرز کے فسادات کی ہوا چل پڑی اور ملک کی مختلف ریاستوں کے شہروں میں فسادات ہوئے جن کی خصوصیت یہ تھی کہ مسلمانوں کی چھوٹی چھوٹی صنعتوں کو یا جہاں مسلمان ورکروں کی قابلِ ذکر تعداد تھی انہی کو چن چن کر نشانہ بنایا گیا۔

اس کے بعد سال ۱۹۶۵ء ہندوستانی مسلمانوں کے لیے بالعموم اور مغربی بنگال کے مسلمانوں کے لیے بالخصوص نئی آزمائشوں کا پیغام لے کر آیا۔ اس سال ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جنگ جو شروع ہوئی تو بیشتر ممتاز مسلمانوں کو اندھا دھند راتوں

رات گرفتار کرلیا گیا اس معاملے میں کسی کانگریسی، غیر کانگریسی، جوان یا بوڑھے کی کوئی تمیز نہیں برتی گئی چنانچہ کلکتہ کے اردو اخباروں کے کئی ایڈیٹر اور کارکن بھی پکڑ کر بند کردیے گئے ان میں 'عصرِ جدید' اور 'امروز' کے لوگوں میں سے مولانا عطاء الرحمٰن قدسی، اقبال اکرامی، قاضی اقبال احمد اور شہاب لکھنوی بھی شامل تھے۔

کوئی دوماہ بعد رہائی پانے والوں میں اقبال اکرامی اور شہاب لکھنوی شامل تھے۔ مجھے خیال ہوا کہ ان کی رہائی کے وقت معلوم نہیں انھیں لینے کے لیے کوئی موجود بھی ہوگا یا نہیں اور ان لوگوں کے پاس گاڑی سواری کے لیے پیسہ بھی ہوگا یا نہیں چنانچہ میں شام کو علی پور جیل کے گیٹ پر پہنچ کر ان لوگوں کے باہر آنے کا انتظار کرنے لگا۔ میں نے بدر عالم نظامی کو ساتھ لے لیا تھا۔ رات کو ۸/ بجے کے بعد وہ حضرات ایک ایک کر کے باہر نکلے۔ ان لوگوں کے نکلنے سے چند منٹ پہلے میں نے گیٹ سے کچھ دور اندھیرے میں کسی شخص کو آہستہ آہستہ بڑھتے ہوئے دیکھا۔ وہ تھے کلیم الدین شمس۔ اقبال اکرامی ان کے گرو تھے ان دونوں کی گہری چھنتی تھی، انہی کو لینے کے لیے وہ آئے تھے۔ کلیم الدین شمس صاحب نسبتاً کم عمری میں ہی سیاست میں قدم رکھ چکے تھے۔ ابھی تعلیم سے فراغت بھی نہیں پائی تھی کہ غالباً قانون کے آخری سال کے طالب علم تھے جب وہ کلکتہ کارپوریشن کے کونسلر منتخب ہوئے۔

اس سے کئی برس پہلے کی بات ہے جب وہ انٹر یا بی اے کے طالب علم رہے ہوں گے۔ بڑا بازار کے کسی ناشر نے کوئی کتاب چھاپی تھی جس میں کوئی ایسا مضمون شامل تھا جو اہانتِ رسولؐ کے مترادف تھا۔ طلبہ نے اس کے خلاف ایجی ٹیشن کیا اور ناشر کی دوکان کو بھی نقصان پہنچایا اس سلسلے میں کچھ طلبہ گرفتار کیے گئے جن کی بعد میں ضمانت ہوگئی۔ غالباً ان میں کلیم الدین شمس بھی شامل تھے۔ میں اس وقت تک ان سے واقف نہیں تھا۔ اس واقعہ کے چند دنوں بعد ایک روز شام کو ایک لڑکا 'عصرِ جدید' کے دفتر میں ایک مراسلہ لے کر آیا میں کام کر رہا تھا۔ اس نے مجھے مراسلہ دیا میں نے اسے دیکھنے کے بعد اس لڑکے کو اپنے پاس کی

کرسی پر بٹھالیا اور سمجھایا کہ میاں ابھی سیاست میں پڑ جاؤ گے تو تعلیم رہ جائے گی۔ ابھی پڑھنے کا وقت ہے پڑھ لو بعد میں سیاست کے لیے ساری زندگی پڑی ہے۔ پڑھ لو گے تو سیاست بھی اچھی کرو گے ورنہ سیاست بھی گھٹیا درجہ کی ہوگی۔ اس طالب علم نے مراسلہ واپس لے لیا اور متشکرانہ انداز میں یہ کہتا ہوا کہ 'ایسا ہی کروں گا'، اٹھ کر چلا گیا۔ وہی کلیم الدین شمس تھے۔ پھر اقبال اکرامی سے ان کا یارانہ بڑھا تو 'امروز' اور 'عصرِ جدید' کے دفتر میں ان کی آمدورفت بھی بڑھی اور ان کے اعلانات اور خبروں وغیرہ کی اشاعت بھی ہونے لگی۔

آگے چل کر وہ خضر پور کے علاقہ سے کلکتہ کارپوریشن کے کونسلر منتخب ہوئے۔ اس کے کافی عرصہ بعد ان سے میری اتفاقی ملاقات اس طرح ہوئی کہ عید کا دن تھا میں نمازِ عید کے بعد اپنے بھائی کے مزار پر فاتحہ پڑھنے کے لیے خضر پور میں واقع سولہ آنہ قبرستان گیا۔ جب واپس آنے لگا تو ایک گلی سے اچانک کلیم الدین شمس صاحب نمودار ہوئے اور جھپٹ کر مجھ سے لپٹ گئے اور کہنے لگے کہ رضوان بھائی آپ کی نصیحت میں آج تک بھولا نہیں ہوں۔

اثنائے جنگ میں اندھا دھند پکڑ دھکڑ کی وجہ سے مسلمانوں میں کانگریس کے تئیں ایک عام بددلی پیدا ہوئی اور ۱۹۶۷ء کے عام انتخابات میں کانگریس پارٹی کو اس کی بھاری قیمت چکانی پڑی۔ اس الیکشن میں کانگریس پارٹی کی شکست کے بعد اقتدار اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ پہلے پی ایس پی اور کمیونسٹ پارٹی کی مخلوط حکومت بنی جو دیر پا نہیں ثابت ہوسکی اور جلد ہی کمیونسٹ پارٹی نے اقتدار کی ڈور مضبوطی کے ساتھ اپنے ہاتھ میں پکڑ لی۔

ہمارے ذاتی حالات یوں رہے کہ ۶۳ء میں چھوٹے بھائی امان اللہ کے انتقال کے بعد میں ریڈیو کی دکان بند کر دینا چاہتا تھا لیکن ان سے چھوٹے بھائی ثناء اللہ نے، جو اس وقت انٹرمیڈیٹ کے طالب علم تھے، اسے جاری رکھنے اور خود چلانے پر اصرار کیا تو میں خاموش ہوگیا لیکن میرے اندر اس طرف جانے کا حوصلہ نہ رہا۔ وہ بھی عجیب عجیب جذباتی الجھنوں میں مبتلا تھے چنانچہ کبھی کبھی دکان کھلی چھوڑ کر کہیں چلے جاتے ایسے میں جس کے ہاتھ جو لگا وہ لے گیا اور دکان رفتہ رفتہ تحلیل ہوتی گئی یہاں تک کہ ۱۹۶۵ء کی

جنگ کا زمانہ آ گیا۔ جب عام پکڑ دھکڑ شروع ہوئی تو میں بہت گھبرایا اور بڑی منت سماجت کر کے ثناء اللہ کو گھر جانے پر راضی کیا کیونکہ ان کی ذہنی پریشانیوں کی وجہ سے ان کا تعلیمی سلسلہ منقطع ہو چکا تھا۔ یہ بھی ایک بڑی پامالی تھی۔ غرض یہ کہ بہن بہنوئی کے ساتھ ثناء اللہ کو بھی گھر بھیج دیا۔ بچے پہلے ہی سے گھر پر تھے اس طرح میں کلکتہ میں تنہا رہ گیا اور اطمینان کر لیا کہ اب جو بھی پیش آئے اس کا تنہا سامنا کرنا ہے۔ دکان بھی قطعی طور سے ختم کر دی گئی۔

اس جنگ کے زمانے میں شہر میں رات کو ایسا سخت بلیک آؤٹ رہتا تھا کہ واقعی ہاتھ کو ہاتھ نہ سوجھائی دے۔ دس بارہ فٹ لمبے ٹھیلے سے تو لوگ عموماً ٹکرا جایا کرتے تھے۔ ان تاریک دنوں میں اپنے ایک دوست اور کرم فرما کے احسان کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ وہ فرشتہ صفت انسان تھا ڈاکٹر عبدالمنان مرحوم۔ رحمٰن برادران کا ذکر پہلے آ چکا ہے وہ 'عصرِ جدید' کی بلڈنگ کی سب سے اوپری منزل پر کرائے کے ایک کمرے میں رہتے تھے۔ ڈاکٹر منان رات کو ایک بجے اتر کر نیچے آ جاتے اور میرے انتظار میں کھڑے رہتے جب میں کام ختم کر کے نکلتا تو وہ مجھے گھر تک پہنچا کر واپس ہوتے۔ مسلمانوں کی جو عام پکڑ دھکڑ تھی اسی اندیشے کی بنا پر وہ ایسا کرتے تھے۔ عالم یہ تھا کہ ہندو محلوں میں شریر لڑکے بھکاریوں کو بھی جن کے داڑھی ہوتی پکڑ کر مارتے پیٹتے اور پاکستانی جاسوس کہہ کر تھانے میں لے جاتے، اس کیفیت سے خود پولیس والے عاجز آ گئے تھے۔ بالآخر انھوں نے جوابی کارروائی شروع کر دی یعنی جو لوگ اس طرح پکڑ کر کسی کو لے جاتے ان کو روک لیتے اور کہتے کہ جس آدمی کو شبہ کی بنیاد پر لائے ہو اس کے متعلق ثبوت بھی لاؤ۔ خیر جنگ جلد ہی ختم ہوئی، خدا خدا کر کے یہ مصیبت بھی ٹلی۔

ڈاکٹر عبدالمنان نہایت مستعد آدمی تھے۔ نوجوانی ہی میں دیوبند جا کر حضرت زکریا شاہ صاحب سے بیعت کر لی اور سخت عبادت اور ریاضت میں مصروف رہنے لگے۔ ماہ رمضان میں اپنے پیرومرشد کے پاس دیوبند چلے گئے تھے وہیں دل کا دورہ پڑا۔ جب کچھ افاقہ ہوا تو انھیں ان کے وطن سارن (بہار) پہنچا دیا گیا۔ وہیں کچھ دنوں بعد دوسرا

دورہ پڑا اور رحلت کر گئے۔

ریاست مغربی بنگال میں بائیں بازو کی پارٹیوں کا غلبہ ہوجانے کے بعد حکمراں حلقوں میں خان بہادر صاحب کا اثر و رسوخ کم ہوگیا دوسری طرف ورکروں کی تحریکات کو بڑھاوا ملا انھیں تقویت اور پشت پناہی ملی۔ انڈین جرنلسٹس ایسوسی ایشن، ویسٹ بنگال پر بائیں بازو کے لیڈروں اور صحافیوں کا غلبہ ہوگیا۔ اعتدال پسند یا تو ایسوسی ایشن کے عہدوں پر نہیں رہے یا ان کی آواز دب گئی۔ میں نے بھی ایسوسی ایشن میں آنا جانا کم کر دیا۔ حالانکہ 'عصرِ جدید' میں میرے حالات دن بہ دن ابتر ہوتے جارہے تھے میں نے سوچا کہ اگر میں نے ایسوسی ایشن کی معرفت کوئی اقدام کیا تو 'عصرِ جدید' کے مینجمنٹ کا کام آسان ہوجائے گا وہ مجھے امریکن دفتر کا ملازم یا کچھ بھی ثابت کرنے کی کوشش کر سکتے ہیں گو میں نے کبھی کسی سے یہ بات مخفی نہیں رکھی تھی کہ میں یو ایس آئی ایس میں جز وقتی کام کرتا ہوں۔ ایسوسی ایشن کے ذمہ داروں سے جب گفتگو ہوتی میں کہتا کہ بھائی میری آمدنی کا کوئی متبادل بندوبست کردو میں یو ایس آئی ایس چھوڑ دیتا ہوں۔ وہاں رہتے ہوئے میں پریس سے پردہ داری کر بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ پریس کانفرنسوں میں یہ لوگ بہرحال آتے تھے اور میں وہاں ان سے ملتا تھا۔ پریس ٹور میں بھی ان لوگوں کا ساتھ ہوتا تھا یوں بھی اگر میری جان پہچان کا کوئی بنگلہ یا انگلش اخبار کا صحافی یو ایس آئی ایس میں کسی کام سے آتا تو میں اس سے گریز کرنے کے بجائے بالقصد ملاقات کرتا جس کا اثر خوشگوار ہی ہوتا تھا۔ برس ہا برس 'عصر جدید' میں کام کرنے کے بعد وہاں میری تنخواہ میں تو کوئی خاص فرق نہیں آیا تھا ہاں یو ایس آئی ایس میں میری آمدنی کوئی سات سو روپیہ ماہانہ تک پہنچ گئی تھی میں نے اپنے ساتھیوں سے یہ بات بھی مخفی نہیں رکھی تھی اور یہ بات یاروں نے خان بہادر صاحب تک پہنچادی۔ چنانچہ ایک روز انھوں نے مجھ سے کہہ بھی دیا کہ بھائی جب تم کو اتنے پیسے وہاں سے ملتے ہیں تو پھر کیوں اتنی تکلیف کرتے ہو 'عصرِ جدید' کا کام چھوڑ کر ایک طرف ہوجاؤ۔

بہرحال وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ 'عصر جدید' میں میری چولیں کسی جانے

لگیں اور ایک دن خان بہادر صاحب نے منیجر صاحب کو حکم دیا کہ رضوان کو نوٹس دے دو۔ ان کے اس فرمان کی اطلاع اسی دن میرے کانوں تک پہنچ گئی۔ میں نے اگلے ہی دن ایسوسی ایشن کے سکریٹری سے مشورہ کر کے ایک نوٹس تیار کی وہیں ٹائپ کی اور سیدھے 'عصرِ جدید' میں آ کر منیجر اقبال احمد صاحب کو دے دیا کہ دستخط کر کے یہ خط موصول کر لیں۔ انھوں نے لے لیا۔ اس میں یہی لکھا گیا تھا کہ آپ ویج بورڈ کی سفارشات کے مطابق تنخواہ نہیں دے رہے ہیں اور اس کا مطالبہ کرنے پر مینجمنٹ ہمیں طرح طرح سے ہراساں کر رہا ہے۔ یہ سلسلہ بند کیجیے۔ اس کی ایک نقل لیبر کمیشنر کو بھیج دی گئی۔ ظاہر ہے اس نوٹس کے بعد خان بہادر صاحب کی وہ نوٹس بے معنی ہوگئی جسے جاری کرنے کا انھوں نے حکم دیا تھا۔ کوئی ہفتہ عشرہ بعد ان کی جوابی نوٹس مجھے ملی جس میں وقت کی پابندی نہ کرنے کا الزام تھا۔ اس سے زیادہ کچھ ممکن بھی نہ تھا اس میں ایک صریحی جھوٹ یہ تھا کہ تم کو کئی بار زبانی وارننگ دی جا چکی ہے۔ یہ آخری تحریری وارننگ دی جا رہی ہے اگر اس کے بعد بھی تم نے اپنی اصلاح نہ کی تو تمہارے خلاف ضروری کارروائی کی جائے گی۔ میں نے اس کی بھی تحریری تردید کی۔ غرض یہ کہ اس ناپسندیدہ مراسلت کا ایک سلسلہ چل پڑا جو میرے مزاج کے خلاف تھا لیکن مجھے جس ناانصافی اور بے رحم جہالت کا سامنا تھا اس سے کوئی سمجھوتہ کرنے کی راہ میں میری خودداری حائل تھی اور اس ناپسندیدہ راہ پر چلتے چلے جانے پر میں مجبور تھا۔

افسوس یہ تھا اور ہے کہ مینجمنٹ کی مشاورت میں ناظر الحسینی صاحب شامل تھے جو خود کو بائیں بازو سے وابستہ سمجھتے تھے اتنا ہی نہیں بلکہ اس دوسری یا تیسری بار 'عصر جدید' میں لانے کی تحریک میں نے ہی کی تھی اور یہ بھی ہوا تھا کہ ایک بار انھوں نے کسی بات پر برہمی کے عالم میں کہہ دیا تھا کہ یہ 'عصر جدید' کا دفتر نہیں 'قصرِ یزید' ہے۔ یہ بات خان بہادر صاحب تک پہنچائی گئی اور ان کی فی الفور برطرفی کا حکم صادر ہوا۔ ان کے اقتصادی حالات اچھے نہیں تھے صحت بھی خراب ہو رہی تھی۔ ایک ہفتہ بعد انھوں نے مجھ سے رابطہ

قائم کیا اور کہا کہ کسی طور مصالحت کرادو۔ میں نے منیجر صاحب کی معرفت خان بہادر صاحب سے رجوع کیا۔ ان کا اصرار تھا کہ ناظر الحسینی تحریری معافی مانگیں۔ میں نے منیجر صاحب سے کہا کہ بھائی انھوں نے جو کچھ کہا وہ ظاہر ہے ایک پُر مذاق بات تھی، انھوں نے کسی بری نیت سے یہ بات نہیں کہی تھی پھر بھی وہ اس پر نادم ہیں اور معذرت خواہ ہیں۔ پھر میں نے ناظر صاحب کو 'عصرِ جدید' کے دفتر میں بلا کر منیجر صاحب کے روبرو کر دیا۔ وہ بحال کر دیے گئے اور ۱۹۶۹ء میں 'عصرِ جدید' سے میری سبکدوشی تک نہ صرف بحال رہے بلکہ جب میں خان بہادر صاحب سے آخری اور حتمی گفتگو کرنے کے بعد ان کے دفتر سے نیچے اتر رہا تھا تو اس سلسلے میں ضروری مشاورت کے لیے منیجر صاحب ان کو ساتھ لے کر اوپر جا رہے تھے۔

مگر ناظر صاحب کی زندگی میں ان سے اس آخری ملاقات سے پہلے اور بھی بہت کچھ ہوا۔ جیسا کہ لکھ چکا ہوں 'عصرِ جدید' میں میری چولیں کسی جا رہی تھیں وہ اس طرح کہ اگر دس پندرہ منٹ بھی دیر ہوتی تو اگلے دن ایک نوٹس۔ اگر دوا لینے کے لیے کولوٹولہ تک گیا تو اگلے دن نوٹس کہ کام کے اوقات میں آپ کو باہر دیکھا گیا اور آپ اتنی دیر تک باہر رہے۔ اس طرح ایک نفسیاتی الجھن پیدا ہوئی اور غصہ اس بات پر بڑھتا گیا کہ اپنے ساتھیوں میں سے کوئی شخص یہ سب حرکتیں کرتا ہے۔ اردو اخباروں میں اب بھی کام تو کالم ہی کی بنیاد پر ہوتا تھا یہ ایک مجبوری بھی تھی کیونکہ اخبار کے صفحات تو بہرحال بھرنے پڑتے تھے۔ چنانچہ اس اعتبار سے ہم کو متوقع مقدار میں کام پورا کرنا پڑتا تھا لیکن ہم خود اصولی یا قانونی طور پر نہ کالم کے پابند تھے نہ ایسا ظاہر کرنا چاہتے تھے اسی وجہ سے ان لوگوں کے حوصلے بڑھے ہوئے تھے اور مجھے نوٹس پر نوٹس دیے چلے جا رہے تھے۔ گھریلو محاذ پر بھی ایک الجھن پیدا تھی کہ والد بہت بیمار تھے ان کی یہ علالت کچھ عرصہ سے چل رہی تھی اس کی وجہ سے ہم لوگ فکر مند تھے اور جب میں ان سے ملاقات کے لیے آخری بار گیا تھا تو انھوں نے کہا کہ میری عمر ۷۶ برس ہوئی لیکن میں نہیں جانتا تھا کہ بخار کیسا ہوتا ہے نہ کوئی

سوئی ٹیکا لگا لیکن اب بخار رہنے لگا ہے یہ کوئی اچھی علامت نہیں ہے۔ ان کی اس کیفیت اور بیان نے مجھے حواس باختہ کر دیا تھا۔ ۱۹۶۷ء میں میری سب سے چھوٹی بیٹی زہرہ پیدا ہوئی اس کی ولادت کے بعد ابا کی علالت کے پیش نظر میں نے اپنی بیوی کو گھر پر ہی چھوڑ دیا تھا۔ بڑی دو بیٹیاں جو کلکتہ میں زیرِ تعلیم تھیں میرے ساتھ تھیں بہن کے زیرِ سرپرستی تھیں۔

ابا کا معاملہ یوں تھا کہ صوفی منش انسان تھے۔ بیشتر اوقات شب و روز عبادات و وظائف میں گزارتے تھے۔ دور نزدیک کے لوگ ان کی دعاؤں سے استفادہ کرتے جن میں اطراف و دیار کے لیڈر، وزیرِ کبیر سب شامل تھے لیکن ابا سب سے بے نیازانہ ملتے۔ مجھ پر جب بھی کوئی برا وقت آتا میں ان کو اطلاع دے کر خود بے فکر ہو جاتا۔ ایسے میں ان کی علالت سے میرا متوحش ہو جانا بالکل فطری امر تھا۔

اس تمام کشاکش کا نتیجہ ظاہر ہے۔ جو ہونا تھا سو ہوا۔ جنوری ۱۹۶۹ء کے اواخر میں میں سخت بیمار ہو گیا کئی روز تک حرکت کرنے سے بھی معذور تھا۔ ڈاکٹروں کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا۔ تین چار دن کے اندر کئی اچھے ڈاکٹروں نے معائنہ کیا لیکن مسکن دوائیں دینے کے سوا کچھ نہ کر سکے۔ اس علالت کا سلسلہ بہت طول کھنچا۔ ادھر گھر پر والد کی حالت نازک۔ ہمارا پورا کنبہ اس کشاکش میں مبتلا ہو گیا۔ مارچ کے اواخر میں ابا کا انتقال ہو گیا آخری دنوں میں میں نہ ان کو دیکھ سکا، نہ ان کے انتقال کے بعد کئی مہینے تک والدہ سے ملاقات کے لیے جا سکا۔

اس علالت کے ابتدائی ہفتہ عشرہ تک میں بالکل ہی بستر پر رہا اس کے بعد ضروری نقل و حرکت کرنے لگا لیکن سیڑھیوں سے نیچے نہیں اتر سکتا تھا۔ یہ کیفیت بھی کوئی ایک مہینہ رہی ہوگی۔ چھوٹے سے کمرے میں پڑا پڑا اوب گیا تھا۔ اس اثناء میں وسیم الحق صاحب نے جو اس زمانے میں رتو سرکار لین سے ''فلم ویکلی'' نکالتے تھے اور اب 'اخبارِ مشرق' کے مالک و مختار ہیں دوستی کا حق ادا کیا۔ وہ کسی کسی دن آتے اور مجھے اپنے ساتھ ٹیکسی میں دریا کے کنارے لے جاتے۔ کچھ دیر سیر کرا کے واپس پہنچاتے۔ اس طرح

میری طبیعت کچھ بدل جاتی۔

دوسرا تکلیف دہ پہلو مالی تھا، طرح طرح کے ٹسٹ اور ڈاکٹروں کی معائنہ فیس اور دواؤں کے اخراجات بے حساب تھے۔ ہر طرح کے ٹسٹ، چوٹی کے ڈاکٹروں کے ذریعہ آنکھ، کان وغیرہ کے معائنے اور دماغ کے ایکسرے کے نتیجہ میں جب کچھ نہیں معلوم ہوسکا تو بھائی صاحب کو ساتھ لے کر ایک ماہرِ نفسیات کے پاس بھی گیا لیکن وہ بڑے لوگوں کا ڈھکوسلا معلوم ہوا۔ ان اخراجات نے ساری مٹی پونجی ختم کردی۔ یوایس آئی ایس میں روزانہ کام کے حساب سے اجرت کا معاملہ تھا اس لیے وہاں نہ کام تھا نہ پیسہ۔ 'عصرِ جدید' سے پہلے تو کبھی ضرورت کے تحت ایڈوانس لے لیا کرتا تھا جو تنخواہ میں سے وضع ہوجاتا تھا لیکن اب مجھے اپنی موت کا اتنا یقین تھا کہ وہاں سے تنخواہ کو بھی خارج از بحث سمجھتا تھا اور یوں کسی طرح کا پیسہ ملنے کا کوئی امکان نہ تھا۔ بعض دوستوں نے مالی اعانت کی پیشکش ضرور کی جس کے لیے میں دل سے ان کا شکرگزار ہوں لیکن اس یقین کی بنا پر کہ میں یہ رقم کبھی انھیں واپس نہیں کرسکوں گا میں نے کوئی مالی امداد قبول نہیں کی بس بہن بہنوئی کی اعانت سے کسی طرح دن گزار لیے۔ جب کچھ چلنے پھرنے کے قابل ہوا تو بدر عالم نظامی کی مدد لی۔ وہ 'عصرِ جدید' میں کام کررہے تھے اور ان سے نانیہالی قرابت بھی تھی۔ وہ آتے اور میں ان کے ساتھ ٹیکسی میں یوایس آئی ایس چلا جاتا۔ گھنٹہ دو گھنٹہ میں آسانی سے جس قدر کام کرسکتا کرلیتا۔ اتنی دیر وہ بیچارے رسپشن پر بیٹھ کر میرا انتظار کرتے۔ پھر ٹیکسی میں لاکر مجھے گھر چھوڑ جاتے۔ اگر دس روپیہ کا بھی کام ہوجاتا تو آتے جاتے ٹیکسی کا کرایہ چار روپیہ دے کر چھ روپئے بچ رہتے۔ رفتہ رفتہ کام کی مقدار بڑھتی گئی اس طرح جینے کی سبیل پیدا ہوگئی لیکن اخبار میں دیر تک وہ بھی رات کو بیٹھنے کے قابل نہیں رہا وہ بھی نامساعد، غیر ہمدردانہ بلکہ مخاصمانہ ماحول میں۔ اس تمام اثناء میں 'عصرِ جدید' سے کسی نے رسماً بھی میری خیریت نہیں پوچھی۔

ڈاکٹروں کی رائے تھی کہ مجھے تبدیلی آب و ہوا کے لیے باہر چلا جانا چاہیے۔

چنانچہ مئی کے اواخر میں گھر چلا گیا تا کہ کچھ دنوں والدہ کے ساتھ بھی قیام کرلوں۔ میں تنہا سفر کے قابل نہ تھا اس لیے بھائی مطیع اللہ گھر سے کلکتہ آئے اور مجھے اپنے ساتھ گھر لے گئے۔ میں نے اپنے بچوں کو کلکتہ ہی میں بہن کے پاس چھوڑ دیا۔ پھر دو ماہ مجھے کچھ نہیں معلوم کہ میرے بچوں کی گزر بسر کیسے ہوئی اور خود میں گھر پر کیسے رہا۔ والدہ اور چھوٹے بھائی نے ہر طرح دلجوئی کی اور میں بالکل صحتمند ہوگیا لیکن اس اثناء میں ایک خاص بات یہ ہوئی جو بڑی حوصلہ افزا تھی کہ یو ایس آئی ایس میں میرے انچارج جو ان دنوں مسٹر رائے تھے دریافت خیریت کے لیے مجھے خط لکھتے اور اپنی صحت پر پوری توجہ دینے کی تاکید کے ساتھ ہی یہ بھی اطمینان دلاتے کہ تم ملازمت کی فکر نہ کرنا تمہارا کام محفوظ ہے جب صحت کی طرف سے اطمینان ہوجائے تو آ کر حسب کام معمول شروع کر دینا۔ میں تب بھی حیران تھا اور آج تک حیران ہوں کہ ہم لوگوں کا ہماری قوم کے اکابر کا اخلاق کہاں گیا۔ دوسروں نے ہم ہی سے یہ سب کچھ سیکھ کر اسے اپنا لیا۔ شاید ہماری پستی اور ان کے عروج کا راز یہی ہے۔

بالآخر میں جب خود کو چاق چوبند محسوس کرنے لگا تو میں نے جولائی میں کلکتہ کا رخ کیا کہ کم از کم ایک کام تو میرے لیے وہاں موجود تھا۔ وہاں پہنچنے پر یو ایس آئی ایس والوں نے میرا خیر مقدم کیا اور میں نے وہاں کام بھی شروع کر دیا لیکن 'عصرِ جدید' میں گیا تو منیجر اقبال صاحب نے فرمایا کہ آپ خان بہادر صاحب سے مل لیں، میں ان سے ملاقات کے لیے ان کے دفتر میں گیا تو انھوں نے نہایت بے مہری سے کہا کہ ابھی جگہ خالی نہیں ہے آدمی کا انتظام کرلیا گیا ہے پھر کبھی آنا۔ بس خان بہادر صاحب کے ساتھ وہی میری آخری ملاقات تھا۔ میں نیچے اتر رہا تھا تو منیجر اقبال صاحب جنھیں غالباً بذریعہ ٹیلیفون طلب کرلیا گیا تھا ناظر الحسینی صاحب کو لے کر اوپر جا رہے تھے۔ زینے پر ان لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ ناظر الحسینی صاحب سے بھی وہ میری آخری ملاقات تھی۔ ان سے یوں بھی بے تکلفی کبھی نہیں تھی۔ بحیثیت شاعر میں ان کی قدر کرتا تھا اور ان کے اشعار کی ستائش کرتا تھا۔

اب 'عصرِ جدید' میں دوبارہ جانے کا میرا کوئی ارادہ نہ تھا۔ نہ میں نے استعفا دیا

نہ برخواست کیا گیا۔ اس ضمن میں میں نے ایسوسی ایشن سے بھی رجوع نہیں کیا لیکن مالی کمزوریوں کی وجہ سے یہ خیال ضرور تھا کہ جائز طریقے سے کچھ پیسہ کہیں سے مل جائے، چنانچہ میں نے 'عصرِ جدید' کے مینجمنٹ سے درخواست کی کہ میری ۱۸ سالہ خدمات کے صلے میں گریجویٹی کی جو بھی رقم بنتی ہو وہ مجھے دے دی جائے۔ جواب ملا کہ خان بہادر صاحب نے پانچ سو روپیہ کی منظوری دی ہے۔ میں نے کہلا دیا کہ اس کو بھی وہ اپنے پاس ہی رکھیں۔ پھر میں نے کسی اردو اخبار کے دفتر میں جانے کا خیال دل سے نکال دیا۔

اس کے بعد ہی اگست کا مہینہ تھا بارش خوب ہو رہی تھی کہ ایک دن خان بہادر صاحب حسبِ معمول اپنے دفتر سے اتر کر ظہر کی نماز پڑھنے کے لیے مسجد کولوٹولہ میں گئے۔ ان کے پیچھے پیچھے دفتر کے دوسرے لوگ بھی کوئی نماز پڑھنے، کوئی کھانا کھانے چلے گئے، اتنے میں ۸۰ کولوٹولہ اسٹریٹ کی لق ودق عمارت کا صرف اتنا ہی اوپری حصہ جس میں خان بہادر صاحب کا دفتر واقع تھا سارا کا سارا دھڑام سے نیچے سڑک پر آ رہا۔ سارے دفتری کاغذات وغیرہ سڑک پر بکھر گئے۔ تجوری اور الماریاں بھی لڑھکی پڑی تھیں بوندا باندی جاری تھی اسی میں کچھ لفنگے بھی ٹوٹ پڑے، پولیس نے فوراً پہنچ کر اس علاقے کا محاصرہ کر لیا پھر اگلے دو ایک دنوں میں سامان وغیرہ ملبے میں سے نکالا گیا۔ اس واقعہ میں دو باتیں حیران کن تھیں۔ اول تو یہی کہ اس عمارت میں کئی رہائشیں اور ساری دکانیں بالکل محفوظ رہیں، کہیں دراڑ بھی نہیں پڑی جبکہ خان بہادر صاحب کا دفتری حصہ سارا کا سارا جو کہ اوپری منزل پر تھا سڑک پر ڈھیر ہو گیا بارش کی وجہ سے کاغذات وغیرہ کو نکالنا بچانا بھی مشکل ہو گیا، دوسرے یہ کہ کولوٹولہ جیسی بھیڑ بھاڑ والی سڑک پر اتنا ملبہ گر جانے کے باوجود کسی شخص کا ہلاک ہونا تو دور کی بات، کوئی زخمی بھی نہیں ہوا۔

اس واقعہ کے چند دنوں بعد ادریس الحق نے جو 'عصرِ جدید' میں رپورٹر کے طور پر کام کر رہے تھے دفتر ہی میں ساتھیوں سے گفتگو کے دوران کہیں کہہ دیا کہ رضوان صاحب کا صبر پڑا ہے جو خان بہادر صاحب کا دفتر الٹ گیا۔ یہ بات فوراً خان بہادر صاحب تک

پہنچائی گئی اور ان کا حکم ہوا کہ ادریس الحق کو نکال دو۔ اگلے دن ان کو کام کرنے سے روک دیا گیا۔ انھوں نے بھی کام چھوڑ دیا۔ ان کی بیوی کسی اسکول میں ٹیچر تھیں اور گھر کی خوشحال تھیں۔ ادریس الحق خود کئی سال سے ایک ہفتہ وار ''آرزوئے ہند'' نکال رہے تھے جسے اشتہارات ملنے لگے تھے اور اس طرح ان کی آمدنی کا ایک معقول ذریعہ بن چکا تھا۔

'عصرِ جدید' سے ادریس الحق کے نکالے جانے کی فوری وجہ تو بظاہر وہی ہوئی جو بیان کی گئی ہے لیکن اس کا بڑا سبب دوسرا تھا جیسا کہ ادریس الحق نے بیان کیا۔ خان بہادر صاحب کی پہلی بیوی جو خاصی صاحبِ جائداد بھی تھیں پاکستان جا کر کراچی میں رہنے لگی تھیں۔ خان بہادر صاحب بھی کراچی جانا چاہتے تھے لیکن وہاں ان کے داخلے پر پابندی تھی اس لیے ان کے ویزا کی درخواستیں رد کر دی جاتی تھیں، خان بہادر صاحب نے اپنے مصاحبوں کے مشورہ پر ادریس الحق کو تعینات کیا کہ پاکستانی ڈپٹی ہائی کمیشن میں کسی سے مل کر ویزا لانے کی کوئی صورت نکالیں۔ جب تک یہ کام اٹکا رہا ادریس الحق کی ناز برداریاں ہوتی رہیں۔ شام کو کسی کسی دن خان بہادر صاحب کی درباری چائے میں شرکت کے لیے بھی انھیں بلا لیا جاتا۔ لیکن بالآخر ادریس الحق کی کوششیں ناکام ہو گئیں تو وہ بھی خان بہادر صاحب کی نظروں سے گر گئے اور جب ادریس الحق نے اس راز کا انکشاف کر دیا تو بس انھیں نکال باہر کر دینے کے لیے کوئی بھی حیلہ کافی ہو سکتا تھا۔

'عصرِ جدید' کا باب ختم کرنے سے پہلے کئی باتوں کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے اول تو یہی کہ میں نے 'عصرِ جدید' میں ترجمہ سے کام کا آغاز کیا اور آخر تک یعنی اگلے ۱۸/برس تک وہاں میرا اصل کام یہی رہا، اس میں نیوز ایڈیٹنگ کا اضافہ ضرور ہوا جس کی اضافی اجرت پچاس روپیہ ماہانہ معین تھی جب زیرِ عتاب آیا یہ رقم کم کر دی گئی۔ جب کسی میٹنگ یا جلسہ وغیرہ میں شرکت کرتا تو اس کی رپورٹ بھی تیار کر دیتا۔ مزید براں کچھ مضامین اپنی طبیعت اور مرضی سے بھی لکھا کرتا جس پر کوئی پابندی نہ تھی نہ ان مضامین کی اشاعت کے لیے کسی سے اجازت لینے کی ضرورت تھی بس اتنی احتیاط شرط تھی کہ خان

بہادر صاحب کے معروف سیاسی نظریات اور مذہبی عقائد کے خلاف کوئی بات نہ ہو چنانچہ کبھی سنجیدہ مضامین اور کبھی انشائیہ لکھا کرتا۔ اس سلسلے میں کبھی اپنے نام کو مخفی بھی رکھنا چاہتا کیوں کہ کوئی غیر معیاری چیز اپنے نام سے منسوب نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اسی ضرورت کے تحت ایک قلم نام ''علمی'' اختیار کرلیا تھا جو وقتاً فوقتاً تخلص کے کام بھی آنے لگا (بعد میں بلکہ بہت بعد میں میں نے اس نام یا تخلص کو ترک کردیا)۔ کبھی کبھی کتابوں پر تبصرے بھی لکھے۔

ان تحریروں کے علاوہ ایک کام یہ بھی کرتا تھا کہ ہر سال کے اختتام پر اس سال کے اہم قومی اور بین الاقوامی واقعات کو تاریخ وار مرتب کرکے دو قسطوں میں شائع کرتا ایک قسط ملکی امور پر اور دوسری قسط عالمی امور پر۔ اس کو لکھنے میں کافی وقت اور محنت تو صرف ہوتی ہی تھی لیکن یہ ایسا کام تھا جس کے لیے سال بھر پیشے سے میری عملی وابستگی اور حاضری ضروری تھی، اس کے لیے میں خاصی کاوش کرتا تھا۔ روزانہ رات کو کام ختم کرنے کے بعد ایک کاپی میں جو میری میز کی دراز میں رکھی رہتی اس روز کے قابلِ ذکر واقعات درج کرتا اور اگر کوئی خاص تراشہ ہوتا تو اس کو بھی کاٹ کر کسی کاغذ پر چسپاں کرکے محفوظ کرلیتا۔ آخر سال کے قریب انہی اجزاء کو مرتب کرتا۔ ان تراشوں کے کئی پلندے اکٹھا ہوگئے تھے جن میں سے بعض چیزیں آج واقعی نایاب معلوم ہوتی ہیں، لیکن وہ سب کسی نہ کسی طور کچھ میرے قیام کلکتہ کے دوران ہی اور کچھ میرے دہلی چلے آنے کے بعد ضائع ہوگئیں۔ اس تراش وخراش کا کام میں رات کو اخبار کا کام ختم کرنے کے بعد ہی کیا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ بھی جو کچھ نثر یا نظم لکھی وہ اکثر و بیشتر رات کو پریس سے گھر آنے کے بعد ہی لکھی کیونکہ دن میں نہ فرصت تھی نہ اتنا سکون۔ لیکن افسوس کہ سب محنت ناقدروں کے درمیان رائیگاں گئی۔

اس تمام اثناء میں سال ڈیڑھ سال کا وہ وقفہ جو چٹرجی کے ساتھ گزرا کام کے اعتبار سے عظیم الشان تھا۔ رات کو گھڑی کی سوئی ۹ پر پہنچی نہیں کہ ہم دونوں کام کی میز پر جم جاتے ساری دنیا کی خبریں ہمارے سامنے ہوتیں اور ہم دنیا و مافیہا سے بے خبر۔ ۱۲ر بجتے

بجتے ہم لوگ سارے کام کو دھن پھٹک کر رکھ دیتے۔ اس کے بعد ایک عرصہ ایسا آیا کہ میرے ساتھ فاتح فرخ اور ظفیر الحسن ہوتے اس زمانے میں رات کا کام ایک ایسی پر کیف تفریح تھا کہ شام ہی سے اس کا انتظار رہتا۔ فاتح فرخ کے لچھے دار قہقہے اور ظفیر صاحب کے ٹھٹھے باہر تک سنائی دیتے اس کا نقطۂ عروج اس وقت آتا جب شہزاد منظر اپنی اسٹورٹس رپورٹ لے کر داخل ہوتے۔

'عصرِ جدید' میں میرے لیے بعض تفریحات تو تھیں لیکن وہ اتنی آسانی سے دستیاب تھیں کہ تفریح کے لیے کسب کے لطف سے عاری تھیں۔ ایک تو وہی پریس ٹور دوسرے سنیما اور اس قبیل کے پروگرام۔ ہر فلم کے عوامی شو سے پہلے ایک خصوصی شو اخبار نویسوں کے لیے ہوا کرتا تھا اس میں عموماً 'عصر جدید' کے پاس پر میں اور صابری صاحب جایا کرتا تھے۔ اگر فاضل پاس آ گئے تو اور لوگ بھی چلے جایا کرتے تھے اس کے بعد فلم ریویو مجھے یا صابری صاحب کو لکھنا ہوتا تھا لیکن شہاب صاحب کی صورت میں ایک اچھا متبادل دریافت ہو جانے کے بعد، وہ بھی ایسے میں کہ جب مجھ پر نظر عنایت نہیں رہ گئی تھی، مجھے اس سعادت سے محروم کر دیا گیا لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں اپنے معاملات میں کچھ مصروف اور کچھ الجھا ہوا ایسا تھا کہ ان تفریحات میں میرے لیے کوئی کشش نہیں رہ گئی تھی۔ دو تین برس تو اپنے خول میں ایسے مگن تھے کہ باہر دیکھنے کی ضرورت ہی نہیں محسوس کرتے تھے پھر ۱۹۶۳ء کی جنوری میں بھائی امان اللہ کے انتقال کے ساتھ غموں کا بھی نقطۂ عروج آیا۔ اس کے بعد ہمارے گھر میں ریڈیو نام کی کوئی چیز نہیں رہی۔ میں نے اس سانحہ کے بارہ تیرہ برس بعد دہلی میں اتفاقی طور پر پہلی فلم دیکھی اور میرے دوسرے بھائی مطیع اللہ نے پھر کبھی کوئی فلم نہیں دیکھی۔

واقعی جسے تفریح کہتے ہیں اس طرح کی کوئی چیز میری زندگی میں تھی ہی نہیں۔ ذمہ داری اور احساسِ ذمہ داری اور مصروفیات نے اتنی مہلت ہی نہیں دی لیکن دراصل یہ بات طبیعت اور مزاج کی ہے ورنہ وقت تو آدمی اپنی ضرورتوں کے لیے نکال ہی لیتا ہے۔

بقول شخصے وقت کبھی نہیں ہوتا وقت نکالنا پڑتا ہے۔ میرے دوستوں کا بھی کوئی ایسا حلقہ نہ تھا جس میں گھنٹے دو گھنٹے صرف کیے جاتے زیادہ سے زیادہ امجدیہ ہوٹل میں جمنے والے گروپوں میں کبھی کبھی شامل ہو جاتا۔ جہاں عمر اور پیشے سے قطع نظر ہم مذاقوں کی نشستیں ہوتیں مثلاً ش مظفر پوری اور ابراہیم ہوش جیسے سینئر ہوتے تو کچھ ہم عمر اور کچھ نسبتاً کم عمر بھی۔ یہ فہرست خاصی طویل ہے لیکن اس کا ایک قابلِ ذکر پہلو بھی ہے۔

خفیہ محکمہ کا ایک انسپکٹر جو دوبے کے نام سے مشہور تھا زکریا اسٹریٹ کے ہوٹلوں کا چکر کاٹتا رہتا اور وہاں بیٹھنے والے گروپوں کے پاس منڈلایا کرتا آس پاس کے مسلم محلوں میں بھی چلتا پھرتا نظر آتا۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ اگر خفیہ محکمہ کے کسی شخص کی اس طرح شناخت ہو تو یہ اس کی لیاقت نہیں عدم لیاقت ہے۔ اخباری حلقے میں بعض کارکن ایسے تھے جن کے بارے میں لوگوں کا خیال تھا کہ وہ مخبری کرتے ہیں جس کے پیسے انھیں ملتے ہیں۔

ایک شخص بہت ہی پُراسرار تھا وہ کھادی کے کرتے پاجامے اور چپل میں کولوٹولہ اور زکریا اسٹریٹ کے علاقے میں مستقل چلتا ہوا نظر آتا۔ چوڑا چکلا بدن، گندمی رنگ، کلین شیو اور ادھیڑ عمر۔ اردو اخباروں کے دفاتر میں بھی جھانکتا پھرتا۔ جب میں ڈاکٹر غزنی کے بچوں کو ٹیوشن پڑھاتا تھا تو روز شام کو ان کے ہاں بھی جھانکتا اور وہ اس کو ایک روپیہ دے دیا کرتے تھے۔ ایک بار میں نے ان سے دریافت کیا تو کہنے لگے کہ بیکار آدمی ہے دوا خانے میں آنے والے خطوں کا جواب لکھ دیا کرتا ہے تو اس کو ایک روپیہ روز دے دیتا ہوں۔ وہ شخص دو ایک بار میرے پاس بھی اس طرح پہنچا کہ جیسے کسی اشتہار کا ترجمہ کر رہا تھا اور کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو پوچھنے کے لیے آ گیا ہو۔ میں اس کا نام بھی نہیں جانتا تھا نہ کبھی جاننے کی ضرورت ہی محسوس کی۔ نصیب صاحب کہلاتا تھا۔

ایک بار ایسا ہوا کہ مولانا حسین احمد مدنیؒ، حکیم محمد زماں صاحب کے مطب میں تشریف فرما تھے اتفاق سے میں بھی اسی وقت پہنچا۔ یہ ان سے نیاز حاصل ہونے کا آخری موقع تھا۔ مصافحہ کرنے کے بعد میں ایک طرف بیٹھ گیا تو دیکھا کہ وہی شخص حکیم صاحب

کے مطب کے باہر چوکھٹ بازو سے لپٹا جھانک رہا تھا۔ ذرا دیر بعد دبے پاؤں داخل ہوا اور چھوٹا سا ایک بنڈل مولانا کی طرف کھسکا کر الٹے پاؤں واپس ہوا۔ مجھے یہ بات کچھ عجیب سی معلوم ہوئی۔ بعد میں حکیم صاحب سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہ شخص پان لایا تھا اور مولانا کے عقیدت مندوں میں سے تھا۔ وہ دیوبند میں تھا تب بھی ان کے لیے پان لایا کرتا تھا، بات آئی گئی ہوگئی۔ میں نے اسے مسلمان ہی سمجھا اور سمجھتا رہا۔ اس سے مختلف سمجھنے کی کوئی وجہ بھی نہ تھی۔

بہت عرصہ بعد ایک روز میں نے کولوٹولہ اسٹریٹ پر غزنی فارمیسی کے سامنے اس شخص کو پہلی بار بش شرٹ اور پینٹ میں سامنے سے بظاہر بہت خوش آتے دیکھا اور اس کی پیشانی پر پہلی بار لال ٹیکہ بھی لگا دیکھا۔ وہ بڑی تیزی سے میرے قریب سے گزر گیا۔ پھر میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا۔ تب میرا تجسس بڑھا اور ادھر اُدھر لوگوں سے پوچھنا شروع کیا تو حسب ذیل کہانی معلوم ہوئی۔

جنگ آزادی کے دوران علمائے دیوبند کافی سرگرم اور سربکف تھے۔ انگریزوں کے خلاف محاذ آرائی میں کتنے ہی علما کو اذیت ناک سزائیں دی گئیں اور کتنے ہی جاں بحق ہوئے جن کی فہرست طویل ہے۔ آزادی کے قریب کے زمانے میں ایک موقع ایسا آیا کہ اکابر علماء جو اسکیمیں بناتے ان سب کی اطلاع انگریزوں کو مل جایا کرتی وہ حیران تھے کہ یہ مخبری کس طرح ہو رہی ہے۔ بالآخر ان کی نظر اس یتیم بچے پر گئی جو دارالعلوم دیوبند میں لاکر داخل کیا گیا تھا اور چھوٹے موٹے کاموں سے لگا دیا گیا تھا جیسے چائے، پان، پانی وغیرہ لانا۔ اس طرح اس کی تعلیم اور پرورش دونوں ہو رہی تھی۔ وہ علماء کی ہر نشست میں اندر باہر آتا جاتا رہتا۔ جب اس کی شناخت کر لی گئی، جو بہت دنوں بعد ہوئی، تو اس کو وہاں سے ہٹا دیا گیا۔ اس کے سپرد جو بھی خدمات رہی ہوں اس سے قطع نظر علماء کے قرب کی وجہ سے اس کو ان سے لگاؤ ہو گیا تھا۔ چنانچہ اپنے قیامِ کلکتہ کے دوران جب اس کو مولانا حسین احمد مدنیؒ کی آمد کا پتہ چلا تو پان کا ہدیہ لے کر حاضر ہوا تھا۔ میں نے جب اس کو ٹیکہ لگائے

بش شرٹ میں دیکھا تھا اس وقت وہ باضابطہ خدمات سے سبکدوش ہو چکا تھا۔

اخباروں میں کاتبوں کے لطائف تو بہت مشہور ہیں، عصرِ جدید میں بھی بہت کچھ دیکھنے اور سننے میں آیا مثلاً ایک دن ایک خوش نویس ابراہیم صاحب نے مجھ سے کہا کہ یہ ظفیر صاحب نے مضمون کا کیسا عنوان لکھا ہے ''وفا حسین''؟ ظفیر صاحب سامنے ہی بیٹھے تھے میں نے سلپ لے کر ان کے سامنے بڑھا دی تو انھوں نے ایک زور دار لاحول پڑھی اور فلک شگاف ٹھٹھا لگایا۔ ارے یہ ''وضاحتیں'' لکھا ہوا ہے۔

ایک بار محمد علی پارک میں جمعیۃ علماء کا کوئی جلسہ ہونے والا تھا۔ خان بہادر صاحب مغربی بنگال جمعیۃ العلماء کے صدر تھے۔ چنانچہ اس جلسے کا اعلان 'عصرِ جدید' میں اشاعت کے لیے دیا گیا اور خان بہادر صاحب نے ہدایت کی کہ اس کو کسی اچھے کاتب سے جلی لکھوایا جائے اور نمایاں طور پر شائع کیا جائے۔ چنانچہ وہ اعلان کتابت کے لیے استاد رفیع کو دیا گیا جنھیں شرف استادی کی بنا پر دوسرے کاتبوں کی اجرت کی بہ نسبت ۲۵ روپیہ ماہانہ زیادہ ملتا تھا۔ استاد نے وہ اعلان لکھ دیا۔ منیجر صاحب نے بہ نفسِ نفیس اس کا پروف پڑھا اور خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اسے خان بہادر صاحب کو بھی دکھایا۔ اگلے دن جب اخبار میں چھپا ہوا دیکھا گیا تو مقام میں محمد علی پارک میں ''پارک'' کی ''ر'' غائب تھی اور ''محمد علی پاک'' رہ گیا تھا۔ شکر ہے ہم لوگوں میں سے کسی نے پروف نہیں پڑھا تھا ورنہ نوکری سے اسی وقت ہاتھ دھوئے ہوتے۔ اس لغزش کی پاداش میں استاد رفیع کی ۲۵/روپیہ ماہانہ کی اضافی تنخواہ سلب کر لی گئی۔

خان بہادر صاحب کو بڑی فکر تھی کہ کتابت 'آزاد ہند' جیسی ہونی چاہیے۔ انھوں نے پوچھا ''فکاہات'' کون لکھتا ہے۔ معلوم ہوا عابدی صاحب۔ ان کو طلب کیا گیا اور حکم ہوا 'آزاد ہند' کے 'نمکدان' کی طرح لکھا کریں۔ انھوں نے فرمایا وہ ''پاشاں پاشاں'' لکھا ہے۔ خان بہادر صاحب نے کہا وہ کیا ہوتا ہے۔ اب عابدی صاحب نے فن خطاطی اور اقسام خط پر لکچر شروع کیا۔ ذرا دیر بعد خان بہادر صاحب نے کہا کہ وہ سب میں کچھ نہیں

جانتا جو خط بھی ہو بس ''نمکدان'' جیسا ہونا چاہیے۔

ایک روز خبروں کا ایک ٹکڑا جلی معلوم ہوا تو خان بہادر صاحب نے دریافت کیا کہ یہ کس کا لکھا ہوا ہے۔ معلوم ہوا عبدالغفار کا۔ وہ نہایت ذہین لیکن چلبلے اور بذلہ سنج واقع ہوئے تھے۔ ان کو طلب کیا گیا اور ہدایت کی گئی کہ اپنا قلم اقبال صاحب (اقبال احمد خاں کاتب) کے برابر رکھو۔ انھوں نے اس حکم کو لفظ بہ لفظ قبول کیا اور جا کر اقبال صاحب کا ایک قلم لیا جو سگریٹ کے سائز کا تھا (وہ اپنے سارے جلی اور خفی خطوں والے قلم سگریٹ کے ٹین والے ڈبے میں رکھتے تھے یعنی لمبائی میں اسی سائز کے ہوتے تھے) غفار صاحب نے ان کے قلم سے ناپ کر اپنے قلم کی ڈنڈی کاٹ دی گویا خط کا سائز برابر ہو گیا۔

ایک روز ہدایت موصول ہوئی کہ سرخیاں کم لگائی جائیں اور بڑی بھی نہ ہوں۔ چنانچہ ہیڈ کاتب حسن صاحب نے مجھ سے کہا کہ رضوان صاحب اگر آپ ایک دن تکلیف کریں تو روز روز کی مصیبت ٹل جائے گی۔ چنانچہ اس روز یہ کیا گیا کہ پارلیمنٹ میں پنڈت نہرو کی کسی تقریر کو دو کالم کی لیڈ بنایا اس کے بعد پورے اخبار میں سرخیاں سنگل کالم کی تھیں۔ عالم یہ ہوا کہ صفحہ اول پر سنگل کالم کی سرخیاں کچھ اس طور تھیں ''مولانا آزاد کی تقریر''، ''پنڈت پنت کا بیان'' وغیرہ وغیرہ۔ اگلے دن خان بہادر صاحب اخبار کا یہ نقشہ دیکھ کر بہت برہم ہوئے اور اپنا حکم منسوخ کر دیا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس روز سارا اخبار ٹھوس میٹر سے بھرنے میں مترجم اور کاتب سب کے چھکے چھوٹ گئے۔

ایک مثالی واقعہ بھی پیش آیا۔ ۱۹۶۷ء کے عام انتخابات کے زمانے میں کام کا مسلسل دباؤ تھا۔ ایسے میں آدمیوں کا اضافہ تو ہوتا نہ تھا۔ جس روز انتخابی نتائج آنے لگے اس روز دن کی ڈیوٹی کا کوئی شخص غیر حاضر تھا۔ چنانچہ میں دو بجے دن کو آ کر بیٹھا تو بیٹھا رہ گیا۔ رات کو ۹ بجے کے قریب مجھے بھی پسینہ آنے لگا کیونکہ ۹ بجے بدر عالم صاحب کو آنا تھا ان کا بھی کہیں پتہ نہ تھا۔ میں نے خبریں تو سب ایڈٹ کر دی تھیں۔ ترتیب درست کر دی تھی، سرخیاں بھی سٹ کر دی تھیں لیکن ترجمہ کرنے کا حواس نہیں رہ گیا تھا۔ بالآخر میں نے

وسیم الحق صاحب کو خبر کی جو میرے آزمودہ دوست تھے قریب ہی رتو سرکار لین میں رہتے تھے اور وہیں سے فلم ویکلی نکالتے تھے۔ وہ خبر ملتے ہی بھاگے ہوئے آئے اور آستین چڑھا کر بیٹھ گئے۔ مجھ سے کہا کہ آپ اطمینان کر لیجیے اور گھر جایئے۔ اس رات بقیہ سارا کام انھوں نے بدر عالم صاحب کو ساتھ لے کر انجام دیا۔

ان تمام تلخیوں اور ترشیوں کے باوجود حقیقت یہ ہے کہ 'عصر جدید' کا ماحول اور کام کرنے والوں کے آپسی تعلقات اتنے خوشگوار تھے کہ خارجی تلخیاں اس میں بے اثر ہوجایا کرتی تھیں۔ کام کا سارا عرصہ ایک تفریح سا بنا رہتا تھا۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ 'عصر جدید' نے جہاں بہت کچھ لیا، صحت کا قیمتی سرمایہ لے لیا، زندگی کا رس چوس لیا وہیں بہت کچھ دیا بھی۔ زندگی کے تجربات کا بیش بہا خزانہ عطا کیا، آئندہ زندگی کی رزم گاہ کے لیے تربیت کا میدان فراہم کیا۔ زندگی کی آسائشوں کے عوض سخت کوشی سے لذت آشنا کیا۔

☆☆☆

سفارتی صحافت

میں ڈپلومیٹک جرنلزم کو مجموعی صحافت کا ایک حصہ سمجھتا ہوں۔ آج کی بڑھتی ہوئی بین الاقوامیت کے دور میں اس کی اہمیت بڑھتی ہی جارہی ہے۔ انگریزی کی اس اصطلاح کا مجھے اردو میں ترجمہ کرکے اسے سفارتی صحافت کا نام دینا پڑا۔ اس کو صحافتی سفارت کاری بھی کہا جاسکتا ہے۔ اس سے میری مراد ایسی صحافت ہے جس کا تعلق دو یا دو سے زیادہ ملکوں یا بین الاقوامی اداروں کے درمیانی معاملات و مسائل سے ہو۔ صحافت کی اس قسم یا نوعیت کو تین زمروں میں تقسیم کردینے سے میرا مفہوم زیادہ واضح ہوجائے گا۔

ہم سب جانتے ہیں کہ بڑے بڑے اخبارات اور خبر ایجنسیاں اہم ممالک اور بین الاقوامی اداروں کے مراکز پر اپنے مستقل نامہ نگار مامور کرتے ہیں۔ ان کا اپنا اپنا طریقۂ کار ہوتا ہے لیکن بالعموم وہ اہم سیاسی خبروں سے واسطہ رکھتے ہیں اور اہم واقعات پر اپنے تبصروں سے، جو متعلقہ اخباروں میں شائع ہوتے ہیں، اپنے ملک کو بروقت آگاہ کرتے رہتے ہیں۔ وہ ایک طرح سے اپنے ملک کی دوسرے ملکوں میں کھلنے والی کھڑکی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جن کے ذریعہ حالات و واقعات کا مشاہدہ اور تجزیہ جاری رہتا ہے۔

دوسرے زمرے میں اسی طرح کے وہ نامہ نگار ہیں جو دیگر ممالک کی طرف سے ہمارے ملک میں مامور ہیں۔ یہ سب ہمارے ملک کے احوال و واقعات سے اپنے اپنے

عوام اور حکومتوں کو آگاہ کرتے رہتے ہیں۔ اس میں بالواسطہ ہماری منفعت بھی مضمر ہوتی ہے۔ مثلاً ہماری مالی مشکلات میں مدد کرنے والے ممالک یا ادارے اطمینان بخش اور قابلِ بھروسہ حالات کی خبریں ملنے پر ہی ہماری بروقت امداد کے لیے تیار ہو سکتے ہیں۔

تیسرے زمرے میں سفارتی مشنوں سے وابستہ صحافی آتے ہیں۔ ان میں سے ایک تو وہ ہیں جو سفارتی مشنوں میں پریس اتاشی یا افسر رابطہ عامہ کے عہدوں پر مامور ہوتے ہیں دوسرے وہ جو مقامی اخباروں اور اداروں سے رابطے کے لیے مقامی صحافیوں میں سے چن کر بیرونی سفارت خانوں میں رکھے جاتے ہیں۔ اس زمرے کے اخبار نویسوں کی پوزیشن بڑی نازک ہوتی ہے۔ وہ جس ملک کے سفارت خانے سے وابستہ ہوتے ہیں اگر اس ملک سے اپنے ملک کے تعلقات دوستانہ یا معمول کے مطابق ہوئے تب تو سب کچھ ٹھیک ٹھاک رہتا ہے۔ گاڑی ڈھرے پر چلتی رہتی ہے لیکن ان تعلقات میں خرابی آئی تو اندر باہر ہر طرف ان کی زندگی عذاب ہو جاتی ہے، انھیں ہر جگہ شک وشبہ کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ حکومت کے عمال کی نظر میں الگ چڑھے ہوتے ہیں پھر ان کا اپنا ضمیر بھی تو ہوتا ہے۔ مزید براں انا کا سوال۔ میں ان لوگوں کی بات نہیں کر رہا ہوں جو ضمیر اور انا دونوں کا سودا کر سکتے ہیں۔ میں بات ان لوگوں کی کرتا ہوں جنھیں دونوں کا پاس ہو یعنی تلوار کی دھار پر چلنے کا فن جانتے ہوں۔ اسی دشوار گزار فن کو ڈپلومیسی کہتے ہیں خواہ وہ اعلیٰ ترین سطح پر سفارتی حکام کی ہو خواہ کمتر سطح پر بیرونی سفارت خانوں میں کام کرنے والے صحافیوں کی۔

موجودہ دنیا کے روز افزوں پیچیدہ تر نظام میں کبھی یہ یقین نہیں کیا جا سکتا کہ آج جن ملکوں کے ساتھ تعلقات دوستانہ ہیں کل بھی ایسے ہی رہیں گے۔ یہ تعلقات ہمیشہ نشیب وفراز سے گزرتے ہیں کبھی سیاسی اسباب کی بنا پر، کبھی اقتصادی اور کبھی کسی بالکل غیر ضروری سبب کی بنا پر جیسے کہ اقوام کی صفوں میں محض شمولیت کی خاطر۔ ایسے میں ان سفارت کار صحافیوں کا کام مشکل ہوتا ہے جسے کچھ مطلب پرست اور مفاد پرست عناصر،

خواہ افراد ہوں یا ادارے، پروپگنڈوں کے ذریعہ مشکل تر بنادیتے ہیں۔ ہر کوئی جانتا ہے کہ ممالک اور ادارے اپنی اپنی ضرورت کے مطابق پروپگنڈے کرتے ہیں لیکن پھر بھی ان پر یقین کرلیا جاتا ہے۔ اس سے ان لوگوں کی راہ کی مشکلیں بڑھ جاتی ہیں جو واقعی اچھا کام کرنا چاہتے ہیں۔ اگر دو ملکوں کے تعلقات خراب ہی ہوں تو اس کا مطلب یہ تو ہرگز نہیں ہوتا کہ وہ ہمیشہ کے لیے اپنے ناتے توڑ لیں۔ کچھ رشتے تو برقرار رکھنے ہی چاہئیں تاکہ تعلقات میں بہتری کی راہیں کھلی رہیں اور سفارت خانوں سے وابستہ مقامی صحافی اس راہ میں بہترین رشتہ کی خدمت انجام دے سکتے ہیں۔ میں ۱۹۵۷ء میں ہی اپنے خالی وقت میں اس راستے پر چل پڑا تھا۔

اس راہ میں مجھے کئی بار الجھنوں کا سامنا ہوا لیکن وہ سب 'عصرِ جدید' میں بعض ناعاقبت اندیش جاہلوں کی پیدا کردہ تھیں۔ میں ان سے الجھنا نہیں چاہتا تھا کیونکہ اس طرح میری توانائیاں ضائع ہوتیں اور وقت خراب ہوتا۔ میں اپنے کام سے کام رکھنا چاہتا تھا اس لیے ان لوگوں کی حرکتوں پر کبھی کوئی جوابی کارروائی نہیں کی بلکہ اپنا دامن بچاتا ہوا اپنے راستے پر چلتا رہا۔ اس میں مجھے بڑے فائدے ہوئے۔

ہمارے اخباروں میں کولہو کے بیل دو طرح کے تھے ایک وہ جو صرف اخبار کے گرد گھومتے تھے دوسرے وہ جنھوں نے اخبار کے دفتر کے علاوہ اسکول کی عمارتیں بھی دیکھی تھیں۔ اس کے جملہ اسباب میں سے ایک سبب وہ بھی تھا جس کا مختصراً ذکر آچکا ہے چنانچہ بیرونی دنیا سے رابطے کے جو مواقع تھے وہ ان کے حصہ میں آنے ہی نہیں پاتے تھے وہ مینجمنٹ کا استحقاق سمجھے جاتے تھے جس میں مالک اور منیجر دونوں معہ کنبہ کے شامل ہوتے تھے۔ ایسا نہیں کہ صحافیوں میں احساس محرومی نہ تھا لیکن وہ کچھ کرنہیں سکتے تھے جیسے گاؤں میں زمینداروں کے بچے بھی رعیت کے کھیت کھلیان سے حسب خواہ استفادہ کرلیا کرتے تھے اور کسان دیکھتا رہ جاتا تھا کچھ بول نہیں سکتا تھا۔

میں اس گھٹن سے نہ صرف آزاد تھا بلکہ میرا دائرہ نسبتاً وسیع تر تھا یہ اور بات تھی

کہ ان مواقع سے جس قدر فائدہ اٹھا سکتا تھا اپنی مصروفیات کی کثریت کی وجہ سے نہیں اٹھایا۔ تاہم مختلف زبانوں اور ہر درجہ کے اخبار نویسوں سے ملنے جلنے اور گفتگو کرنے کا موقع ہی کافی فائدہ مند تھا۔ یو ایس آئی ایس کی طرف سے پٹنہ جانے کا بھی کبھی کبھار موقع مل جایا کرتا تھا کیونکہ پٹنہ میں امریکن لائبریری اور کلچرل سینٹر تھا جو یو ایس آئی ایس کلکتہ کے تحت کام کرتا تھا وہاں جاتا تو پٹنہ کے اردو اخباروں میں جھانک لیتا اس طرح بہار کے صحافیوں میں بھی دیدشنید ہوگئی اور جب وہ کلکتہ آتے تو اس کی تجدید ہو جایا کرتی تھی۔ انہی حضرات میں جناب غلام سرور صاحب مالک و مدیر ''سنگم'' تھے جنھوں نے آگے چل کر سیاست کی راہ اختیار کی اور وزارت اور ایوان کی صدارت تک پہنچے۔ ڈاکٹر محمد اسد تھے جو پٹنہ سے نکل کر شکاگو تک پہنچے اور نارتھ ایسٹ ایلی نوائے یونیورسٹی میں سیاسیات کے پروفیسر ہوئے اور وہاں ۱۹۸۳ء میں ان سے میری ملاقات ہوئی۔ شین مظفر پوری صاحب پٹنہ نشین ہوگئے تھے ان سے بھی وہیں ملاقاتیں ہوتی رہیں اور گرمجوشی سے ملتے رہے۔ مظہر امام صاحب جب تک پٹنہ ریڈیو اسٹیشن سے وابستہ رہے ان سے وہاں ملاقاتیں ہوتی رہیں جو بعد میں سری نگر دور درشن کے ڈائریکٹر ہوئے۔

سب سے بڑھ کر یہ بات کہ ترجمہ سے ہٹ کر کچھ اور لکھنے کا موقع ملا تو اس کا سلیقہ بھی آیا۔ دماغ نے ترجمہ کے کولہو سے نکل کر کچھ سوچنے کا ڈھنگ سیکھا اور تجربہ بھی کیا۔ غرض یہ کہ مشاہدات اور ان کے تحریری اظہار کا سنہرہ موقع مجھے اسی راہ میں ملا جس نے میری آئندہ راہوں کا تعین کر دیا۔

☆☆☆

آزاد ہند سے وابستگی

۱۹۶۹ء میں 'عصرِ جدید' سے بے تعلقی کے بعد سارا وقت خالی ہی خالی تھا۔ یو ایس آئی ایس کا کام کل وقتی نہ تھا اس لیے اس فکر میں تھا کہ اردو اخباروں سے ہٹ کر کوئی اور کام اختیار کرنا چاہیے۔ خالی وقت اسی سوچ میں گزر رہا تھا لیکن یہ خالی وقت بھی بمشکل دو ہفتہ ملا ہوگا کہ مجھے احمد سعید ملیح آبادی، ایڈیٹر و پروپرائٹر ''آزاد ہند'' کا پیغام موصول ہوا کہ آ کر مجھ سے ملاقات کرلو۔ میں 'آزاد ہند' میں گیا اور سعید صاحب سے ملاقات کی۔ جیسا کہ اندازہ بلکہ اندیشہ تھا سعید صاحب نے 'آزاد ہند' میں کام کرنے کی مجھے پیشکش کی اور میں نے معذرت چاہی۔ پھر انھوں نے کہا کہ بھائی میں آج آپ کو کوئی نیا نہیں بلا رہا ہوں میں نے تو ہمیشہ ہی بلایا آپ ہی نہیں آئے لیکن مجھے اس کا کوئی رنج نہیں ہوا بلکہ خوشی ہوئی کہ آپ جہاں کام کرتے ہیں وہاں کے وفادار بھی ہیں۔ اب چونکہ آپ 'عصرِ جدید' چھوڑ چکے ہیں اس لیے یہاں آنے میں کوئی قباحت نہیں ہونی چاہیے۔

میں نے عرض کیا کہ سعید صاحب آپ مجھے جب بلایا کرتے تھے اس وقت میری صحت ٹھیک تھی لیکن اب تو میری صحت ویسی نہیں رہی میرا خیال ہے کہ میں آپ کی توقعات کے مطابق کام نہیں کرسکوں گا لیکن اس کے بعد سعید صاحب نے جو کچھ کہا اس نے مجھے واقعی پگھلا دیا۔ انھوں نے کہا کہ بھائی میں آپ سے کام کے لیے کب کہہ رہا

ہوں۔آپ خالی ہیں شام کو یہاں آجایا کیجیے۔ بیٹھئے ہم لوگ آپ کی صحبت سے لطف اندوز ہوں گے۔ مطلب صاف تھا۔مگر اردو اخبارات سے میرا جی روٹھ گیا تھا میں نے سعید صاحب کے اس انداز بیان کے بعد اس بارے میں غور کرنے کے لیے ان سے مہلت لے لی اور گھر چلا آیا۔

اسی زمانے میں ''سنگم'' پٹنہ کے ایڈیٹر، پروپرائٹر غلام سرور صاحب اپنے اخبار کا کلکتہ ایڈیشن نکالنے کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے شین مظفر پوری کو پٹنہ سے پھر کلکتہ آکر یہ اخبار شروع کرنے کے لیے راضی کرلیا تھا اور 'آزاد' بنارس کے تاروپود سنوارنے والے سید منیر نیازی کو نہ معلوم کیسے پالیا تھا۔ انھوں نے رپن اسٹریٹ میں اس اخبار کا دفتر تجویز کیا، اسی جگہ ایک شام انھوں نے مقامی اردو اخبار نویسوں اور کچھ دوسرے لوگوں کو بھی چائے پر مدعو کیا۔ تماشا دیکھنے کے لیے میں بھی گیا۔ اس موقع پر غلام سرور صاحب نے مجھے مشورہ دیا کہ میں 'سنگم' میں آجاؤں۔ یادنہیں کہ سعید صاحب اور غلام سرور صاحب ان دونوں حضرات میں سے پہلے کس سے ملا تھا لیکن یہ ملاقاتیں قریب قریب ایک ہی وقت میں ہوئیں اور میں نے دونوں حضرات سے غور کرنے کے لیے مہلت لے لی لیکن پھر دوسری پہل سعید صاحب ہی کی طرف سے ہوئی۔ ان کے فرستادہ سمیع اللہ صاحب نے آکر مجھ سے دریافت کیا کہ آپ نے اب تک کوئی جواب نہیں دیا لیکن انھوں نے اتنی ہی بات نہیں کی بلکہ ان کی گفتگو کا لب ولہجہ سفارشی تھا یعنی یہ کہ مجھے 'آزاد ہند' میں جانا چاہیے۔

سمیع اللہ کا معاملہ یوں تھا کہ وہ عمر میں مجھ سے بہت چھوٹے تھے اور جب ظفیر صاحب 'عصر جدید' میں تھے تو وہ ظفیر صاحب سے انگریزی پڑھنے کے لیے آیا کرتے تھے پھر آگے چل کر کچھ ترجمہ کی مشق کرنے لگے تو اسے لے کر برائے اصلاح میرے پاس 'عصر جدید' میں آیا کرتے تھے چنانچہ میں انھیں اپنے خورد اور عزیز کے طور پر سمجھتا تھا۔ ایسے میں جب انھوں نے مجھے 'آزاد ہند' میں آجانے کا مشورہ دیا تو میں نے اسے مبنی برخلوص

سمجھا اور شائبہ بھی نہیں گزرا کہ وہ مشورہ 'آزاد ہند' کے منیجر کا تھا۔ بس میں اس کے بعد ہی سعید صاحب کے دربار میں حاضر ہوگیا۔ وہاں کام کچھ رفتہ رفتہ شروع ہوا۔ ایک سو پچاس روپیہ تنخواہ متعین ہوئی اور چار کالم ترجمہ میرے ذمہ کیا گیا۔ پھر کچھ دنوں بعد جب نیوز ایڈیٹنگ میرے ذمہ ہوئی تو اس کے ساٹھ روپیہ ماہوار زائد ملنے لگے۔ وہ میرے ذہنی انتشار کا دور تھا اس زمانے میں میرے لیے اطمینان کی بات یہ تھی کہ مجھے شام کو ۴ر بجے 'آزاد ہند' جانا تھا اور اپنا کام کرکے فرصت کر لینی تھی۔ اس سے پہلے یا کام کے بعد کے وقت پر کسی کا کوئی دعویٰ نہیں تھا اور نہ مجھ پر کوئی گرفت یا پابندی تھی۔ یہ کیفیت بذات خود صحت افزا ثابت ہوئی۔ 'آزاد ہند' میں کام شروع کرنے کے بعد میں نے ایک اصول اپنالیا اور اس پر عمل کرتا رہا وہ یہ کہ اپنے کمرے میں جانا، وہاں کام کرنا اور وہیں سے واپس چلے آنا۔ سعید صاحب کے کمرے میں صرف بشرط ضرورت یا کسی موضوع پر گفتگو کے لیے جاتا ورنہ کئی کئی دن تک آتے جاتے دور ہی سے سعید صاحب سے سلام کلام ہوجاتا۔

(فروری ۱۹۹۲ء میں کلکتہ کے اخباروں میں یہ الم انگیز خبر دیکھنے کو ملی کے عزیزم سمیع اللہ نے بہ عارضۂ کینسر اس دارِ فانی سے کوچ کیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔)

'آزاد ہند' کے دفتر میں کمروں کا نظام کچھ ایسا تھا کہ سیڑھیوں سے اوپر چڑھتے ہی سامنے کاتبوں کا کمرہ اور بائیں ہاتھ کو سعید صاحب کا کمرہ جس میں ان کی میز کے علاوہ منیجر کی اور ایک کلرک ٹائپسٹ کی میزیں بھی تھیں۔ سعید صاحب کی نشست کچھ ایسے زاویے سے تھی کہ وہ ہر آنے جانے والے پر نظر رکھتے۔ ان کے اکاؤنٹینٹ کا کمرہ ان کے پیچھے تھا اس میں ایک بنگالی بابو مستقل مجاور کے طور پر ۲۴ر گھنٹے موجود رہتے۔ مترجموں کا کمرہ کاتبوں کے کمرے کے عقب میں تھا۔ چنانچہ ان حضرات کو سعید صاحب کی نگاہوں سے، جو نیچی ہوتے ہوئے بھی پوری طرح باخبر رہتیں، اور پھر کاتبوں کے کمرے سے یعنی ہیڈ کاتب منشی نجم الدین صاحب کی غضب آلود نگاہوں کے سامنے سے گزرنا پڑتا۔ آنے والا برقت آتا تو منشی جی کی بڑی بڑی سرخ آنکھوں کا زاویہ ساٹھ ڈگری نیچے کی طرف ہوتا

اور اگر کوئی اپنے معینہ وقت کے بعد تاخیر سے آتا تو ان کی نگاہوں کا زاویہ پھیل کر ۱۲۰ ڈگری تک ہوجاتا اور وہ ان نگاہوں سے ہی 'آزاد ہند' کے پورے مینجمنٹ کا پیغام نشر کردیتے۔ منشی جی بھی بنگالی بابو کی طرح کل وقتی تھے یعنی 'آزاد ہند' کا کاروبار شروع ہونے کے وقت سے اخبار کی کاپی جانے کے وقت تک نشستیں بدل بدل کر بیٹھے رہتے اور اس کے بعد وہیں بستر پھیلا دیتے۔

کچھ لوگوں کا کہنا تھا کہ منشی نجم الدین صاحب اور ان کے بھائی فہیم الدین صاحب مولانا ملیح آبادی کے 'روزانہ ہند' کے زمانے سے ان کے ساتھ تعاون کرتے آئے تھے۔ چنانچہ وہ بھی 'آزاد ہند' کے ساتھ سعید صاحب کو ورثہ میں ملے۔ حقیقت یہ ہے کہ بڑے خلوص اور وفاداری کے ساتھ آخر عمر تک خدمات انجام دیتے رہے۔ معلوم نہیں کب اور کن حالات میں انھوں نے 'آزاد ہند' سے مفارقت اختیار کی اور اپنے وطن گیا مراجعت کر گئے۔

جب میں نے 'آزاد ہند' میں قدم رکھا تو جاوید نہال نیوز ایڈیٹر تھے۔ ان کے علاوہ محمد مصطفیٰ صابری، شمس الزماں، سجاد نظر وغیرہ موجود تھے۔ صابری صاحب کا تذکرہ 'عصرِ جدید' کے سلسلے میں آچکا ہے۔ اب ان کی کیفیت میں فرق یہ آیا تھا کہ وہ بالکل بجھ گئے تھے ان کی بذلہ سنجی کافور ہوگئی تھی اس کی وجہ کسی حد تک تو بڑھتی ہوئی عمر تھی اور کچھ یہ کہ اخبار میں ان کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہی تھی۔ مجھے جمیل مظہری کا یہ جملہ اکثر یاد آتا ہے کہ ''جینے کے لیے کچھ غرور کی ضرورت ہوتی ہے۔'' میں نے اس کا مطلب یہ نکالا ہے کہ کسی راہ میں بڑھنے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی کو اپنے اس کام یا پیشے پر فخر کا احساس ہو۔ اپنی زندگی کے متعدد تجربات میں میں نے اس اصول کو درست پایا۔ میں نے کئی طرح کے کام کیے، کئی طرح کی ملازمتیں کیں لیکن ان میں سے کسی کو لے کر آگے نہیں بڑھ سکا کیونکہ شاید میں ان میں سے کسی پر فخر نہیں کرسکا۔ صحافت نے مجھے جو کچھ بھی دیا لیا ہو لیکن ایک فخر کا احساس ضرور دیا غالباً یہی وجہ تھی جو میں ساری مشقتوں کے باوجوں اس ڈگر کو

پکڑے رہا اور اس پر بڑھتا چلا گیا۔ صابری صاحب 'آزاد ہند' میں اس غرور سے محروم ہوگئے تھے۔ منشی نجم الدین صاحب بھی ان کو آنکھ دکھا سکتے تھے۔ وہ کچھ عرصہ تک 'آزاد ہند' کے اداریہ نگاروں میں شامل تھے پھر یہ کام بھی ان سے لے لیا گیا۔ ممکن ہے ان کی صحت بھی خراب ہوگئی ہو لیکن انھوں نے کبھی اپنی کسی تکلیف کا اظہار نہیں کیا اس لیے کسی نے اس بارے میں کبھی کچھ نہیں جانا۔ وہ ایک بار اپنے وطن سہارنپور گئے تو پھر واپس نہیں آئے۔ میرے دہلی آنے کے کچھ عرصہ بعد غالباً ۱۹۷۶ء میں کلکتہ کے کسی اخبار میں میں نے ایک چھوٹی سی خبر دیکھی جو ان کے انتقال کے بارے میں تھی پھر میں نے ایک مبسوط مضمون ان کے بارے میں لکھا جو روزنامہ 'الجمعیۃ' دہلی میں شائع ہوا۔

جاوید نہال صاحب کی شخصیت قابلِ ذکر ہے۔ وہ مولانا آزاد کالج میں اردو کے استاد تھے۔ آگے چل کر ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ ہوئے اور کلکتہ یونیورسٹی سے بھی وابستہ رہے اور انہی وابستگیوں کے ساتھ ریٹائر ہوئے لیکن صحافت سے نہیں ریٹائر ہوئے۔ جسے وہ اپنے پیشۂ معلّمی سے پہلے سے لیے چلے آرہے تھے۔ وہ ڈاکٹر اور پروفیسر جاوید نہال اور کبھی نہال حسن ہاشمی لکھے جاتے رہے۔ یقین ہے کہ وہ پروفیسر رہے ہوں گے۔ کلکتہ میں ایک مشکل یہ ہے کہ کوئی لکچرر یا ریڈر نہیں لکھتا۔ جو بھی کالج یا یونیورسٹی میں معلّمی اختیار کرتا ہے اس کے نام کے ساتھ ''پروفیسر'' کا سابقہ لگ جاتا ہے۔ میں نہیں سمجھ سکا کہ یہ حضرات صرف ''ڈاکٹر'' لکھنا کافی کیوں نہیں سمجھتے۔ کوئی ڈاکٹر لکھے یا پروفیسر اس سے غیر متعلق لوگوں کے لیے کوئی فرق نہیں پڑتا اس لیے کہ کلکتہ جیسے بڑے شہر میں ان دونوں صیغوں میں سے کسی صیغے کے لوگوں کی کمی نہیں ہے یہ مسئلہ صرف علمی اخلاقیات کا ہے۔ پیشہ معلّمی سے وابستہ حضرات اس نکتہ کو زیادہ اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔

کلکتہ کی اردو صحافت میں جاوید نہال صاحب واحد معلم نہ تھے۔ پہلے بھی ایسے اصحاب موجود تھے اور اب بھی ہوں گے۔ مثال کے طور پر قیصر شمیم، ظفر اوگانوی، راز عظیم، سجاد نظر وغیرہ۔ اردو صحافت سے اساتذہ کی وابستگی ایک ایسا موضوع ہے جو قدرے تفصیل

کے ساتھ گفتگو کا متقاضی ہے۔ کچھ عجب نہیں کہ روز اول سے ان دونوں پیشوں کے درمیان چولی دامن کا رشتہ رہا ہو۔ دونوں کا تعلق قلمدان سے ہے اور صحافت بھی ایک طرح کا تدریسی عمل ہے جو برائے بالغاں اور کسی قدر برائے خوش فکراں ہے۔ دوسری طرف اساتذہ کے پاس فرصت کے اوقات بہت کافی ہوتے ہیں۔ ان کے لیے فرصت اور مہلت اس لیے رکھی گئی تھی کہ زیادہ سے زیادہ مطالعہ فرما کر اس کا فائدہ طلبہ کو پہنچائیں لیکن استاد تو بہرحال استاد ہوتا ہے۔ ان میں سے کچھ حضرات نے اپنا فاضل وقت سیاست کے ذریعے ملک وقوم کی خدمت کے لیے وقف کیا اور کچھ نے صحافت کی راہ پکڑی۔

یوں تو اس میں کچھ مضائقہ نہیں تھا لیکن ہوگیا، وہ یوں کہ توجہات بنٹ گئیں، سنجیدگی کے ساتھ پوری توجہ نہ طلبہ کی ذہنی پرورش پر صرف کی جاسکی نہ قارئین کی فکری مشاطگی پر۔ یہ بڑے خسارے کی صورت ہوئی۔ دوسری خرابی یہ ہوئی کہ جب صحافت ضابطہ بند ہونے لگی تو اساتذہ کی صورت میں جز وقتی کارکن مالکان اخبار کے ہاتھ میں ایک کارگر ٹرمپ کارڈ ثابت ہوئے۔ کل وقتی اخبارنویس یونہی فاقہ مست کسان کے مریل بیل کی طرح برائے نام چارے پر گزربسر کررہے تھے۔ اس میں بھی بٹہ لگانے کے لیے جز وقتی کارکنوں کی خدمات حاصل کرلی گئیں جن سے کسی رقم پر بھی علی الحساب سمجھوتہ کیا جاسکتا تھا گویا مالکان اخبار کے لیے یہ نعمتِ غیر مترقبہ، فن اور اس سے وابستہ افراد دونوں ہی کے لیے مضرت رساں تھی۔ حقیقت یہی تھی خواہ بطور افراد ان کی کچھ بھی مجبوریاں یا ترجیحات رہی ہوں۔

ایک زمانے میں جاوید نہال صاحب ہوگلی محسن کالج میں پڑھاتے تھے، 'آزاد ہند' کا اداریہ لکھتے تھے اور اسپورٹس رپورٹنگ کے لیے کھیلوں کو دیکھنے یا ان کی رپورٹیں لینے جایا کرتے تھے۔ میں واقعی حیران تھا کیونکہ میں نے اداریہ نگاری کو ہمیشہ ایک مشکل کام سمجھا ہے، جو بڑی توجہ، وسیع مطالعہ اور غور وفکر وقدرت تحریر کے ساتھ ساتھ سکون واحتیاط کی متقاضی ہوتی ہے۔ میں نے ایک بار جاوید نہال صاحب سے دریافت کیا کہ بھائی ایڈیٹوریل لکھنے کے لیے آپ وقت کیسے نکالتے ہیں۔ انھوں نے اپنے مخصوص انداز میں

دبی دبی ہنسی کے ساتھ کہا کہ ''بھائی وہ تو میں ہوگلی جاتے ہوئے ٹرین ہی میں لکھ لیتا ہوں۔'' میں اسے بھی کوئی معمولی بات نہیں سمجھتا۔

'آزاد ہند' میں ہمارے دوسرے رفیق کار شمس الزماں صاحب تھے وہ اپنی ہمہ جہتی کی وجہ سے ایک چیستاں تھے ان کی مصروفیات صحافی ہونے کے علاوہ سیاسی، ثقافتی اور کسی حد تک کاروباری بھی تھیں بہ ایں معنیٰ کہ کلکتہ میں کسی تجارتی ادارے کی نمائندگی بھی کرتے تھے۔ حلقہ احباب میں شمس، شمس صاحب، زماں اور زماں صاحب کہلاتے تھے۔ ان کی گوناگوں مصروفیات کا علم صرف انہی کو تھا۔ طبعاً ترقی پسند تھے لیکن سرمایہ داروں سے بھی ان کی گہری چھنتی تھی۔ تنقید میں تنقیص کی حد تک بے لاگ۔ ایک طرف شاعروں اور ادیبوں سے اور دیگر فنکاروں سے رشتہ استوار رکھتے تھے تو دوسری طرف سیاستدانوں اور قانون سازوں سے بھی اسی قدر گھلے ملے رہتے تھے۔ قلم سے زیادہ پلیٹ فارم کے کھلاڑی تھے۔ جس شخص میں اس قدر تنوع ہو اس کے بارے میں سرسری حوالے انتہائی ناکافی ہیں۔ مختصراً یہ کہ میں ۱۹۷۵ء کے اواخر میں کلکتہ سے دہلی آیا تو شمس الزماں صاحب بھی ۱۹۷۶ء میں کسی وقت دہلی وارد ہوئے اور اپنی گوناگوں مصروفیات کے ساتھ صحت کی خرابی کے باوجود رواں دواں رہے۔

ایک اور رفیق کار سجاد نظر تھے۔ انھوں نے کلکتہ سے شائع ہونے والے تقریباً ہر اردو اخبار سے رشتہ جوڑا لیکن دل کسی سے نہیں لگایا اس معاملے میں عجب ہرجائی واقع ہوئے تھے۔ لیکن انھوں نے پہلی وفاداری گھر میں اور دوسری وفاداری گھر سے باہر اسکول میں خوب نبھائی۔ افسانہ نگاری سے بھی ڈھیلا ڈھالا رشتہ قائم رکھا۔ ظالم باصلاحیت آدمی تھا لیکن اس نے اپنی صلاحیتوں کو پہچانا ہی نہیں۔

راز عظیم نے بھی 'آزاد ہند' میں میرے ساتھ کام کیا۔ 'عصرِ جدید' میں تو میرے ساتھ تھے ہی۔ وہ بھی آدمی دھن کے پکے تھے۔ اسکول میں پڑھاتے رہے۔ اخباروں میں کام کرتے رہے اور حصول اسناد کا سلسلہ بھی جاری رکھا یہاں تک کہ اردو میں پی ایچ ڈی

کر کے ڈاکٹریٹ کی ڈگری بھی حاصل کر لی اس ضمن میں یہ اور مشتاق احمد تو جاوید نہال صاحب کے مقلد تھے۔

دیگر دو اصحاب جن کے ساتھ آنکھ مچولی ہوتی رہی یعنی وہ کبھی 'عصر جدید' میں رہے کبھی 'آزاد ہند' میں وہ تھے نیاز اعظمی اور محمود ایوبی۔ میں ان دونوں کو اپنے عزیز کے طور پر سمجھتا رہا جس کی کوئی خاص وجہ نہیں معلوم۔ اگر کوئی وجہ رہی ہوگی تو وہ خود ان حضرات کا میرے تئیں رویہ رہا ہوگا۔ ان دونوں نے آگے پیچھے کلکتہ کو خیر باد کہہ کر بمبئی کی راہ لی۔ ماہ و سال کا مجھے علم نہیں لیکن غالباً نیاز اعظمی پہلے گئے۔ یہ کوئی نئی بات نہ تھی کلکتہ اور بمبئی کی صحافتی دنیا کے درمیان لین دین کا سلسلہ پہلے سے چلا آ رہا تھا۔ رئیس الدین فریدی، ابراہیم ہوش، رفیق عابدی صاحبان کی مثالیں ہیں ان کے بعد کی نسل کے بھی کئی صحافیوں اور کاتب حضرات سے بمبئی میں میری ملاقات ہوئی۔

نیاز اعظمی بمبئی کی صحافتی دنیا کے نشیب و فراز سے گزرتے ہوئے 'انقلاب' میں پہنچے اور وہاں نیوز ایڈیٹر ہو گئے لیکن ذاتی صدمات سے پیہم دوچار ہونے کے بعد ان پر فالج کا اثر ہو گیا اور وہ اپنی بقیہ زندگی کسی طور گزارنے کے لیے اپنے وطن ضلع اعظم گڑھ کے قصبہ دیدار گنج میں اپنے والدین کے پاس واپس چلے گئے۔

۷۰-۶۹ء میں جب کلکتہ سے 'سنگم' نکلنے لگا تو ایوبی صاحب بمبئی سے آئے ہوئے تھے اور غالباً اس وقت تک وہاں ان کے حالات مستحکم نہیں ہوئے تھے۔ میں 'آزاد ہند' میں آ چکا تھا۔ ہم لوگوں نے ایوبی کو 'آزاد ہند' میں لانے کی کوشش کی، سعید صاحب نے ان کو گفتگو کے لیے بلایا، ایوبی آئے بھی لیکن کلکتہ کے اردو اخبارات کے مالکوں کے خلاف سخت تنفر اور اشتعال کے عالم میں، اور سعید صاحب کو بہت سخت سست جواب دے کر چلے گئے غالباً وہ یہی کچھ سنانے کے لیے آئے تھے پھر بمبئی چلے گئے، اردو بلٹز کے اسسٹنٹ ایڈیٹر ہوئے۔ بمبئی میں متعدد بار ان سے ملاقاتیں رہیں اور وہ ہر طرح مطمئن معلوم ہوتے تھے۔

ایک بات قابلِ غور ہے اور یہاں اس کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے۔ محمود ایوبی

مسلمان مالکوں سے خاصے برہم اور مشتعل تھے وہ بلٹز میں ملازمت کے دوران شدید طور پر بیمار ہوئے لیکن ان کے ساتھ جو حسنِ سلوک ہوا اس کے لیے وہ بلٹز کے مالک مسٹر کرنجیا کے بالخصوص ممنون تھے اور اخبار کے مینجمنٹ اور شعبہ ادارت کی عنایات اور ہمدردیوں کے لیے بالعموم ممنونیت کے احساسات رکھتے تھے۔ خود میرا تجربہ یہ تھا کہ 'عصر جدید' میں ملازمت کے دوران میری شدید علالت پر کسی طرح کی ہمدردی یا اعانت تو دور کی بات مجھے دھکا دینے کا وہی موزوں ترین موقع سمجھا گیا۔ اسی وقت یو ایس آئی ایس والوں نے، جہاں میری مستقل ملازم کی حیثیت بھی نہ تھی اور اس ادارے کی نوعیت ہر اعتبار سے مغائرت کی تھی، میری دلجوئی کی اور حوصلہ بڑھائے رکھنے کی کوشش کی۔ ۱۹۶۴ء کے فسادات کے دوران جب 'عصر جدید' والوں نے مجھے کرفیو پاس تک دینا مناسب نہیں سمجھا، یو ایس آئی ایس والے خیریت دریافت کرتے رہے ایک روز جب میں نے انھیں بتایا کہ کئی روز سے شکر نہیں مل رہی ہے تو انھوں نے آفس کی کینٹین سے شکر مہیا کی۔

میں نے یہ بات بارہا سوچی ہے اور اکثر سوچتا ہوں کہ آخر ہمارا اخلاق کیا ہوا، ہمارا کردار کہاں گیا؟ کیا ہمارا کام صرف دوسروں کی تنقیص اور خود ترحمی کے عالم میں ہاتھ پھیلائے رہنا رہ گیا ہے؟ آخر ہم کہاں جا رہے ہیں؟

'آزاد ہند' میں آگے چل کر جن حضرات سے سابقہ پڑا اور وہاں رہتے دم تک سابقہ رہا وہ احمد سعید ملیح آبادی صاحب کے علاوہ ایک صاحب اور بھی تھے منیر نیازی جن کا اصرار تھا کہ ان کے نام سے پہلے سید ضرور لگایا جائے حالانکہ وہ اپنے رویہ میں سعید صاحب سے کم خانصاحبی نہیں معلوم ہوئے۔ منیر نیازی ''سنگم'' کے کلکتہ ایڈیشن میں کام کرنے کے لیے بنارس سے نہ معلوم کس طرح لائے گئے تھے۔ وہ وہاں روزنامہ 'آزاد' میں کام کرتے تھے۔ غالباً ۱۹۷۱ء میں 'سنگم' بند ہوا تو میں نے سعید صاحب سے تجویز کیا کہ منیر نیازی کو 'آزاد ہند' میں بلا لیا جائے اور وہ بلا لیے گئے۔ پھر دسمبر ۱۹۷۵ء میں ان کو 'آزاد ہند' میں اپنا قائم مقام چھوڑ کر میں دہلی چلا آیا لیکن اس سے پہلے 'آزاد ہند' کے دورانِ قیام میں

میری سرگزشت باقی ہے۔

سعید صاحب نے مجھے 'آزاد ہند' میں ملازمت کی نہیں 'ہم نشینی' کی دعوت دی تھی۔ ان کا کہنا تھا ''آپ شام کو یہاں آ کر بیٹھا کریں ہم لوگ آپ کی صحبت سے لطف اندوز ہوں گے۔'' بس اتنی ہی بات ہوئی تھی اور میں کچھ دنوں کے توقف کے بعد اس بات کے دامِ ہم رنگِ چمن میں آ گیا اور کسی پلے ہوئے پنچھی کی طرح رہائی کے بعد پھر اڑ کر پنجرے پر آ بیٹھا۔ روز شام کو ۴ر بجے 'آزاد ہند' جانے لگا اور عموماً ۸ر بجے تک بیٹھتا۔ سعید صاحب نے اس نئی یار باشی کے لیے انہی حدوں کا تعین کیا تھا۔ اس نئی مصروفیت کا بلکہ اس سے زیادہ نئے ماحول کا جس میں لفظاً اور معناً آزادی کا اور کسی قدر ذہنی برابری کا احساس تھا صحت پر خوشگوار اثر ہوا اور بہتیری خرابیوں اور کمزوریوں کے باوجود نارمل طریقے سے کام کرنے لگا۔ یعنی صبح ۸ر بجے کے قریب یو ایس آئی ایس جاتا، دوپہر کو وہاں سے آ کر کھانے کے بعد آرام کرتا اور پھر شام کو ٹہلتا ہوا 'آزاد ہند' چلا جاتا۔

رئیس احمد جعفری نے عرصہ دراز تک 'آزاد ہند' میں نیوز ایڈیٹنگ کے فرائض انجام دیے لیکن میرے وہاں پہنچنے سے پہلے وہ 'آزاد ہند' سے دوسری بار سبکدوش ہو کر کہیں اور چلے گئے تھے اور جاوید نہال صاحب نیوز ایڈیٹنگ کر رہے تھے اور کسی کسی دن اداریہ بھی لکھتے تھے۔ کچھ عرصہ بعد شام کی نیوز ایڈیٹنگ میرے ذمہ آ گئی آگے چل کر کسی کسی دن فیچر بھی لکھنے لگا غالباً اسی سے سعید صاحب کو یہ اندازہ ہوا کہ میں اداریہ لکھنے کا بھی اہل ہوں اور انھوں نے اس فرض میں مجھے اپنا شریک بنالیا۔ اس کے بعد وہ مرحلہ آیا جہاں سعید صاحب اپنی بات سے بالکل پھر گئے یعنی 'یار باشی' کو تو ہم لوگ پہلے ہی طاق پر رکھ چکے تھے اب نئی بات یہ ہوئی کہ موصوف نے ذمہ داریوں کا طوق میرے گلے میں ڈالا اور خود عازم بیت اللہ ہوئے۔ یہ ان کا دوسرا حج تھا۔

ابھی سعید صاحب اسی طرف تھے کہ بنگلہ دیش کی تحریک نے شدت اختیار کر لی۔ پہلے بنگالیوں پر پنجابیوں کے مظالم پھر بہاریوں پر مکتی باہنی اور ان کے حواریوں کی انسانیت

سوز چیرہ دستیوں کی داستانیں تاریخ کے صفحات پر ثبت کی گئیں اور نوبت ہندوستانی افواج کی مداخلت تک پہنچی جو سقوطِ ڈھاکہ پر منتج ہوئی۔ اس تمام عرصہ میں سارا بنگال بالخصوص کلکتہ پریس ایک ناقابلِ بیان تہلکہ سے دوچار تھا۔ سعید صاحب نے حج سے واپسی کے بعد کچھ روز اپنے وطن ملیح آباد میں آرام و قیام ضروری سمجھا اس دوران ہم لوگوں کو 'آزاد ہند' میں سارے نشیب و فراز سے گزرنا پڑا۔

ہم لوگوں کو کئی مشکلوں اور نزاکتوں کا سامنا تھا۔ سابق مشرقی پاکستان سے شائع ہونے والے اردو اخبارات بند ہو چکے تھے۔ ہم لوگوں کو معلوم تھا کہ دیر سویر 'آزاد ہند' کی چند کاپیاں ڈھاکہ تک پہنچ جاتی ہیں اس لیے وہاں کے اردو خوانوں کا لحاظ رکھنا پھر اپنے ملک کی پالیسیوں کا پاس اور بنگال کی عمومی فضا کا لحاظ رکھنا ضروری تھا تاہم کھلے عام مظالم سے چشم پوشی بھی نہیں کی جاسکتی تھی غرض یہ کہ سخت امتحان تھا جس سے ہم لوگ گزر گئے۔ اردو دنیا والے پھر بھی اپنے خول میں گم تھے مگر مجھے یو ایس آئی ایس سے وابستگی کی بنا پر ہر روز بیرونی دنیا کا سامنا تھا جہاں ہندوستانی مسلمانوں کو بالعموم پاکستان کا طرفدار سمجھا جاتا تھا اور پاکستان کی شکست کو ان کی شکست کے مترادف سمجھا گیا۔ خود مسلمان احساسِ جرم کی نفسیات میں مبتلا تھا۔

ذاتی طور پر یو ایس آئی ایس سے میری وابستگی کا ایک مطلب اور بھی تھا۔ بنگلہ دیش کی جدوجہد کے دوران امریکہ نے پاکستان کی کوئی خاص مدد تو نہیں کی لیکن وہ یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ ہندوستان ایک خاص حد سے تجاوز کرے چنانچہ جب جنگ کا مغربی محاذ گرم ہوا تو امریکہ نے جنگ بندی کے لیے دباؤ ڈالنا شروع کیا۔ غالباً اس کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ نوزائیدہ بنگلہ دیش پر ہندوستانی افواج کا غلبہ نہ ہونے دیا جائے اور وہ فوجیں اپنی کارروائی کے بعد ہندوستان واپس چلی جائیں۔ عین اسی وقت بحرالکاہل میں موجود امریکہ کے ساتویں بحری بیڑے کا فلیگ شپ خلیج بنگال میں بھی آ گیا۔ اس واقعہ کو ہندوستانی پریس نے خوب خوب اچھالا۔ اس کیفیت نے ہندوستانیوں کی نظر میں امریکہ کو

قابلِ مذمت بنا دیا تھا اور امریکی اداروں سے وابستگان کی حالت خراب تھی خصوصاً بنگال میں۔ مسلمان ہندوستان کی بہی خواہی اور وفاداری کے اظہار کے لیے امریکہ کو گالی گفتہ دینے میں زیادہ ہی آگے آگے تھے۔

اس ضمن میں قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ بڑی طاقتوں نے بین الاقوامی سمندروں کا آپس میں جو بٹوارہ کر رکھا تھا اور اپنا اپنا حلقۂ اثر بنا رکھا تھا اس کے مطابق بحر ہند کا بین الاقوامی سمندر برطانیہ کے زیر اثر تھا لیکن ایشیا اور افریقہ میں برطانوی نوآبادیوں کے خاتمے کے ساتھ ساتھ برطانیہ کی اقتصادی طاقت کم ہوتی جا رہی تھی اور اس خطہ سے اس کی دلچسپیاں بھی کم ہو رہی تھیں چنانچہ ۱۹۶۰ء کے عشرہ کے اواخر میں برطانیہ نے اعلان کر دیا تھا کہ وہ سنگاپور سے اپنا بحری مستقر اور اس علاقے میں اپنا بحری بیڑہ جو بحر ہند کی نگرانی پر مامور تھا ہٹا رہا ہے اور اب مشرق میں اس کے بحریہ کی گارگزاریاں بحیرہ روم میں سوئز تک محدود رہیں گی۔ اس طرح بحر ہند کے علاقے میں ایک بہت بڑا فوجی خلا پیدا ہو رہا تھا جس کو پُر کرنے کے لیے بڑی طاقتوں میں سے امریکہ اور روس رہ گئے تھے۔ ان دونوں میں سے کوئی بھی اس علاقے کو ہندوستان کے زیر اثر چھوڑنے کے لیے تیار نہ تھا۔

اسی حقیقت کے پیش نظر میں نے اس وقت 'آزاد ہند' میں ایک طویل مضمون میں لکھا تھا کہ بنگلہ دیش کی جدوجہد کے نتیجہ میں ہندوستان کا کوئی فائدہ نہیں ہونے والا ہے کیونکہ بحر ہند میں پیدا شدہ خلا کو پُر کرنے کے لیے دو بڑی طاقتوں کا دوڑنا زبردست طوفان کا پیش خیمہ ہے۔ اس خطے میں موسمیاتی طوفان بھی اسی طرح آتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ ایک نیا ملک بن جانے کے بعد ہندوستان کو ایک کے بجائے دو غیر دوست پڑوسیوں سے نپٹنا ہوگا اس لیے کہ قوموں کے تعلقات ان کے مفادات پر مبنی ہوتے ہیں نہ کہ نیک خواہشات اور وقتی سیاسی مصالح پر چنانچہ چند دریائی جزیروں کی ملکیت اور دریائی پانی کی تقسیم کے سوال پر ہندوستان اور بنگلہ دیش کے اختلافات جاری رہے۔ پورے برصغیر میں اس تاریخی واقعہ یعنی تشکیل بنگلہ دیش کا طرح طرح سے ردِعمل ہوا یہ سب تاریخ کا حصہ

ہے۔ بہ سبب قربت و قرابت کلکتہ بہت زیادہ متاثر ہوا۔ مسلمانوں کے لیے بڑا صبر آزما وقت تھا جو ۱۹۶۵ء میں ہند پاک جنگ کے دوران سخت صدمہ اور حکومت کے اہانت آمیز اور ناعاقبت اندیشانہ رویہ کی وجہ سے بڑے عذاب سے گزر چکے تھے۔ پھر وہی اندیشے کابوس بن کر ان کے سینے پر سوار تھے۔

لیکن اس بار مغربی بنگال میں بائیں بازو کی حکومت نے یقیناً سوجھ بوجھ سے کام لیا۔ ۱۹۶۵ء میں مغربی بنگال کی کانگریسی حکومت نے مسلمانوں کے ساتھ جو سلوک کیا تھا اس کی سزا اس کو دو ہی برس بعد عام انتخابات میں ایسی ملی کہ اس ریاست میں وہ پارٹی اقتدار سے بالکل ہی محروم کر دی گئی۔ الیکشن کے قریب پارٹی لیڈروں میں مسلمان ووٹروں سے نظر ملانے کی جرأت نہیں تھی خود پارٹی ورکر اپنے لیڈروں سے علی الاعلان سوال کر رہے تھے کہ آپ نے ہمارے ساتھ جو سلوک روا رکھا اس کا کیا جواز تھا۔ ایسے کتنے ہی مسلمان جو پارٹی کے سرگرم کارکن تھے بلا کسی الزام کے، بلا مقدمہ چلائے اور بلا فردِ جرم لگائے مہینوں علی پور جیل میں سڑتے رہے تھے۔ لیکن ۷۱-۷۰ء میں برسرِ اقتدار کمیونسٹوں نے ایسی حماقتیں نہیں کیں تاہم اندیشے حقیقی تھے۔

بہرحال کلکتہ کا مسلمان سراسیمہ تو تھا ہی ایک عجیب کرب میں مبتلا تھا جسے نہ دکھا سکتا تھا نہ چھپا سکتا تھا۔ بہار کے مختلف اضلاع سے آنے والے مسلمانوں کی کلکتہ میں اچھی خاصی آبادی ہے جن میں سے بیشتر ایسے رہے ہوں گے جن کے دور نزدیک کے اقارب سابق مشرقی پاکستان میں رہے ہوں گے۔ بنگلہ دیش کی تحریک کے دوران مکتی باہنی کے ہاتھوں ان پر جو عذاب آیا اس کی وجہ سے کچھ لوگ بھاگ کر اس پار آنے میں بھی کامیاب ہو گئے تھے اور وہ کلکتہ میں اپنے عزیزوں کو تلاش کر کے پناہ لینے کی کوشش کر رہے تھے۔ کچھ دم لے کر آگے بڑھ جاتے مقدر جہاں لے گیا ہو، کچھ بہار کے مختلف علاقوں میں گئے ہوں گے کچھ نیپال کے سرحدی علاقوں میں داخل ہو کر پاکستان کی راہ پکڑنے میں کامیاب ہوئے ہوں گے۔ اس راہ جانگسل میں کتنے کام آئے ان کا شمار کسی کو نہیں معلوم۔

کلکتہ کے مسلمانوں کے لیے ایسے عزیزوں کو پناہ دینا بھی مشکل تھا اور وہ اپنے لاپتہ عزیزوں کے غم میں بھی گھل رہے تھے ان کے اس دکھ کو اغیار نے پاکستان کی طرفداری اور اس کی شکست پر پشیمانی سے تعبیر کیا۔ مسلمانوں کی نظریں بالعموم اس طرح جھکی ہوئی تھیں گویا مشرقی پاکستان میں پاکستانی افواج کے مظالم کے ذمہ دار وہی تھے اور شکست کا کلنک بھی انہی کا حق ہے۔ بنگالی ہندوؤں کا مشتعل ہونا بھی فطری تھا کیونکہ بنگلہ دیش سے آنے والے ہندو بنگالیوں کا تانتا بندھا ہوا تھا وہ اپنی پریشانیوں کی داستانیں سناتے اور بنگلہ اخبارات اس میں نمک مرچ کا اضافہ کر کے چھاپتے۔ کوئی یہ نہیں کہتا تھا کہ یہ عذاب تو وہاں ہندو مسلمان، بنگالی غیر بنگالی سب پر گزرا ہے۔ ہاں ہماری سرحد کے اندر یہ امتیاز ضرور تھا کہ جو ہندو آ رہے تھے وہ رفیوجی تھے اور سرکاری مشنری کی امداد و اعانت اور عوام کی ہمدردیوں کے مستحق تھے، لیکن جو مسلمان نظر آیا وہ معتوب و مردود اور اس کی کم سے کم سزا یہ تھی کہ اس کو اسی جہنم میں واپس ڈھکیل دیا جائے۔

اس دوران مغربی بنگال میں مسلمانوں کی پکڑ دھکڑ تو کم ہوئی تاہم کئی لوگ بلا کسی فرد جرم یا مقدمہ کے لمبے عرصے تک نظر بند رہے، ان میں سب سے برا حال ادریس الحق مرحوم کا ہوا جو تقریباً دو سال نظر بند رہے۔ اس اثناء میں میں نے انڈین جرنلسٹس ایسوسی ایشن میں ذمہ دار اخبار نویسوں سے مل کر کئی بار کوشش کی کہ ان کی رہائی کے لیے کچھ کیا جائے ان لوگوں نے کوشش کی بھی لیکن کچھ حاصل نہیں ہوا۔ ادریس الحق جب بالآخر چھوٹ کر آئے تو دق کے مرض میں مبتلا ہو چکے تھے اور اس درجہ خوفزدہ تھے کہ جن اذیتوں سے گزرے تھے انھیں زبان پر بھی لاتے ہوئے گھبراتے تھے۔ رہائی کے بعد بہت دنوں تک تو کسی سے ملے ہی نہیں۔ کئی مہینے بعد ایک دن میرے گھر آئے تو بتایا کہ میری عدم موجودگی میں میری بیوی مجبوراً اپنی بچی کو لے کر بھائی کے ہاں چلی گئی کیونکہ اپنے گھر میں اس کی خبر گیری کرنے والا کوئی نہ تھا پھر گھر کا سارا سامان نامعلوم لوگ اٹھا لے گئے۔ گھر کے اسباب میں صرف ایک تخت بچ رہا۔ بالآخر ادریس الحق دق کے مرض میں ہی جاں بحق

ہوئے۔ میں اس وقت دہلی آچکا تھا۔

انجامِ کار اس جنگ کے جو اثرات ہندوستانی مسلمانوں پر مرتب ہوئے ان کا ایک مختصر جائزہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ لگتا تھا کہ پاکستان کی شکست کے ساتھ ہی شمالی ہند کے خصوصاً مغربی بنگال اور بہار کے مسلمانوں کی بھی شکست ہوگئی ہے۔ اس کی کئی وجہیں تھیں۔ دراصل یہ اس نظریہ کی شکست تھی جو تشکیل پاکستان کی اساس تھا یعنی مذہبی سیاست اور دوقومی نظریہ۔ یہ شکست اس حقیقت کی بھی ایک دلیل تھی کہ برصغیر میں لسانی تعصّبات مذہب سے زیادہ طاقتور ہیں۔ اس سے بہت پہلے ۱۹۵۶ء میں ہندوستان میں لسانی صوبوں کی تشکیل کے اصول کو تسلیم کیے جانے ہی سے یہ بات ثابت ہوچکی تھی۔ بہار اور بنگال کے بیشمار خاندان سرحدوں کے دونوں جانب بنٹے ہوئے تھے اس لیے ہندوستان کے لوگوں کا مشرقی پاکستان یا نوازائیدہ بنگلہ دیش میں اپنے عزیزوں کے جان و مال کے متعلق فکرمند ہونا بھی فطری بات تھی لیکن اس سے بھی بڑھ کر وہ زخم تھا جو دوسروں کی نظرِ تحقیر کے تیروں سے لگ رہا تھا جس نے ان مسلمانوں کو بھی ٹیس میں مبتلا کردیا تھا جنھیں نہ پاکستان سے نظریاتی اتفاق تھا نہ وہاں کے لوگوں سے ان کی کوئی منفعت وابستہ تھی۔ ہندوستان میں ایک سال تک ۹۲ ہزار پاکستانی فوجیوں کی نظر بندی کی وجہ سے یہ زخم عرصہ دارز تک تازہ رہا اور یہ ایسے وقت میں ہوا جب ہندوستانی مسلم نوجوانوں نے احساسِ کمتری کے خول سے نکلنے کی کوشش شروع ہی کی تھی، مقابلے کے امتحانوں میں شریک ہونے لگے تھے اور نئی راہوں کی تلاش میں ہاتھ پاؤں مارنے لگے تھے اس سانحہ سے انھیں ایک اور جھٹکا لگا۔

لیکن بنگلہ دیش بن جانے کا ایک مثبت اور دوررس نتیجہ بھی ہوا۔ شمالی ہند کے وہ لائق اور باصلاحیت مسلم نوجوان جو تلاش معاش میں دور دور تک جاسکتے تھے بنگال میں نسبتاً نرم بین الاقوامی سرحدیں پار کرکے مشرقی پاکستان میں داخل ہوجایا کرتے تھے اور وہاں سے مغربی پاکستان بھی چلے جایا کرتے تھے، انھوں نے اچھی طرح سمجھ لیا کہ یہ راستہ بند

ہوگیا اب جو کچھ کرنا ہے یا جو کچھ ہونا ہے ہندوستان ہی میں ہونا ہے اس طرح ان کا ذہن یکسو ہوگیا۔ غالباً اوسط درجہ کے مسلمان سرمایہ دار بھی جو تذبذب کا شکار تھے، مستقبل کو سمجھنے سے قاصر تھے، سرمایہ لگانے سے عاری تھے انھوں نے بھی سمجھ لیا کہ اب یہیں کچھ نہ کچھ کرنے کے سوا کوئی اور چارہ نہیں ہے۔ ظاہر ہے جب سرمایہ اور محنت دونوں کو یہ احساس ہوگیا کہ ہمارا میدان عمل وہیں ہے جہاں ہم ہیں۔ آنے والے دنوں، مہینوں اور برسوں میں وہ اسی راہ پر گامزن ہوگئے۔ اسے ایک صحت منداور حوصلہ افزا صورت حال سمجھنا چاہیے۔

مختصر یہ کہ بنگلہ دیش کی تشکیل نے ہندوستانی مسلمانوں کی آنکھوں کے سامنے کئی فیصلے کردیے۔ مذہب قومیت کی بنیاد نہیں بن سکتا، ہندوستانی مسلمان جہاں ہے وہیں اس کو مرنا جینا ہے چنانچہ وہ اڑوس پڑوس میں جھانکنے سے تائب ہوئے، جو کچھ اثاثہ بچا تھا یا باہر سے جو کچھ کما کر لائے اس کو کارآمد بنانے لگے۔ بنگلہ دیش بن جانے کے بعد ہندوستان میں اردو اخباروں کی حالت بہتر ہوگئی، ان کی تعداد بڑھی، اشاعت بڑھی اور اخباروں کے علاوہ بہتیرے مسلم ادارے ملک کے مختلف علاقوں میں قائم ہونے لگے بہ الفاظ دیگر ہندوستانی مسلمانوں میں ایک نیا اعتماد پیدا ہوا۔

بنگلہ دیش کے پورے ہنگامے سے میں ذاتی طور پر متاثر نہیں ہوا تھا لیکن ایک ناکردہ گناہ کی ندامت بنگالی ساتھیوں اور دوستوں سے نظر برابر نہیں ہونے دیتی تھی حالانکہ ان میں سے بیشتر اپنی دلی شادمانی کا جوان کے چہروں سے چھلکی پڑتی تھی میرے سامنے کوئی خاص اظہار نہیں کرتے تھے۔ مجھے اس کی بھی گرانی محسوس ہوتی تھی کہ آخر یہ لوگ مجھے ہندوستانی کیوں نہیں سمجھتے صرف مسلمان یا اردو والا ہی کیوں سمجھتے ہیں حالانکہ اس برصغیر کی حالیہ تاریخ میں یہ کوئی نئی بات نہیں ہوئی تھی۔ ترکی میں خلافت کے خاتمہ پر ہندوستانی مسلمان شعلہ صفت ہوگیا تھا اور اس کے اس احساس میں کانگریس کے زیر اثر سارا ملک شریک ہوگیا، نہر سوئز پر بمباری اور اسرائیل کے ہاتھوں عربوں کی شکست پر اس برصغیر کے مسلمانوں کا ویسا ہی ردِعمل ہوا۔ عراق کی شکست پر بھی عام مسلمانوں کا ردِعمل

ساری دنیا نے دیکھا اور یہ بھی دیکھا ہوگا کہ عراق ہی کے ہم مذہب اور ہم نسل مظلوم پڑوسی کویت کی مظلومیت پر انہی مسلمانوں نے آنکھ بند کر لی جس طرح بنگلہ دیش کی تشکیل سے پہلے اس خطہ میں پاکستانی فوجیوں کے جبر کی طرف سے آنکھیں موند لی تھیں اب یہ سارے واقعات تاریخ کا حصہ ہیں لیکن ان کا سنجیدگی کے ساتھ تجزیہ کیا جانا چاہیے۔

اس کے بعد کے چند برس بلا کسی خاص وقوعہ کے گزرے یہ ضرور ہوا کہ میری خراب صحت کے پیش نظر میری پہلی بیٹی قمر جبیں کی شادی کسی قدر عجلت کے ساتھ ۱۹۷۱ء میں کر دی گئی۔ 'آزاد ہند' میں منیر نیازی آ گئے تو ان کی وجہ سے کام کا بوجھ ہلکا ہو گیا اور شمس الزماں اور جاوید نہال جیسے ساتھیوں کی موجودگی میں کام کی فضا بھی خوشگوار ہو گئی۔ ہاں یہ کارواں قدرے سست خرامی سے ۱۹۷۴ء میں داخل ہوا تو نئے فتنوں نے انگڑائی لی۔

اُدھر یو ایس آئی ایس میں ۱۹۷۱ء میں ہی ایک موقع ایسا آیا کہ اسٹاف میں بڑے پیمانے پر کٹوتی ہوئی۔ ہندی ایڈیٹر کی مستقل جگہ ختم کر دی گئی اور میری بھی جو کچھ حیثیت تھی اس کا جھٹکا کر دیا گیا مگر مقامی افسران مجھ پر مہربان تھے انھوں نے کسی طرح اجرت کم کر کے مجھے بچا لیا اور اطمینان دلایا کہ ابھی جو کچھ ملتا ہے لے لو پھر دیکھا جائے گیا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ یو ایس آئی ایس میں میری آمدنی گھٹ کر ڈھائی سو روپیہ رہ گئی اور تقریباً اتنا ہی 'آزاد ہند' کا لیکن دوسری طرف خرچ بڑھا ہوا تھا۔ بچوں کو گھر بھیج دیا اور کسی طرح گزارہ کرنے لگے۔ ایک سال کافی تکلیف سے گزرا کیونکہ علاج معالجے کے اخراجات بھی کافی تھے لیکن سال بھر بعد دفتر والوں نے میرا معاملہ اٹھایا اور پیسے بڑھا کر دس بارہ سو تک کرا دیئے جو کلکتہ میں قیام رہنے تک کسی قدر اضافے ہی کے ساتھ جاری رہے۔

لیکن ابھی پس منظر میں کچھ جھلکیاں باقی ہیں۔ اخبار میں میری جو بھی حدود و قیود تھیں ان سے قطع نظر یو ایس آئی ایس نے مجھے نئے سبزہ زاروں کی سیر کرائی وہ اس طرح کہ ۵۰ء اور ۶۰ء کے عشروں کے دوران ہندوستان میں امریکی امداد سے قائم ہونے والے کارخانوں اور اداروں کی اچھی خاصی تعداد تھی جن میں سے بہتیرے بنگال اور بہار کے

صنعتی اور معدنیاتی خطوں میں بھی قائم تھے چنانچہ جب انگریزی اور بنگلہ اخبار نویسوں کی کوئی جماعت یو ایس آئی ایس کے زیرِ اہتمام کسی دورے پر لے جائی جاتی تو اردو کی نمائندگی کے لیے مجھے اس میں شریک کرلیا جاتا فائدہ یہ تھا کہ میرے لکھے ہوئے مضامین کلکتہ اور پٹنہ کے کئی اردو اخباروں میں چھپ جاتے۔ اس طرح میری آنکھ بھی کھلتی رہی اور ہاتھ بھی صاف ہوتا رہا، فکر میں تازگی بھی آتی رہی کیونکہ یہ کام ڈھرے سے ذرا مختلف تھا۔ ان سفروں میں دیگر اخبار نویسوں سے بھی میری رسم و راہ بڑھی اور یو ایس آئی ایس کی طرف سے میری مالی منفعت میں بھی کسی قدر اضافہ ہوا۔

اس طرح کے ایک لمبے پریس ٹور میں پہلی بار نومبر ۱۹۶۳ء میں جانے کا اتفاق ہوا یہ ایک ہفتہ کا ٹور تھا، بنگال، بہار، آسام اور یوپی کا۔ خان بہادر صاحب ہفتہ بھر کے لیے جانے کی مجھے اجازت دینے کے لیے کسی طرح تیار نہ تھے میں نے بڑی خوشامدیں کیں اور کسی طرح ان کو راضی کرلیا۔

بات دراصل یہ تھی کہ اس طرح کے ٹور میں عام طور سے مالک یا مینجمنٹ کا کوئی آدمی جایا کرتا تھا یہ اردو اخبارات کی بڑی بدنصیبی تھی۔ یہ لوگ دوسرے اخبار نویسوں کے سامنے اردو کا ایک گھٹیا نقشہ پیش کرتے تھے۔ واپسی کے بعد کچھ لکھنے سے بھی قاصر رہتے تھے اس لیے ٹور کا اہتمام کرنے والے اداروں کو اردو والوں کی طرف سے مایوسی ہوا کرتی تھی انھیں مفید مقصد کوئی چیز نہیں ملتی تھی تو وہ اس مد پر صرف ہونے والی رقم کو زیاں تصور کرتے تھے چونکہ اس طرح کے ٹور کا اہتمام ریاستی یا مرکزی حکومت یا کوئی بڑا ادارہ کیا کرتا تھا اس لیے وہ آئندہ کے لیے اردو والوں کے معاملے میں محتاط ہوجایا کرتے تھے۔ بعض مواقع پر اردو اخبار والے دوسروں کے مذاق کا موضوع اور نشانہ بھی بنتے۔ شکر ہے اب حالات کافی بدل گئے ہیں۔ اردو اخبارات کے ایڈیٹر بین الاقوامی دوروں پر اور وزیراعظم کے ہمرکاب اخبار نویسوں کے ساتھ بھی جانے لگے ہیں۔ یہ شرکاء بالعموم مالک ایڈیٹر ہوا کرتے ہیں لیکن اگر وہ باصلاحیت ہیں اور اپنی صحافت کی آبرو رکھنے کے اہل ہیں تو

ان کے ان دوروں میں جانے پر کسی کو کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔ یوں آئیڈیل صورت تو یہی ہوتی کہ دیگر سینئر صحافیوں کو بھی اس طرح کے مواقع دیے جاتے۔

آسام کی سیر

یو ایس آئی ایس کے زیرِ اہتمام مذکورہ بالا ٹور میں دس بارہ اخبار نویس شریک تھے ان کے علاوہ آفس کے پریس چیف مسٹر گنگولی تھے جو بڑے اچھے منتظم تھے اور مجھ پر بالخصوص بہت مہربان تھے ان کے علاوہ امریکن انفارمیشن آفیسر مسٹر گولڈ تھے۔ ہم لوگ سب سے پہلے کلکتہ سے کوئی سات میل کے فاصلے پر واقع بن ہگلی ہسپتال دیکھنے کے لیے گئے جو معذوروں کا ہسپتال تھا اور ایک صاحبِ خیر بنگالی ڈاکٹر نے قائم کیا تھا۔ موصوف امریکہ میں کارِ خیر کے بعض ادارے دیکھ کر آئے تھے جن سے بہت متاثر تھے چنانچہ اپنی پریکٹس چھوڑ چھاڑ کر اسی کام میں جُٹ گئے۔ اسی ہسپتال میں ڈاکٹر ریشما چٹرجی نے جو اس وقت کلکتہ یونیورسٹی کے سائنس کالج میں پروفیسر تھیں اپنی دریافت کردہ مرگی کی دوا کا تجربہ کررہی تھیں۔ انھوں نے ایک دیسی بوٹی سرپ گندھا سے جس کا نام طبِ یونانی میں اسرول ہے ایک مسکن دوا تیار کی تھی جو اتفاق سے مرگی کے مریضوں کے لیے مفید معلوم ہوئی امریکہ نے اس تحقیق میں معاونت کے لیے امداد فراہم کی۔ وہ کہہ تو رہی تھیں کہ بہت جلد اس دوا کو پیٹنٹ کرائیں گی لیکن مجھے نہیں معلوم کہ اس کا انجام کیا ہوا۔

اس ہسپتال کی خوبی یا خاص بات یہ تھی کہ وہاں کا زیادہ تر کام وہاں کے معذور مریض خود کرتے تھے ہسپتال کا عملہ ان کا ہاتھ بٹاتا تھا ان میں خود اعتمادی پیدا کرنے کے لیے ایسا کیا جاتا تھا۔ نفسیاتی کیفیات کو خاص اہمیت دی جاتی تھی چنانچہ ہر ماہ ساری نرسوں، ڈاکٹروں اور عملہ کے دیگر لوگوں کا بشمول خود بانیِ ہسپتال (جن کا نام مجھے یاد نہیں رہا) نفسیاتی ٹسٹ ہوا کرتا تھا جس کا مقصد یہ معلوم کرنا ہوتا تھا کہ ان کے جذبۂ خدمت میں کوئی کمی یا کمزوری تو نہیں آئی ہے چنانچہ ہسپتال میں نفسیات کا ایک مکمل شعبہ تھا۔

اس کے بعد ہم لوگوں کا گروپ کلکتہ سے بذریعہ طیارہ گوہاٹی روانہ ہوا وہاں سے

بذریعہ کار کوئی ۸۷ میل کے فاصلے پر واقع شیلانگ جانا تھا۔ نومبر کے مہینہ میں کلکتہ میں ٹھنڈ کا سوال ہی نہیں ہوتا تاہم شیلانگ میں سردی کے خیال سے گرم کپڑے لے لیے تھے۔ یہ میرا پہلا فضائی سفر تھا۔ ہوائی جہاز چھوٹا تھا مزید براں اس خطہ کی ناہموار اور ابر آلود فضائی کیفیات، ایسے میں دورانِ پرواز ہچکولے کھائے۔ طبعاً الڑھ اور بے خوف ہونے کی وجہ سے ان ہچکولوں سے کوئی پریشانی تو نہ تھی لیکن یہ حیرانی ضرور تھی کہ دونوں ہتھیلیاں پسینے سے بھیگی کیوں جاتی ہیں شاید یہ خوف کا طبعی اور اضطراری اظہار تھا جس پر میں قادر نہ تھا جوں توں یہ گھنٹہ بھر کی پُر کیف مشقت تمام ہوئی۔ پر کیف اس لیے کہ تاحد نظر ہمالیہ کی چوٹیاں صف بستہ نظر آ رہی تھیں اور ان پر دھنی ہوئی روئی کے انبار تھے۔ کہیں کہیں شام کی کرنوں کے زیر اثر منظر سنہرا بھی تھا۔

گوہاٹی میں موسمی کیفیت معتدل اور میدانی سی تھی وہاں سے ہم لوگ اپنی اپنی کاروں میں شیلانگ کے لیے روانہ ہوئے چکرانے والے پہاڑی راستوں پر بھی میرا یہ پہلا سفر تھا۔ گاڑی جوں توں بلندی پر چڑھتی گئی ٹھنڈک بڑھتی گئی اور میں اپنے جسم پر ایک ایک کر کے گرم کپڑے کا بوجھ بڑھاتا گیا۔ رات ۸ بجے جب شیلانگ کے پائن ووڈ ہوٹل میں جا کر ہماری گاڑی رکی تو عالم یہ تھا کہ میں کوٹ سوئیٹر وغیرہ سب پہنے اور مفلر سر پر لپیٹے بنڈل بنا کار کی سیٹ پر پڑا ہوا تھا۔ چکر اور متلی سے بدحواس تھا۔ کار سے باہر آتے ہی قئے ہوئی اس کے بعد طبیعت ہلکی ہوگئی۔ رسپشن پر جا کر میں نے اپنے کمرے کی چابی لی اور وہاں پہنچ کر آرام کرنے لگا۔ آتش دان کی وجہ سے کمرہ کافی آرام دہ ہوگیا تھا کوئی گھنٹہ بھر میں میری کیفیت نارمل ہوگئی۔ ہم لوگوں کو اگلے دن شیلانگ سے کوئی ۱۴ میل کے فاصلہ پر واقع اُمیام ہائیڈرو الکٹرک پروجکٹ دیکھنے کے لیے جانا تھا۔ رات کے کھانے سے فراغت کے بعد رات بھر آرام سے سویا۔ فضا بالکل ساکت تھی، ہر طرف مکمل سکوت تھا۔ کلکتہ کے ہنگاموں سے نکل کر آنے والوں کے لیے یہ ایک بڑا اور نمایاں فرق تھا۔

اگلے دن سویرے آنکھ کھلی تو سب سے پہلے یہ احساس ہوا کہ فضا میں ایک ہلکی سی

موسیقی حل ہے۔ کھڑکی کے پردے ہٹائے تو سامنے پہاڑوں پر شاہ بلوط کے بلند و بالا اشجار صف بہ صف جھومتے ہوئے نظر آئے۔ اس منظر کا بھرپور نظارہ کرنے کے لیے میں نے دروازہ کھولا تو موسیقی کا ایک ایسا جھنا کا سامعہ نواز ہوا جس کا مجھے کوئی تجربہ نہیں تھا، نہ اس موسیقی کا نہ اس منظرِ فردوس نظر کا۔ شاہ بلوط کے درخت ہوا کی موجوں کے ساتھ وجد میں تھے اور ان کی چکنی چکنی پتیوں کی سرسراہٹ ایک کیف آور موسیقی پیدا کر رہی تھی۔

صبح کی چائے کے بعد ہوٹل سے باہر نکل کر اس نئے مشاہدے سے روح کو تازہ کرنا چاہا۔ باہر کچھ دور پر دیکھا کہ ایک آبجو کے کنارے رنگ برنگے پھولوں کے حسین تختے تھے جب وہاں تک جانے کا قصد کیا تو معلوم ہوا کہ کوئی میدانی راستہ نہیں ہے کہ سیدھے پہنچ جائیں، ذرا دور جانے کے لیے بھی خاصے نشیب و فراز سے گزرنا پڑتا اور وقت بھی لگتا اس لیے خیال ہوا کہ ہوٹل میں واپس جا کر ناشتہ سے فراغت کرلوں تب آ کر اس منظر کو اپنی آنکھوں میں سمیٹوں لیکن ناشتہ کے بعد جب وہاں تک پہنچنے میں کامیاب ہوا تو وہ کہکشاں غائب ہو چکی تھی۔ ہوٹل میں ایک شخص سے ماجرا پوچھا تو اس نے بتایا کہ یہ پھول سورج کی کرنوں سے شرماتے ہیں اس لیے آفتاب بلند ہوتے ہی آنکھیں چرا لیتے ہیں شام کو پھر آنکھیں کھول کر دعوتِ نظارہ دیتے ہیں۔

دس بجے کے قریب ہم لوگوں کا کارواں اُمیام کے لیے روانہ ہوا۔ امیام ندی کوئی سات ہزار فٹ کی بلندی پر امیام جھیل سے نکل کر پہاڑی راہوں سے گزرتی ہوئی آسام کے میدانی علاقوں میں اترتی ہے اور دریائے برہمپتر سے مل جاتی ہے۔ امیام ندی کے پانی سے بجلی پیدا کرنے کے لیے ایک موزوں پہاڑی مقام پر جہاں یہ ندی نسبتاً تنگ راستوں سے گزرتی ہے اور دونوں کناروں کے پتھر سخت ہیں دریا کو سخت تر حصار میں لیا گیا۔ کنکریٹ کے مضبوط کنارے بنا کر دریا کی وسعت کو تنگ تر کرتے گئے۔ جس سے اس کے دھارے کی رفتار بھی تیز ہوتی گئی اور بالآخر اس کو ایک فولادی گرفت میں لے لیا گیا یعنی ایک میل لمبے فولادی پائپ سے اس کو گزارا گیا اس سے نکلنے پر دریا کا دھارا اتنا

پُر زور اور پرشور ہوتا ہے کہ اس کے سامنے کسی چیز کا ٹھہرنا محال ہے وہیں بجلی پیدا کرنے والے جنریٹر کی ایک بہت بڑی چرخی نصب کی گئی۔ پانی کا دھارا اس چرخی پر پڑتے ہی وہ لٹو کی طرح ناچنے لگتی ہے اور اس طرح بجلی کی پیداوار ہوتی ہے۔ پانی آگے نہر میں آزادی کے ساتھ رواں ہوکر مزید نشیب کی طرف بڑھتا ہے لیکن کچھ دور آگے جا کر اس پانی کے ساتھ پھر وہی سلوک کیا جاتا ہے اور ایک بار پھر اس سے بجلی پیدا کرنے کا کام لیا جاتا ہے گویا ایک ہی ندی کے ایک ہی پانی کو دو مختلف سطحوں پر بجلی کی پیداوار کے لیے استعمال کرنے کے بعد میدانی علاقے میں قدرتی طور پر بہنے دیا جاتا ہے۔ یہ اس وقت ہندوستان میں انجینئرنگ کا ایک غیر معمولی کارنامہ تھا۔

اس پروجکٹ کو دیکھنے کے بعد اخبار نویسوں کی ایک ٹولی نے چراپونجی جانے کا فیصلہ کیا جو نہ صرف ہندوستان میں بلکہ دنیا میں سب سے زیادہ بارش والا مقام سمجھا جاتا ہے اور شیلانگ سے زیادہ دور بھی نہیں۔ میں اپنی کار میں گھومتا گھامتا ہوٹل واپس آ گیا۔ بازار کی طرف سے گزرا تو دیکھا کہ ہر طرف مسلح پولیس گشت کر رہی ہے۔ اس وقت یہ بات بڑی غیر معمولی معلوم ہوئی کیونکہ اس سے پہلے نہ تو ایمرجنسی کے نفاذ کا منظر دیکھا گیا تھا نہ ملک میں عام دہشت گردی کی فضا پیدا ہوئی تھی جس نے اچھے اچھے شہروں کو ایک محصور شہر کا رنگ دے دیا اور شہری فضا میں ایسے شکوک وشبہات گھول دیے کہ ہر معصوم شہری دہشت گرد نظر آنے لگا۔

چنانچہ میں نے ڈرائیور سے ماجرا دریافت کیا۔ اس نے بتایا کہ اطراف کے ناگا قبائلیوں کو جب کسی چیز کی قلت ہوتی ہے تو وہ بازار پر چھاپے مارتے ہیں حال ہی میں شکر لوٹنے کے لیے ٹوٹ پڑے تھے اسی لیے حکومت ایک طرف تو ان کی ضروریات زندگی فراہم کرنے کی کوشش کرتی ہے دوسری طرف بازاروں کی حفاظت کا بندوبست بھی کرتی ہے۔ دراصل یہ ایک عام آدمی کے سمجھنے سمجھانے کی بات تھی۔ حقیقت یہ تھی کہ ناگاؤں کی ایک علیٰحدہ ریاست کے مطالبے نے مسلح شورش کی شکل اختیار کر لی تھی اور بالآخر ناگالینڈ بن کر رہا۔

شام کو ایک بار پھر شہر گردی کے لیے نکلا تو ایک مرکزی میدان کی طرف چلا گیا جہاں بہت سارے مقامی لوگوں کو کسی کھیل میں مصروف دیکھا اور صرف اتنا سمجھ سکا کہ وہ لوگ تیر اندازی کے مقابلے کر رہے تھے اور ہار جیت میں تیروں کا لین دین ہو رہا تھا بالکل اسی طرح جیسے ہمارے گاؤں اور شہروں میں لڑکے کنچے کھیلتے ہیں اور ہار جیت میں انہی گولیوں کا لین دین کرتے ہیں۔ ان کے چھوٹے چھوٹے تیروں کے سرے تو تر پھل اور نوکیلے تھے لیکن دم پر رنگ برنگے پر جڑے ہوئے تھے اور یہ پچھلا سرا دو حصوں میں نیم محرابی شکل میں مڑا ہوا تھا جیسے عام طور سے چڑیوں کی دم ہوتی ہے۔

شیلانگ میں دو روز قیام کے دوران قدرت کی فیاضیوں سے اپنے دل و دماغ کو سرشار کرنے کے بعد تیسری صبح کو ہم لوگوں کا کارواں واپس چل پڑا اور چکر دار پہاڑی راستے سے گزرتا ہوا گوہاٹی پہنچا اور وہاں سے بذریعہ ہوائی جہاز کلکتہ واپس آئے۔ میں سوچتا رہا کہ قدرت کی اتنی فیاضیوں، پہاڑوں کی اتنی کشادہ دامنی کے درمیان انتہائی دشوار گزار حالات میں پلنے بڑھنے والوں کو فطرتاً آزادی پسند ہونا چاہیے اور اپنی تہذیب و روایات کو محفوظ رکھنے کا قدرتاً خواہشمند ہونا چاہیے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ کیا مشرق اور کیا مغرب ہندوستان کے سارے شمالی پہاڑی علاقے مقامی لوگوں کی آزادی کی تحریکوں کے نرغے میں ہیں۔ شاید یہ لوگ اپنے طریقے سے جینا چاہتے ہیں اور اپنے معاملات میں میدانی علاقے کے لوگوں کی مداخلت کو پسند نہیں کرتے۔

بچپن میں اپنی طرف ہم نے دیکھا اور سنا تھا کہ مزدور طبقے کے بعض افراد کام کی تلاش میں دور دور تک چلے جاتے تھے۔ جو نام اس وقت کان میں پڑے تھے ان میں بنگال، آسام، برما، ملایا، رنگون، سنگاپور، سماترا اور جاوا تھے۔ ان کے علاوہ ایک نام ''کامروپ کمچھا'' بھی تھا اس طرف چائے کے باغات میں کام کرنے کے لیے ہم لوگوں کی طرف کے مزدور چلے جایا کرتے تھے۔ یہ لوگ ان دور دراز مقامات سے کئی کئی برس بعد واپس آتے لیکن کامروپ کمچھا جانے والے شاید و باید واپس آتے مشہور تھا کہ وہاں کی

عورتیں جادوگرنی ہوتی ہیں اور وہ اس طرف جانے والوں مردوں کو بھیڑا بنا دیتی ہیں اس لیے وہ وہیں رہ جاتے ہیں۔

شیلانگ میں معلوم ہوا کہ کھاسی پہاڑیاں اسی اطراف میں ہیں بہ الفاظ دیگر میں اس خطے کی فضا میں سانس لے رہا تھا تو بچپن کے وہ قصے کہانیاں بھی یادوں کے جھروکے سے جھانکنے لگیں پھر میں نے اطراف و جوانب کا بنظر غائر مشاہدہ کیا تو مجھے وہ کہانیاں حقیقت سے بہت قریب نظر آئیں۔

عورتیں بالعموم نہایت سڈول مضبوط جسم کی، رنگ سرخ و سفید، چہروں کو دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ قدرت نے غازہ کاری پر خاص توجہ صرف کی ہے، گھنے سیاہ بالوں کی موٹی موٹی چوٹیاں، مضبوط ساق و ساعد دعوتِ نظارہ دیتی ہوئی۔اس کے برعکس مرد بالعموم کمزور اور نحیف، مدقوق پیلے چہرے، پیٹ کی پوٹلی نکلی ہوئی، ہاتھ پاؤں پتلے پتلے۔عورتیں ہی لکڑیوں کے گٹھے اور دیگر سامان سروں سے پیچھے لٹکے ہوئے ٹوکروں میں بھرکر پہاڑی راستوں پر چڑھتی اترتی ہوئی۔

معلوم ہوا کہ اس علاقے کی آب وہوا عورتوں کے لیے سازگار ہے لیکن مردوں کے لیے کچھ زیادہ سازگار نہیں اس لیے مرد عام طور سے ہلکے پھلکے کام کرتے ہیں اور بھاری کام عورتیں کرتی ہیں۔ ظاہر ہے ایسے حالات میں جب ہم لوگوں کی طرف کا کڑیل مرد وہاں پہنچے گا اور وہاں کی عورتیں اسے زیادہ سے زیادہ آسائش دینے کی کوشش کریں گی تو مرد کو پھر اور کیا چاہیے، بس وہ وہیں کے ہوکر رہ جاتے ہوں گے۔ یہ جادو نہیں تو کیا ہے؟

ہم لوگ کلکتہ واپس آئے اور اگلے دن صبح کو یہ کارواں بذریعہ کار دھنباد کے لیے روانہ ہوا جہاں مرکزی وزیر مرار جی بھائی ڈیسائی ایک فولاد کارخانے کا افتتاح کرنے والے تھے۔ شام کو اس تقریب میں شرکت کی۔ اگلے دن ہم لوگوں نے دامودر وادی کارپوریشن کے بند اور کئی کارخانے دیکھے جن میں خام کوئلہ سے کوک بنانے اور کوئلہ کو گیس میں تبدیل کرنے والے کارخانے شامل تھے جن کے لیے امریکہ نے امداد دی تھی۔ دو دن اور ایک

رات دھنباد میں قیام کے بعد یہ قافلہ بذریعہ ٹرین بنارس روانہ ہوا جہاں منڈواڈیہہ ڈیزل لوکوموٹیو فیکٹری میں تیار ہونے والا پہلا انجن باہر آنے کو تھا۔ یہ کارخانہ بنارس شہر سے کوئی سات آٹھ میل کے فاصلے پر منڈواڈیہہ کے مقام پر واقع ہے۔ اس کے بعد ہم لوگوں کو ریہانڈ ڈیم کے لیے مرزا پور جانا تھا پھر کلکتہ واپسی۔

صدر کینڈی کا قتل

۲۲؍نومبر ۱۹۶۳ء کی صبح کو ہم لوگ ہوٹل میں ناشتے سے فارغ ہوکر منڈواڈیہہ جانے کے لیے تیار بیٹھے تھے کہ اتنے میں مسٹر گنگولی جو اس ٹور پروگرام کے مہتمم تھے بدحواس بھاگے ہوئے باہر سے آئے اور صدر کینڈی کے قتل کی خبر سنائی۔ ایک لمحہ کے لیے سب سکتے میں آ گئے۔ یو ایس آئی ایس کے انفارمیشن آفیسر مسٹر پی ایف گولڈ موجود تھے۔ وہ کچھ دیر خاموش بیٹھے سوچتے رہے اور اسی اثناء میں انھوں نے آئندہ ساری کارروائی کا فیصلہ کرلیا۔

انھوں نے سر اٹھایا اور اخبار نویسوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ حضرات! ابھی ابھی ہمیں صدر کینڈی کے قتل کی خبر ملی ہے اس سے زیادہ فی الحال ہم کچھ نہیں کہہ سکتے لیکن دنیا کا کوئی کام نہیں رکتا۔ ایک منٹ کی دعائیہ خاموشی کے بعد انھوں نے مسٹر گنگولی کو ساری ضروری ہدایات دے دیں۔ ہم لوگ پروگرام کے مطابق ڈیزل لوکوموٹیو فیکٹری دیکھنے جائیں گے۔ مرزا پور کا پروگرام کینسل کیجیے۔ جو بوگی کلکتہ جانے والی دہرہ دون ایکسپریس میں کل لگنے والی ہے اس کو آج ہی کی ٹرین میں لگوانے کا انتظام کیجیے، بصورت دیگر سب لوگ ایک دن بنارس میں قیام کریں گے۔ میں بہرصورت آج ہی کلکتہ واپس جاؤں گا۔ گنگولی صاحب نے سارے احکام کی تعمیل کی، بنارس میں ریلوے افسروں سے ملے، لکھنؤ تار دلوایا۔ غرض یہ کہ ہم لوگ اسی شام بذریعہ ٹرین کلکتہ کے لیے روانہ ہوگئے۔ اگلی صبح کو کلکتہ پہنچے۔

اس سفر کے دوران پہلی بار مجھے امریکیوں کو قریب سے بے تکلفی کے ساتھ اپنے اپنے کام میں لگے ہوئے دیکھنے کا موقع ملا۔ دھنباد میں زیر تعمیر کول واشری میں دیکھا کہ

امریکی انجینئر مقامی مزدوروں کے دوش بدوش بلا تکلف کام کر رہے تھے اور سیاہ پسینے میں لت پت۔ لنچ کے لیے وقت معین پر روانہ ہوئے اور ایک گھنٹہ خوب بے فکری کے ساتھ کھایا پیا اور ٹھیک وقت پر واپس آ گئے۔ صدر کینڈی کے قتل کی خبر کے بعد انھیں کام دھندا بند کر کے بیٹھتے نہیں دیکھا بلکہ اور بھی سرگرم عمل پایا۔ میں سمجھتا ہوں کسی قوم کو آگے لے جانے میں، طاقتور بنانے میں اور آسمان کی بلندیوں تک پہنچانے میں افراد کے اس کردار کو خاص دخل ہوتا ہے۔

اس کے بعد میں یو ایس آئی ایس کے زیر اہتمام پریس ٹور میں جانے لگا جو کسی موقع کی مناسبت سے مختصر ہوا کرتے تھے۔ اردو اخبار نویس کی حیثیت سے مجھے شریک کر لینے میں ان لوگوں کو آسانیاں تھیں۔ ایک تو یہی کہ میں ان کے انتظامی امور میں معاونت بھی کر سکتا تھا دوسرے یہ کہ میں اردو اخباروں کے لیے عمومی رپورٹ بنا کر بھیج دیتا پھر یہ کہ اخبار نویسوں کی جو ناز برداریاں کرنے پڑتی تھیں اس میں ایک آدمی کا بار کم ہو جاتا۔ ایک بات یہ بھی کچھ کم اہم نہ تھی کہ اردو اخبار نویسوں نے امریکی اداروں سے کوئی خاص ربط ضبط نہیں رکھا تھا۔ کبھی کبھار کسی موقع پر صرف روزانہ ہند کے ایڈیٹر رئیس الدین فریدی صاحب آ جاتے۔ ۱۹۶۰ء کے قریب ایک پریس آفیسر مسٹر براؤن تھے۔ ان سے فریدی صاحب کی اچھی ملاقات ہوگئی تھی۔ سادہ سوتی کپڑے اور سینڈل پہن کر آفس آتے۔ ان کی بیوی بھی اسی مزاج کی تھیں۔ غالباً اسی مزاجی کیفیت کی وجہ سے ان کی طبیعت سرکاری نوکری سے میل نہیں کھاتی تھی چنانچہ ہندوستان سے واپس جانے کے کچھ ہی عرصہ بعد انھوں نے استعفیٰ دے دیا اور آبائی کاروبار میں لگے لیکن جلد ہی اس سے بھی اوب گئے پھر ان کو ''نیویارک ٹائمز'' کے شعبہ ادارت میں کوئی جگہ مل گئی۔ کچھ عرصہ بعد اپنی اسی حیثیت میں وہ دو ایک روز کے لیے کلکتہ آئے یا اس طرف سے گزرتے ہوئے ٹھہر گئے تھے تو فریدی صاحب کو تلاش کرتے ہوئے ان سے ملاقات کے لیے چونا گلی گئے۔

پریس ٹور میں جانے کا ایک ضمنی فائدہ مجھے یہ ہوا کہ انگریزی اور بنگلہ اخبار

نویسوں سے راہ و رسم بڑھ گئی جن سے جرنلسٹس ایوسی ایشن میں صرف دید شنید تھی نتیجہ کے طور پر ''امرت بازار پتریکا'' اور ''ہندوستان اسٹینڈرڈ'' میں کبھی کبھی میری چھوٹی موٹی تحریریں چھپ جایا کرتیں جن سے کوئی خاص مالی منفعت تو نہ تھی لیکن حوصلہ افزائی ضرور ہوتی۔ یوایس آئی ایس میں رفتہ رفتہ میرا کام بڑھتا گیا اور پیسے بھی بڑھتے گئے۔

اخباروں میں ہڑتال

۴۷ء کی بات ہے ایک دن میں کھانا کھا کر لیٹا تھا کہ سہ پہر میں پانچ چھ کاتب وارد ہوئے جن کی قیادت عبدالغفار صاحب کر رہے تھے۔ ان لوگوں نے کہا کہ ہمارے مطالبات کے بارے میں مالکوں کا رویہ سخت ہے اور وہ تنخواہوں میں کسی اضافہ کے لیے تیار نہیں ہیں۔ (یہی واحد مطالبہ تھا اس کے سوا کچھ نہیں) چنانچہ اب ہم لوگ ہڑتال کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے اس خیال سے اختلاف کیا اور کہا کہ اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا اس سے کچھ لوگوں کو نقصان کا اندیشہ ہے۔ لیکن شاید وہ لوگ طے کر کے آئے تھے۔ میں اس سال انڈین جرنلسٹس ایسوسی ایشن، ویسٹ بنگال کی اکزیکیوٹیو کمیٹی میں شامل تھا چنانچہ یہ لوگ میری وساطت سے ایسوسی ایشن کی پشت پناہی بھی حاصل کرنا چاہتے تھے۔ میرے اختلاف رائے کے بعد یہ لوگ چلے گئے اور مکمل خاموشی اختیار کر لی۔ میں نے بھی سمجھا کہ وہ وقتی تحریک رہی ہوگی دب گئی۔ اسی طرح کچھ دن گزر گئے۔

ایک روز شام کو چار بجے میں حسبِ معمول کام پر 'آزاد ہند' پہنچا اور اپنے کمرے میں چلا گیا تو منیر نیازی موجود تھے لیکن کچھ غیر معمولی سناٹا معلوم ہوا جو کاتب اس وقت موجود ہوا کرتے تھے وہ نہیں تھے اور ہیڈ کاتب منشی نجم الدین صاحب، دفتر کے مجاور، سراپا سوالیہ نشان بنے ہوئے بیٹھے تھے اور اپنی موٹے شیشے والی عینک سے ہم لوگوں کو گھورے چلے جا رہے تھے۔ میں نے منیر نیازی سے دریافت کیا کہ آج یہ کیا معاملہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ سعید صاحب کہتے ہیں کہ کاتبوں نے ہڑتال کر دی ہے وہ بھی کلکتہ کے سارے اردو اخباروں میں۔ اس کے بعد میں سعید صاحب کے کمرے میں گیا جو غیر معمولی طور پر بے

وقت موجود تھے۔ انھوں نے ہڑتال کی خبر کی تصدیق کی۔

لیکن بعد کے واقعات سے پتہ چلا کہ سعید صاحب مجھ کو ہی اس تحریک کا لیڈر سمجھ رہے تھے یا ان کو بدظن کرنے کے لیے 'عصرِ جدید' والوں نے ان کے ذہن میں یہ گمان راسخ کر دیا تھا۔ میں نے ان سے ہڑتال کے بارے میں جو دریافت کیا اس کو انھوں نے میری چالاکی یا منافقت پر محمول کیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ سعید صاحب ایسے ہوشیار اور مردم شناس آدمی کی یہ بہت بڑی بھول تھی۔ بہرحال میری پوزیشن ہڑتالیوں سے بھی زیادہ خراب ہوگئی کیونکہ ان لوگوں نے یہ سمجھا کہ میں سعید صاحب سے دوستی کی بنا پر مالکوں کا طرفدار ہوں اسی وجہ سے ہڑتال کی مخالفت کر رہا تھا۔ ادھر مالکوں کی اجتماعی ذہانت نے مجھے ایسوسی ایشن کا نمائندہ سمجھتے ہوئے ہڑتالیوں کا لیڈر تصور کیا۔ لیکن ہڑتال کی تمام مدت کے دوران میں اپنے معمول پر قائم رہا یعنی وقت پر ''آزاد ہند'' جاتا، منیر نیازی یا جو کوئی بھی موجود ہوتا اس کے ساتھ کچھ دیر بیٹھتا۔ سعید صاحب بھی اس وقت عموماً اپنے کمرے میں موجود ہوتے کبھی ان سے سلام کلام بھی ہو جاتا لیکن اس سے زیادہ نہیں۔ یہ ہڑتال ۳۵ دن جاری رہی، اس اثناء میں کلکتہ سے اردو کا کوئی اخبار نہیں نکلا۔

میرا موقف یہ تھا کہ ارد واخبارات میں ویج بورڈ کی سفارشات کے مطابق اجرت دینے کی صلاحیت نہیں ہے اس لیے ان سے اس بنیاد پر گفتگو کی جائے کہ وہ خود اجرتوں میں کتنے فیصد اضافہ کر سکتے ہیں اسی کو تسلیم کر لیا جائے لیکن مالکان اس معاملے میں ٹس سے مس ہونے کو تیار نہ تھے۔ میں نے ایسوسی ایشن کے ذمہ داروں سے کہا کہ شام کے اخبارات تو بالکل کمزور ہیں اس لیے وہاں کے ورکروں کو کام پر جانے دیا جائے۔ چنانچہ ان امور پر غور کرنے کے لیے اگزیکیوٹیو کمیٹی کی ایک میٹنگ ہوئی جس میں نمائندہ کاتبوں کو بھی خاص طور سے مدعو کیا گیا۔ میرے مشورہ پر ایسوسی ایشن کے سکریٹری راضی ہوگئے کہ شام کے اخباروں میں کام کرنے والے کام پر واپس جائیں۔ چنانچہ انھوں نے اسی وقت ''آبشار'' کے دفتر میں ٹیلیفون کیا کہ آپ کے ورکر کل سے کام پر واپس جائیں

گے لیکن وہاں سے منیجر صاحب نے شدت کے ساتھ جواب دیا کہ پہلے یہ لوگ تحریری معافی نامہ پیش کریں تب ہم کام پر واپسی کے لیے ان کی درخواست پر غور کریں گے۔ سکریٹری نے ٹیلیفون رکھ دیا اور مجھ سے کہا کہ تم صلح مصالحت کی بات کرتے ہو اور اُدھر ان لوگوں کا یہ رویہ ہے۔ میں نے کہا کہ پھر آپ لوگ جو چاہیں کریں۔ میں اٹھ کر چلا آیا۔ ایسوسی ایشن میں وہ میرا آخری دن تھا پھر کبھی اس طرف نہیں گیا۔

لیکن غالباً احمد سعید صاحب تک یہ بات پہنچا دی گئی کہ ایسوسی ایشن کی میٹنگ میں رضوان اللہ شریک تھے گویا سازش کے محرک ہونے اور ہڑتال کی قیادت کرنے کے الزامات کا یہ پکا ثبوت تھا جس پر سعید صاحب نے یقین کرلیا اور پھر میرے اس بیان کا یقین نہیں کر سکے کہ خود سعید صاحب کی زبانی مجھے کاتبوں کی ہڑتال کی اطلاع ملی تھی اور اس سے پہلے مجھے اس کا کوئی علم نہ تھا۔

ہڑتال کو تو کسی نہ کسی دن ختم ہونا ہی تھا۔ ۳۵ دن پر ختم ہوئی۔ اس دوران میں افسوسناک واقعات بھی ہوئے۔ ہڑتال کے آخری دن شام کو احمد سعید صاحب نے 'آزاد ہند' کے دفتر میں اعلان کیا کہ کل سے فلاں فلاں کام پر آئیں گے جن میں منیر نیازی اور شمس الزماں بھی شامل تھے لیکن مجھ سے کہا کہ آپ کل صبح گھر پر مجھ سے ملئے۔ میں نے ۹ بجے حاضر ہونے کا وعدہ کرلیا۔

اگلے دن صبح کو چاندنی میں ان کی قیام گاہ پر حاضر ہوا۔ سعید صاحب نے پھل، بسکٹ، چائے وغیرہ کا اہتمام کیا تھا تاکہ گفتگو خوشگوار فضا میں ہو۔ انھوں نے فرمایا کہ میری اطلاع کے مطابق آپ نے اس ہڑتال کو منظّم کیا اور اس کی قیادت کی۔ میں نے عرض کیا کہ جناب میرے آپ کے درمیان صاف صاف گفتگو میں وہ تھوڑے سے پیسے سدِ راہ ہو سکتے ہیں جو مجھے 'آزاد ہند' سے ملتے ہیں اس لیے میں سب سے پہلے اس دیوار کو راستے سے ہٹا دیتا ہوں تاکہ کوئی لاگ نہ رہ جائے اور آپ میری باتوں کی صداقت کا یقین کرسکیں۔ سعید صاحب اس جواب کے لیے تیار نہیں معلوم ہوتے تھے کیونکہ سرمایہ کا مزاج

کبھی یہ فرض ہی نہیں کرسکتا کہ کوئی ورکر پیسے سے منہ پھیرے گا۔ سرمایہ کی نظر میں کسی ورکر میں انا نام کی کوئی چیز ہو ہی نہیں سکتی جو سرمایہ سے زیادہ وزن دار اور پُرکشش ہو۔

سعید صاحب کے چہرے پر ایک رنگ آیا اور ایک رنگ گیا اور پھر انھوں نے معذرت کے انداز میں کہا کہ بھائی میرا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا میں تو صرف آپ سے وضاحت چاہتا تھا۔ میں نے عرض کیا کہ جناب آپ کا مطلب ہو یا نہ ہو لیکن میرا قطعی مطلب یہی ہے کہ میرے اور آپ کے درمیان کوئی مالی مصلحت نہ حائل ہو اور اب میں کہتا ہوں کہ اس ہڑتال کا مجھے سب سے پہلے آپ ہی کی معرفت علم ہوا۔ اس سے پہلے مجھے اس کا کوئی علم نہ تھا۔ سعید صاحب نے فرمایا کہ اگر میں تحریری ثبوت اور گواہ پیش کروں تو۔ میں نے عرض کیا کہ آپ ایسا کوئی ثبوت نہیں پیش کرسکتے جس سے ہڑتال میں میرا ملوث ہونا ثابت ہو اور اگر آپ کا بیان درست ثابت ہوا تو آپ جو جرمانہ تجویز کریں مجھے منظور ہوگا۔ انھوں نے کہا کہ کل اسی وقت آیئے۔ میں نے حامی بھرلی اور چلا آیا۔

اگلے دن ۹ بجے صبح کو پھر میں وہاں پہنچا تو سعید صاحب نے پچھلی کسی تاریخ کا ''آزاد ہند'' پیش کیا جس میں ایسوسی ایشن کے نئے عہدیداروں کے انتخاب کی خبر تھی اور اکزیکیوٹیو کے نئے ممبروں میں میرا نام بھی شامل تھا۔ میں نے کہا کہ میں ایسوسی ایشن یا ایکزیکیوٹیو کمیٹی کی رکنیت سے تو انکار نہیں کرتا اور یہ کوئی جرم نہیں ہے اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ میں نے اس ہڑتال کی بھی تحریک اور قیادت کی۔

اتنے میں کسی کی آمد کی اطلاع ملی۔ احمد سعید صاحب نے اوپر بلالیا۔ وہ منیر نیازی تھے۔ میں سمجھ گیا کہ ان کے متوقع گواہ وہی تھے۔ لیکن ان کے آتے ہی سعید صاحب نے گفتگو کا رخ بدل دیا اور کہا کہ بھائی سب بھول جایئے جو ہوا سو ہوا جایئے کام کیجیے۔ چند رسمی باتوں کے بعد میں اٹھ کر چلا گیا۔ میں تو یہ سمجھتا ہی تھا کہ منیر نیازی کے پاس میرا کوئی راز نہ تھا۔ ان کی آمد کا مطلب میں نے یہ نکالا کہ سعید صاحب نے کام کی کسی بات کے لیے ان کو بلایا ہوگا۔ لیکن منیر نیازی کو سخت خفت کا احساس تھا وہ نہیں سمجھے تھے کہ وہاں

مجھ سے مڈبھیڑ ہوگی۔

میں سعید صاحب کے گھر سے یو ایس آئی ایس گیا اور کام میں مصروف ہو گیا۔ کچھ دیر بعد منیر نیازی وہیں پہنچے لیکن مجھ سے نظریں چار کرنا ان کے لیے مشکل ہو رہا تھا وہ صرف اپنی صفائی دینا چاہتے تھے۔ میں ان کو کسی ندامت کے عالم میں نہیں دیکھنا چاہتا تھا، میں نے دوستوں کی ندامت کو کبھی پسند نہیں کیا اور خود کو نا سمجھ ظاہر کرنے کو ترجیح دی گویا جس بات پر کسی کو نادم ہونا چاہیے تھا اسے میں سمجھا ہی نہیں۔ ایسے کئی مواقع آئے۔

بہرحال! منیر نیازی نے اپنی صفائی میں جو کچھ کہا وہ مختصراً یہ ہے:

''سعید صاحب نے مجھے بلایا اور کہا کہ رضوان صاحب نے آپ کو بہکا کر ایسوسی ایشن کا ممبر بنا دیا۔ میں نے کہا کہ ہم لوگ بچے نہیں ہیں کہ کسی کے بہکاوے میں آ جائیں۔ وہ ایسوسی ایشن کی ممبری کے لیے فارم لائے تھے، میں ممبر بننا چاہتا بھی تھا لیکن ممبر نہیں بنا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس فارم میں ایک خانہ تنخواہ کا بھی تھا وہ اتنی کم تھی کہ لکھتے ہوئے مجھے شرم آئی اس لیے میں نے فارم کی خانہ پری نہیں کی اور ممبر نہیں بنا۔ اس کے بعد سعید صاحب خاموش ہو گئے۔''

میں نے دو لفافے تیار رکھے تھے جن میں سے ایک احمد سعید صاحب کے نام تھا وہ میں نے منیر نیازی کو دیا کہ لے جا کر سعید صاحب کو دے دیں۔ اس میں ایک خط تھا جس کی عبارت بہت مختصر تھی ''محترم احمد سعید صاحب! میں ذوق ہم سفری میں اتنی دور تک پرواز کر گیا کہ تاب و تواں جواب دے گئی۔ اب معذرت خواہ ہوں۔ آپ کا مخلص رضوان اللہ۔'' منیر نیازی نے اس کو پڑھا اور ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں ان کی پیشانی پر پسینہ آ گیا جو ان کے خلوص کا گواہ تھا۔ وہ کچھ دیر تک سر پکڑ کر خاموش بیٹھے رہے۔ پھر کہا کہ یہ کام مجھ سے نہیں ہو سکتا۔ اس کے بعد وہ دیر تک بیٹھے رہے اور میرے ساتھ ہی باہر نکلے۔ وہ لفافہ انہی کے پاس رہا لیکن وہ اصرار کرتے رہے کہ شام کو کام پر ضرور آیئے۔ اب تو سعید صاحب نے خود ہی کہہ دیا ہے۔ میں یہ لفافہ ان کو نہیں دوں گا۔

میں شام کو چار بجے 'آزاد ہند' پہنچنے کے لیے کچھ پہلے ہی گھر سے نکلا کرتا تھا۔ اس دن میرا ایسا کوئی ارادہ نہ تھا لیکن ساڑھے تین بجے کے قریب منیر نیازی اور سمیع اللہ میرے گھر پہنچ گئے اور اصرار کرنے لگے کہ آپ کو دفتر چلنا ہی ہوگا۔ انھوں نے اس قدر مخلصانہ اصرار کیا کہ میری قوتِ مزاحمت جواب دے گئی اور میں ان دونوں اصحاب کے ساتھ 'آزاد ہند' چلا گیا اور اس طرح کام میں لگ گیا گویا کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ لیکن دلوں میں یقیناً بال آ گیا تھا۔ اس ہڑتال میں جن دو تین کاتبوں نے قیادت کی تھی ان کو کام پر نہیں آنے دیا گیا اور پھر ایک لامتناہی اور لا حاصل دفتری اور قانونی کارروائی ان لوگوں کے خلاف شروع ہوئی۔

۱۹۷۴ء کی گرمیوں میں میری دوسری بیٹی عائشہ کی شادی ہوئی۔ یہ تقریب ہمارے وطن کوئریاپار میں انجام پائی۔ میری پہلی بیٹی قمر جبیں کی شادی کی تقریب بھی ۱۹۷۰ء میں وہیں انجام پائی تھی۔ یہ تقریبات بزرگوں اور عزیزوں سے ملاقات کا نادر و نایاب موقع تھیں۔

میری صحت کی کیفیت کچھ اطمینان بخش نہیں تھی بس یونہی کام چلاؤ تھی کہ 'آزاد ہند' اور یو ایس آئی ایس دونوں جگہ کے کام نپٹاتا رہا۔ انہی کیفیات سے گزرتے ہوئے ۱۹۷۵ء میں داخل ہوئے جو کہ قومی زندگی میں اور میری ذاتی زندگی میں بھی بڑا تہلکہ خیز اور انقلاب انگیز سال ثابت ہوا۔

مسز اندرا گاندھی کی انتخابی اٹھا پٹک، عدالتی چارہ جوئی اور بالآخر ملک میں ایمرجنسی کا نفاذ ایسے تاریخی واقعات ہیں جن سے سب واقف ہیں اور ان کی تفصیل میں جانا مقصود بھی نہیں لیکن ہم لوگ اس سے کس طرح متاثر ہوئے یہ بتانا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

ملک میں ایمرجنسی

۱۲/جون ۱۹۷۵ء کو میں نے اپنی ڈائری میں یہ عبارت لکھی ''آج کا دن اندرا گاندھی کی زندگی میں اور حکمراں کانگریس پارٹی کی تاریخ میں ایک موڑ معلوم ہوتا ہے۔ مسٹر

راج نرائن کے مقابلہ میں مسز اندرا گاندھی قانونی جنگ ہار گئیں۔ الٰہ آباد ہائی کورٹ نے انتخابی مقدمہ میں ان کے خلاف فیصلہ صادر کر دیا۔''

احمد سعید صاحب نے اس روز 'آزاد ہند' کے لیے ایک معرکۃ الآراء ایڈیٹوریل لکھا جس کا عنوان تھا ''اندرا گاندھی کا واٹر گیٹ'' اس کو لکھنے کے بعد میرے پاس بھیجا کہ اسے دیکھ لوں۔ میں نے اسے پڑھنے کے بعد کہا کہ سعید صاحب ابھی مسز گاندھی وزیر اعظم ہیں اور کچھ بھی کر سکتی ہیں، اس لیے یہ اداریہ مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ سعید صاحب معاملے کی نزاکت کو تاڑ گئے اور اس اداریہ کو روک لیا اور مجھ سے کہا کہ آپ ہی لکھئے۔ پھر میں نے اس روز اداریہ لکھا۔ آنے والے واقعات نے ثابت کر دیا کہ اگر سعید صاحب والا اداریہ 'آزاد ہند' میں چھپ گیا ہوتا تو شاید اخبار کو بے قیاس نقصان پہنچ جاتا۔ اس کے بعد ہی نافذ ہونے والی ایمرجنسی اور پریس سنسرشپ کے دوران سیاسی لیڈروں، اخباروں، ایڈیٹروں وغیرہ پر جو کچھ گزری اس کی روداد بیان کرنے کے لیے جلدیں درکار ہوں گی۔ ۲۳/جون کو مسز گاندھی نے الٰہ آباد ہائی کورٹ کے فیصلے کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل داخل کر کے اس فیصلے کا نفاذ روک دیا۔ اس کے بعد ۲۶/جون کو ملک میں ایمرجنسی کے نفاذ کا اعلان کر دیا گیا۔ اخباروں پر سنسرشپ کی پابندیاں اتنی سخت تھیں کہ شاید برطانوی دورِ حکومت میں بھی کبھی نہ رہی ہوں حتیٰ کہ عالمی جنگ کے زمانے میں بھی نہیں رہی ہوں گی۔ اخباروں میں چھپنے والا ایک ایک لفظ سنسر کی پیشگی کلیئرنس کے لیے بھیجنا پڑتا تھا، سنیما کے اشتہار تک اس لازمہ سے مستثنیٰ نہیں تھے۔

اسی اثناء میں برصغیر کا دوسرا تہلکہ خیز واقعہ بنگلہ دیش میں نئے انقلاب کا رونما ہونا ہوا۔ وہاں ۱۵/اگست کو شیخ مجیب الرحمٰن کو معہ دیگر افراد خاندان کے قتل کر دیا گیا۔ یہ واقعہ ہندوستان اور بنگلہ دیش کے تعلقات میں ایک نئے موڑ کا پیش خیمہ تھا۔ سابق مشرقی پاکستان یا بنگلہ دیش کے ہر واقعے کا کلکتہ میں فوراً اثر محسوس کیا جاتا تھا کیونکہ وہاں کے ہندوؤں میں معمولی سی تحریک یا ہلچل کو بھی کلکتہ کے بنگلہ اخبارات پہاڑ بنا کر پیش کرنے کی

روایت رکھتے تھے اس طرح بنگال کی پوری فضا متاثر ہوجاتی۔ یہ بنگال کی دانشوری پر ایک داغ ہے۔ ہمارے برصغیر میں ایک عجب ستم ظریفی اور بدقسمتی ہے کہ یہاں کے دانشور زیادہ فرقہ پرستانہ ذہنیت رکھتے ہیں خواہ وہ کسی مذہب یا علاقے سے تعلق رکھتے ہوں۔ گاؤں کے لوگوں میں مذہب ملت کے فرق کے باوجود بڑی یگانگت ہوتی ہے۔ ان کے تعلقات میں بھی زہر گھولتے ہیں شہروں سے آنے والے اخبارات جو نام نہاد دانشوروں کی ذہنی اُپج سے بھرے ہوتے ہیں اس لیے تعلیم کے پھیلاؤ کے ساتھ ہی روایتی رواداری اور آپسی تعلقات کی نابودگی کے لیے بھی تیار رہنا چاہیے۔

اسی اثناء میں واقعات کا ایک ایسا سلسلہ بھی چل پڑا تھا جس کا نشانہ میں تھا۔ غالباً اپریل ۱۹۷۴ء میں مغربی بنگال سے راجیہ سبھا کے ممبر مسٹر بھوپیش گپتا نے جو کمیونسٹ لیڈر تھے، ایوان میں ایک بیان دیا جس کا لب ولباب یہ تھا کہ یو ایس آئی ایس کلکتہ میں ایک شخص ایسا ہے جو مغربی بنگال میں فرقہ پرستی پھیلا رہا ہے۔ وہ ایک ایسے اردو اخبار میں کام کر چکا ہے جس کا مالک اسلامی کتابوں کے ایک اشاعت گھر کا بھی مالک ہے۔ یہ اشارے ''عصرِ جدید'' اور دارالاشاعت اسلامیہ کی طرف تھے۔ یہ دونوں ادارے خان بہادر شیخ محمد جان صاحب کی ملکیت میں تھے۔ مسٹر بھوپیش گپتا نے یہ بھی فرمایا کہ اسی اشاعت گھر کے چھپے ہوئے قرآن کے اوراق ردی میں بیچے گئے تھے جس کے نتیجہ میں ہوگلی میں فساد ہوتے ہوتے رہ گیا۔ شخص مذکورہ کے بارے میں، جس کا صاف اشارہ میری طرف تھا، انھوں نے فرمایا کہ اس شخص نے کئی جلسوں میں تقریریں بھی کیں جن کا مقصد فرقہ پرستی پھیلانا تھا۔ ان کے اس بیان کو پارٹی کے ہم نوا اخباروں نے خوب اچھالا اور سچائی معلوم کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ پارٹی نے اتنے ہی پر بس نہیں کیا بلکہ ہینڈ بل چھپوائے جنھیں اخباروں میں شائع کرانے کی غرض سے ان کے ورکر اردو اخباروں کے دفتروں میں جھانکنے لگے۔ لیکن اس مہم میں انھیں منہ کی کھانی پڑی۔ روزنامہ ''آبشار'' کمیونسٹ پارٹی کی ملکیت میں نہ ہونے کے باوجود نظریاتی طور پر پارٹی سے اس قدر ہم

آہنگ تھا کہ پارٹی ہی کا اخبار سمجھا جاتا تھا۔ اردو حلقے میں متعارف ایک پارٹی ورکر، جو اب اس دنیا میں نہیں رہے، ''آبشار'' کے دفتر میں گئے اور ایڈیٹر ابراہیم ہوش کو وہ ہینڈ بل دے کر اشاعت کی درخواست کی۔ ہوش صاحب نے ان کو ڈانٹ پلائی اور کہا کہ ہم کیا رضوان کو نہیں جانتے۔ ان صاحب کو دفتر سے باہر نکال دیا۔ رئیس الدین فریدی، ایڈیٹر ''روزانہ ہند'' نے مسٹر بھوپیش گپتا کے بیان کو اخبار کے ادارتی صفحہ پر چھاپا اور ساتھ ہی بہت سخت ایڈیٹوریل لکھا جس میں ان کو لتاڑا کہ ایک ذمہ دار لیڈر کو اس قدر غیر ذمہ دارانہ بیان دینے سے پہلے حقیقت حال معلوم کر لینا چاہیے تھا اور یہ کہ انھوں نے جن واقعات کا حوالہ دیا ہے وہ سب غلط ہیں۔ ہم لوگوں کو یہیں رہتے ہوئے ان واقعات کا کوئی علم نہیں۔ اس طرح انھوں نے ایوان کو گمراہ کیا ہے۔ مذکورہ پارٹی ورکر اخباری تراشے اور کچھ ہینڈ بل وغیرہ ایک فائل میں لیے ہوئے ''آزاد ہند'' میں پہنچے۔ اس وقت احمد سعید صاحب موجود نہیں تھے چنانچہ وہ ہم لوگوں کے کمرہ میں آ گئے۔ وہاں ایک بڑی میز کے ایک طرف میں بیٹھا ہوا تھا اور سامنے منیر نیازی اور شمس الزماں۔ وہ حضرت آ کر ان دونوں کے درمیان خالی کرسی پر بیٹھ گئے اور اپنی فائل کھولتے ہوئے کچھ گویا ہوئے ہی تھے کہ منیر نیازی پوچھ بیٹھے کہ یو ایس آئی ایس میں کام کرنے والے جس شخص کا ذکر کیا گیا ہے کیا آپ اس سے واقف ہیں۔ ان صاحب کا جواب نفی میں تھا۔ منیر نیازی نے کہا کہ وہ یہی تو ہیں رضوان صاحب۔ بس انھوں نے آہستہ سے فائل سمیٹی لیکن شمس الزماں نے ان کی اچھی طرح خبر لی اور کہا کہ اب پارٹی ورکروں کے پاس کوئی کام نہیں رہ گیا ہے سوائے جھوٹی سچی افواہیں گھڑنے کے۔ وہ بیچارے اٹھے اور خاموشی سے نکل گئے۔

ایک طرف یہ سب ہو رہا تھا، دوسری طرف میں نے یہ کیا کہ اس سلسلے کی کوئی خبر یا کوئی چیز انگریزی یا اردو میں چھپی ہوئی جو میری نظر سے گزرتی میں اس کو تراش کر ایک فائل میں رکھتا گیا۔ ہینڈ بلوں میں جن جلسوں کا ذکر کیا گیا تھا جو ان کے بیان کے مطابق فرقہ پرستی پھیلانے کی غرض سے کیے گئے تھے ان کی خبریں یا اعلانات پچھلے اخباروں میں

تلاش کر کے ان کے تراشے بھی رکھے اور ان جلسوں کے داعیان اور مقرروں کے نام نوٹ کر لیے۔ ان میں سے دو اصحاب کے نام ہر جلسہ کی رپورٹ میں پائے گئے۔ ایک صاحب مٹیا برج کے علاقے کے تھے اور دوسرے پارک سرکس کے جو خیر سے کبھی کلکتہ کارپوریشن کے کونسلر بھی رہ چکے تھے اور اب کوئی خاص ذریعہ معاش نہ تھا۔

ماہ جولائی میں مجھ پر عتاب نازل ہوا۔ یو ایس آئی ایس دہلی نے کلکتہ آفس سے وضاحت طلب کی کہ وہ کون شخص ہے جو دفتر کی بدنامی کا باعث ہے۔ ہمارے دفتر کے لوگ ان خبروں سے تو باخبر تھے ہی میری ذات سے بھی اچھی طرح آگاہ تھے اور میری پشت پناہی پر آمادہ تھے۔ چنانچہ ہمارے پریس چیف مسٹر گنگولی نے مجھے بلا کر پہلے سمجھایا اور ڈھارس بندھائی کہ تم گھبراؤ نہیں ہم جانتے ہیں کمیونسٹوں کا پروپیگنڈا ہے لیکن تم یہ بتاؤ کہ تمہارے خیال سے یہ کارروائی کن لوگوں کی ہوسکتی ہے۔ تب میں نے ان کو اپنی تحقیق کے نتیجہ سے آگاہ کیا اور بتایا کہ مجھے ان دو اشخاص پر شک ہے جن کے نام مذکورہ جلسوں میں مقررین کی حیثیت سے پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک صاحب اس جگہ کے لیے جس پر میں کام کر رہا ہوں امیدوار بھی رہ چکے تھے۔

کوئی ہفتہ بھر کی خاموشی کے بعد گنگولی صاحب نے مجھے پھر بلایا اور کہا کہ ''رضوان تمہارا خیال بالکل ٹھیک تھا انہی دونوں کی یہ بدمعاشی ہے ہمارے ذرائع نے اس کی تصدیق کر دی ہے۔'' مجھے نہیں معلوم کہ انھوں نے دہلی کو کیا جواب لکھا۔

لیکن اگست کی ۲۷ تاریخ تھی میں حسبِ معمول یو ایس آئی ایس میں کام کر رہا تھا کہ گنگولی صاحب میری میز کے قریب آئے ان کے ساتھ ایک امریکی افسر بھی تھے جن کا تعارف کراتے ہوئے انھوں نے کہا کہ ''یہ ہیں مسٹر میرین، یو ایس آئی ایس نئی دہلی کے انفارمیشن آفیسر۔ یہ تم سے کچھ گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔'' پھر مسٹر گنگولی اپنے کمرے میں واپس چلے گئے اور میرین صاحب نہایت بے تکلفی کے ساتھ مجھ سے باتیں کرنے لگے۔ کس اخبار میں کام کرتے ہو؟ کیا لکھتے ہو؟ تمہاری دلچسپیاں اور مشاغل کیا ہیں؟ یو ایس

آئی ایس میں کتنے عرصہ سے ہو؟ وغیرہ وغیرہ۔ آخر میں انھوں نے فرمایا کہ یو ایس آئی ایس دہلی میں ایک اردو ایڈیٹر کی جگہ خالی ہے کیا تم دہلی آنا پسند کروگے؟

یو ایس آئی ایس، کلکتہ میں کام کے ابتدائی دنوں سے ہی میرا نشانہ دہلی تھا۔ ۷۰ء میں جب اردو میں امریکن رپورٹر کی اشاعت شروع ہوئی اس وقت اس کی ایڈیٹری کے لیے میں نے کوشش بھی کی تھی اور اس وقت کے پریس چیف مسٹر کول نے مجھ سے وعدہ بھی کیا تھا لیکن اس جگہ پر بسنت کمار چٹرجی کا تقرر ہوگیا۔ ہم اور چٹرجی عصرِ جدید میں ساتھ کام کر چکے تھے۔ وہ ۱۹۵۳ء میں کلکتہ سے دہلی آگئے اور روزنامہ 'پرتاپ' میں کام کرنے لگے۔ وہ مزاجاً سوشلسٹ تھے اس لیے یو ایس آئی ایس میں ان کا تقرر میرے لیے حیرت خیز تھا۔ کوئی اٹھارہ مہینے بعد ہی امریکن رپورٹر کے سارے ایڈیشن بند ہوگئے۔ پھر کچھ عرصہ بعد چٹرجی سویٹ انفارمیشن آفس میں لے لیے گئے یہ دوسری حیرت ناک بات تھی۔ وہاں وہ آخر تک رہے۔

خیر، ۱۹۷۵ء میں جب مجھے دہلی آنے کی پیشکش کی گئی تو میں نے چند لمحوں میں ہی اسے تسلیم کرنے کا فیصلہ کرلیا اس لیے کہ کلکتہ میں بھی حالات میرے لیے تقریباً ناسازگار ہوگئے تھے۔ آزاد ہند میں ایک کشیدہ فضا تھی جس میں میں کام کررہا تھا۔ سعید صاحب کا جی مجھ سے بھر گیا تھا لیکن براہِ راست جواب دینے میں مروت حائل تھی۔ میں دوبار کنارہ کشی کی کوشش کر چکا تھا، جسے دوستوں اور بہی خواہوں نے ناکام کردیا تھا۔ معلوم نہیں سعید صاحب کو اس کا علم تھا یا نہیں۔

بہرحال، جب میں نے میرین صاحب پر اپنی آمادگی ظاہر کردی تو انھوں نے باقاعدہ انٹرویو شروع کردیا۔ آخر میں یہ بھی کہا کہ تم کلکتہ کی نرم آب و ہوا کے عادی ہو لیکن دہلی کی آب و ہوا شدید ہے۔ میں پھر بھی اپنی رائے پر قائم رہا۔ انھوں نے پھر بچوں کے تعلیمی مسائل کی طرف توجہ دلائی۔ آخر میں انھوں نے کہا کہ اگر تمھیں کچھ پوچھنا یا کہنا ہے تو کہو۔ میں نے ایک تو تنخواہ کا گریڈ دریافت کیا جو ان کے بیان کرنے کے بعد مجھے معقول

معلوم ہوا۔ پھر میں نے ملازمین کی تخفیف کے بارے میں اپنے اندیشوں کا اظہار کیا۔ حکومت امریکہ کی ملازمت میں یہ کھٹکا ہمیشہ لگا رہتا ہے کہ نہ معلوم کب ملازمین کی تعداد کم کرنے کے لیے چھنٹائی کا اعلان کر دیا جائے جس کے بعد بعض معین اصولوں کے مطابق چھنٹائی ہو جاتی ہے اس کی زد میں کوئی بھی آ سکتا ہے۔ مقامی افسروں کے لیے کسمسانے کی تھوڑی بہت گنجائش رہتی ہے۔ اگر کسی کو بچانا چاہتے ہیں تو کوئی راہ نکال لیتے ہیں۔

میرین صاحب نے میرے سیدھے سوال کا سیدھا جواب دیا کہ اس طرح کی تخفیف کے خلاف تو کوئی ضمانت نہیں دی جا سکتی، یہ خطرہ تو ہر کسی کو مول لینا ہی پڑتا ہے۔ تم اگر حلوائی کی دکان سے لڈو خریدتے ہو تو اس بات کی کوئی ضمانت نہیں کہ وہ لڈو زہریلے نہیں ہوں گے، وہ تو گھر لے جا کر کھانے کے بعد ہی معلوم ہوگا۔ ان کی اس گفتگو کے بعد میں خاموش ہو گیا۔ یعنی بات پکی ہوگئی۔ میرین صاحب دہلی واپس چلے گئے۔

اس کے بعد مجھے درخواست کا فارم باضابطہ خانہ پری کے لیے دیا گیا اور اس طرح ضابطے کی کارروائیاں شروع ہوگئیں۔ یعنی سرکاری ذرائع سے میرے بارے میں تحقیقات، حوالہ دیے ہوئے افراد کو خطوط لکھ کر میرے بارے میں معلومات کا حصول اور میڈیکل اکزامنیشن وغیرہ۔ اپنی صحت کی کیفیت دیکھتے ہوئے مجھے طبی معائنہ میں پاس ہونے کا یقین نہیں تھا لیکن پاس ہو ہی گیا۔

حوالوں کے طور پر 'عصر جدید' اور 'آزاد ہند' کے مالکان اور یو ایس آئی ایس کلکتہ سے رجوع کیا گیا۔ ظاہر ہے کلکتہ آفس نے موافقانہ جواب دیا ہوگا اس لیے کہ وہ لوگ مجھ پر بہت مہربان تھے مزید براں انھوں نے دیگر دونوں حوالوں کے خطوط مجھے ہی دے دیے کہ ہاتھ کے ہاتھ لے جاؤ اور جواب بھی لیتے آؤ تاکہ بذریعہ ڈاک کارروائی میں وقت نہ ضائع ہو۔ احمد سعید صاحب نے قدرے توقف سے بذریعہ ڈاک جواب بھیجا لیکن خان بہادر صاحب نے ساری سابقہ بے مہریوں کا کفارہ ادا کر دیا۔ انھوں نے میرے پاس کہلا بھیجا کہ اس سوالنامے کے حسب خواہ جوابات الگ کاغذ پر لکھ کر دے دو میں اسی کو ٹائپ

کروا کر بھیج دوں گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ انھوں نے لکھ لکھا کر لفافہ میرے پاس بھیجا دیا اور میں نے اس کو آفس میں پہنچا دیا۔

ان تمام کارروائیوں کی تکمیل میں کافی تاخیر ہوئی یہاں تک کہ نومبر کا مہینہ آ گیا جبکہ میرا انٹرویو اگست میں ہوا تھا۔ اس تاخیر سے مجھے الجھن ہونے لگی تھی بلکہ کسی کسی وقت تو اس نئی ملازمت کے امکان ہی پر شک ہونے لگتا۔ جن دوستوں کو اس کا علم ہو گیا تھا وہ بھی شک کرنے لگے تھے شاید اس کو میری ٹیپ سمجھنے لگے ہوں۔ اس طرح میں ایک عجیب گھٹن کی فضا میں سانس لے رہا تھا۔ بالآخر وسط نومبر میں ایک روز دہلی سے تقرر نامہ موصول ہوا کہ بس آ کر جوائن کر لو۔

ایڈیٹرس کانفرنس

ادھر کلکتہ میں ایک بڑا تماشا ہونے جا رہا تھا یعنی آل انڈیا اردو ایڈیٹرس کانفرنس کا اجلاس ۲۷ کو شروع ہونے والا تھا جس کے مہتمم احمد سعید صاحب تھے جنھیں ریاستی حکومت کی بھرپور پشت پناہی حاصل تھا اور مالی تعاون بھی چنانچہ مصروفیات کی وجہ سے ان کو اخبار کی طرف دیکھنے کی فرصت نہ تھی اور کلکتہ میں کانفرنس ہونے کی وجہ سے اسی وقت اخبار پر زیادہ توجہ کی ضرورت تھی۔ میں بھی یہ تماشہ دیکھ کر ہی جانا چاہتا تھا۔ غرض یہ کہ میں نے نومبر کے آخر تک کلکتہ میں ٹھہرنے کا فیصلہ کیا۔

اتوار ۳۰ نومبر کی شام کو کلکتہ سے بذریعہ ٹرین روانہ ہو کر سوموار پہلی دسمبر کی شام کو میں دہلی پہنچا۔ ایک تو ٹھنڈک کلکتہ کی بہ نسبت زیادہ تھی، دوسرے رات کا وقت، تیسرے ایمرجنسی کا زمانہ، چوتھے جامع مسجد کے اطراف میں صفائی اور توڑ پھوڑ کی مہم کے دوران شہر کی فضا میں کشیدگی اور سب سے بڑھ کر یہ بات کہ میں دہلی کی شہری زندگی کے نشیب و فراز سے کوئی خاص واقفیت نہیں رکھتا تھا۔ پرانی دہلی اسٹیشن پر اترا، باہر آیا، ایک رکشا لیا اور جامع مسجد کے لیے روانہ ہو گیا اور وہاں ایک ہوٹل میں فروکش ہوا۔ وہ ناز ہوٹل تھا جس کا نام میں نے سعید صاحب سے سن رکھا تھا۔ چھوٹا لیکن صاف ستھرا ہوٹل۔

اگلے دن یعنی ۲؍دسمبر کو منگل کے دن صبح سویرے ناشتہ سے فراغت کے بعد یو ایس آئی ایس کے لیے چل پڑا۔ ایک اسکوٹر لیا اور کرزن روڈ پر واقع، جو اب کستور با گاندھی مارگ ہے، یو ایس آئی ایس پہنچا۔ اس وقت تک ملک کے اندر اور باہر لوگ دہشت گردی کی وبا سے نا آشنا تھے اس لیے اس کے تدارک کی تدبیروں کا کوئی سوال ہی نہ تھا چنانچہ لوگ دفتر کے اندر باہر بلا روک ٹوک آتے جاتے تھے۔ میں نے رسپشن پر پہنچ کر اپنا تعارف کرایا، اس نے لفٹ کی طرف اشارہ کیا کہ اوپر جایئے۔ میں اس وقت کے پریس چیف کول صاحب کے پاس جانے کے لیے لفٹ کے انتظار ہی میں تھا کہ پیچھے سے کسی نے کندھے پر ہاتھ رکھا، وہ تھے مسٹر وی پی سنگھ جو اس وقت ہندی ایڈیٹر تھے۔ چونکہ دہلی والے کلکتہ آتے جاتے رہتے تھے اس لیے میں ان لوگوں سے اور وہ لوگ مجھ سے اچھی طرح واقف تھے۔ وی پی صاحب بھی انہی لوگوں میں سے تھے، وہ مجھے کول صاحب کے پاس لے گئے اور اس طرح میں یو ایس آئی ایس، دہلی میں داخل ہوگیا۔ اسی دن ایمبسی میں جاکر میں نے ضابطے کی کارروائیاں مکمل کیں۔ واپس آکر مسٹر میرین سے ملاقات کی وہی میرین صاحب جنھوں نے کلکتہ میں میرا انٹرویو لیا تھا۔ اب وہی میرے باس تھے۔ وہ کلکتہ میں نہیں کھلے تھے لیکن دہلی آنے کے بعد معلوم ہوا کہ وہ نہایت شستہ اردو بول سکتے تھے۔ بچپن میں ان کی تعلیم دہرہ دون میں ہوئی تھی جہاں ان کے والد ایک مشنری پادری تھے۔ اس زمانے میں انگریزی اسکولوں میں اردو کی تعلیم لازمی تھی چنانچہ وہ اچھی اردو جانتے تھے۔

کلکتہ کو الوداع

اس طرح ۲؍دسمبر ۱۹۷۵ء کو میں نے ایک نئے کیریئر کی ابتدا کی۔ جون ۱۹۵۱ء میں کلکتہ میں جو کیریئر میں نے اختیار کیا تھا اس میں ۲۴؍برس سے زائد عرصہ تک پاپڑ بیلنے کے بعد اسے پیچھے چھوڑ آیا تھا لیکن جس طرح اسے پیچھے چھوڑ کر آیا تھا وہ بھی ناقابلِ فراموش تھا۔ ۳۰؍نومبر کی شام کو ہوڑہ اسٹیشن پر مجھے الوداع کہنے کے لیے صرف بدر عالم نظامی آئے تھے جو صرف ہم پیشہ ہی نہیں تھے بلکہ کچھ قرابت بھی رکھتے تھے اور قربت بھی،

جس کا اظہار وہ پہلے بھی کر چکے تھے۔ ان کے علاوہ کوئی شخص ایسے میں میرا شریک حال نہ تھا کہ جب میں ۲۴ ربرس تک ایک معروف پیشہ میں لگے رہنے کے بعد شہر کو چھوڑ کر بظاہر ہمیشہ کے لیے جا رہا تھا نہ اس مستقل ہجرت سے پہلے کوئی ایسی تقریب یا کوئی ایسی بات ہوئی جس سے یہ گمان گزرتا کہ کچھ لوگوں سے میری شناسائی بھی رہی ہے۔ میں دہلی آنے کے بعد اکثر حیرت کے ساتھ سوچتا رہا کہ یہ میری کمزوری تھی، یا میرے حلقہ کی، یا میرے ہم پیشہ لوگوں کی، یا یہ ایک بہت بڑے شہر کی سرد مہری تھی۔

☆☆☆

تیسرا ورق

سفارتی صحافت — نئی دنیا

نئی دنیا

دہلی آجانے کا مطلب یہ تھا کہ میری دنیا ہی بدل گئی۔ اندر سے باہر دفتر تک سب کچھ بالکل نیا تھا۔ سارا ماحول نیا تھا، لوگ نئے تھے، زندگی کے تئیں لوگوں کے رویے نئے تھے۔ لوگوں سے تعلقات کی نہج ماضی سے بالکل مختلف تھی گویا میں ایک خطِ تقسیم کو پار کر کے اس مقام پر پہنچ گیا جہاں سے ایک نئی زندگی کا آغاز کرنا تھا، ایک نئی بساط بچھانی تھی، نئے تانے بانے تیار کرنے تھے، کوئی عزیز قریب نہ تھا، میں تھا اور ایک اتھاہ نئی دنیا۔ عزائم اور چیلنج آمنے سامنے تھے۔

روز اول سے معمول یہ بنا کہ ہوٹل میں ناشتے وغیرہ سے فراغت کے بعد ۸/ بجے تک دفتر چلے جانا، سارا دن وہیں گزارنا اور شام کو ہوٹل میں واپس آ کر کچھ دیر آرام کے بعد کھانا کھانا اور سو رہنا۔ دسمبر کا مہینہ تھا سردیوں کا آغاز ہو چکا تھا دن چھوٹے تھے چنانچہ جھٹ پٹے میں آفس جانا اور اندھیرے میں ہی واپس آنا۔

یو ایس آئی ایس کا دہلی آفس کلکتہ آفس سے بہت مختلف تھا۔ کلکتہ میں چورنگی روڈ پر جو اَب جواہر لال نہرو روڈ ہے میٹرو سینما کے قریب ٹاور والی بلڈنگ میں (جہاں آزادی سے پہلے مشہور وہائٹ اَوے لیڈ لا کمپنی کا بہت بڑا جنرل اسٹور تھا) یو ایس آئی ایس آفس تھا (اب یہ دفتر اسی شاہراہ پر کچھ اور آگے اپنی نئی عمارت میں منتقل ہو گیا ہے) ایک بڑا لمبا

چوڑا ہال تھا جس میں حسبِ ضرورت پتلی پتلی دیواریں بنا کر خانے یا کمرے بنا دیے گئے تھے گویا سخت ڈبہ بندی نہیں تھی اور سب چھوٹے بڑے بے تکلفی سے ہر وقت ملتے جلتے رہتے تھے۔ مدارج اور مراتب کے فرق کے باوجود ایک بڑے خاندان کا سا ماحول تھا جس پر بنگالی معاشرت کی چھاپ تھی۔ امریکی افسر جو آتے جاتے رہتے وہ بھی متاثر ہوتے۔

اسی دفتر میں کئی برس تک مجھے مسٹر این سی مینن کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا جو بلا کے ذہین اور حوصلہ مند آدمی تھے اور بلا نوش بھی۔ ان کے لیے کسی ایک جگہ پر زیادہ عرصہ تک برقرار رہنا مشکل تھا چنانچہ یو ایس آئی ایس چھوڑ کر ''اسٹیٹسمین'' میں چلے گئے۔ وہاں جی نہیں لگا تو ''ہندوستان ٹائمز'' کی نامہ نگاری اختیار کر لی، اسی سلسلہ میں دہلی آ گئے۔ سکم میں اور بنگلہ دیش میں ہندوستانی فوجوں کی دو مہموں کے دوران انھوں نے ''ہندوستان ٹائمز'' کے لیے نامہ نگاری کی، واشنگٹن میں اس اخبار کے نامہ نگار رہے اور پھر اس کے بعد ایڈیٹر ہوئے۔ جب میں دہلی آ گیا تو کبھی کبھی مینن صاحب سے ملاقات ہو جایا کرتی تھی۔ وہ مجھ سے کہتے کہ تمہارا کوئی کام ہو تو بتاؤ لیکن میرا کوئی ایسا کام اٹکا ہی نہ تھا جو ان سے کہتا۔ پھر وہ واشنگٹن چلے گئے۔

دہلی آفس کا ماحول کلکتہ آفس سے بہت مختلف تھا۔ اس دفتر کا دائرۂ کار بھی تو بہت وسیع ہے جو تقریباً سارے شمالی ہند پر محیط ہے اسے ایک مرکزی آفس کی حیثیت حاصل ہے اس کی اپنی پانچ منزلہ عمارت کناٹ پلیس یعنی دہلی کے قلب میں واقع ہے۔ کلکتہ آفس کی حیثیت بہرحال علاقائی ہے۔ دہلی میں سفارت خانہ ہونے کی وجہ سے بھی اس دفتر کی اہمیت بڑھ جاتی ہے کیونکہ بہتیری سفارتی سرگرمیوں کا مرکز یہی آفس ہوا کرتا ہے۔ زیادہ تر پریس کانفرنسیں اور دیگر ثقافتی پروگرام اسی دفتر میں ہوا کرتے ہیں۔

میرے ذاتی اعتبار سے بھی دہلی آفس کی اہمیت بہت ہے۔ اس دفتر میں اردو اور ہندی ایڈیٹر بالفعل ہندوستان بھر میں اپنے ایڈیٹروں سے رابطہ کا کام کرتے ہیں، اخباری مواد تیار اور تقسیم کرتے ہیں، ضرورت کے تحت ایڈیٹروں سے موضوعاتی گفتگو کرتے ہیں،

ٹیلیفون کے ذریعہ رابطے رکھتے ہیں، مختلف مواقع پر اور پروگراموں میں شرکت کے لیے انھیں مدعو کرتے ہیں اور کبھی کبھی خود ان کے دفتروں میں جا کر ان سے ملاقاتیں کر لیتے ہیں۔ گویا یہ دونوں ایڈیٹر اپنے اپنے لسانی حلقے اور امریکی سفارت خانے کے درمیان ایک مستقل رابطے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے حلقے سے متعلق امور میں سفارتخانہ ان سے رجوع بھی کرتا ہے۔ چنانچہ اس دفتر میں بحیثیت ایڈیٹر کام کرنا ایک بہت بڑا موقع لیکن ایک بڑا چیلنج بھی تھا۔ اردو اخباروں میں زبردست گھسائی کے بغیر ان دونوں پاٹوں کے بیچ سے سلامتی سے گزر جانا ناممکن حد تک دشوار ہوتا۔

اس کے علاوہ بھی بعض نزاکتیں تھیں، طرح طرح کی پروپیگنڈے بازیوں نے یو ایس آئی ایس اور یہاں کام کرنے والوں کے متعلق بڑی غلط فہمیاں پھیلا رکھی تھیں اردو خواں حلقہ اس سے کچھ زیادہ ہی متاثر معلوم ہوتا تھا۔ کلکتہ کی بات یوں تھی کہ وہاں کا صحافتی حلقہ مجھے اچھی طرح جانتا پہچانتا تھا۔ میرے شب و روز، اور خوبی خرابی سب سے آگاہ تھا چنانچہ جب میرے خلاف پروپیگنڈے کا طوفان برپا ہوا تو مجھے اپنی صفائی میں کسی سے کچھ نہیں کہنا پڑا لیکن دہلی میں مجھ سے اس حد تک آگاہ کوئی نہ تھا نہ میں کسی ایسے بھلے آدمی سے واقف تھا جس پر صد فی صد بھروسہ کرسکتا اس لیے دفتری معاملات میں مجھے بڑی نزاکتوں کا سامنا تھا۔ کس سے ملوں کس سے نہ ملوں، کس سے کس حد تک گفتگو کروں، دفتر کے اندر اور باہر ہر جگہ میرے لیے یہی صورتِ حال تھی۔

ایسے میں جو دہلی والا سب سے پہلے یعنی میری آمد کے تیسرے دن ہوٹل میں آ کر مجھ سے ملا وہ نصیر خاں صاحب تھے۔ اچھے خاصے شریف اور مخلص انسان جو نہ معلوم کس طرح سویٹ انفارمیشن سروس میں پہنچ گئے تھے اور وہاں سے کلکتہ بھیج دیے گئے تھے۔ چونکہ ان کا تعلق شعبۂ اردو سے تھا اس لیے کبھی کبھی ''آزاد ہند'' میں آیا کرتے تھے اور انھیں سعید صاحب سے گفتگو کرتے میں نے دیکھا تھا۔ نہ معلوم کب وہ دہلی واپس آ گئے۔ یہاں دفتر والوں سے ان کی اَن بن ہوگئی اور وہ سبکدوش کر دیے گئے۔ خود انہی کے الفاظ

میں — ''ایک دن ہمارے روسی افسر نے مجھے اپنے کمرے میں طلب کیا، کوئی غیر معمولی بات نہ تھی اس لیے میرے ذہن میں کوئی شک وشبہ نہ تھا لیکن اس کے کمرے میں داخل ہونے کے بعد میں نے دیکھا کہ نوٹوں کی گڈیاں اس کی میز پر رکھی ہوئی تھیں اس نے کہا کہ یہ تمہارے واجبات ہیں انھیں اٹھالو اور گھر جاؤ۔ اس کے بعد نہ کوئی صفائی سنی گئی نہ کسی مراسلے کا جواب دیا گیا۔''

آل انڈیا اردو ایڈیٹرس کا کلکتہ میں جو اجلاس ہوا اس میں شرکت کے لیے نصیر خاں صاحب وہاں گئے تھے ان سے ملاقات ہوئی تو میں نے بتایا کہ میں بھی دہلی آنے والا ہوں اور یہ کہ ناز ہوٹل میں قیام کا امکان ہے۔ اس طرح انھیں میری دہلی آمد کا علم تھا اور انھوں نے اخلاقاً ہوٹل میں آکر مجھ سے ملاقات کی۔ اس ملاقات سے ان کی غرض و غایت کچھ بھی رہی ہو لیکن سچ یہ ہے کہ میرے لیے گھبرا دینے والی بات تھی کیونکہ میں نے ایک ایسے دفتر میں کام شروع ہی کیا تھا جو روسیوں کے معاملے میں انتہائی حساس تھا، یہ شہر میرے لیے بالکل نیا تھا میں کسی شخص کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ اگر میں اچھے برے شگون میں یقین رکھتا تو اس واقعہ کو یقیناً ایک بدشگونی یا فالِ بد سمجھتا۔

لیکن واقعی بدشگونی دفتر میں ہوئی۔ پہلے ہی دن جب میں نے یو ایس آئی ایس میں پریس چیف مسٹر پی این کول سے جا کر ملاقات کی تو ذرا دیر بعد انھوں نے کسی صاحب کو ٹیلیفون کیا اور وہ صاحب اگلے چند منٹوں میں حاضر ہوگئے۔ بڑے بانکے اور سجیلے گٹھیلے بدن کے قدرے پستہ قد اور ادھیڑ عمر لیکن نوجوانی کے رنگ میں رنگے، کالی تاؤدار نکیلی مونچھیں، تھری پیس گرم سوٹ میں ملبوس، بہار دار ٹائی اور قدرے اونچی ہیل کے نکیلے ٹو والے جوتوں میں کچھ اچکے اچکے سے، پتلوں کی دونوں جیبوں میں ہاتھ ڈالے، شکم بسیار خور کو قدرے آگے بڑھائے تشریف لائے چہرے پر کچھ خفت آمیز تبسم بکھیرے ہوئے۔ یہ تھے مسٹر سدرشن لال ملک۔ مختصراً ملک صاحب۔ اردو کیلی گرگرافر تھے لیکن افسرانہ کروفر کے ساتھ رہتے تھے۔ یہ میری آمد سے پہلے دو تین اردو ایڈیٹروں کو الوداع کہہ چکے تھے۔

شاید اب خالی جگہ کے متمنی بھی رہے ہوں اور اب ہم دونوں کا ایک دوسرے سے پالا پڑنے والا تھا لیکن یہ نہیں معلوم تھا کہ پہلے ہی دن اس بری طرح پالا پڑے گا۔

کچھ دیر بعد مجھے رسمی کارروائیوں کے لیے ایمبسی بھیج دیا گیا وہاں سے واپسی کے بعد پریس سکشن کے سربراہ مسٹر میرین سے رسمی ملاقات کی پھر دیگر ایڈیٹروں اور اسٹاف سے تعارف کرایا گیا اور مجھے اپنے کمرے میں پہنچا دیا گیا یعنی اس کمرے میں جہاں ملک صاحب بلا شرکت غیرے براجمان تھے۔ ایک طرف دروازے کے قریب ایک خالی میز تہمتِ برہنگی کے ساتھ پڑی تھی جس کے مدار میں دو تین عمر رسیدہ کرسیاں بھی تھیں اور بس۔ میز پر انگریزی-اردو ڈکشنری کی ایک جلد پڑی ہوئی تھی جسے غالباً بابائے اردو عجلت میں ہندوستان ہی میں چھوڑ گئے تھے اور تب سے وہ دست بردِ زمانہ کے ہاتھوں پامال اور بے حال ہو رہی تھی۔ یہ نقشہ دیکھنے کے بعد میں کچھ تو بھانپ گیا اس لیے کہ بہرحال اٹھارہ برس یو ایس آئی ایس میں ہی گزار کر کلکتہ سے آیا تھا۔ اگر باہر سے سیدھا آتا تو شاید معاملات کو سمجھنے میں کچھ وقت لگتا۔

ہندی اور پنجابی ایڈیٹروں کے الگ الگ کمرے تھے اور ان کے معاون یا ٹائپسٹ ملحقہ کمروں میں تھے وہ دونوں ایک ہی کمرے میں تھے لیکن ایڈیٹر الگ الگ کمروں میں تنہا۔ پھر ان کی میزیں، کرسیاں اور دیگر لوازمات جس طرح کے ہوتے ہیں اس سے بھی میں واقف تھا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایک بڑے کمرے میں کیلی گرافر کی مرکزی میز ہوگی جس پر شیشہ اور آرائش کے جملہ سامان معہ گلدستہ کے ہوں گے اور ایڈیٹر کی کھلی میز دروازے کے قریب پڑی ہوگی۔ اس میز سے لگی دیوار پر ہی گھڑی لگی ہوئی تھی چنانچہ ملک صاحب وقتاً فوقتاً میری موجودگی میں اپنے بوٹ سمیت میری میز پر کھڑے ہو کر گھڑی کا وقت ٹھیک کیا کرتے تھے جو کہ، ظاہر ہے، ایک اہانت آمیز رویہ تھا۔ لیکن اس صورت حال کو میں نے اس احساس کے ساتھ قبول کر لیا کہ اس سے میری کسی کوتاہی کا اظہار نہیں ہوتا بلکہ انتظامیہ کی کوتاہی ہے اور پریس چیف براہِ راست اس کا ذمہ

دار ہے، اسی لیے میں نے نہ کسی چیز کا مطالبہ کیا نہ اس کیفیت پر کوئی تبصرہ کیا۔ آنے والے دنوں میں میں نے یہ محسوس کیا کہ دفتر کے مختلف سکشنوں کے لوگ میرے کمرے میں آتے تو ایک خاص نظر سے ہمارے کمرے کا جائزہ لیتے۔ میں بھی دیکھتا رہا۔ سب مطلب سمجھتے ہوئے خاموشی کو راہ دی۔ ذہن میں یہ بات راسخ ہوگئی کہ میں اس دفتر میں ایک ناپسندیدہ شخص ہوں اس لیے کسی سے ہمدردی یا معاونت کی امید نہیں رکھنی چاہیے۔

ایک تو دہلی کی آب و ہوا میں ایسی کوئی بات ضرور ہے کہ یہاں مروتوں کا شجر بار آور نہیں ہوتا، مسابقت کے پینگ بہت اونچے جاتے ہیں پھر ایسے شہر میں ایک ایسا دفتر جس کی باگ ڈور بھی سات سمندر پار کسی کھونٹے سے بندھی ہو اور اس دفتر میں ایک سے بڑھ کر ایک چھٹے ہوئے گھاگھ جو ہر روز صبح سے شام تک راجدھانی کے صفِ اول کے صحافیوں اور دانشوروں کو نئی دانشوری کا درس دیتے ہوں ان کے درمیان ایک ناپسندیدہ نووارد۔ یہ تھی میری حیثیت جسے میں نے بخوشی قبول کیا۔

دفتر میں پہلا دن تو تعارف اور ملاقاتوں میں گزر گیا۔ شام کو ساڑھے پانچ بجے دفتر کا وقت ختم ہوا تو اندھیرا ہو چکا تھا۔ ملک صاحب نے استفسار کیا کہ میرا قیام کس ہوٹل میں ہے اور میں وہاں تک کیسے جاؤں گا۔ اس کے بعد انھوں نے اصرار کیا کہ وہ خود اپنے اسکوٹر پر بٹھا کر مجھے لے جائیں گے اور ہوٹل تک چھوڑ آئیں گے۔ دن بھر دفتر کے اندرونی حالات کے مشاہدے کے بعد میرے کچھ ذہنی تحفظات تھے لیکن ملک صاحب کا اصرار غالب آ گیا۔ وہ مجھے کناٹ پلیس سے لے کر روانہ ہوئے۔ بقول ان کہ وہ ساٹھ کلومیٹر فی گھنٹہ سے کم رفتار سے نہیں چلاتے اور یہ کہ انھیں کبھی کوئی ناخوشگوار واقعہ نہیں پیش آیا۔ ان کی اس تمہیدی تقریر کا مقصد مجھے اطمینان دلانا تھا۔

آئی ٹی او کراسنگ سے آگے بڑھے اور بہادر شاہ ظفر مارگ پر بڑھنے لگے جہاں بیشتر اخباروں کے دفاتر ہیں تو شام کے کہر آلود دھندلکے میں ہوا کے دوش پر سوار ملک صاحب رننگ کمنٹری دیتے رہے اور ہاتھ اٹھا اٹھا کر اشاروں سے بتلاتے رہے کہ یہ فلاں

اخبار کا دفتر ہے یہ فلاں ادارہ ہے میں لقمہ دیتا رہا کہ بھائی اپنی گاڑی کا خیال کرو اور وہ اپنے ماضی کے شاندار اور بے داغ ریکارڈوں کے حوالے دے کر اطمینان دلاتے رہے یہاں تک کہ ہماری سواری دلی گیٹ کے قریب پہنچ گئی اور ملک صاحب نے اشارہ کے لیے بایاں ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ میری زوردار چیخ نکل گئی ''عورت!'' ایک مزدور عورت سر پر لکڑی کا ایک گٹھہ رکھے ہوئے دائیں طرف سے سڑک پار کر رہی تھی کہ ملک صاحب کے اشہبِ برق رفتار نے اس کو آلیا۔

اسی لمحہ مجھے لگا کہ میرے چہرے کی بائیں جانب کسی نے بارود مل دی ہے اور میں نے خود کو فٹ پاتھ پر کھڑے ہوئے پایا، دراصل میں اس چیخ کے ساتھ ہی جست لگا کر فٹ پاتھ پر آ گیا تھا ملک صاحب کی پیٹھ سے چہرے کی جلد رگڑ گئی تھی اور کچھ خون چھچھا آیا تھا بس۔ سڑک پر جو منظر سامنے تھا وہ یہ تھا کہ گاڑی کی زد میں آنے والی عورت سڑک پر لمبی پڑی تھی اور ملک صاحب اس پر جھکے ہوئے تھے اس سے میں نے یہ سمجھ لیا کہ ان کے ہاتھ پاؤں سلامت ہیں۔ میں اپنی جگہ کھڑا تھا اسی وقت ایک رکشا بالکل غیر متوقع طور پر وہاں آ پہنچا میں لپک کر اس پر بیٹھ گیا اور اپنے ہوٹل میں آ گیا۔ گرم پانی لے کر چہرے کو سینکا۔ کچھ دیر بعد ملک صاحب بھی میری خیریت دریافت کرنے کی غرض سے وہاں پہنچ گئے۔ اس واقعہ کو میں نے برے شگون کے طور پر نہ سوچا نہ سمجھا لیکن وہ یقیناً ایک برا شگون تھا جیسا کہ دفتر کے آئندہ واقعات سے ظاہر ہوا۔

نیا شہر

جامع مسجد کے علاقے میں اطراف کا منظر بھی قابلِ ذکر ہے۔ ایمرجنسی کا زمانہ تھا پرانی دلّی کے بعض علاقوں کی صفائی بالخصوص ترکمان گیٹ کے علاقے کی توڑ پھوڑ کا عمل شروع ہوا۔ مجھے نہیں معلوم کے اس سے پہلے وہاں کیا کیا کچھ تھا لیکن اتنی بات ضرور ہے کہ جامع مسجد کے اطراف میں توڑ پھوڑ کا کام بہت بڑے پیمانے پر ہو رہا تھا کوئی دو درجن بلڈوز کام سے لگے ہوئے تھے سیکڑوں ٹرک ملبے اور مٹی ہٹانے پر مامور تھے ہر چہار

طرف دور دور تک تیز روشنی کے بڑے بڑے بلب لگے ہوئے تھے اور بڑی شدت کے ساتھ دن رات کام ہو رہا تھا۔ اس کی کئی وجہیں تھیں۔ ایک تو یہی کہ ایمرجنسی کے زمانے میں سارے کام بالعموم تیزی سے ہوا کرتے تھے، ہر کوئی اپنی جوابدہی کو ڈرتا تھا۔ صدیوں کی غلامی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے صرف کوڑے کے ڈر سے کام ہوتے ہیں احساس ذمہ داری کے تحت نہیں۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ پرانی دلّی میں توڑ پھوڑ ایک حساس معاملہ تھا جس کی وجہ سے مسلمانوں میں بالخصوص بڑا ہیجان برپا تھا، کچھ ہنگامے اور پولیس سے جھڑپیں بھی ہو چکی تھیں اس لیے سرکاری مشنری کی کوشش یہ تھی کہ اس جھگڑے والے کام کو جلد از جلد نمٹا دیں اس کے مکمل ہو جانے کے بعد سب شور شرابہ خود ہی دب جائے گا۔ تیسری وجہ یہ تھی کہ بقرعید قریب تھی اس لیے حکام کی کوشش یہ تھی کہ بقرعید آنے تک وہ سارا علاقہ صاف ستھرا کر دیا جائے اور چوتھی بات ذرا دور کی تھی وہ یہ کہ جتنی جلدی اس علاقے کی صفائی ہو جائے گی اتنی ہی جلدی اس متبادل بازار کی تعمیر ممکن ہو سکے گی جہاں جامع مسجد کے اطراف کی دکانوں کی شکست و ریخت کے بعد وہاں کے اجڑے ہوئے دکانداروں کی بازآبادکاری مقصود تھی۔

نتیجہ یہ ہوا کہ دن رات کام کر کے بلڈوزوں نے ساری پرانی تعمیرات کو صاف کیا، زمین چورس کی اور وہاں ٹرکوں نے تازہ مٹی بچھادی پھر اس پر ہری گھاس پھیلا دی گئی۔ راستوں کی نشاندہی کر کے ان کے دونوں طرف تھوڑے تھوڑے فاصلے پر گڈھے کھودے گئے پھر ہزارہا سرو کے قدرے بڑے پودے لا کر ان گڈھوں میں نصب کر دیے گئے۔ چنانچہ ۱۴ر دسمبر کو بقرعید کے آتے آتے سارے علاقے کا نقشہ ہی بدل گیا۔

میں صبح کو آفس چلا جاتا شام کو ہوٹل واپس آتا اس لیے دن بھر کی خبر نہیں مگر بلڈوزروں اور ٹرکوں کی گھڑگھڑاہٹ رات بھر سنائی دیتی۔ چار دن بعد جب پہلا سنیچر آیا تو ناشتہ وغیرہ سے فراغت کے بعد جامع مسجد کی سیڑھیوں کے سامنے مٹیا محل کو جانے والی سڑک کے قریب ہی ایک گلی میں مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کی رہائش گاہ پر حاضر ہوا۔ مفتی

صاحب مرحوم جب کلکتہ تشریف لاتے تو مولانا حکیم محمد زماں حسینی صاحب کے یہاں ان کی نشست رہتی وہیں میں نے بھی ان سے نیاز حاصل کیا تھا۔ دہلی میں کسی واقف کار سے ملاقات بہرحال ایک ضرورت تھی چنانچہ میری درخواست پر حکیم صاحب نے مفتی صاحب کے نام ایک تعارفی رقعہ مجھے دے دیا تھا اسی کو لے کر میں مفتی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنا تعارف کرایا۔ دہلی میں آمد اور قیام کی وجہ بتائی ان سے یہ بھی گزارش کی کہ کسی اچھے معالج کا نام پتہ بتائیں تاکہ اپنی دوا درمن کے سلسلے میں اس سے رجوع کرسکوں وہ معالج خواہ کسی سسٹم کا ہو اس کا بھروسے کے قابل ہونا شرط ہے۔ چنانچہ انھوں نے چاندنی چوک کے علاقے میں کوچہ رحمٰن میں حکیم حفیظ الرحمٰن صاحب کا نام بتایا اور کہا کہ ان سے مل لو۔ اس تعارفی ملاقات کے بعد کبھی کبھار مفتی صاحب کے ہاں حاضر ہوا کرتا۔ ذاتی مصروفیات اور دہلی کے فاصلے اس میں حائل ہوتے گئے۔

اسی جگہ حکیم حفیظ الرحمٰن صاحب کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے۔ دہلی آنے کے بعد ہوا، پانی کی تبدیلی اور ہوٹلوں کے کھانے نے معدہ کو خراب کرنے میں زیادہ وقت نہیں لیا۔ بات جنوری کے مہینے کی ہے شام کو دفتر سے نکلا تو دن غروب ہی ہو چکا تھا ایک اسکوٹر میں بیٹھا اور حکیم صاحب کی جستجو میں چاندنی چوک روانہ ہوگیا۔ ٹاؤن ہال کے بالمقابل نئی سڑک سے ملحق پہلی گلی کوچہ رحمٰن ہے۔ معروف جگہ ہے اس لیے اس کا پتہ لگانے میں کوئی خاص زحمت نہیں ہوئی اور وہ گلی اندر کو ٹیڑھی میڑھی چلی گئی ہے اس لیے انجان شخص بھی سوائے اس گلی میں بڑھنے کے اور کہیں نہیں بہک سکتا۔ حکیم حفیظ الرحمٰن صاحب بھی اس علاقے کی معروف نہیں بلکہ بہت ارفع شخصیت تھے جنھیں پوچھتے ہوئے لوگ نہ معلوم کہاں کہاں دیس بدیس سے چلے آتے ہوں گے اس لیے ان کے مطب تک پہنچنے میں کوئی خاص زحمت نہیں ہوئی لیکن مطب کے اندر کا منظر میرے لیے یقیناً غیر متوقع اور کسی قدر حیرت خیز تھا خصوصاً اس وجہ سے کہ میں نے کئی مقبول و معزز حکماء کو ان کے اصل ماحول میں میں نے دیکھا تھا، ان کے حلیے اور رویہ سے اچھی طرح واقف تھا۔

مثلاً خود میرے والد کے ماموں حکیم شاہ محمد عمر صاحب جو مہاراجہ دربھنگہ کے طبیب خاص تھے اس لیے اکثر سمستی پور (بہار) میں قیام فرماتے یوں دور دور تک ان کا شہرہ تھا۔ اپنے وطن مئو میں (جو اس وقت ضلع اعظم گڑھ کا ایک معروف قصبہ تھا اور اب الگ ایک ضلع بن گیا ہے) ان کا طریقہ یہ تھا کہ صبح نمازِ فجر کے کافی دیر بعد وظائف وغیرہ سے فارغ ہوکر مسجد سے باہر آتے تو مریضوں کی خاصی تعداد موجود ہوتی۔ ایک لمبا دسترخوان بچھتا اور موجود لوگ ناشتہ میں شریک ہوتے اس میں مریض غیر مریض کی تمیز نہیں ہوتی۔ ان کے دوسرے دو بھائیوں، حکیم شاہ عبدالعزیز صاحب اور حکیم شاہ عبدالحفیظ صاحب، نے امتدادِ زمانہ کے باوجود خاندانی روایتوں کو نبھانے کی کوشش کی حتیٰ کہ موضع راجن پور، جوان بزرگوں کے خاندان کی پرورش کے لیے شاہان مغلیہ کے زمانے سے بطور جاگیر ملا ہوا تھا، رفتہ رفتہ ان کی ملکیت سے نکل گیا اب ان کی یادگار محلّہ اورنگ آباد میں وہ احاطہ رہ گیا ہے جس میں اس خاندان کے افراد پیدائش سے موت تک زندگی کے سارے مراحل طے کرتے تھے اور وہیں پیوندِ خاک ہوجاتے تھے اور مہمان خانے کا وہ لمبا کمرہ ایک حسرت کدہ کی صورت موجود ہے جس میں فرسودہ تختوں کا وہ سلسلہ بھی باقی ہے جہاں خوانِ پہن بچھا کرتا تھا۔

لڑکپن اور طالب علمی کے زمانے میں کانپور میں حکیم غلام مصطفیٰ صاحب کو دیکھا کہ نئی سڑک پر اپنے مطب میں واقعی لبِ سڑک فرش پر بیٹھے رہتے وہ خود چوکھٹ کے اندر اور مریضوں کی بھیڑ چوکھٹ کے باہر فٹ پاتھ پر۔ حکیم صاحب کے پیچھے آدھے درجن افراد نسخے تیار کرنے میں مصروف رہتے۔ اتفاق سے چمن گنج میں حکیم صاحب کی رہائش گاہ کے سامنے ہی ہم لوگ بھی رہتے تھے اس لیے دیکھتے کہ صبح ٹھیک آٹھ بجے حکیم صاحب اپنی پوری ٹیم کے ساتھ یکہ پر مطب کے لیے روانہ ہوجاتے اور ایک بجے واپس آتے۔ سہ پہر میں جاتے تو رات کو ۸/بجے واپس آتے۔ غالباً ان کے معاونین سب ان کے اقارب تھے۔

تیسرا مشاہدہ کلکتہ میں حکیم مولوی محمد زماں حسینی صاحب کے ہاں ہوا جہاں ان

کے مطب پر کسی علمی مرکز کا گمان ہوتا۔ ان کی میز کا زیادہ حصہ کتابوں سے بھرا ہوا، مریضوں سے زیادہ اصحابِ علم وفضل کی آمدورفت رہتی۔ جن میں حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ، حضرت قاری محمد طیب صاحبؒ، حضرت مفتی عتیق الرحمٰن صاحب، حضرت مولانا سعید احمد اکبرآبادی مرحومین جیسی شخصیات کو تو میں نے خود ہی وہاں دیکھا، یہ فہرست کافی طویل ہے جس میں مولانا عبیداللہ سندھی، مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی، غرض یہ کہ کلکتہ آنے جانے والے یا مدرسہ عالیہ سے وابستہ سارے جید علماء کے علاوہ زندگی کے دیگر معروف شعبوں میں مثلاً صحافت اور سیاست وغیرہ سے تعلق رکھنے والے ہر عمر کے لوگ شامل تھے۔ ان کی چائے سے اور خواص کی عطر سے بھی تواضع ہوتی۔

لیکن یہاں حکیم حفیظ الرحمٰن صاحب کے ہاں نقشہ ہی کچھ اور تھا۔ مطب میں داخل ہوتے ہی سامنے کسی قدر نشیبی چوکھٹے میں دو عطار نسخے باندھتے نظر آتے ہیں۔ ان کے سامنے کاؤنٹر ہے اور دو طرف نیچے سے اوپر تک شیشے کی الماریوں میں نفیس اور لطیف نظر آنے والی دوائیوں کی لیبل لگی ہوئی شفاف شیشیاں قرینے سے رکھی ہوئی۔ دائیں طرف مریضوں کی انتظار گاہ یعنی بیٹھنے کا بندوبست، آگے بڑھئے تو ایک نفیس اور قدرے بلند شہ نشین پر حکیم صاحب کی میز کرسی اور اس کے عقب میں ایک آرام دہ تخت معہ مسند جس پر کسی کو بیٹھے یا آرام کرتے میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ حکیم صاحب کی نشست دوا خانے والے گوشے کی آڑ میں پڑتی ہے اس لیے باہر سے اندر داخل ہونے والا فوراً حکیم صاحب کے روبرو نہیں ہوتا لیکن موصوف اپنے شہ نشین پر اندر سے باہر تک سب خبر رکھتے ہیں۔ آرائش کی چیزیں مثلاً کلنڈر، کتبے، گھڑی وغیرہ دیواروں پر آویزاں اور خود حکیم صاحب کی میز ٹیلیفونوں اور پرکشش دوا کی شیشیوں، قلمدان اور قلموں سے بھری ہوئی۔

میں پہلی بار جب وہاں پہنچا تو جاڑوں کی شام تھی، خدا نے جس کو جو کچھ دیا تھا اس نے پہن اوڑھ رکھا تھا۔ حکیم صاحب کو جو دیکھا تو میرا فوری ردِعمل قدرے حیرت کا تھا جس کا میں نے حکیم صاحب سے گفتگو کے دوران اظہار بھی کیا۔ یہی کوئی ۴۵-۴۸ کے

قریب سِن، صحت مند اور توانا جسم، درمیانہ قد، رنگ گیہواں، ابرو اور پیشانی پر ایک خاص تیکھا پن، باریک تراشی ہوئی مونچھیں، سفید ادھی کے کرتے اور پاجامے میں ملبوس، ایک سفید کشمیری شال کندھے اور پہلو کے درمیان آڑی ترچھی لپیٹی ہوئی اور حکیموں کے حلیہ کی مناسبت سے نہ ریش نہ کلاہ۔

میں حکیم صاحب کے درباری آداب سے نا آشنا سیدھا شہ نشین تک چلا گیا۔ مفتی صاحب کے حوالے سے جلدی جلدی اپنا تعارف کرایا جسے انھوں نے (خلافِ معمول) بڑے تحمل کے ساتھ سنا۔ اگلی سانس میں ہی میں نے اپنی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے یہ بھی کہہ دیا کہ آپ کسی طرح حکیم تو معلوم نہیں ہوتے پھر ان کے جوابی استفسار پر میں نے کسی حکیم کے متوقع چہرے مہرے اور شکل و شباہت پر اظہار خیال کیا۔ خیر! انھوں نے اسی وقت کوئی دوا دی جس سے تھوڑی دیر میں مجھے سکون ہونے لگا۔ کچھ دیر بعد انھوں نے نبض دیکھی اور تفصیلی حالات سنے اور ہفتہ بھر کی دوا دی لیکن مجھے نقاہت محسوس ہو رہی تھی اور چاندنی چوک سے بہت دور ساؤتھ ایونیو جانا تھا جہاں میں ان دنوں سید احمد ہاشمی صاحب ایم پی کے کوارٹر میں قیام پذیر تھا چنانچہ جی چاہ رہا تھا کہ کہیں تھوڑی دیر آرام کرلوں۔

یاد پڑا کہ نصیر خانصاحب گلی قاسم جان میں رہتے ہیں جو وہاں سے قریب ہی تھی اسی گلی میں الجمعیۃ کا دفتر تھا جہاں میں جا چکا تھا، چنانچہ میں تیز قدم سے اسی طرف بڑھا اور پوچھتے پاچھتے نصیر خان صاحب کے مکان تک پہنچ گیا، دروازے پر دستک دی تو وہ فوراً باہر آئے میں نے اپنی طبیعت کا حال بتایا اور آرام کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ وہ مجھے اندر لے گئے اور آرام دہ بستر پر لٹایا، ان کی اہلیہ نے فوراً چائے انڈے وغیرہ کا اہتمام کیا جس سے میں نے انھیں بہ اصرار باز رکھا۔ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد جسم میں حرارت آئی اور طبیعت بھی صحیح ہوئی تو خانصاحب کا شکریہ ادا کر کے میں نے ان سے رخصت لی۔ وہاں سے چاندنی چوک میں نکلنے کے لیے میں نے جو راستہ اختیار کیا اس وقت نہیں جانتا تھا اب سمجھتا ہوں کہ وہ بلیماران والی سڑک تھی۔ خیال ہوا کہ ساؤتھ ایونیو پہنچنے کے بعد کھانے کا

مرحلہ بہرحال درپیش ہوگا تو کیوں نہ یہ کارِ خیر اِدھر ہی انجام دیتا چلوں۔ دائیں ہاتھ کو ایک چھوٹا سا ہوٹل دیکھ کر اس میں چلا گیا کہ روٹی شوربہ تو مل ہی جائے گا۔ سو مل گیا۔

میں ایک چھوٹی سے میز پر کھانے لگا۔ ہوٹل میں کام کرنے والا ایک لڑکا سامنے ہی بیٹھا جھوٹے برتن صاف کر رہا تھا اس نے پانی بھرا المونیم کا جگ اور گلاس میری میز پر رکھ دیا۔ ٹھنڈی رات کی وجہ سے ہوٹل خالی تھا شاید کوئی اور گاہک نہیں تھا۔ مجھے اپنی غلطی کا احساس تو ہو ہی گیا تھا، جوں توں ایک روٹی زہر مار کی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ ابھی کاؤنٹر پر پیسے دے ہی رہا تھا کہ ایک خانصاحب ہوٹل میں داخل ہوئے اور میز پر سے پانی کا جگہ اٹھایا اور جہاں ذرا دیر پہلے ہوٹل کا لڑکا برتن صاف کر رہا تھا وہیں بیٹھ کر استنجا فرمانے لگے۔ مجھے ابکائی آنے لگی اور میں نکل کر بھاگا۔

حکیم صاحب سے اس پہلی ملاقات کے بعد حسبِ ضرورت وقتاً فوقتاً ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ ایک طرح ان سے ہمارے رشتے استوار ہوگئے۔ انھوں نے ہمارے گھر کے دیگر افراد کا علاج معالجہ کیا۔ کچھ بے تکلفی بھی ہوگئی تو معلوم ہوا کہ وہ پہلے تو مجھے بنگالی سمجھتے رہے۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ میرا وطن اعظم گڑھ ہے تو ان کے چہرے پر صاف بے یقینی کے آثار تھے جسے میں بھی سمجھ گیا۔ انھوں نے بہ اصرار میری وطنیت دریافت کی اور میں نے تصدیق کی تو مان گئے۔ بات یوں ہے کہ دہلی میں اعظم گڑھ کے لوگ بالعموم جھگڑالو اور لڑاکا سمجھے جاتے ہیں یہاں تک کہ بعض مالک مکان اعظم گڑھ والوں کو اپنے مکان میں کرایہ دار رکھنے سے بھی احتراز کرتے ہیں۔ حکیم صاحب کو ایک عرصہ تک میرے اندر ایسا کوئی عنصر نظر نہ آیا تھا اس لیے انھیں میری اعظم گڑھ کی وطنیت پر شک تھا۔

خود حکیم صاحب کے بارے میں مجھے جو کچھ معلوم ہوسکا وہ اس طرح ہے کہ وہ خالص دہلی کے رہنے والے ہیں۔ کسی زمانے میں ہمدرد دواخانے میں طبیب خاص کے طور پر برسرکار تھے۔ ۱۹۴۶ء میں کلکتہ کے فسادات کے دوران ہمدرد والوں نے ایک طبی دستہ کلکتہ روانہ کیا اور انہی حکیم صاحب کی سربراہی میں اس جماعت نے وہاں ایک ماہ تک

کام کیا اس کے بعد ہمدرد دوا خانہ چاہتا تھا کہ وہ کلکتہ ہی میں مستقل قیام کریں، جسے حکیم صاحب نے منظور نہیں کیا اور ہمدرد سے کنارہ کشی اختیار کی اور اپنا مطب قائم کیا۔

میں دہلی آنے کے بعد جن صاحب سے جلد از جلد ملاقات کرنا چاہتا تھا وہ تھے مولانا سید احمد ہاشمی جو راجیہ سبھا کے ممبر تھے۔ جمعیۃ العلماء کے رکن تھے اور اخبار الجمعیۃ کے ڈائرکٹر بھی تھے۔ ان کی رہائش گلی قاسم جان میں واقع جمعیۃ بلڈنگ میں تھی۔ دفتری امور جمعیۃ العلماء کے دفتر واقع مسجد عبدالنبی میں انجام دیا کرتے تھے اور ساؤتھ ایونیو پر واقع وہ کوارٹر جو ایم پی کی حیثیت سے انھیں الاٹ کیا گیا تھا فی سبیل اللہ تھا۔ وہاں ان کے ایک آفس سکریٹری رہا کرتے تھے، کبھی کبھی ہاشمی صاحب خود بھی وہاں چلے جایا کرتے تھے۔ اس بڑے سے کوارٹر میں کئی حصے تھے جو آئندہ روندہ کے لیے مختصر اور طویل وقفہ کے لیے مہمان خانے کے کام آتے تھے۔

ہاشمی صاحب جمعیۃ العلماء کے ایک کارکن کی حیثیت سے کلکتہ میں کام کر چکے تھے خان بہادر شیخ محمد جان صاحب جمعیۃ العلماء مغربی بنگال کے صدر تھے اور انہی کے اخبار 'عصرِ جدید' میں میں نے عرصۂ دراز تک کام کیا تھا اس طرح ہاشمی صاحب سے کبھی ان کے دفتر میں اور کبھی اپنے دفتر میں ملاقاتیں ہوا کرتی تھیں۔ دہلی آنے کے بعد پہلے ہی اتوار کو میں نے ہاشمی صاحب سے ملاقات کی۔ وہ بڑی گرمجوشی کے ساتھ ملے اور ان کی گفتگو سے مجھے بڑی تقویت ملی۔ انھوں نے مشورہ دیا کہ میں ہوٹل چھوڑ کر ان کے کوارٹر میں آجاؤں۔ اس پر ان کا اصرار جاری رہا۔

۱۴؍دسمبر کو بقرعید تھی خیال ہوا کہ عید کی نماز مسجد عبدالنبی میں پڑھوں تو کچھ لوگوں سے ملاقات اور تعارف کا موقع ملے گا اور ہاشمی صاحب کے حلقہ میں کچھ وقت بھی گزار لوں گا چنانچہ سویرے ہی تیار ہوکر ہوٹل سے مسجد عبدالنبی کے لیے روانہ ہوا جو بہادر شاہ ظفر مارگ پر آئی ٹی او کراسنگ کے قریب نکڑ پر بہت نمایاں ہے۔ وہاں نماز کے بعد ناشتے کا اہتمام ہوا جس میں ہاشمی صاحب کے علاوہ وہاں مقیم اور موجود جمعیۃ العلماء کے

کارکن بھی شریک تھے اور میرے جیسے چند بے گھر بار بھی تھے انہی میں سے ایک محمد فاروق صاحب تھے جو یو پی امپوریم میں کیشئر تھے۔ وہ اعظم گڑھ کے رہنے والے تھے گفتگو کے دوران ہاشمی صاحب نے پھر اپنی تجویز دہرائی کہ میں ہوٹل چھوڑ کر ان کے کوارٹر میں منتقل ہوجاؤں۔ فاروق صاحب کا جذبۂ وطنیت جوش میں آیا اور وہ بہ اصرار میرے ساتھ ہوٹل آئے اور وہاں سے سامان سمیٹ کر منتقل ہونے میں مدد کی۔

ناز ہوٹل کی ایک بات مجھے بہت پسند آئی۔ ہم لوگ جب ہوٹل پہنچے اور بیرے سے کہا کہ میں کمرہ چھوڑنا چاہتا ہوں بل وغیرہ بنوا کر لاؤ تو وہ چلا گیا اور ذرا دیر میں ایک ٹرے لے کر آیا جس میں سوئیں کے تین پیالے تھے۔ کیونکہ میرے ساتھ فاروق صاحب اور ان کا بیٹا یعنی ہم لوگ تین نفوس تھے، میں نے حیرت کے ساتھ بیرے سے کہا کہ میں نے سوئیں لانے کے لیے نہیں بل بنوانے کے لیے کہا تھا اس نے بڑی ملائمیت سے جواب دیا کہ صاحب آج عید ہے اس لیے مہمانوں کو ہوٹل کے مالک کی طرف سے سوئیں پیش کی جاتی ہے۔ اس الوداعی حیرت کے بعد ہم لوگ ایک ٹیکسی میں ساؤتھ ایونیو کے لیے روانہ ہوگئے اور وہاں پہنچ کر ہاشمی صاحب کے کوارٹر کی بالائی منزل پر ایک بڑے سے کمرے میں جس سے ملحق غسل خانہ بھی تھا بستر ڈال دیا۔ وہاں ایک چارپائی اور دو ایک کرسیاں اور میز وغیرہ جیسی بنیادی ضرورت کی چیزیں موجود تھیں۔ سامنے کھلا ہوا مزے کا صحن تھا دہلی میں اسے برساتی کہتے ہیں۔ وہ سنیچر کا دن تھا جب ہم وہاں وارد ہوئے۔ اگلے دن اتوار کی صبح کو خطوط لکھے پھر اس جگہ قدرے طویل قیام کی تیاریوں میں لگ گئے یعنی ناشتے کا سامان جیسے بسکٹ، پاؤ روٹی، مکھن تازہ اور خشک میوے، چائے، انڈے، دودھ اور شکر، چائے کی کیتلی، پیالیاں، گلاس اور ایک دو پلیٹیں۔ غرض یہ کہ اسی طرح کی متفرق چیزیں لاکر درست کیں اور ایک الکٹرک ہیٹر لائے۔ یوں ناشتے کا اہتمام ہوگیا اور شب و روز کے نئے معمولات کا آغاز ہوا۔ ہمارے دفتر کے لوگ تو بالعموم آفس کی کینٹین میں نو بجے کے قریب ناشتہ کرتے، صبح کو بڈ ٹی لے کر گھر سے چلتے ہوں گے لیکن میں کبھی بڈ ٹی کا عادی نہیں رہا

ہمیشہ سویرے ڈٹ کر ناشتہ کرتا رہا۔

دن کا کھانا آفس کی کینٹین میں کھاتا اور شام کو آفس سے نکلنے کے بعد ریگل بلڈنگ میں واقع ہوٹل 'شدہ ویجی ٹیرین' سے (جہاں اب ہوٹل العرب ہوگیا ہے) کھانے کا ڈرائی پیکٹ لے کر اپنی رہائش پر آجاتا اس کی وجہ یہ تھی کہ ساؤتھ ایونیو پر قریب پاس کھانے کا کوئی معقول ہوٹل نہ تھا۔ میرے کوارٹر سے کچھ دور ایک ڈھابہ تھا جہاں چنے کی دال اور کچھ اوٹ پٹانگ سبزیاں اور روٹی مل سکتی تھی۔ اس کے لیے بھی بڑی ہمت کی ضرورت تھی کیونکہ سردی سخت تھی اور سنتریوں یا گشتی پولیس کے علاوہ کوئی آدمی یا آدم زاد نظر نہیں آتا تھا۔ ایسا مکمل سناٹا رہتا تھا جس سے مجھے واقعی وحشت ہوتی تھی اس کے کئی وجوہ تھیں۔ ایک تو یہی کہ میں کلکتہ کی گھمسان آبادی والے علاقے میں رہنے کا عادی تھا دوسرے یہ کہ ایمرجنسی کا زمانہ تھا۔ کلکتہ میں اخباروں پر سنسر کی پابندی کے علاوہ ایمرجنسی کا کوئی خاص اثر عوامی زندگی پر نہیں معلوم ہوتا تھا لیکن دہلی میں تو معمولی سے لغزش بھی جرم شمار کی جاسکتی تھی۔ حالت یہ تھی کہ بس کا کنڈکٹر بھی مسافروں کے ساتھ پولیس کانسٹبل جیسا سلوک کرتا تھا، کوئی دادفریاد نہ تھی، عام آدمی ڈرا سہا پھرتا تھا۔

خود میرے ساتھ ایک معاملہ یہ ہوا کہ اتوار کا دن تھا میں لال قلعہ کے سامنے اوکھلا جانے والی ۴۰۳ نمبر کی بس کے انتظار میں بس اسٹینڈ پر کھڑا تھا کافی دیر کے بعد بس آئی اور اسٹینڈ پر رکے بغیر آگے بڑھ گئی لیکن ذرا دور آگے جاکر لال بتی پر اسے رکنا پڑا۔ میں نے دوڑ کر بس کا ہینڈل پکڑا اور اس کے پائیدان پر پاؤں رکھا ہی تھا کہ کسی نے پیچھے سے میری کمر پکڑ لی۔ پلٹ کر دیکھا کہ ڈی ٹی سی کا ایک انسپکٹر ہے اور اس کے دو معاون۔ انھوں نے مجھے لے جاکر قریب ہی کھڑی ایک گاڑی میں بند کردیا۔ میرا جرم یہ تھا کہ میں نے ریڈلائٹ پر بس پکڑنے کی کوشش کی۔ ڈرائیور سے کسی نے نہ پوچھا کہ اس نے اسٹینڈ پر بس کیوں نہیں روکی۔ اس گاڑی میں میری ہی طرح اور بھی بے گناہ بند تھے۔ ان کے نام پتے درج کیے جاتے اور ایک ایک کرکے وہیں موجود ایک مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیے

جاتے۔ کوئی ایک گھنٹہ انتظار کے بعد میری باری بھی آئی۔ کسی دادفریاد کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔ مجھ پر تین روپیہ جرمانہ کیا گیا جسے ادا کر کے میں باہر آ گیا۔

بالعموم دہلی کے لوگوں کا مزاج یہاں کی آب و ہوا کی طرح سخت و کرخت ہے، شدت پسند ہے۔ نرمی اور ملائمیت کا رویہ ان پر بے اثر ہوا کرتا ہے، لوگ درشت لہجہ میں گفتگو کرتے ہیں اور اسی زبان اور لہجہ کو درخورِ اعتنا سمجھتے ہیں۔ عام ضابطوں یا قوانین کی خلاف ورزی نوجوانوں میں ایک فیشن تصور کیا جاتا ہے گویا قانون شکنی یہاں کی ہوا اور فضا میں حل ہوکر خو بو بن گئی ہے اس لیے یہاں سخت گیر حکام یا حکمراں ہی کامیاب ہوسکتے ہیں۔ ایسے میں عام شہری زندگی کو رواں دواں رکھنے کے لیے سخت ضابطہ بندی کسی حد تک ضروری ہے تاہم اس کو فوجی ضابطوں کی انتہا تک کھینچنا مناسب نہیں مثال کے طور پر بس کے پچھلے گیٹ سے جو اترا اسی کو پکڑ لیا جس نے اگلے گیٹ سے چڑھنے کی کوشش کی اس کو دھرلیا۔ یہی شدت اور زیادتیاں تھیں جن کی وجہ سے ایمرجنسی کے دوران دہلی کے عوام کو جبر واستبداد کے حالات سے دوچار ہونا پڑا اور اسی کے ردِعمل کے طور پر وزیراعظم مسز اندرا گاندھی کو شدید عوامی تحریکات کا سامنا کرنا پڑا جو بالآخر ۱۹۷۷ء کے انتخابات میں ان کی پارٹی اور خود ان کی شکست اور زوال کا موجب ہوئیں۔

اسی وقت کلکتہ کا ایک مثالی واقعہ بیان کرنا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ وہاں ٹراموے کمپنی کے انسپکٹر چلتی گاڑی میں اور اترنے والے مسافروں سے سڑک پر بھی ٹکٹ چک کرتے ہیں بھیڑ بھاڑ کے اوقات میں عموماً اندر گھسنے سے گریز کرتے ہیں۔ اترنے والے مسافر انھیں ٹکٹ دے کر، دکھا کر یا پھینک کر آگے بڑھ جاتے ہیں جو کہ اظہار ناپسندیدگی کا ایک طریقہ ہے۔ اسی طرح ایک روز ہیریسن روڈ اور لور چیت پور روڈ کی کراسنگ کے قریب اسٹینڈ پر ٹرام رکی تو وہاں ایک انسپکٹر ٹکٹ چیک کر رہا تھا۔ ایک بنگالی مسافر اترا اور تیزی سے دو قدم آگے بڑھا لیکن انسپکٹر نے ٹکٹ طلب کرتے ہوئے اس کے سامنے ہاتھ پھیلا دیا۔ اس شخص نے انسپکٹر کے ہاتھ پر تھوک دیا اور بڑبڑاتا ہوا نکل گیا

کہ گاڑی کے اندر کیوں نہیں چیک کرتا، ہم تمہاری گاڑی میں نہیں آیا۔ اس انسپکٹر بیچارے کی بیچارگی قابلِ دید تھی۔

ابھی میں ہاشمی صاحب کے کوارٹر ہی میں تھا کہ ایک شب کھا پی کر لیٹا اور آنکھ لگی ہی تھی کہ کسی نے باہر دروازہ کھٹکھٹایا۔ میرا دل دھڑکا کہ نہ معلوم کون سی آفت ہے۔ اندر ہی سے پوچھا کون ہے؟ تو جواب ملا دروازہ کھولئے۔ آواز جانی پہچانی معلوم ہوئی۔ کمرہ کا دروازہ کھول کر پھر پوچھا کون ہے تو جواب ملا نصیر خاں۔ تب میں نے باہری دروازہ کھولا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ نصیر خاں صاحب ہیں اور ان کے ساتھ شمس الزماں صاحب جن کا ایک بازو اور سر بندھا چھنا تھا۔ اندر بلایا پوچھا کہ ماجرا کیا ہے۔ معلوم ہوا کہ چنڈی گڑھ میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا اجلاس ہو رہا تھا اس میں رپورٹنگ کے لیے شمس صاحب آئے تھے اسی اثناء میں کہیں سیڑھی سے پھسل کر گر گئے، کافی چوٹ آئی اور باندھ چھان کر دہلی پہنچا دیے گئے۔ اگلے دن کلکتہ جانے والے تھے چنانچہ سردی میں اتنی رات کو خانصاحب مجھ سے ملاقات کرانے کے لیے وہاں آ گئے تھے اور کچھ ہی دیر بعد وہ لوگ چلے گئے لیکن خانصاحب اگلے اتوار کو مجھے اوکھلا چلنے کی دعوت دے گئے۔

اس وقت اوکھلا میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے علاوہ کینال ہیڈ بھی تھا جسے پکنک اسپاٹ کی حیثیت حاصل تھی۔ چھٹیوں کے دن اور عید بقرعید کے موقع پر پرانی دلی والے بسوں میں بھر بھر کر یہاں آتے اور جمنا کے کنارے دن گزار کر شام تک واپس جاتے۔ اس کے علاوہ بٹلہ ہاؤس کی مختصر سی آبادی تھی یعنی ایک سڑک کے کنارے رہائشی مکانات اور چند دکانیں۔ وہی سڑک آگے جو گابائی کو گئی تھی اور پھر بڑھ کر جمنا ندی کے بالکل کنارے دور تک پھیلے ہوئے اس جنگل میں گم ہوگئی تھی جو بعد میں ذاکر نگر نام کی ایک بہت بڑی کالونی اور مسلم آبادی میں تبدیل ہو گیا۔

پرانی دلّی میں ترکمان گیٹ کے علاقے کی صفائی اور توڑ پھوڑ کے بعد وہاں کی ڈیریاں تو بالعموم اس علاقے میں منتقل ہوگئی تھیں لیکن دوسرے لوگ بھی اکا دکا آباد ہونے

لگے تھے انہی لوگوں میں نصیر خان صاحب کے برادر نسبتی بھی شامل تھے۔ چنانچہ خان صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ اتوار کو میرے سالے کی بچی کا ختم قرآن ہے بکرا کٹے گا اور بریانی بنے گی، ہمارے گھر کے سب لوگ جائیں گے تم بھی چلو اچھی تفریح رہے گی۔ میں نے حامی بھر لی۔ اتوار آیا اور ہم لوگ اوکھلا پہنچے۔ یہ اوکھلا سے میرا پہلا تعارف تھا اور بڑا اچھا استقبال تھا۔ سامنے دریا بہہ رہا تھا اس کے کنارے کنارے کچھ مکانات بنے ہوئے تھے، چارپائیاں پڑی ہوئی تھیں۔ وہیں ہم لوگ اکٹھا ہوئے، باتیں کرتے رہے، بریانی کھائی اور شام ہونے تک واپس آ گئے۔ اب دریا اس جگہ سے تقریباً ایک میل دور چلا گیا ہے اور وہاں تک گھنی آبادی ہوگئی ہے۔

میں نے ماہ جنوری ۱۹۷۶ء کے اواخر تک ہاشمی صاحب کے کوارٹر میں قیام کیا لیکن دریں اثناء مکان کی تلاش جاری رکھی تاکہ مناسب وقت پر بچوں کو کلکتہ سے بلاسکوں۔ ہاشمی صاحب کہتے کہ مکان کے لیے بلاوجہ فکرمند ہو جب تک چاہو یہاں رہو۔ ایک روز گفتگو کے دوران میں نے ان سے کہا کہ میں دہلی کے علاقوں سے بالکل نا آشنا ہوں کچھ بتایئے تو سہی کہ کس علاقے میں رہائش ہونی چاہیے تو انھوں نے کہا کہ میں نے تمہارے لیے اوکھلا تجویز کیا ہے۔ اوکھلا سے میرا سرسری تعارف تو ہو ہی چکا تھا۔ اسی اثناء میں نشورؔ واحدی صاحب کا عنایت نامہ صادر ہوا جس میں انھوں نے لکھا تھا کہ میرے چھوٹے بھائی روض الرحمٰن واحدی جامعہ ملیہ میں ہیں اور وہیں اسٹاف کوارٹر میں رہتے ہیں جا کر ان سے ملو۔ چنانچہ اتوار آتے ہی میں نے اوکھلا کے لیے بس پکڑی۔ اس وقت یہاں جامعہ کی صرف پرانی عمارتیں تھیں اور اسٹاف کوارٹر اوکھلا بازار کے عقبی حصہ میں ایک احاطے کے اندر تھے۔ جامعہ کے بہتیرے بلاک اور کوارٹر ۸۰ء والے عشرے میں تعمیر ہوئے ہیں۔

بس جب اوکھلا پہنچ کر رکی اور سب مسافر اتر گئے تو میں نے ڈرائیور سے پوچھا کہ جامعہ اسٹاف کوارٹر کہاں ہے۔ اس نے پوچھا کہ کس کے ہاں جانا ہے۔ میں نے بتایا کہ واحدی صاحب کے ہاں تو اس نے کہا ابھی بیٹھے رہیے اور بس کو لے کر اسٹاف کوارٹر

والی سڑک پر چلا جس پر کوئی ٹرافک نہیں تھی۔ کوارٹر کی باؤنڈری کے قریب بس روک کر اشارہ کیا کہ وہ ان کا کوارٹر ہے۔ میں نے شکریہ ادا کیا اور اتر پڑا۔ اس وقت اوکھلا کی آبادی اتنی ہی تھی کہ ڈی ٹی سی کا اسٹاف بھی خاص خاص لوگوں کو جانتا پہچانتا تھا۔ بسوں میں بھی کوئی خاص بھیڑ بھاڑ نہیں ہوتی تھی۔ اب تو خدا کی پناہ۔ اوکھلا سے چلنے والی بسیں روانگی کے وقت سے بہت پہلے ہی بھر جاتی ہیں اور برا حال ہوتا ہے۔

میں واحدی صاحب کے کوارٹر پر پہنچا تو ان کی سب سے بڑی صاحبزادی رضیہ جو ایم اے (عربی) کی طالبہ تھیں باہر ہی ایک کرسی پر بیٹھی جاڑے کی دھوپ سینک رہی تھیں۔ پہلا تعارف انہی سے ہوا پھر واحدی صاحب سے جو سارے اوکھلا میں بابو جی کے نام سے جانے پہچانے جاتے تھے، ان کے بچے بھی انہیں بابو جی کہتے تھے۔ وہ ٹیچنگ کالج کے آفس میں تھے اسی لیے بابو جی کہلانے لگے۔ وہ اپنی کئی خوبیوں کی وجہ سے مقبول و معروف تھے۔ ایک تو ان کی ذاتی زندگی تھی جس میں باجماعت نماز کی سخت پابندی اور اوراد ووظائف کی کثرت تھی۔ کلین شیو لیکن صوفی مشرب، مرنجان و مرنج۔ دوسری طرف ان کا معاشرتی رویہ تھا جس کا اظہار دو طرح سے ہوا کرتا تھا۔ ایک تو یہ کہ جامعہ میں سرکاری غیر سرکاری کوئی تقریب ہو اس کے اہتمام و انتظام میں پیش پیش یا اسٹاف میں سے کسی کے ہاں کوئی تقریب ہو اس میں بھی مشاورت سے لے کر عمل درآمد تک آگے آگے۔ دوسرے اعزہ و اقارب کے تئیں ان کا رویہ۔ جو دہلی آیا اور اس کی رسائی کسی طرح اوکھلا تک ہوئی تو بس اس کو قیام کا پہلا غیر مشروط آفر بابو جی کی طرف سے ملتا چنانچہ ان کے کوارٹر میں باہری کمرہ یا ڈرائنگ روم اور اوپر بابو جی کا کمرہ بھی اکثر مہمان خانہ نظر آتا۔

اسی روایت کے مطابق واحدی صاحب نے پہلی ہی ملاقات میں مشورہ دیا کہ وہاں ساؤتھ ایونیو میں کیا تنہا پڑے ہو یہیں آجاؤ۔ اس کے بعد کئی اتوار ایسے گزرے کے میں اوکھلا چلا آتا اور شام کو واپس جاتا بالآخر جنوری کی آخری تاریخوں میں میں نے ساؤتھ ایونیو سے اپنا بستر لپیٹا، ایک ٹیکسی میں رکھا اور اوکھلا آکر بابو جی کے کوارٹر میں پڑاؤ

ڈالا۔ کوئی پانچ ہفتے انہی کے ہاں گزارے۔ دریں اثناء مکان کی تلاش میں لگا رہا۔ عموماً اتوار کو بابو جی مجھے لے کر نکلتے اور مکان کی تلاش میں بٹلہ ہاؤس سے لے کر نیوفرینڈس کالونی تک گشت کرتے۔

دہلی آنے کے بعد ابتدائی رابطوں میں ایک قابل ذکر شخصیت خواجہ عبدالخالق صاحب کی تھی جو حکومتِ ہند کے پریس انفارمیشن بیورو (پی آئی بی) میں اردو ڈسک کے انچارج تھے۔ وہ اسی حیثیت سے کئی برس کلکتہ میں گزار چکے تھے اور وہاں سے ٹرانسفر ہوکر دہلی آئے تھے۔ خواجہ صاحب اصلاً کانپور کے رہنے والے تھے۔ وہاں کی ایک مشہور سیاسی اور سماجی شخصیت خواجہ عبدالسلام صاحب کے صاحبزادے تھے۔ میرے ماموں جان مولوی حفیظ الرحمٰن صاحب ایمنؔ نے بچپن سے ان کو پڑھایا تھا بلکہ از اول تا آخر ان کے اتالیق رہے تھے۔ خواجہ صاحب ہمیشہ بڑے احترام کے ساتھ ان کا نام لیتے۔ خواجہ صاحب کے چچا خواجہ عبدالواجد صاحب کرائسٹ چرچ کالج میں میرے فارسی کے استاد تھے۔ اس طرح ہم لوگوں کے درمیان ایک برادرانہ رشتہ قائم تھا۔ میں دہلی آیا تو ہمارے آفس کے قریب ہی بنگالی مارکیٹ کے علاقے میں ان کا کوارٹر تھا۔ چھٹیوں میں کبھی کبھی ان کے یہاں بھی چلا جاتا تھا۔ ہمارے یہ تعلقات برابر قائم رہے۔

فروری کا مہینہ اور مارچ کے آٹھ دس روز واحدی صاحب کے مہمان خانے میں گزرے۔ اسی اثناء میں والدہ نے گھر سے اس لڑکے کو بھیج دیا جو وہاں بطور ملازم کام کیا کرتا تھا تاکہ یہاں مکان مل جانے پر مجھے کھانے پینے کی تکلیف نہ ہو وہ بھی ہمارے ساتھ واحدی صاحب کے ہاں مہمان ہوگیا۔ مارچ آتے ہی کلکتہ سے ہمشیرہ نے اطلاع دی کہ وہ آرہی ہیں کیونکہ لڑکیوں کے تعلیمی سلسلے کی وجہ سے جون جولائی تک میرے اہل وعیال کا کلکتہ میں قیام لازمی تھا۔ اتفاق ایسا کہ بابو جی کے کوارٹر کے سامنے ہی جامعہ ٹیچرس کالج کے ایک استاد، دت صاحب کا مختصر سا خام مکان موجود تھا جس کی تعمیر نو کا منصوبہ تو تھا لیکن اس میں دیر تھی۔ بابو جی نے ان سے بات کرکے دوسو روپیہ ماہوار کرائے پر مجھے دلا دیا۔

آپا کی آمد سے دو روز پہلے یہ مکان طے ہوگیا اور میں نے جلدی جلدی گھر داری کا مختصر سامان اکٹھا کیا مثلاً دو تین چارپائیاں، دریاں، چادریں، کچھ پلیٹ پیالے اور اسی قبیل کی چیزیں۔ اگست تک آپا کا قیام رہا پھر میرے اہل وعیال آ گئے اور آپا چلی گئیں اس کے بعد ۱۹۷۸ء تک اسی مکان میں ہمارا قیام رہا اور ہم مستقلاً کسی معقول رہائش کی تلاش میں سرگرداں رہے۔ مہینے کی پہلی تاریخ کو دت صاحب یا ان کی بیوی کرائے کے لیے آجاتیں، دوسری تاریخ کے آنے تک تو وہ لوگ بہت ہی پریشان ہوجاتے لگتا کہ ان کے گھر میں فاقے کی نوبت آ گئی ہے۔ تھوڑے ہی دنوں بعد وہ ہم لوگوں کے قیام کی وجہ سے فکر مند بھی رہنے لگے تھے اور اصرار کرنے لگے تھے کہ ہم کسی طرح مکان چھوڑ دیں لیکن میں اپنی اس بات پر قائم تھا کہ جب تک کوئی بہتر متبادل نہ مل جائے ہم یہاں سے جانہیں سکتے۔

قصہ یوں تھا کہ دت صاحب کا وہ مکان دو حصوں میں بٹا ہوا تھا ایک حصہ میں ہم تھے، دوسرے حصہ پر ان کی پہلی بیوی قابض تھیں جو بوڑھی ہوچکی تھیں اور ان کے کوئی اولاد نہ تھی۔ ایک بھتیجے کو گود لے لیا تھا اور اس کی پرورش کررہی تھیں جو بڑا ہوکر مکان کے اس نصف حصہ پر قابض ہوسکتا تھا۔ چنانچہ کبھی کبھی بڑی بی کی جم کر پٹائی ہوتی۔ یہ ان لوگوں کا داخلی معاملہ تھا اس لیے کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا تھا لیکن جب ان کی حالت خراب ہوتی تو ہم لوگ دوا درمن یا دانے پانی سے حسب توفیق ان کی خدمت کرتے۔ ہم لوگوں کی یہ حرکت ہمارے مالک مکان کو ناگوار تھی اور وہ چاہتے تھے کہ کسی طرح ہم ان کا مکان خالی کردیں۔

اس مکان میں ایک ہی کمرہ تھا وہ بھی مختصر اس میں لڑکیوں کی چارپائیاں ڈال دی گئیں اور ہم لوگ برآمدے میں جاڑا گرمی گزارنے لگے۔ چقیں ڈال رکھی تھیں لیکن دہلی کی دو سردیاں اس برآمدے میں ہم لوگوں نے جس طرح گزاریں وہ ہم ہی جانتے ہیں۔ اکثر جسم میں درد ہوجاتا کبھی کوئی بازو کبھی کوئی ٹانگ اکڑ جاتی مگر ہمارے لیے کوئی چارۂ کار نہیں تھا۔ اوکھلا سے ایک منی بس نئی دہلی ریلوے اسٹیشن کے لیے بھی جاری ہوگئی تھی جو کناٹ پلیس سے گزرتی تھی اس سے آفس جانے آنے کا آرام ہوگیا۔

نیا آفس:

دفتر میں حالات و معاملات اپنی ڈگر پر چلتے رہے جو بڑی ناہموار تھی اور اس راہ میں ہماری ساری سابقہ اور موجودہ صلاحیتوں کی اور قوت برداشت کی بھی آزمائش تھی۔ ابتدائی چند روز تو میں خاموشی سے مشاہدے کرتا رہا کہ یہاں کام کس طرح ہو رہا ہے۔ جو مضامین اخباروں کو بھیجے جا رہے تھے اور جو شائع ہوتے تھے ان پر مبنی ایک ہفتہ وار رپورٹ کا رواج تھا پھر انہی رپورٹوں پر مبنی ایک ماہانہ رپورٹ تیار کی جاتی تھی اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ امریکن افسران پریس سیکشن کی کارگزاریوں سے واقف رہیں۔ انگریزی میں جو کچھ آتا جاتا تھا وہ تو خود ہی ان کی نظر میں رہتا تھا لیکن اردو، ہندی اور پنجابی زبانوں میں ساری کارکردگی کے لیے انھیں متعلقہ ایڈیٹروں کی رپورٹوں پر ہی انحصار کرنا پڑتا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ان رپورٹوں کی تیاری کے لیے کوئی باقاعدہ نظام نہیں تھا۔ ایڈیٹر حضرات ڈیسک کلینڈر پر کچھ نوٹ کرلیا کرتے تھے اور اسی پر مبنی یا محض فرضی ہفتہ وار رپورٹ دے دی جاتی جس کا اصل صورت حال سے تعلق برائے نام ہی ہوتا تھا۔ یہ بات مجھے اصولاً ناپسند تھی اور میں خود اپنے دستخط سے کوئی غلط تحریر نہیں دینا چاہتا تھا اس لیے میں نے تہیہ کرلیا کہ کام ہی اس قدر کیا جائے کہ اصل رپورٹ روشن ہو اور اس پر کسی طرح کی انگشت نمائی کی نوبت نہ آئے۔ یوں بھی میرے حق میں یہی بات مناسب تھی کہ میری کوئی کمزوری دوسروں کے ہاتھ میں نہ آئے خصوصاً اس لیے کہ میرے اوپر کول صاحب اور نیچے ملک صاحب تھے۔

دسمبر ۱۹۷۵ء کا مہینہ تو جوں توں گزر گیا لیکن جنوری ۱۹۷۶ء کے آتے ہی میں نے ایک رجسٹر رکھا جس پر ہر روز کی کارروائی تاریخ وار درج کرنے لگا پھر ہمارے جو مضامین اخباروں میں چھپتے ان کا تاریخ وار اندراج کرنے لگا اور ان کے تراشے بھی رکھنے لگا۔ اس کارروائی میں سب کی بندش نظر آ رہی تھی چنانچہ ملک صاحب نے اس کی سخت مخالفت کی لیکن میں نے اسے مسترد کر دیا اور اپنے روزنامچے کے اندراجات پر سختی سے قائم رہا دریں اثناء ملک صاحب دفتری ساتھیوں اور بیرونی دوستوں، عزیزوں کو بکثرت بلا کر

ہمارے کمرے میں چائے ناشتہ سے ان کی تواضع کرنے لگے جس سے ان کی غرض و غایت اس فرق کو ظاہر کرنا تھا جو اس کمرے میں ہمارے اور ان کے فرنیچر اور رکھ رکھاؤ کے درمیان موجود تھا۔ ہر شخص سے میرا پہلا تعارف وہ ان الفاظ میں کراتے کہ یہ ہمارے ساتھی ہیں جو کلکتہ سے آئے ہیں لیکن میں یہ سب نظرانداز کر کے کام کی دھن میں تھا۔ روز صبح کو ایک مضمون کا ترجمہ کرنے کے بعد گیارہ بجے کے قریب کینٹین میں چائے پینے چلا جاتا۔ یہ نتیجہ تھا دراصل اخبار میں وقت کی پابندی اور شدت کے ساتھ کام کرنے کی عادت کا۔ اس کے بعد میری کوشش یہ رہتی کہ جو کچھ بھی میں لکھوں وہ اسی دن کتابت کے بعد چھپ کر اخباروں کو چلا جائے۔

اس شدت کے ساتھ کام کرنے کی وجہ سے جو نتائج ماہانہ رپورٹوں میں سامنے آنے لگے وہ سب کے لیے حیران کن تھے اور یاروں نے یہ سوچنا شروع کر دیا کہ کہیں یہ شخص گھپلے بازی میں دوسروں سے سبقت تو نہیں لے جانا چاہتا۔ چنانچہ ایک روز تو ہمارے پریس چیف کول صاحب نے مجھے بلا کر صاف صاف کہہ دیا کہ رضوان بھائی یہ جو کچھ آپ نے رپورٹ میں لکھا ہے اس پر کوئی یقین کرسکتا ہے۔ میں نے کہا ٹھہر جایئے پھر میں نے رجسٹر لا کر ان کے سامنے رکھ دیا اور اخبارات کے تراشے بھی۔ بس انھوں نے سر پکڑ لیا اور سر جھکائے بیٹھے رہے میں اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا آیا۔ میں سمجھتا ہوں اسی دن کول صاحب نے مجھ سے چھٹکارا حاصل کرنے کا فیصلہ کرلیا تا کہ آگے چل کر میں سب کے لیے دردسر نہ بنوں۔ اتفاق ایسا ہوا کہ ابھی مجھے کام کرتے چھ سات ماہ گزرے ہوں گے کہ ہمارے پریس آفیسر یا ڈائرکٹر مسٹر میرین کا تبادلہ ہوگیا اور وہ واشنگٹن واپس چلے گئے۔ ان کی جگہ مسٹر باب مِلر آئے۔ اب وہ نئے افسر تھے ان کو تو جس کے بارے میں جو کچھ بتایا دیا گیا ہوگا اسی روشنی میں انھوں نے دیکھا ہوگا۔ میرے کمرے میں آ کر میری پوزیشن دیکھ کر بھی میرے بارے میں کوئی اچھی رائے نہیں قائم کی ہوگی۔

میری خاموشی اور دھیمی چال کی وجہ یہ تھی کہ میرا مقابلہ ملک صاحب سے نہ تھا

بلکہ کول صاحب سے تھا اور غالباً کول صاحب نے ملک کو یہ تاثر دے دیا تھا کہ اس شخص کا چل چلاؤ ہے۔ یہ حضرت اس بات کو بھی ہضم نہ کر سکے اور باہر بعض اخبار نویسوں سے بھی اس کا اظہار کر دیا۔ یہ کسی ایڈیٹر کے لیے یقیناً سبکی کی بات تھی لیکن میں نے نرم روی کی پالیسی جاری رکھی۔اس حال میں گیارہ مہینے گزر گئے، پروبیشن یعنی آزمائشی مدت کے بعد مستقلی کا وقت آ گیا یہی وہ موقع یا مرحلہ تھا جب کول صاحب بھرپور وار کر سکتے تھے مستقلی کے بعد یہ کام ذرا مشکل ہو جاتا۔

یہی وہ اندیشہ تھا جس کا اظہار میں نے انٹرویو کے درمیان مسٹر میرین سے کیا تھا دور نزدیک مجھے یہ عندیہ دے دیا گیا کہ اردو ایڈیٹر کی جگہ باقی نہیں رہے گی اور یہ کہ مجھے باہر کہیں کام کی تلاش شروع کر دینی چاہیے۔ میں خاموشی سے یہ سب سنتا رہا لیکن ۲۲ر نومبر ۱۹۷۶ء کو وہ سرخ دن بھی آ گیا جب سہ پہر میں مسٹر ملر نے مجھے اپنے کمرے میں طلب کیا جہاں ایکزیکیوٹیو آفیسر مسٹر کرائٹزر بھی موجود تھے۔ملر صاحب نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔ پھر چند معذرتی کلمات کے ساتھ ایک لفافہ مجھے پیش کیا۔اس میں ایک فرمان میرے نام تھا۔عبارت مختصر تھی ''دفتر کو اردو ایڈیٹر کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ پوزیشن ختم کی جاتی ہے۔ہمیں اس کا افسوس ہے۔ہم آپ کے بہتر مستقبل کے لیے دعا گو ہیں۔''اس پر ایکزیکیوٹیو آفیسر مسٹر کرائٹزر کے دستخط تھے۔

میں نے اسے اطمینان سے پڑھا پھر دریافت کیا کہ جناب اس میں کوئی تاریخ نہیں درج کی گئی ہے۔ اس پر وہ دونوں حضرات ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے بالآخر کرائٹزر صاحب نے کہا کہ سال کے آخر تک سمجھو یعنی ۳۱ر دسمبر تک۔ بہ الفاظ دیگر مجھے پانچ ہفتوں کی مہلت دی گئی۔ میں نے ان حضرات کا شکریہ ادا کیا اور کمرے سے باہر آ گیا۔ میرے سیکشن میں ساتھیوں کو پتہ تھا چنانچہ ان میں سے بعض کمرے کے باہر گیلری میں موجود تھے انھیں توقع تھی کہ میں آنسو پونچھتا ہوا باہر آؤں گا لیکن میں مسکراتا ہوا نکلا۔ اس پر لوگوں کو نہ صرف حیرت ہوئی بلکہ پنجابی ایڈیٹر کرپال سنگھ تو ہمیشہ اس کا تذکرہ آنے پر

یہی کہتے کہ رضوان اللہ تم اس وقت مسکرا کیسے رہے تھے۔ میرا جواب یہ تھا کہ رونے سے تو بھیک بھی نہیں ملتی اور مسکراہٹوں کے ساتھ دنیا کو فتح کیا جاسکتا ہے۔ بہرحال وہ دن بھی زندگی میں ایک موڑ ہی تھا۔ اسی وقت کرپال سنگھ کے متعلق چند باتیں مناسب معلوم ہوتی ہیں۔ انتہائی زندہ دل انسان تھے، لاہور کی صحبتیں اٹھائے ہوئے تھے۔ روز صبح کو گرودوارے جاتے تھے۔ میری طویل آزمائش کے دوران وہ مجھ سے کہتے کہ میں ہر روز پانچ گرودواروں میں جاتا ہوں اور ماتھا ٹیک کر واہ گرو سے کہتا ہوں کہ رضوان بے قصور ہے۔

اس روز شام کو گھر آیا، حسبِ معمول فراغت کے بعد چائے پی اور بستر پر دراز ہوکر آرام کرنے لگا۔ اتنے میں کسی نے زنجیر کھٹکھٹائی۔ نکل کر دیکھا تو دت صاحب کھڑے تھے اور فرما رہے تھے کہ مکان خالی کردو۔ میں نے پوچھا ابھی؟ تو کہنے لگے ابھی نہیں۔ دو چار دن میں یا مہینے کے آخر تک۔ میں نے کہا بہت اچھا اور وہ چلے گئے۔ میں پھر آ کر لیٹ گیا اور ہنسنے لگا۔ بیوی نے اس طرح ہنسی کی وجہ پوچھی تو میں نے کہا کہ آج عجب دن تھا۔ دفتر والے کہتے ہیں دفتر چھوڑ دو۔ مالک مکان کہتا ہے گھر چھوڑ دو۔ یہ سن کر وہ غریب سناٹے میں آ گئی۔ پھر میں نے واقعات کی تفصیل بتائی اور اپنی ڈائری اٹھا کر لال روشنائی سے اس تاریخ کے صفحہ پر جلی حروف میں لکھ دیا کہ ''میں نہ گھر چھوڑوں گا نہ دفتر۔'' اس کے بعد زندگی نے عجب ڈھب اختیار کیا۔ دن بھر دفتر میں جم کر کام کرنا سب سے ملنا جلنا اور بظاہر بالکل بے غم رہنا اور گھر آ کر رات بھر اختلاج میں پڑا رہا اور بے اختیاری کے آنسو پونچھتا جاتا۔ کول صاحب مجھ سے فرماتے کہ تم بیکار یہاں دفتر میں وقت ضائع کر رہے ہو جاؤ باہر کہیں کام تلاش کرو یہاں سے تو تنخواہ ملتی رہے گی۔ میں نے ان سے کہا کہ کول صاحب میں کام کے آخری دن بھی ساڑھے پانچ بجے تک کام کروں گا۔ آپ اطمینان رکھئے۔

لیکن وہ مجھے باہر بھیجنے پر تلے ہوئے تھے۔ دو ایک اخباروں میں انھوں نے میرے لیے سفارش بھی کی۔ ان کے اصرار پر میں وہاں گیا بھی لیکن نوکری کی بات کسی سے نہ کی۔ وقت گزرتا گیا اور دسمبر ۱۹۷۶ء ختم ہونے کو آیا تو مجھے انتظار تھا کہ شاید علیحدگی کا

کوئی پروانہ ملے گا۔ چنانچہ ایک دن ایکز یکیوٹیو آفس سے ایک بند لفافہ موصول ہوا۔ میں تو اس کے لیے تیار ہی تھا مگر اس میں بات کچھ اور ہی تھی۔ میری عارضی ملازمت میں تین ماہ کی توسیع کر دی گئی تھی۔ بہ الفاظ دیگر تین ماہ کی مزید مہلت۔

دریں اثناء کئی اور باتیں دفتر کے اندر ہوئیں۔ ایک تو یہ کہ اردو، ہندی اور پنجابی کے تینوں ایڈیٹروں اور ان کے تینوں اسسٹنٹ کو ایک بڑے کمرے میں منتقل کر کے ایک ہی جگہ بٹھا دیا گیا۔ ملر صاحب کا خیال تھا کہ اس طرح ایک پریس یونٹ کی کارکردگی بہتر ہوگی۔ دوسرے یہ کہ کچھ اسٹاف واقعی کم کرنے کی بات تھی اس سلسلے میں کتر بیونت ہو رہی تھی۔ جن لوگوں کی پوزیشن مضبوط تھی وہ بھی پوری طرح مطمئن نہیں تھے ہمارے جیسے کچے لوگوں کا سوال ہی کیا۔ دراصل حکومت امریکہ کی ملازمت میں یہ بڑا الجھنہ رہتا ہے جس کے مثبت اور منفی دونوں پہلو ہیں۔ بڑے لمبے چوڑے ضابطے ہیں جن کا اطلاق بڑا لچکدار ہوتا ہے چنانچہ مقامی افسروں کے رویہ پر بہت کچھ منحصر ہوتا ہے جس کو بچانا چاہتے ہیں اس کو بچانے کے سو حیلے دریافت کر لیتے ہیں اور جس سے دلچسپی نہیں ہوتی اس سے مجبوری کا اظہار کر کے معذرت کر لیتے ہیں اور اس کے واجبات بڑی فراخ دلی کے ساتھ جلد از جلد ادا کر دیتے ہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ وقتاً فوقتاً بجٹ کی حدود و قیود کے پیش نظر بنیادی ہدایات کر دی جاتی ہیں کہ ملازمین کی تعداد یا اخراجات میں اتنے فیصد کمی کر دی جائے۔ میرے دورانِ ملازمت میں اس طرح کے کئی جھٹکے آئے۔

دراصل اس عمل میں ایک حکمت عملی بھی پوشیدہ ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ نئے تقاضے بھی سامنے آتے ہیں اور نئی صلاحیتوں والے لوگوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ پرانے ڈھرے پر کام کے عادی لوگ نئے حالات اور نئی ضرورتوں سے ہم آہنگ نہیں ہو پاتے چنانچہ چھٹنی کے موقع پر ایسے لوگوں کو چلتا کر دیا جاتا ہے جو واقعی غیر ضروری یا بے وقت ہو چکے ہوتے ہیں۔ پھر آگے چل کر اگر متعلقہ محکمے کو آدمیوں کی ضرورت ہوتی ہے تو وہ ایسے لوگوں کو لے لیتا ہے جو وقت کے تقاضے پورے کرتے ہوں گویا اس عمل کے ذریعہ

حکومت کے محکموں کو نیا خون ملتا رہتا ہے۔ یہ بات بالکل اسی طرح ہے جیسے نئی ٹیکنالوجی کے لیے تربیت یافتہ لوگوں کی ضرورت ہو۔ مثلاً کمپیوٹر کی کارفرمائی کے بعد پرانے ٹائپسٹ بیکار ہوگئے ان میں سے وہی ٹھہر سکے جنھوں نے نئی ضرورتوں کے مطابق صلاحیتیں پیدا کرلیں گویا یہ بھی جہد بقا میں موزوں ترین کا انتخابی عمل ہے۔

میرا مشاہدہ ہے کہ جب ایسا کوئی موقع آتا تو مقامی امریکی افسران کا رویہ بالعموم ہمدردانہ ہوا کرتا تھا وہ بہت ساری کارروائیوں اور پروگراموں میں تخفیف کرکے اسٹیشنری تک کم کرکے جس قدر آدمیوں کو بچاسکتے بچانے کی کوشش کرتے یعنی آدمی کم کرنے کے بجائے خرچ کم کرتے اس کے بعد دوسری حکمتیں بھی کرتے مثلاً متعلقہ سال کے دوران متوقع یا واقعی ریٹائر ہونے والوں کی خالی آسامیوں کو پُر نہیں کرتے یا جن لوگوں کا ریٹائر منٹ قریب ہوتا انھیں زیادہ معاوضہ کی پیشکش کرکے جلد ریٹائر ہوجانے کی ترغیب دیتے تاکہ اس طرح ان لوگوں کو بچالیا جائے جن کی مسافت طویل اور منزل دور ہے۔ اس طرح ریٹائر ہونے والے نقل وطن کرکے امریکہ جانے کے لیے گرین کارڈ وغیرہ کی سہولتیں طلب کرتے تو ان کی درخواستوں پر بھی مثبت اور ہمدردانہ رویہ اختیار کیا جاتا۔ دشواری جب بھی پیش آئی مقامی ملازمین کے رویہ کی وجہ سے پیش آئی یعنی اگر کوئی ہندوستانی افسر اپنے زیردستوں میں سے کسی کو ناپسند کرتا تو اس سے گلا چھوڑانے یعنی اس کا جھٹکا کرنے کا یہی بہترین موقع ہوا کرتا۔ اس کی کارگزاری خراب ظاہر کی جاتی یا اس کو غیر ضروری قرار دینے کے جتن کیے جاتے۔ امریکیوں کی مشکل یہ ہے کہ انھیں بہرحال انہی افسران سے کام لینا ہوتا ہے اور انہی پر بھروسہ کرنا ہوتا ہے اس لیے حتی الوقع انھیں ناراض نہیں کرتے۔ مزید یہ کہ امریکی افسران آتے جاتے رہتے ہیں ان کی مدتِ قیام زیادہ سے زیادہ چار سال ہوتی ہے اس لیے نظامِ کار میں تسلسل مقامی لوگوں ہی کی معرفت قائم رہتا ہے۔

امریکی دفتری نظام میں ضابطے بھی بہت ہیں۔ امریکیوں کی ہوشیاری یہ ہے کہ جب جیسا موقع ہوتا ہے اسی کے مطابق نرم یا سخت ضابطوں کا اطلاق کردیتے ہیں۔ اسے

حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے انتظامی ڈھانچے میں ضروری لچک بھی کہا جاسکتا ہے۔ اسی طرح ملازمین کے حقوق کے تحفظ کے لیے بھی ضابطوں کا پورا نظام ہے۔ ضرورت کے تحت ملازمین ان ضابطوں کا سہارا لیتے ہیں۔ مثلاً ایک ضابطہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص پچیس برس ملازمت کر چکا ہے اور ابھی ریٹائرمنٹ کی عمر کو نہیں پہنچا ہے تو اس کو برطرف نہیں کیا جاسکتا۔ اس کی برطرفی کی دو استثنائی صورتیں ہیں یعنی یہ کہ اس سے کوئی قابل تعزیر غلطی سرزد ہوئی ہو یا وہ جس ذمہ داری پر فائز ہے اس کی واقعی ضرورت باقی نہ رہ گئی ہو۔ میرے معاملے میں بھی یہی ثابت کرنے کی کوشش کی جارہی تھی کہ اردو ایڈیٹر کی ضرورت باقی نہیں رہی اور یوں بھی میری ملازمت مستقل نہیں ہوئی تھی اس لیے مجھے برطرف کرنے میں کوئی قباحت نہیں تھی اور میں کسی معاوضے کا مستحق بھی نہیں تھا کہ جس کا دفتر پر مالی بار ہوتا۔

ملازمین کے مفادات کے تحفظ کے لیے ضابطوں سے قطع نظر ایک تنظیم بھی موجود ہے یعنی امریکن ایمبسی کے ملازمین کا فیڈریشن جس کے تحت کئی ایسوسی ایشن ہیں ان میں سے ایک یو ایس آئی ایس کے ملازمین کا ایسوسی ایشن بھی ہے جس سے میں وابستہ تھا۔ دراصل ملازمین کو انجمن سازی کی اجازت بھی امریکی سفارت خانے کی ایک غیر معمولی خصوصیت ہے جو کسی اور سفارت خانے میں نہیں نظر آتی۔ سارے ملازمین نہ تو ملازمت کے سارے ضابطوں کی موشگافیوں سے آگاہ ہوتے ہیں نہ اعلیٰ ترین افسروں سے نبرد آزما ہونے کی ہر کسی میں صلاحیت ہوتی ہے اس لیے ایسوسی ایشن ان کی نمائندگی کرتا ہے۔ گفت وشنید کا سلسلہ اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک ساری حجتیں تمام نہ ہوجائیں۔ ایک سطح پر ناکامی کے بعد اس سے ارفع اور پھر اس سے ارفع یعنی ایمبیسی میں اعلیٰ ترین سطح تک معاملہ کو لے جایا جاسکتا ہے۔ اس کام میں ایسوسی ایشن بڑا مددگار تھا۔ اس کے لیے امریکیوں کی برداشت واقعی قابلِ تعریف ہے۔

میرے معاملے میں بھی ایسوسی ایشن نے مداخلت کی۔ بات یوں تھی کہ ہر کوئی سمجھ رہا تھا کہ میرے ساتھ ناانصافی ہورہی ہے اور بالعموم کول صاحب اس کے ذمہ دار

تصور کیے جا رہے تھے۔ وہ بذاتِ خود اپنے ساتھیوں میں مقبول نہیں تھے بلکہ ان کے بعض سینئر ساتھیوں نے ان کے ساتھ عدم تعاون کا رویہ اختیار کر رکھا تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے پیشرو پریس چیف کی سبکدوشی کے بعد پریس سیکشن میں کم سے کم تین سینئر انگلش ایڈیٹرس موجود تھے جو اس جگہ پر فائز کیے جا سکتے تھے لیکن داخلی وجوہ جو بھی رہی ہوں غالباً انہی لوگوں کی سرکوبی کے لیے مسٹر میرین نے کول صاحب کو جو سینئر اردو ایڈیٹر تھے ترقی دے کر پریس چیف بنا دیا۔ وہ پریس چیف تو بن گئے لیکن آگے ان کے راستے میں پھسلن بہت تھی جب کارکردگی میں دشواریاں پیش آنے لگیں تو میرین صاحب کو بھی اپنی غلطی کا احساس ہوا اور وہ جھنجھلاہٹ میں کول صاحب سے ناراض رہنے لگے یہی وجہ تھی کہ انھوں نے ان کے مشورے کے بغیر ہی کلکتہ جا کر میرا انٹرویو لیا اور میرا تقرر کر دیا۔ یہ بات تو کول صاحب کو گراں تھی ہی اس کے علاوہ ان کا ایک اور کھیل بگڑ گیا۔ مسٹر میرین کے چلے جانے کے بعد انھوں نے چھٹنی والے موقع کو غنیمت جانا اور مجھے ہٹا کر اردو ایڈیٹر والی جگہ خالی رکھنا چاہتے تھے تاکہ بدرجۂ مجبوری پھر نیچے خالی کرسی پر کھسک آئیں جس پر مجھے بٹھا کر مسٹر میرین نے بظاہر ان کا راستہ بند کر دیا تھا۔ کول صاحب کے اس کھیل کو ہر کوئی سمجھ رہا تھا لہٰذا کچھ میرے ساتھ ہمدردی میں اور کچھ کول صاحب کے ساتھ بغض کی بنا پر چند سینئر حضرات میرے طرفدار ہو گئے۔ بعض دوسرے عناصر بھی مفید طور پر اور میرے حسب حال کام کرنے لگے۔

اس زمانے میں اسسٹنٹ ہندی ایڈیٹر مسٹر امبیکا سنگھ تھے وہ ضلع اعظم گڑھ کے رہنے والے ٹھاکر تھے اور جذبۂ وطنیت سے غلو کی حد تک سرشار تھے۔ وہ میری آمد سے بہت خوش تھے اور جب مجھ پر یہ افتاد پڑی تو بہت پریشان بھی ہوئے اور جس حد تک پشت پناہی کر سکتے تھے کرنے لگے۔ ان کے ذریعہ مجھے ہر شخص کی اصلیت سمجھنے میں مدد ملی۔ مزید براں انھوں نے اکزیکیوٹیو آفس کے سکریٹری مسٹر تھیوگ راج سے بھی گزارش کی کہ وہ میری جس قدر مدد کر سکتے ہوں کریں۔ اس وقت یو ایس آئی ایس کے ملازمین کے ایسوسی

ایشن کے صدر مسٹر ناتھ تھے جو آگرہ کے رہنے والے تھے اور ان کی سسرال امبیکا سنگھ کے گاؤں میں تھی ان کے سسر سے بھی امبیکا سنگھ کی رسم و راہ تھی۔ چنانچہ انھوں نے ناتھ صاحب سے کہہ کر میرے معاملے میں ایسوسی ایشن کو متحرک ہی نہیں کچھ زیادہ ہی سرگرم کر دیا۔ مسٹر ناتھ دفتر میں کافی سینئر بلکہ اعلیٰ ترین ہندوستانی افسروں میں سے تھے۔ وہ کنٹری ڈائرکٹر کے مشیر تھے اس لیے اعلیٰ ترین سطح تک ان کی براہِ راست رسائی تھی۔

ابھی امبیکا سنگھ میرے معاملے کی پیروی کر ہی رہے تھے کہ معلوم ہوا کہ دو ہندی ایڈیٹروں میں سے صرف ایک کو رکھنے کا فیصلہ کیا گیا ہے اور چونکہ وہ جونیئر ہیں اس لیے انہی کو جانا پڑے گا اس صورت میں انھیں پنشن بھی نہیں ملتی کیونکہ استحقاق کے لیے عمر اور مدت ملازمت کی لازمی شرائط وہ نہیں پوری کر پائے تھے۔ سینئر ہندی ایڈیٹر وی پی سنگھ کو مشورہ دیا گیا کہ وہ ریٹائرمنٹ لے لیں تو انھیں پنشن مل جائے گی اور اس طرح امبیکا سنگھ بچ جائیں گے لیکن انھوں نے وہی ۲۵ ربرس ملازمت کے بعد حاصل ہونے والے استحقاق سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ریٹائرمنٹ لینے سے انکار کر دیا غرض یہ کہ امبیکا سنگھ کو اس صدمہ کی وجہ سے دل کا دورہ پڑا اور وہ ہسپتال میں داخل ہو گئے۔

میں جب انھیں دیکھنے کے لیے گیا تو وہ خطرے سے باہر آ چکے تھے لیکن بہت نحیف تھے۔ میں نے کہا کہ تم بنا سپتی ٹھاکر ہو کیا کہ اتنا صدمہ بھی نہیں برداشت کر سکے تو مسکرائے اور آہستہ سے کہا کہ اصلی ٹھاکر ہوں تب ہی بچ گیا ورنہ رخصت ہو گیا ہوتا۔ بہرحال دفتر نے ان کو بچانے کی راہ نکال لی۔ دوسرے سیکشن میں ایک جگہ خالی ہو رہی تھی ان کو وہاں کر دیا گیا تا کہ وہ اپنی ملازمت کے تین سال پورے کر لیں جو پنشن کے ساتھ ریٹائرمنٹ کے لیے ضروری تھے۔ کچھ عرصہ بعد جب وہ دفتر آنے لگے تو ایک دن انھوں نے مجھ سے کہا کہ مجھے تم سے بڑی تقویت ملی۔ میں ہسپتال میں پڑا سوچ رہا تھا کہ رضوان بال بچوں کے ساتھ اس شہر میں بے یار و مددگار ہے اور اس پر کوئی اثر نہیں اور میں ایک جھٹکا بھی نہیں برداشت کر سکا۔ خیر! امبیکا سنگھ ۵۸ سال کی عمر میں ریٹائر ہوئے اس کے

سات آٹھ سال بعد انھوں نے گرین کارڈ حاصل کیا اور فیملی سمیت امریکہ چلے گئے۔ جاتے جاتے انھوں نے اپنے ان کاغذات کی ایک ایک نقل مجھے دی جن کی ضرورت گرین کارڈ کی درخواست کے سلسلے میں پڑتی ہے۔ مقصد یہ تھا کہ جب میں امریکہ جاؤں تو اس رہنمائی سے آسانی ہو۔ فروری ۱۹۹۲ء میں واشنگٹن میں ان کا انتقال ہوا۔

مجھے تین مہینے کی یعنی مارچ ۱۹۷۷ء تک مہلت مل گئی تھی۔ اس میعاد کے ختم ہونے تک مزید تین ماہ کی توسیع یعنی ۳۰ر جون تک کی مہلت دی گئی۔ اس اثناء میں کول صاحب مجھ سے چھٹکارے کی اور کچھ لوگ مجھے بچانے کی کوششوں میں لگے رہے۔

داخلی ردوبدل یا تنظیم نو کے نتیجہ میں یہ طے پایا تھا کہ اردو، ہندی اور پنجابی تینوں یونٹوں میں صرف ایک ایک آدمی ہوگا چنانچہ ہندی اور پنجابی ٹائپسٹوں کو جنرل ٹائپسٹ قرار دے دیا گیا اور ایڈیٹروں کو بچالیا گیا۔ میرے معاملے میں کاتب کو بچایا جارہا تھا اور ایڈیٹر کا جھٹکا کیا جارہا تھا۔ بس اصولی طور پر میں نے یہی لائن پکڑ رکھی تھی کہ جب ہندی اور پنجابی ایڈیٹروں کو رکھا گیا ہے تو اردو ایڈیٹر کو بھی کیوں نہ رکھا جائے اور کاتب کو عام ٹائپسٹ قرار دے کر اس سے ٹائپسٹ کا کام لیا جائے۔ اس دلیل میں کافی وزن تھا۔ ملک صاحب کو مختلف سیکشنوں میں بھیجا جانے لگا کہ کوئی سیکشن انھیں بطور ٹائپسٹ قبول کرلے تو میرا راستہ صاف ہوجائے گا لیکن وہ ہفتہ بھر بعد روتے پیٹتے واپس آجاتے۔

وقت اسی طور گزرتا رہا۔ میں دن بھر آفس میں کام کرتا ہنستا بولتا، گھر آکر اختلاج میں مبتلا ہوجاتا۔ لیکن اس اثناء میں ایک بات میں نے یہ دیکھی کہ کنٹری آفس کے اکزیکیوٹیو افسر مسٹر کرائٹزر جن کی مٹھی میں سارے ملازمین کا اعمال نامہ تھا کبھی کبھار ہمارے کمرے کا دروازہ کھول کر جھانک لیا کرتے۔ ان کی اس اتفاقی آمد کا وقت صبح ۸ بجکر ۳۵ منٹ کے آس پاس یعنی ساڑھے آٹھ بجے آفس شروع ہونے کے فوراً بعد یا شام کو ساڑھے پانچ بجے آفس بند ہونے سے پانچ منٹ پہلے ہوا کرتا۔ وہ جب جھانکتے تو کمرے میں مجھے ضرور پاتے اور کوئی ہو یا نہ ہو کیونکہ لوگ بالعموم کچھ دیر سے آیا کرتے اور

جلدی کھسک جایا کرتے۔ اس تاک جھانک کے نتیجہ میں انھوں نے میرے متعلق کوئی اچھی رائے ضرور قائم کی ہوگی۔

دوسری طرف کول صاحب کے متعلق ملر صاحب کی بدگمانیاں بڑھنے لگیں۔ پھر یہ کہ انہی کے مشورے پر ملر صاحب نے میری ملازمت ختم کرنے کا فیصلہ کیا تھا لیکن اکزیکیوٹیو آفس اس میں توسیع کیے جارہا تھا اور اس معاملے میں ملر صاحب بے بس تھے۔ ان حالات میں ان کو اپنی غلطی اور میرے ساتھ نا انصافی کا احساس ہونے لگا اس کے ساتھ خفت بھی۔ وہ اس کا ذمہ دار کول صاحب کو سمجھتے تھے اس لیے ان کے تئیں ملر صاحب کے رویہ میں ترشی اور تلخی آنے لگی۔

ایک بزرگ کی نمود:

جون کا مہینہ آ گیا— جون ۱۹۷۷ء— اس مہینے کی دس گیارہ تاریخ رہی ہوگی۔ شام ہوگئی تھی مغرب کا وقت قریب تھا۔ میں باہر نکلا تو دیکھا کہ سامنے جامعہ اسٹاف کوارٹر کے قریب ایک کار کھڑی ہے اور مولانا عبیداللہ صاحب مرحوم ٹہل رہے ہیں۔ یہ بزرگ شخصیت تھی اللہ تعالیٰ ان کے مدارج بلند فرمائیں۔تبلیغی جماعت میں اعلیٰ مقام رکھتے تھے اور بنگلہ والی مسجد، نظام الدین میں، جو مرکز کے نام سے دنیا بھر میں مشہور اور مرجعِ خلائق ہے، قیام فرماتے تھے۔ وہ رشتے میں واحدی صاحب کے بھتیجے ہوتے تھے اور اقارب سے ایک خاص تعلق رکھتے اور برتتے تھے اور خود گھوم کر ان سے مل لیا کرتے تھے۔انھیں دیکھ کر میں بڑھا اور دریافت کیا کہ اس وقت یہاں کیسے تشریف رکھتے ہیں تو فرمایا کہ نصیر ماموں آئے ہیں چچا سے ملاقات کے لیے انہی کا انتظار کررہا ہوں انھیں لے کر واپس جاؤں گا۔ اتنے میں مولوی نصیر صاحب بھی تشریف لے آئے اور مجھے دیکھتے ہی گلے لگالیا اور فرمانے لگے بابو اب تم ٹھیک جگہ آئے ہو۔ میں نے عرض کیا کہ کیا ٹھیک جگہ آیا ہوں یہاں جینا دوبھر ہے۔ وہ ایک دم سنجیدہ ہوگئے اور کہنے لگے کہ میں کل دن میں آؤں گا تو پوری بات سنوں گا۔اس کے بعد وہ دونوں بزرگ گاڑی میں بیٹھے اور روانہ ہوگئے۔

یہاں مولوی نصیر صاحب کے بارے میں کچھ بیان کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ان کا وطن شیخپور تھا جو ضلع بلیا، یوپی، میں واقع ہے۔ موصوف اس ضلع میں آباد بزرگوں کے ایک قدیم خاندان سے تعلق رکھتے تھے، بیحد سادہ اور صوفی منش انسان۔ غازی پور کے قدیم مدرسہ چشمۂ رحمت میں تیس سال تک مدرسی کے فرائض انجام دیتے رہے اور وہیں سکونت اختیار کر لی لیکن انھوں نے اپنے آبائی وطن اور عزیزوں سے رشتے استوار رکھے، گھوم پھر کر ان سے ملتے ملاتے رہے اور ان کی خوشی اور غم میں شریک ہوتے رہے چنانچہ میری دوسری بیٹی عائشہ کی جو بارات آئی اس میں وہ بھی شریک تھے۔ اس سے پہلے ایک بار کلکتہ بھی تشریف لائے تھے اور وہاں ان سے مختصر سی ملاقات ہوئی تھی۔ وہ بزرگان دین سے خاص لگاؤ کی بنا پر مزارات کی زیارت کے لیے بھی سفر کرتے۔ دہلی آمد اور قیام کے دوران بھی یہاں بزرگوں کے مزارات کی زیارت کی۔ نصیرالدین چراغ دلّی سے انھوں نے خاص تعلق کا اظہار کیا جنھیں وہ اپنے اسلاف میں شمار کرتے ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ انہی بزرگ کے اخلاف میں سے حضرت شاہ پھول ہیں جن کے نام پر موضع شاہ پھول آباد ہوا جس کا نام اب شیخپور ہے جہاں ان بزرگ کا مزار ہے اور مخدوم صاحب کے نام سے دور دور تک جانے جاتے ہیں۔ مولوی نصیر صاحب بعض علوم باطنی میں بھی درک رکھتے تھے اور خدمتِ خلق کے طور پر دعا تعویذ بھی کرتے تھے، کسی کو پانی دم کر کے دیتے اور درپیش مسائل حل کرنے کی تدبیریں بتاتے۔

تو اگلے دن مولوی نصیر صاحب واحدی صاحب کے ہاں تشریف لائے اور مجھے بلا بھیجا۔ میں گیا تو اٹھ بیٹھے اور کہنے لگے کہ اب پوری بات بتاؤ۔ میں نے دفتری حالات تفصیل کے ساتھ بیان کیے اور یہ بھی بتا دیا کہ میری ملازمت کی آخری ۳۰/جون معین کی گئی ہے۔ کہنے لگے گھبراؤ نہیں مجھے تو لوگ تیس برس تک نکالتے ہی رہ گئے اور نکال نہیں سکے۔ پھر انھوں نے میری والدہ کا نام دریافت کیا اور آنکھیں بند کر کے دائیں ہاتھ کی انگلی سے بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر کچھ حساب کرتے رہے اس کے بعد مجھ سے پوچھنے لگے کہ

۲۲؍جون پہلے یا ۳۰؍جون؟ میں حیران خاموش تھا پھر انھوں نے بہ اصرار پوچھا تو بالآخر میں نے کہا کہ ۲۲؍جون تو فرمانے لگے ''بس کچھ نہیں ہوگا جاؤ۔ روز دفتر جانے سے پہلے یہ سورۃ پڑھ لیا کرو۔'' یہ بات آئی گئی ہوگئی وہ بھی وطن واپس چلے گئے۔

ایک دن شام کو میں دفتر سے آیا اور چائے وغیرہ سے فراغت کے بعد آرام کرنے لگا تو بیگم نے یاد دہانی کے طور پر کہا کہ آج تو ۲۲؍جون تھی۔ میں نے کہا ہاں تھی اور آج واقعی ایک غیر معمولی بات ہوئی۔ اس کی تفصیل یوں ہے:

آفس میں ساڑھے پانچ بجنے سے کچھ پہلے اکزیکیوٹیو آفیسر مسٹر کرائٹزر کی سکریٹری نے مجھے ٹیلیفون کیا کہ صاحب تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتے ہیں۔ میں فوراً ان کے آفس میں گیا۔ انھوں نے بیٹھنے کا اشارہ کیا پھر فرمانے لگے کہ تمھیں معلوم ہے تمہاری ملازمت کے صرف آٹھ دن باقی ہیں؟ میں نے عرض کیا جی ہاں۔ پھر پوچھا کہ ''تم نے کوئی متبادل کام تلاش کیا؟'' بس جیسے میری زبان بے لگام ہوگئی۔ جذبات نے ہوش و حواس کا دامن تھامے ہوئے سبقت لے لی۔ میں گویا ہوا—

جناب میں ایک سینئر جرنلسٹ ہوں پچیس برس پاپڑ بیلنے کے بعد آج اس منزل تک پہنچا ہوں جہاں آپ دیکھ رہے ہیں۔ اب باہر کام کھوجتا ہوں تو پانچ سات سو کی نوکری ملتی ہے تو کیا اب میرے پاس اتنا وقت ہے کہ میں پھر پچیس سال کام کر کے کسی منزل تک پہنچوں؟ اس لیے جب تک کوئی معقول کام نہ ملے مجھے بیکار ہی رہنا ہوگا اور انتظار کرنا ہوگا۔ ہم اخبار نویسوں کا یہی مقدر بھی ہے لیکن مجھے کچھ اور بھی عرض کرنا ہے۔ میں کلکتہ میں ایک اخبار نویس کی حیثیت سے جما ہوا تھا آپ کے ایک افسر نے وہاں جا کر مجھے اس ملازمت کی پیشکش کی میرا قصور صرف اتنا ہے کہ میں نے وہ پیشکش منظور کر لی اور دہلی چلا آیا جو میرے لیے بالکل نامانوس شہر تھا۔ اس اثناء میں مجھے اپنی فیملی چھ مہینے کلکتہ میں رکھنی پڑی یعنی بیک وقت دو بڑے شہروں میں میرا اسٹبلشمنٹ رہا نتیجہ کے طور پر میں نے جو کچھ تھوڑی بہت پونجی پس انداز کی تھی وہ ختم ہوگئی اب ایسے میں آپ میری نوکری ختم

کر کے مجھے بالفعل سڑک پر چھوڑ رہے ہیں۔

میں نے کہا کہ یہ ادارہ مستقبل میں دس برس اور بیس برس تک کی پلاننگ کرتا ہے مجھے افسوس ہے کہ آپ کا اتنا سینئر افسر ایک برس آگے بھی نہیں سوچ سکا۔ آپ کہتے ہیں کہ یہ ایک انتظامی مسئلہ ہے تو کیا یہ صرف انتظامی مسئلہ ہے؟ انسانی مسئلہ نہیں ہے؟ جب آپ ہندی اور پنجابی ایڈیٹروں کو بحال رکھتے ہیں اور ان ٹائپسٹوں کو عام ٹائپسٹ بنا رہے ہیں تو یہی معاملہ اردو ایڈیٹر کے ساتھ بھی کیوں نہیں کرتے؟ یہ فیصلہ بھی کرنا چاہیے کہ دفتر کو اردو ایڈیٹر کی ضرورت ہے یا کیلی گرافر کی جسے بچانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ میں نے کہا کہ جناب میں پچیس برس کام کر چکا جو کارکردگی کی ایک زندگی کے برابر ہے اب میرا کوئی مستقبل نہیں ہے نہ میں اپنے مستقبل کے لیے کام کر رہا ہوں۔ میں اپنے بچوں کے مستقبل کے لیے کام کر رہا ہوں اور آپ کا ادارہ ان معصوموں کے مستقبل کو پامال کر رہا ہے۔

کرائٹزر صاحب سر جھکائے ہاتھوں سے سر تھامے خاموشی کے ساتھ میری ساری باتیں سنتے رہے۔ میں اپنی بات ختم کر کے اٹھا تو انھوں نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور فرمایا کہ تمہاری ملازمت میں ماہ بہ ماہ توسیع ہوتی رہے گی۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور چلا آیا۔

۲۷ر جون کو مجھے اکزیکیوٹیو آفس سے ایک خط ملا جس کے مطابق میری ملازمت میں تین ماہ کی توسیع کی گئی یعنی ماہ ستمبر تک امریکی مال سال بھی ستمبر میں ختم ہوتا ہے اور اکتوبر سے نیا مالی سال شروع ہوتا ہے گویا مجھے رواں مالی سال تک کام کرتے رہنے کی مہلت دی گئی۔ چند دنوں بعد اکزیکیوٹیو آفس کے ایک سینئر افسر مسٹر تھیوگ راج نے مجھ سے کہا کہ بس یہ آخری مہلت ہے۔ نئے مالی سال کے آغاز تک تمہیں کوئی کام تلاش کر لینا چاہیے۔ خود مسٹر تھیوگ راج اگست میں ریٹائر ہو گئے۔ ستمبر کے اواخر میں مجھے پھر ایک خط ملا جس کے مطابق میری ملازمت میں مزید ایک ماہ کی توسیع کی گئی یعنی اکتوبر سے میں نئے مالی سال میں داخل ہو گیا۔ اکتوبر کے پہلے ہفتے میں مسٹر تھیوگ راج سے اتفاقاً ملاقات ہو گئی وہ کسی کام سے آفس آئے تھے۔ میں نے ان کو بتایا کہ میں تو نئے مالی سال

میں داخل ہوگیا تو وہ بڑے زور سے ہنسے اور کہنے لگے کہ جو مہلت مل رہی ہے اس سے جہاں تک فائدہ اٹھا سکتے ہو اٹھاؤ لیکن کوئی کام تلاش کرتے رہو۔ وہ مسٹر تھیوگ راج سے آخری ملاقات تھی۔ وہ حلق کے کینسر میں مبتلا ہو چکے تھے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد اپنے وطن مدراس چلے گئے تھے کچھ عرصہ بعد وہیں ان کا انتقال ہوگیا۔

امید وبیم کی حالت میں ہمارے دن گزرتے رہے یہاں تک کہ اکتوبر کا مہینہ ختم ہونے کو آیا۔ اس وقت تک مجھے باضابطہ کچھ نہیں بتایا گیا تھا لیکن ناتھ صاحب اور دو ایک صاحبان نے اپنے طور پر مجھے بتادیا تھا کہ میری ملازمت مستقل کرنے کا فیصلہ کیا جاچکا ہے تاہم جب تک کوئی سرکاری کاغذ نہ ملتا میں کیسے اطمینان کر لیتا۔

بہرحال اکتوبر کی ۳۱؍تاریخ کو بڑا ڈرامائی دن تھا۔ پہلے ملر صاحب نے بلا کر پوچھا کہ تمہیں اپنی ملازمت کے بارے میں کچھ معلوم ہوا۔ میں نے نفی میں جواب دیا تو انھوں نے مجھے واپس کر دیا۔ پھر کول صاحب کو بلا کر برہمی کا اظہار کیا اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ انھوں نے کول صاحب کو میری مستقلی کی اطلاع دے دی تھی اور چاہتے تھے کہ غیر رسمی طور پر مجھے بتادیا جائے۔ خیر کچھ دیر بعد ملر صاحب نے مجھے پھر بلایا اور وہ خط دیا جس میں برطرفی کی تنسیخ کی گئی تھی اور ملازمت مستقل کی گئی تھی اس خط کو مجھے دینے کے بعد ملر صاحب نے مجھ سے بے حد معذرت کی اور کہتے رہے کہ مجھے غلط اطلاعات دی گئی تھیں، تمہارے بارے میں غلط فہمی پیدا کی گئی تھی، مجھے افسوس ہے کہ میری غلطی کی وجہ سے تمہیں تکلیف ہوئی، تمہاری صحت کو بھی نقصان پہنچا ہوگا وغیرہ وغیرہ۔ اس دن ملر صاحب کے اندر چھپا ہوا انسان صاف سامنے کھڑا تھا۔

آفس میں مستقلی

یکم نومبر ۱۹۷۷ء کو میری ملازمت مستقل ہوگئی اور ایک طویل ڈرامے کا ڈراپ سین ہوا۔ دفتر میں مٹھائی تقسیم کی گئی۔ ملر صاحب اور کرائٹزر صاحب نے بھی مٹھائی کھائی۔ آزمائش والے دور میں اندر باہر کئی عناصر کارفرما رہے۔ جون میں میری ایک کہانی

''ہندوستان ٹائمز'' کے سنڈے میگزین میں شائع ہوئی، پہلی اکتوبر کو میری ایک گفتگو وائس آف امریکہ سے نشر ہوئی۔ نازک وقتوں میں چھوٹی چھوٹی باتیں بھی بڑی ہوجاتی ہیں۔

یہ سب تو ہوا لیکن اس کے بعد سے کول صاحب کے متعلق ملر صاحب کا رویہ بہت سخت ہوگیا اس کی وجہ وہی تھی کہ ملر صاحب یہ سمجھ رہے تھے کہ انھوں نے میرے بارے میں ان کو مغالطے میں رکھا جس کے نتیجہ میں مجھے نقصان اٹھانا پڑا اور خود ان کو خفت کا سامنا ہوا۔ اس کے برعکس ملر صاحب مجھ پر بہت مہربان ہوگئے اور چھ مہینے کے اندر ہی اگلے گریڈ میں میری ترقی کردی اتنا ہی نہیں بلکہ اگلے سال ایک اور ترقی کی سفارش کی لیکن اس کارروائی کو انجام تک نہیں پہنچا سکے تھے کہ خود ان کا تبادلہ ہوگیا اور وہ ریاض میں مامور کردیے گئے۔ بقول ان کے انھیں پہلے واشنگٹن میں دس مہینے عربی سیکھنی ہوگی اس کے بعد ریاض جائیں گے۔ بہت بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ ریاض میں ہی اپنی مدت ملازمت مکمل کرکے ریٹائر ہوئے۔

نئے سال ۱۹۷۸ء کا آغاز امریکی صدر جمی کارٹر کے دورۂ دہلی کے ساتھ ہوا۔ ہمارے دفتر میں صدر کے اس دورے کی تیاریاں دسمبر ہی میں شروع ہوگئی تھیں۔ ان تیاریوں میں پریس کو خاص دخل تھا یعنی ہند امریکی تعلقات کے مختلف پہلوؤں پر پریس میٹر تیار کرنا اور ان کی زیادہ سے زیادہ اشاعت کا بندوبست کرنا۔ اس کے علاوہ ایک پریس سینٹر موریہ شیراٹن میں قائم کیا گیا جہاں صدر کے قیامِ دہلی کے دوران وہائٹ ہاؤس کی یومیہ پریس کانفرنس اور پریس ریلیز کی تیاری اور تقسیم کا سارا نظام مرکوز کرنا تھا ہندوستان اور دنیا بھر کے سیکڑوں اخباروں کے نامہ نگاروں کے لیے جملہ سہولتوں کا وہاں اہتمام کیا گیا تاکہ وہ اسی جگہ اپنی رپورٹیں بہ آسانی تیار کرسکیں اور اپنے اپنے ملکوں میں اپنے اخباروں کو بھیج سکیں۔ غرض یہ کہ یہ سارا اہتمام بہت بڑے پیمانے کا تھا۔ یوں تو وہائٹ ہاؤس کا پورا پریس آفس موجود تھا پھر بھی اس کی مدد کے لیے کافی مقامی اسٹاف کی ضرورت تھی اس کام میں تعاون کے لیے کلکتہ، بمبئی اور مدراس کے آفسوں سے بھی پریس چیف اور

بعض دیگر اسٹاف کو دہلی طلب کرلیا گیا تھا۔

صدر کارٹر کا دورہ:

صدر کارٹر یکم جنوری کو دہلی تشریف لائے لیکن آفس میں ۱۵؍دسمبر سے ہی میری کارکردگی کے اوقات صبح ۶ بجے سے شام کو وقت کی قید کے بغیر، کام ختم ہوجانے تک کردیے گئے تھے۔ چنانچہ عموماً دس بجے رات تک گھر واپس آتا اور صبح پانچ ساڑھے پانچ کے قریب چلا جاتا۔ صدر کارٹر کے دوران قیام میں تین روز تو ۱۲؍بجے رات کے قریب گھر آتا۔ کسی کسی روز یو ایس آئی ایس سے اٹھ کر کچھ دیر کے لیے وائس آف امریکہ کے آفس میں جانا پڑتا اور اگر کوئی نشریہ اردو میں ایسا ہوتا کہ دہلی میں مدد کی ضرورت ہوتی تو میں اس میں تعاون کرتا۔ مسلسل دو ہفتہ تک اتنی شدید مصروفیت نے حالت خراب کردی۔ لکھتے لکھتے بازو اکڑ جاتے۔ شکر ہے یہ آزمائش بحسن وخوبی تمام ہوئی۔

صدر کارٹر کے دورۂ ہندوستان کی تاریخی اہمیت تھی کیونکہ مسز اندرا گاندھی کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد ہی سے ہندوستان اور امریکہ کے تعلقات میں سرد مہری، پھر دوری اور اس کے بعد کشیدگی آنے لگی تھی۔ تحریک بنگلہ دیش کے دوران تو وزیر اعظم اندرا گاندھی اور امریکی صدر ریچرڈ نکسن کے اختلافات نے ذاتی رنجش کی شکل اختیار کرلی اور دونوں ملکوں کے کشیدہ تعلقات میں تلخی کا عنصر بھی شامل ہوگیا لیکن تاریخ نے دونوں کے ساتھ دلچسپ مذاق کیا۔ واٹر گیٹ اسکنڈل نے وہاں صدر نکسن کو مسندِ صدارت سے دست بردار ہونے پر مجبور کیا تو یہاں ایمرجنسی کے نفاذ اور اسکے دوران پریس سنسرشپ، فیملی پلاننگ کے ضابطوں میں سختی اور دیگر استبدادی اقدامات مسز اندرا گاندھی کی اقتدار سے محرومی کا موجب ہوئے۔ جسے لوگ ازراہِ تفنن اندرا گاندھی کا انڈیا گیٹ کہتے تھے۔ امریکنوں نے اس واقعہ کو ہندوستان میں جمہوریت کی فتح سے تعبیر کیا اور مسٹر مرارجی ڈیسائی کی مخلوط حکومت سے تعلقات استوار کرنے کی کوششیں شروع کردیں۔

ان حالات میں صدر امریکہ ہندوستان کے دورے پر آئے تھے۔ صدر امریکہ

کے دورے کے موقع پر اخبار نویسوں کی ایک جمعیت ان کے ساتھ ہوتی ہے وہ تو تھی ہی اس کے علاوہ بھی دنیا بھر کے اخبار نویس دہلی میں ٹوٹ پڑے تھے۔ چنانچہ پریس سے متعلق حکومت ہند کے اداروں اور دیگر اطلاعاتی نظاموں پر سخت دباؤ تھا۔ یہی کیفیت امریکی دفتر اطلاعات (یوایس آئی ایس) کی تھی جو وہائٹ ہاؤس کے پریس آفس کے متوازی کام کررہا تھا۔ وہائٹ ہاؤس کا پریس سنٹر موریہ شیراٹن میں قائم کیا گیا تھا وہیں صدر کے پریس سکریٹری کی معمول کے مطابق یومیہ نیوز بریفنگ ہوتی تھی، ایڈیٹنگ اور پرنٹنگ کا سارا نظام ایسا زودکار تھا کہ بریفنگ ختم ہوتے ہی ضروری اعلانات و بیانات سیکڑوں اخبار نویسوں کو وہیں تقسیم کردیے جاتے۔

پریس کے اس اہتمام کے علاوہ صدر کی آمد کے سلسلے میں دیگر اہتماموں کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ صدر کے استعمال میں آنے والی دو کاریں جو صدر کی دفتری ضروریات سے پوری طرح لیس ہوتی ہیں جن میں ٹیلیفون کی ہاٹ لائن بھی ہوتی ہے ایئرفورس کے ہوائی جہازوں کے ذریعہ پہلے ہی دہلی پہنچادی گئی تھیں۔ اسی طرح صدر کی آمد سے پہلے ایک طیارہ اخبار نویسوں کی جمعیت کو لے کر آ گیا تھا۔ شہر میں سکیوریٹی کا انتظام بالعموم چست تھا لیکن صدر کے جلوس کے راستوں پر ہیلی کاپٹر پرواز کرتے رہے۔ اونچی عمارتوں پر جابجا مسلح چوکیاں قائم کردی گئی تھیں۔ حکومت ہند کی طرف سے ان انتظامات کے باوجود اپنے صدر کی حفاظت اور سلامتی کی پہلی ذمہ داری امریکی محافظوں نے سنبھال رکھی تھی اور اس میں کسی کو ذرا بھی مداخلت کی اجازت نہیں دی۔

جلوس کے راستوں پر عوام کی بھیڑ بے اندازہ تھی۔ جن پتھ جیسی کشادہ شاہراہ پر پولیس نے بڑی سختی سے سڑک کو گاڑیوں کی گزرگاہ کے لیے صاف رکھا تھا لیکن دونوں طرف مجمع کی بے پناہ دبازت تھی۔ اس سے پہلے ہندوستان والوں نے دوسر براہوں کے دورے کے موقع پر ایسی بھیڑ دیکھی ہوگی جس کا موازنہ اس موقع سے کیا جاسکے ایک تو برطانیہ کی ملکہ ایلیزابتھ کا دورہ اور دوسرے سویٹ یونین کے صدر نکتیا خروشچیف اور وزیر

اعظم بلگانن کا مشترکہ دورہ۔ یہ دونوں دورے ۵۰ء کے عشرہ میں ہوئے اس وقت میں کلکتہ میں تھا وہیں ان دوروں کے مناظر میں نے دیکھے۔

ملکہ کے جلوس کے لیے تو پھر بھی سنٹرل ایونیو پر اتنی گنجائش تھی کہ ملکہ کھلی کار میں کھڑی اطمینان سے سلامی لیتی ہوئی گزریں لیکن خروشچیف اور بلگانن کے دورے کے موقع پر تو عالم یہ ہوا کہ یہ دونوں لیڈر ہوائی اڈے سے باہر صرف کچھ دور تک جاسکے پھر مجمع کے دباؤ کی وجہ سے ان کی گاڑیوں کا آگے بڑھنا ناممکن ہوگیا۔ چنانچہ انھیں ایک دوسری بند گاڑی میں منتقل کیا گیا اور دوسرے غیر متعین راستے سے راج بھون پہنچا دیا گیا۔ اصل راستے میں لوگوں کی بھیڑ منتظرِ نظارہ ہی رہ گئی جہاں مجمع کا عالم یہ تھا کہ سنٹرل ایوینیو پر پریس فوٹو گرافروں اور نامہ نگاروں کی گاڑیوں کا ایک کے پیچھے ایک گزرنا بھی محال تھا۔ غالباً ایسا جلوس ہندوستان میں کبھی نہیں دیکھا گیا ہوگا۔

بہرحال صدر کارٹر کے دورے کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ ہندوستان اور امریکہ کے تعلقات پر جمی ہوئی برف پگھلنی شروع ہوئی اور رفتہ رفتہ تعلقات معمول پر آتے گئے جس کا سلسلہ جنتا پارٹی کے مختصر عرصۂ اقتدار کے بعد بھی جاری رہا۔

صدر کارٹر کے دورے کے دو ہی ہفتہ بعد وسط جنوری میں یہ افسوسناک واقعہ پیش آیا کہ ایک سنیچر کو کول صاحب آفس میں پریس ڈیوٹی پر مامور تھے دوپہر کو ایک اسکوٹر پر گھر واپس جارہے تھے کہ راستے ہی میں ان کے قلب کی حرکت بند ہوگئی اگلے دن اتوار کو ان کی آخری رسوم ادا کی گئیں۔ میرے خیال سے ان کے اس انجام کے جملہ اسباب میں کوئی مہینہ بھر کی شدید دفتری مصروفیات اور ملر صاحب کے رویہ کو بھی دخل تھا گو کچھ عرصہ بعد سری نگر میں کول صاحب کے دوست ایک صحافی نے مجھے بتایا کہ انھیں کچھ عرصہ سے قلب کی تکلیف تھی جس کا وہ اظہار نہیں کرنا چاہتے تھے اور معقول علاج معالجہ بھی نہیں کررہے تھے۔ کول صاحب کا انتقال ملر صاحب کے لیے بھی ایک بڑا جھٹکا تھا۔ وہ ان کی حرکتوں کو ناپسند کرتے تھے اور اس پر ناپسندیدگی کا اظہار بھی کرتے تھے۔ مگر یہ نہیں سمجھتے

تھے کہ اس کا ان کی صحت پر اتنا شدید اثر بھی پڑ سکتا ہے۔ ملر صاحب کام کے معاملے میں سخت گیر ضرور تھے لیکن دل کے نرم اور انسان دوست تھے۔ شراب بالکل نہیں پیتے تھے، تقریبات میں دوسروں کو پیش کرتے لیکن خود منرل واٹر کی چسکی لیتے رہتے۔ ہندی ایڈیٹر مسٹر وی پی سنگھ پریس سیکشن میں سب سے سینئر تھے اس لیے کول صاحب کے انتقال کے بعد انہی کو پریس چیف بنا دیا گیا اس طرح ہمارے سیکشن کی کارکردگی میں کوئی خاص فرق نہیں آیا۔ ذاتی طور پر میرا معاملہ یوں ہوا کہ میں زیادہ اطمینان اور اعتماد کے ساتھ کام کرنے لگا اور ایک گریڈ کی ترقی بھی ہوئی۔

کچھ ہی دنوں بعد ہمارے سیکشن کے پنجابی ایڈیٹر مسٹر کرپال سنگھ ریٹائر ہو گئے۔ ان کے ریٹائرمنٹ کے بعد چنڈی گڑھ کے ایک صاحب پنجابی ایڈیٹر مقرر ہوئے لیکن اپنے رویہ کی وجہ سے وہ کسی کو بھی خوش نہ رکھ سکے اور چھ مہینے کے اندر ہی سبکدوش کر دیے گئے۔ اس کے بعد ایک خاتون صحافی اور ادیب گگن گل کا بحیثیت پنجابی ایڈیٹر تقرر ہوا۔ پریس چیف وی پی سنگھ سے ان کی گہری چھنتی تھی لیکن ایک سال سے کچھ کم ہی عرصہ میں ان کو بھی رخصت کر دیا گیا اس کے بعد کوئی پنجابی ایڈیٹر نہیں مقرر کیا گیا اور پنجابی یونٹ ہی بند کر دی گئی۔

اس وقت یہ سوال پیدا ہوا کہ پنجاب سے شائع ہونے والے پنجابی اخباروں سے رابطہ کی کیا صورت ہو۔ اردو، ہندی اور پنجابی اخباروں کا ایک بڑا مرکز جالندھر تھا چنانچہ یہ معلوم کرنے کے لیے مجھے مامور کیا گیا کہ وہاں کے جو ایڈیٹر پنجابی زبان میں پریس میٹر پا رہے تھے وہ پنجابی کے بجائے کس زبان میں پریس میٹر کو ترجیح دیں گے۔ میں نے جالندھر جا کر پنجابی ایڈیٹروں اور اخبار نویسوں سے ملاقات کی اور ان کی ترجیحات نوٹ کر لیں ان کے لیے اردو اور ہندی دونوں ہی برابر تھیں۔ بہرحال جس نے جو پسند کیا اس کا نام اسی زبان کی پریس لسٹ میں شامل کر لیا گیا۔ اس وقت تک ۱۹۸۱ء کا سال آ گیا تھا۔

پنجابی ایڈیٹر کی سبکدوشی کا ایک خاص سبب یہ تھا کہ حکومت امریکہ نے سرکاری

اخراجات میں کمی کے لیے ملازمین کی تعداد میں تخفیف کا فیصلہ کرلیا تھا۔ یہ ہم لوگوں کے لیے ہیجان کا ایک نیا سامان تھا۔ ہمارے جیسے نو واردوں کے لیے واقعی خدشے تھے چنانچہ ہندوستان بھر میں امریکی سفارت خانے اور ملحقہ دفاتر کے سارے ملازمین نے باقاعدہ ٹریڈ یونین کے طور پر منظّم ہوکر متحدہ اور متفقہ کارروائی شروع کی۔ ایمبسی کے ملازمین کو اپنے ایسوسی ایشن بنانے کی اجازت تھی، ایمبسی کے ملازمین، یو ایس آئی ایس کے ملازمین، لائبریری آف کانگریس کے ملازمین کے الگ الگ ایسوسی ایشن تھے پھر ان کا ایک مرکزی فیڈریشن تھا جس سے کلکتہ، بمبئی اور مدراس کے دفاتر کے ملازمین کی تنظیمیں بھی وابستہ تھیں اور ان کے نمائندے فیڈریشنوں کے سالانہ جلسوں میں اور دیگر خصوصی مواقع پر شرکت کے لیے دہلی آیا کرتے تھے۔ لیکن ان تنظیموں کی حیثیت بڑی حد تک ثقافتی تھی نہ کہ ٹریڈ یونین کی سی تاہم اس سے امریکی انتظام کاروں کو ایک سہولت تھی کہ کسی بھی معاملے میں ہندوستانی عملہ کی عمومی رائے کا اندازہ ہوجاتا تھا اس لیے انھوں نے ان تنظیموں کے تئیں نرم بلکہ ہمدردی اور تعاون کا رویہ اختیار کررکھا تھا۔ اسی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہندوستانی ملازمین نے چھٹنی سے متعلق کمیشن کی رپورٹ پر سخت ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ بعض لوگوں نے واقعی بڑا شدید رویہ اختیار کیا لیکن امریکنوں نے اس پر کسی ناگواری کا اظہار نہیں کیا بلکہ ان کا عام رویہ ہمدردی کا رہا اور جس قدر ملازمین کو وہ بچاسکتے تھے انھیں بچانے کی کوشش کی۔

دہلی میں مامور امریکی حکام نے بڑا معقول رویہ اختیار کیا۔ انھوں نے واشنگٹن کو یہ سمجھایا کہ ۱۸؍فیصد اسٹاف میں تخفیف کا مطلب ہے اخراجات میں ۱۸؍فیصد کمی۔ چنانچہ اسٹاف کم کرنے کے بجائے پروگراموں میں کمی کی گئی، اسٹیشنری وغیرہ میں کمی کی گئی، حالیہ اور مستقبل قریب میں ریٹائر ہونے والوں کی خالی جگہوں کو پُر نہ کیا گیا۔ اگلے چھ مہینوں میں جو لوگ ریٹائر ہونے والے تھے انھیں قبل از وقت رضا کارانہ طور پر ریٹائر ہوجانے کی ترغیب کے لیے معمول سے زیادہ معاوضہ کی پیشکش کی گئی نتیجہ کے طور پر اس مار کی زد میں

آنے والے ملازمین کو بچالیا گیا۔صرف دوتقریباً نووارد ٹائپسٹ اس کی زد میں آئے لیکن انھیں بھی جلد ہی دوسرے دفاتر میں لے لیا گیا۔

رہائش کی تبدیلی

کسی معقول مکان کی تلاش میں تو ایک عرصے سے سرگرداں تھے۔واحدی صاحب کی کاوشوں سے ذاکرنگر میں ایک مکان مل گیا، بالائی منزل پر جس میں دیوار و در تھے لیکن کسی کھڑکی دروازے میں پلے نہیں تھے۔ پھر بھی ہم اس میں منتقل ہوگئے کیونکہ رہائش کے معاملے میں بہت پریشان ہو چکے تھے۔ دراصل اس وقت اوکھلا کے علاقے میں آبادی بہت کم تھی، جن لوگوں کے مکانات تھے انھوں نے صرف اپنی ضرورت کے مطابق بنائے تھے۔ بٹلہ ہاؤس میں سڑک کے کنارے صرف مکانات کی ایک قطار تھی جو جوگابائی تک چلی گئی تھی۔اس کے عقب میں دریائے جمنا تھی جس کا سیلابی پانی بٹلہ ہاؤس کی سڑک تک آجاتا تھا۔ جوگابائی صرف ایک جنگل تھا اس کے آگے ذاکرنگر آباد ہونا شروع ہوا تھا۔ ایک بازار والی سڑک پر اور دوسری متوازی سڑک پر کچھ مکانات بننے لگے تھے۔ ایک پگڈنڈی جنگل سے گزرتی ہوئی بٹلہ ہاؤس اور جوگابائی کو ذاکرنگر سے جوڑتی تھی۔ٹیلیفون کا آخری کھمبا بٹلہ ہاؤس میں تھا۔

میرا ایک بڑا مسئلہ یہ تھا کہ میں اکثر باہر جایا کرتا تھا،ٹیلیفون نہ ہونے کی وجہ سے فیملی سے بالکل بے خبر ہوجاتا تھا۔ٹیلیفون کے لیے درخواست دی تھی تو جواب ملا کہ ابھی اس علاقے میں ضروری سہولتیں نہیں ہیں۔ میں نے اپنے ڈائرکٹر صاحب سے اپنا یہ مسئلہ بیان کیا۔ پھر انھوں نے نہ معلوم کیا کیا کہ پندرہ بیس روز کے اندر ایک دن شام کو آفس سے آیا تو کمرے میں ایک ٹیلیفون سیٹ رکھا ہوا تھا اس کے بعد چند دنوں کے بعد بٹلہ ہاؤس کے آخری ٹیلیفون پول سے کیبل جوڑ کر درختوں کی ڈالیوں میں لپیٹ لپیٹ کر میرے گیٹ تک لایا گیا اور وہاں ایک پول گاڑ کر کنکشن دے دیا گیا۔ اس طرح اس علاقے میں وہ پہلا ٹیلیفون ہوگیا۔اس مکان کی کھڑکی ، دروازے میں پلے بھی لگ گئے۔

ہم لوگوں نے اس مکان میں تقریباً دس سال بڑے اچھے خوشیوں کے دن گزارے۔ ۱۹۸۹ء میں اپنا گھر بن جانے کے بعد وہاں منتقل ہوگئے۔

اسی اثناء میں بین الاقوامی محاذ امریکہ کے زاویہ نگاہ سے گرم اور گرم تر ہوتا جارہا تھا۔ ہندوستان اور امریکہ کے تعلقات تو ہموار ہونے کی راہ پر تھے لیکن پڑوس کے دو قریبی ملکوں میں ایسے حالات پیدا ہوگئے جن سے امریکہ براہِ راست متاثر ہورہا تھا اور اسی کے مطابق پالیسیوں اور ان پر عمل درآمد کے طریقوں میں تبدیلیاں آرہی تھیں۔

افغانستان اور ایران:

ایک تو افغانستان میں کمیونسٹ انقلاب برپا ہوا اور دو تین لیڈروں کی ادلا بدلی کے بعد ۱۹۷۹ء میں سویٹ فوجوں نے براہِ راست افغانستان پر چڑھائی کردی۔ ایسے میں جو کشت وخون ہوتا ہے اس کا سلسلہ آٹھ نو برس تک جاری رہا۔ افغانوں کی خون آشام سرشت کے مطابق اس خونریزی اور برادر کشی کا سلسلہ افغانستان سے روسی فوجوں کی پسپائی کے بعد بھی جاری رہا۔ اسی طرح کا واقعہ ایران میں پیش آیا جہاں شاہ ایران کے خلاف بغاوت نے ایک مکمل انقلاب کی صورت اختیار کرلی۔ شاہ کو ملک بدری اختیار کرنی پڑی جہاں کینسر کا موذی مرض ان کے تعاقب میں رہا اور بالآخر انھوں نے اپنے میزبان ملک مصر میں اس دارِ فانی سے کوچ کیا۔

ایران نے آیت اللہ روح اللہ خمینی کے اسلامی انقلاب کے لیے درکشادہ کردیے اور پھر عمل تطہیر کے نتیجے میں بے شمار دانشوروں، سیاست دانوں، سپہ سالاروں کے خون سے سرزمین ایران سیراب ہوئی، امریکہ سے ایرانیوں کی نفرت اس انتہا تک پہنچی کہ انھوں نے امریکی سفارتخانے کا محاصرہ کرلیا اور سفارتی عملے کے ۶۶ امریکیوں کو یرغمال بنالیا۔ ایک سال سے زیادہ عرصہ تک انھیں اسی عالم میں قیدی بنائے رکھا جنھیں رہا کرانے کی کوئی سیاسی یا سفارتی کوشش کامیاب نہیں ہوئی بلکہ امریکیوں کے ایک ہوائی حملہ اور ان قیدیوں کو رہا کرانے کی کوشش بھی موسم کی خرابی کی وجہ سے ناکام ہوگئی۔

جنگ ویٹ نام میں ناکامی کی وجہ سے افسردہ و آزردہ امریکی قوم کے لیے یہ دوسرا بڑا صدمہ تھا جس کا تاوان صدر کارٹر کو ادا کرنا پڑا یعنی جب وہ دوسری مدتِ صدارت کے لیے امیدوار ہوئے تو قوم نے انھیں مسترد کر دیا اور زیادہ سخت گیر شخص کو ترجیح دی وہ تھے مسٹر رونالڈ ریگن جنھوں نے امریکہ کے چالیسویں صدر کی حیثیت سے ۱۹۸۱ء میں زمام اقتدار سنبھالی۔

افغانستان اور ایران کے واقعات ایسے تھے جنھوں نے دنیا بھر کے مسلمانوں کو کسی نہ کسی طور فکر مند کر دیا تھا۔ افغانستان پر سویٹ فوج کشی ایک ایسا معاملہ تھا جس نے امریکیوں کو سویٹ یونین کی سرحدوں کہ قریب اپنی سرگرمیاں تیز کرنے کا موقع فراہم کر دیا۔ چنانچہ افغان مجاہدین کی مالی، فنی اور حربی امداد کے لیے حکومت امریکہ کے ادارے بڑی تیزی سے حرکت میں آ گئے لیکن انھیں کوئی امریکی امداد ایران کی طرف سے پہنچانے کی تدبیر نہیں ہوسکتی تھی حالانکہ ایران سویٹ یونین کی اس حرکت سے ہرگز خوش نہیں تھا خود اس کو آذربائیجان کی طرف سے روسی خطرہ لاحق تھا پھر افغان پناہ گزینوں نے ایران کے لیے مسائل پیدا کر رکھے تھے۔ بایں ہمہ حقیقت یہ ہے کہ ایران میں شاہ مخالف بہ الفاظ دیگر امریکہ مخالف انقلاب کے بعد ہی سویٹ یونین کو افغانسان پر فوج کشی کی جسارت ہوئی۔ اس کا یہ اندازہ غلط نکلا کہ یہ مہم بہت کم عرصہ میں کامیابی سے ہمکنار ہوگی۔ الٹے نو برس کی یہ مہم جوئی سویٹ یونین ہی کو لے ڈوبی۔ افغانوں کو امداد پہنچانے کا واحد راستہ پاکستان کی طرف سے تھا اس خطے میں امریکی سرگرمیاں تیز ہوگئیں۔

میں ایک طرف امریکی سفارت خانے سے وابستہ تھا تو دوسری طرف میں نے ہندوستان کے اردو اخباروں سے بھی رشتے قائم رکھے تھے۔ میں اس حقیقت سے آگاہ تھا کہ ہندوستان کے مسلمان بالعموم امریکی پالیسیوں سے اختلاف کا رویہ رکھتے تھے لیکن یہ بھی سچ ہے کہ افغانستان کے ساتھ تاریخی رشتوں اور روابط کی بنا پر وہ روسی فوج کشی اور مظالم کو ناپسند کرتے تھے ہمارے اردو اخبارات اور ان کے قاری زیادہ تر مسلمان ہی تھے۔

سویٹ یونین کی پالیسیوں اور پروگراموں کی نفی کرنا دنیا بھر میں امریکی مشنوں کی کارکردگی کا بڑا حصہ تھا۔ ہندوستان میں بھی یو ایس آئی ایس کی کارکردگی کا ایک بڑا حصہ یہی عمل تھا لیکن ہندوستان اور سویٹ یونین کے تعلقات کی نہج اور نوعیت کے اعتبار سے یہ کام قدرے مشکل تھا دونوں حکومتوں کے درمیان دوستی اور تعاون کے معاہدے کے علاوہ دیگر معاہدے بھی تھے جن کے مطابق سویٹ یونین ضرورت کے وقت ہندوستان کی مدد کرنے کا پابند تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں ہندوستانی مفادات کے خلاف کسی تجویز پر ویٹو یعنی حق تنسیخ استعمال کرنے کے سوا روس نے ہندوستان کی کوئی عملی امداد نہیں کی۔ مثال کے طور پر پاکستان کے ساتھ کسی جنگ میں یا چین کے ساتھ جنگ میں روس نے ہندوستان کی مدد کے لیے نہ فوج بھیجی نہ غیر معمولی پیمانے پر فوجی سازوسامان فراہم کیا جبکہ چین سے جنگ کے موقع پر امریکی دیوپیکر ٹرانسپورٹ طیارے جرمنی سے جنگی سازوسامان لاد کر براہِ راست کلکتہ آرہے تھے اتنا ہی نہیں بلکہ کلکتہ سے نیفا تک ان سامانوں کو پہنچانے کے لیے ٹرانسپورٹ کی سہولتیں ناکافی ہونے کی وجہ سے یہ کام بھی امریکی طیارے انجام دے رہے تھے۔ اقتصادی امداد کا ذکر نہیں کررہا ہوں وہ ایک الگ بحث ہے۔

مذکورہ بالا کیفیت تو تھی حکومتی سطح پر ہندوستان اور روس کے رشتوں کی لیکن عوامی سطح پر ان رشتوں میں بڑی گرم جوشی تھی۔ مختلف کمیونسٹ اور سوشلسٹ پارٹیاں، ورکروں اور مزدوروں کی تنظیمیں سویٹ یونین کے لیے سرگرمی کے ساتھ کام کررہی تھیں جس کے لیے انھیں معاوضے بھی مل رہے تھے۔ ملک کی سب سے بڑی اور حکمراں کانگریس پارٹی بھی ایک تو اپنے اعلان کردہ سوشلسٹ نظریہ کی بنا پر، دوسرے حکومتوں کے درمیان معاہدوں کی بنا پر سویٹ یونین کی طرف جھکاؤ رکھتی تھی۔ حکومت اور پارٹی لیڈروں کا تھوڑا سا جھکاؤ بھی دوسروں کے لیے کافی اشارہ تھا۔

ایک تیسرا عنصر بھی تھا۔ ہندوستان میں سی آئی اے کی سرگرمیوں کے متعلق بے

پناہ پروپیگنڈا سویٹ حکومت کے اداروں اور کمیونسٹ پارٹیوں کی طرف سے کیا جارہا تھا۔ اس پروپیگنڈے کو مسز اندرا گاندھی کے دورِ حکومت میں بڑی تقویت ملی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سی آئی اے کی اصلی نقلی کارروائیوں اور کارگزاریوں کے متعلق بڑی کہانیاں اخباروں میں چھپنے لگیں اور یہ پرمذاق حد تک روزمرہ کا معمول بن گئیں۔ ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے چنانچہ سنجیدہ حلقہ تو ایک حد تک ان کہانیوں پر یقین کرنے کے بعد ٹھہر کر سوچنے لگا لیکن عوام کا بڑا طبقہ اس قدر متاثر ہوا کہ لوگ امریکی اداروں کی سنجیدہ اور تعمیری کارروائیوں کو بھی سی آئی اے کی کوئی حرکت یا چال سمجھنے لگے۔ اس کیفیت نے ہمارے جیسوں کے لیے جو اردو اخباروں سے سروکار رکھتے تھے کچھ زیادہ ہی مشکلیں پیدا کردیں۔

آزادی کے بعد ہندوستان میں اردو خواں، بالخصوص مسلمان، وہی دانشور سرگرم رہ گئے جن کے رجحانات بائیں بازو کی طرف تھے۔ ان ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں کے دو بڑے اور مضبوط مراکز بمبئی اور حیدرآباد تھے ان شہروں کے اردو اخبارات و جرائد بھی صفِ اول کے کمیونسٹ ادیبوں اور دانشوروں سے متاثر تھے۔ مغربی بنگال میں بھی کمیونسٹوں اور مارکسیوں کے زیر اثر اردو اخبارات کا رویہ سویٹ یونین کی طرف جھکاؤ کا تھا۔ اردو اخباروں کا ایک بڑا مرکز سرینگر تھا لیکن کشمیری اخبارات کو اپنے ہی مخمصوں سے فرصت نہیں تھی اس لیے دیگر بین الاقوامی کشاکشوں سے ان کا تعلق واجبی واجبی سا تھا۔ انھیں دو خانوں میں رکھا جاسکتا ہے ایک روس نواز جن کی پالیسی کچھ حکومت ہند کے زیر اثر اور کچھ کمیونسٹ پارٹی کے زیرِ اثر تھی۔ دوسرے وہ جو روس سے کوئی ہمدردی تو نہیں رکھتے تھے لیکن امریکہ سے بھی خوش نہیں تھے کیونکہ امریکہ براہِ راست ان کی کوئی مدد نہیں کررہا تھا۔

اب رہے شمالی ہند کے قابلِ ذکر اخباری مراکز دہلی اور جالندھر۔ یہاں کے قابلِ ذکر اردو اخبارات مسلمانوں کی ملکیت اور ادارت میں نہیں تھے اس لیے محسوس ہوتا تھا کہ وہ فکری اعتبار سے آزاد ہیں یعنی حکومت یا کسی سیاسی پارٹی کے زیرِ اثر کام نہیں کرتے بلکہ ہر معاملہ میں اپنی آزادانہ رائے رکھتے ہیں اور اسی کے مطابق پالیسی اختیار

کرتے ہیں۔ ایسے میں ان اخبارات کے ساتھ کام کرنے میں مجھے آسانی تھی۔ میرا مشاہدہ یہ تھا کہ امریکہ سے متعلق معاملات میں اردو اخباروں کے دروازے مقفل تھے، تازہ ہوا جانے کا کوئی بندوبست نہ تھا اس لیے کسی موضوع پر ان سے بحث مباحثہ یا مکالمہ ایک مشکل اور اکثر لا حاصل امر تھا لیکن دہلی اور جالندھر کے غیر مسلم اخباروں سے مختلف امریکی پالیسیوں اور پروگراموں پر گفتگو کرنا آسان تھا۔

افغانستان کا مسئلہ اور معاملہ دیگر امور سے مختلف تھا۔ اس معاملے میں ایک عمومی اتفاق رائے تھا کہ سویٹ یونین نے افغانستان پر فوج کشی کر کے ظلم اور زیادتی کی ہے۔ اس ایشو پر ہندوستانی اخباروں میں امریکی پالیسی کے مطابق کام کرنا نسبتاً آسان ہوگیا۔ اتفاق ایسا کہ روس کی اس جارحیت کا سلسلہ اتنا طول کھنچا کہ نو برس تک جاری رہا۔ اس اثناء میں افغانوں پر روسیوں کے مظالم کی بیشمار داستانیں مختلف امریکی اور غیر امریکی ذرائع سے آتی رہیں اور اخبارات کے کالموں میں راہ پاتی رہیں۔

ہند افغان تعلقات:

اسی موقع پر ہندوستان اور افغانستان کے تعلقات پر ایک نظر ڈال لینا بھی بے محل نہ ہوگا۔ روایتی طور پر ان دونوں ملکوں کے تعلقات دوستانہ چلے آرہے تھے حتیٰ کہ آزادی سے بہت پہلے آزاد ہندوستان کی جلاوطن حکومت کابل ہی میں قائم کی گئی جس کے صدر راجہ مہیندر پرتاپ اور وزیرِ اعظم مولوی برکت اللہ بھوپالی تھے۔ آزادی کے بعد بھی یہ تعلقات قائم رہے۔ ایسے میں جب سویٹ یونین نے افغانستان پر فوج کشی کردی تو ہندوستان کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوگیا کہ ایک روایتی دوست افغانستان کی طرفداری کرے یا معاہدوں میں شریک برائے نام دوست سویٹ یونین کی ہندوستان کی زیرِ قیادت غیر جانبدار تحریک میں بھی افغانستان شامل تھا اور اس تحریک کا ایک کمزور رکن تھا۔ ایسے میں ہندوستان نے روس اور افغانستان کے درمیان بڑی حد تک غیر جانبداری کو راہ دی۔ یہ امر قابلِ بحث ہے کہ کسی صریح ظلم کی صورت میں غیر جانبدار رہنا یعنی ظالم اور مظلوم دونوں کو

برابر کا درجہ دینا اخلاقی طور پر کس حد تک جائز ہے۔صرف یہ کہہ کر اس بحث سے صرفِ نظر نہیں کیا جاسکتا کہ سیاست میں فلسفہ، اخلاق کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ بہرحال اس غیر جانبداری بہ الفاظ دیگر سویٹ یونین کی تائید سے گریز نے افغانستان کے ایشو پر میرا کام آسان کر دیا۔

ملازمت کے لوازمات:

میں اخبار نویس تو ضرور تھا لیکن حکومت امریکہ کے ایک ملازم ہونے کے ناطے ان ضابطوں کا پابند تھا جن کی پابندی ہر جگہ سرکاری ملازمین پر لازم ہوتی ہے یعنی سرکاری ملازم حکومت کی پالیسی کے مطابق کام کرتا ہے اس کے پروگرام پر عمل درآمد کرتا ہے اس میں اس کے ذاتی نظریات کا کوئی عمل دخل نہیں ہوا کرتا۔ یہ تو ایک تبصرہ ہوا اس باب میں کہ ہند امریکی تعلقات اور دیگر بین الاقوامی معاملات و واقعات کے بارے میں حکومت امریکہ کی جو پالیسی بھی ہو اسی کے مطابق مجھے اردو اخبارات سے مراسلت کرنی تھی، رابطے قائم رکھنے تھے، اس سے بحث نہ تھی کہ وہ پالیسی مقبول ہے یا نامقبول۔

ایک سرکاری ملازم کی حیثیت سے مجھے یہ بات بھی ہمیشہ ملحوظ رہی کہ میں ایک بیوروکریسی (دفتر شاہی نظام) بلکہ دنیا کی سب سے بڑی بیوروکریسی کے تحت کام کر رہا ہوں۔ اس نظام کے بعض خواص تقریباً ہر جگہ اس طرح کے نظام میں پائے جاتے ہیں ان کو سمجھ لینا اور سمجھ کر برتنا اپنی کامیابی میں معاون ہوتا ہے چنانچہ میں نے ہمیشہ جتنا وقت کام پر صرف کیا اسی کے مساوی کاوش اس کام کو مفید اور بارآور ثابت کرنے پر صرف کی۔ مثال کے طور پر مجھے قدم قدم پر اس پروپیگنڈے کا سامنا تھا کہ ہندوستان میں اردو زبان ختم ہو رہی ہے، چالیس پچاس برس سے کم عمر کے لوگ اردو خواں نہیں رہے، اردو اخبارات کی کوئی آواز نہیں ہے، اس زبان کا کوئی سیاسی اثر نہیں ہے نہ اس کا کوئی مخصوص علاقہ اور حلقہ ہے۔ مجھے ہر نووارد امریکی افسر کو یہ بات سمجھانی پڑتی تھی کہ بہتیری کمزوریوں کے باوجود اس زبان کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

اردو کی اہمیت:

جس زبان کے اخبارات ملک کے تقریباً ہر بڑے شہر سے نکلتے ہوں (یہ مقام انگریزی اخباروں کے سوا کسی اور کو نصیب نہیں) جس زبان کے روزنامے ایک سو سے زیادہ اور مجموعی اخباروں کی تعداد ڈیڑھ ہزار سے زیادہ ہو، جس زبان میں آل انڈیا ریڈیو کے دس بارہ گھنٹے نشریات ہوں، جس زبان کے مکمل شعبے ملک کی تقریباً ہر قابلِ ذکر یونیورسٹی میں موجود ہوں، مرکزی اور ریاستی حکومتوں کے انفارمیشن آفسوں میں جس زبان کے شعبے اور انفارمیشن آفیسر ہوں، جس زبان کے بولنے والوں کی تعداد مغربی یورپ کے کئی ملکوں کی مجموعی آبادی کے برابر ہو، دنیا کے سارے بڑے بڑے نشریاتی نظام جس زبان سے صرفِ نظر نہ کر سکتے ہوں اسے ایک عالمی طاقت کا دفتر اطلاعات کس طرح نظر انداز کر سکتا ہے۔ یہ دلائل اتنے مضبوط تھے کہ ہر کسی کی سمجھ میں آسکتے تھے، یہی سارے مخالفانہ پروپیگنڈوں کی کاٹ تھی۔ اگر معاملہ صرف مسلمانوں کا ہوتا تو بھی دنیا بھر کے ملکوں میں ملیشیا کے بعد دوسری سب سے بڑی مسلم آبادی اور ہندوستان کی سب سے بڑی اقلیت کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں تھا جس کا رنگ دہلی اور اطراف دہلی کی تین یونیورسٹیوں پر چڑھا ہوا ہے، جس کے عالمی شہرت رکھنے والے تعلیمی اور مذہبی ادارے بھرپور زندگی رکھتے ہیں، جن کے ووٹ حاصل کرنے کے لیے الیکشن کے موقعوں پر ہر پارٹی حتی الوسع کوشش کرتی ہے کیونکہ وہ سیاسی توازن بنانے بگاڑنے کی صلاحیت رکھتے ہیں یوں اپنی بے شعوری کی وجہ سے اس صلاحیت کا بخوبی استعمال نہ کریں یہ اور بات ہے۔ منفی ہی سہی لیکن ایک وزنی عنصر سویٹ انفارمیشن سروس تھا جہاں اردو کا ایک مکمل شعبہ کوئی نصف درجن افراد پر مشتمل تھا جہاں سے شائع ہونے والے جرائد کے علاوہ بہت سارا پریس میٹر روز اردو اخباروں کے لیے بھیجا جاتا تھا۔ اس کے مقابلے میں ایک ایڈیٹر اور ایک اسسٹنٹ اردو سروس کے لیے رکھنا امریکیوں کے نزدیک ایک معقول ضرورت تھی۔

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں میں ایک بیوروکریسی سے وابستہ تھا۔ اس نظام کی ایک

خصوصیت یہ بھی ہوتی ہے کہ نیچے سے اوپر تک ہر افسر اپنے افسر بالا کو اپنی کارگزاریوں کے متعلق اچھا تاثر دینے کی کوشش کرتا ہے اس لیے اگر یہ سمجھ لیا جائے کہ بہتر کارکردگی کی پرکھ اور پیمائش کے پیمانے کیا ہیں اور انھیں اچھی طرح برتا جائے تو ترقی کی راہ کی رکاوٹیں دور ہوتی چلی جاتی ہیں۔

میں نے اپنے دفتر میں کارکردگی کے ان پیمانوں کو اچھی طرح سمجھنے کی کوشش کی اور اسے ہمیشہ ملحوظ رکھا۔ ہماری بہتر کارکردگی ہمارے پورے سیکشن کی کارکردگی کی بہتری میں اضافہ کا موجب تھی یعنی ہمارے انچارج افسر کے حق میں تھی، پھر ہمارے شعبہ اور ہمارے افسر کی بہتر کارکردگی پورے دفتر کی بہتر کارکردگی میں معاون ہوتی۔ واشنگٹن ہیڈ کوارٹر میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو تو آئینہ میں دکھایا ہوا عکس نظر آتا تھا انھیں کیا پتہ کہ کون معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں۔

مثال کے طور پر افغانستان کے معاملے کو لیتے ہیں۔ وہاں کے جنگ و جدال میں امریکہ براہِ راست تو نہیں لیکن بالواسطہ ملوث تھا اور ہر محاذ پر اس کی کوششیں جنگی پیمانے پر جاری تھیں ان میں سے ایک اہم محاذ میڈیا کا بھی تھا جو فی زمانہ رائے عامہ بنانے اور حکومتی پالیسیوں پر رائے عامہ کا دباؤ بڑھانے کا بہترین ذریعہ ہے۔ میں اسی محاذ پر احقر ترین کارکن تھا لیکن اس سے انکار نہیں کہ بہرحال افغانستان کے معاملات میں حکومت امریکہ کی پالیسیوں کو کامیاب بنانے کے لیے کام کر رہا تھا۔ چنانچہ طرح طرح کا بے انتہا لٹریچر تیار کر دیا جو اردو اخبارات میں راہ پا رہا تھا۔ حساب کتاب کے مجموعی کھاتے میں یقیناً اس کا شمار ہوتا رہا ہوگا بلکہ اس کی وجہ سے کھاتے کا وزن بڑھ جاتا رہا ہوگا۔ اس پر میری بڑی حوصلہ افزائی کی گئی، ایوارڈ اور نقد انعامات سے نوازا گیا، ظاہر ہے یہ سب کچھ میرے افسروں کے حصہ میں بھی آیا ہوگا جس کا مجھے علم نہیں اس کے بعد ہی انھوں نے مجھ پر نوازشیں کی ہوں گی۔

دشواریاں: اپنی کارگزاریوں اور ذمہ داریوں کی انجام دہی کے سلسلے میں

مجھے ایک بڑی اڑچن کا سامنا تھا اور ایک بڑی سہولت بھی حاصل تھا۔ اڑچن سویٹ انفارمیشن سروس اور اس کے لیے کام کرنے والوں کی طرف سے تھی جو تقریباً ہر بڑے شہر میں اور ہر زبان میں سرگرمِ عمل تھے۔ ان کے ہاں اردو میں کام کرنے والا کوئی نصف درجن افراد پر مشتمل اسٹاف تھا۔ ''سویٹ دیس'' اور اس کے علاوہ بھی دو ایک جرائد اردو میں نکلتے تھے، بہت سارا مواد ماسکو اور مشرقی جرمنی سے بھی آتا تھا مزید برآں مقامی لوگوں سے بھی معمولی اجرت پر مقامی زبانوں میں کام لیا جاتا تھا غرض کہ اخبارات پر (میں اردو پریس کی بات کر رہا ہوں) سویٹ مٹریل کے انبار کے بے پناہ دباؤ تھا لیکن میرے خیال سے اس کا ایک افادی پہلو بھی تھا وہ یہ کہ ہر روز اتنے سارے مٹریل کا انبار دیکھ کر ایڈیٹروں میں ایک طرح کی اکتاہٹ اور کراہت پیدا ہو رہی تھی۔ گندے گھٹیا درجہ کے کاغذ پر بھدی لکھائی چھپائی والے بنڈلوں سے لوگ تنگ آئے ہوئے تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس تمام مواد کا بہت کم فیصد حصہ اشاعت کا منہ دیکھتا رہا ہوگا۔ امریکہ خصوصاً سی آئی اے کی سرگرمیوں کے متعلق کچھ چٹ پٹی کہانیاں وہ اخبار چھاپا کرتے تھے جو نظریاتی طور پر یا کسی اور وجہ سے سویٹ یونین کے قریب تھے یا وہ جو امریکہ کو اور اس کی پالیسیوں کو محض ناپسند کرتے تھے۔

سہولت: ایک بڑی سہولت جو مجھے حاصل تھی وہ یہ تھی کہ مشرقی ہند کے اردو پریس میں بشمول کلکتہ اور پٹنہ مجھے خاص اعتبار حاصل تھا۔ میں اچھا برا جیسا بھی تھا اپنی تمام خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ جانا پہچانا جاتا تھا۔ وہاں سے نکلے ہوئے میرے شناسا دہلی اور بمبئی جیسے شہروں میں بھی پہنچ گئے تھے اور بعض کلیدی جگہوں پر تھے ان سے مجھے اخلاقی توانائی ملتی اور عملی مدد بھی۔ میری بہتر کارکردگی کا یہ بہت بڑا راز تھا، میرے دوست اور بہی خواہ میرا سب سے قیمتی سرمایہ تھے۔ چنانچہ دفتری کارگزاریوں کی پرکھ کے جو معیار تھے ان پر میں جس حد تک چلا گیا کسی اور زبان میں حتیٰ کہ انگریزی میں بھی کوئی نہیں پہنچ پایا۔ گیارہ بارہ ایڈیٹر دیسی زبانوں میں کام کر رہے تھے ان میں میرا پلڑا ہمیشہ سب سے بھاری رہا۔

اردو اخباروں میں مدت دراز تک کارکردگی اور ان کی ضرورتوں کو اچھی طرح سمجھ لینے سے بھی مجھے اپنی کارکردگی بہتر بنانے میں مدد ملی۔ میرا مشاہدہ تھا کہ بعض اخباروں کو اپنے ادارتی صفحہ پر کسی اچھے فیچر کی مستقل ضرورت رہتی ہے۔ اسی طرح ایڈیٹوریل کالم میں یا کہیں اور بچی کھچی جگہ کی خانہ پری کے لیے دلچسپ فلر کی ضرورت ہوتی ہے میں ان دونوں ضرورتوں کی تکمیل کے لیے اچھا مواد فراہم کرنے کی کوشش کرتا تھا اور اس سلسلے میں اپنے دفتری حدود کے اندر ہر مکمل وسیلے کو کھنگالا کرتا تھا جس پر خاصا وقت صرف ہوتا تھا۔ ہر سمجھدار اور ذمہ دار ایڈیٹر جانتا ہے کہ اپنے قارئین کی پسند کا مواد تلاش کرنا کتنا ضروری اور اس کے ساتھ ہی مشکل بھی ہے۔

ہمارے لیے یہ مشکل اور بھی زیادہ تھی کیونکہ اخبارات کو بھیجے جانے والے مواد کا معتبر اور مستند ہونا لازمی تھا۔ میں اس مفروضے کے تحت کام کرتا تھا کہ جو کچھ لکھ رہا ہوں اسے کوئی دو سو ناقدین اور مخالفین کے سامنے جانا ہے اور ان میں سے معلوم نہیں کون کیا مصیبت کھڑی کرے۔ دوسری طرف امریکہ میں چونکہ کاپی رائٹ کے قوانین پر سختی سے عمل ہوتا ہے اس لیے یہ امر ملحوظ رکھنا بھی ضروری تھا کہ کہیں اس طرح کی پیچیدگیاں نہ پیدا ہوں۔ ایک بار ایسا ہوا کہ میں نے ایک مضمون کسی امریکی میگزین سے لیا اور اخباروں کو بھیج دیا۔ متعلقہ مہینے میں جاری شدہ مضامین کی فہرست پر دوسرے سیکشن کے کسی امریکی کی نظر پڑی تو بجائے اس کے کہ وہ مجھ سے یا میرے ڈائریکٹر سے رجوع کرتا اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتا کہ میں نے کاپی رائٹ کا کلیرنس حاصل کیا ہے یا نہیں اس نے اپنا اعتراض کنٹری آفس کے ڈائریکٹر کو لکھ بھیجا وہاں سے جواب طلبی میرے ڈائریکٹر سے ہوئی پھر انھوں نے مجھ سے جواب طلب کیا تو میں نے عرض کیا کہ جناب اخباروں میں میری زندگی گزر گئی، ایسی کچی گولیاں تو میں نے کھیلی نہیں ہیں پھر ان کو کاپی رائٹ کلیرنس دکھایا۔ اس کے بعد ہمارے ڈائریکٹر نے بڑا سخت جواب لکھا پھر اوپر سے ایک معذرت نامہ میرے نام آیا۔ امریکیوں کے متعلق ایک بات بالعموم میرے مشاہدے میں یہ آئی کہ جب

ان کو اپنی غلطی کا علم اور احساس ہوجاتا ہے تو پھر وہ انا کو ایک طرف رکھ دیتے ہیں، پردہ ڈالنے کے لیے کوئی لیپا پوتی نہیں کرتے، صاف صاف معذرت کرتے ہیں اور ممکن ہوا تو ازالے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔

ہم جو پریس میٹر تیار کرتے اسے موتیوں کی طرح پرونا ملک صاحب کا کارنامہ تھا دراصل وہ شخص پیدائشی فنکار تھا۔ اردو زبان و بیان بلکہ اردو تہذیب سے اچھی طرح آگاہ و آشنا، خطاطی میں کمال کی دستگاہ کے حامل اور ہرفن مولا۔ میں اپنے اخباری تجربات کی روشنی میں موضوعات و مضامین کو حتی الوسع مقبول اور سرخیوں کے ذریعہ پرکشش بنانے کی کوشش کرتا تو ملک کی خوش نویسی اس کے ظاہری حسن میں چار چاند لگاتی۔ اچھا کاغذ اور جدید ترین مشینوں پر صاف ستھری چھپائی مستزاد تھی۔ ہماری کامیابیوں میں یہ سارے عناصر کارفرما تھے۔ میں اور ملک دونوں اپنے اپنے طور پر یہ کوشش بھی کرتے تھے کہ پریس میٹر ٹھیک وقت سے اخبار کے دفتروں میں اور صحیح آدمی کے ہاتھ میں پہنچ جائے۔ اس کے لیے بڑی بھاگ دوڑ کی جاتی۔

حسابی نکتہ یہ تھا کہ ہماری دفتری کارگزاریوں کی پرکھ میں اعداد و شمار کو بڑا دخل تھا۔ یہ سارا کھیل کمپوٹر کا تھا۔ کمپیوٹر بہرحال ایک مشین ہے جسے آدمی چلاتا ہے جو اسے من مانے چلا کر من مانے نتائج یا جوابات حاصل کرسکتا ہے۔ جو نکتہ میں نے کبھی کسی کو نہیں بتایا اور جس پر کسی کی نظر نہیں گئی وہ یہ تھا — دہلی، بمبئی، کلکتہ اور مدراس چاروں دفاتر کی کارگزاریاں الگ الگ کمپیوٹر ظاہر کرتا تھا۔ پھر دوسرے پروگرام میں یہی کارگزاریاں زبانوں کے اعتبار سے ظاہر کی جاتی تھیں جیسے کہ اردو، ہندی، انگریزی، بنگالی، مراٹھی وغیرہ۔ میری کارگزاری کا اظہار دہلی کے ذیل میں اور اردو کے ذیل میں ہوا کرتا تھا لیکن حقیقت یہ تھی کہ ہمارے اردو اخبارات تو ہر دفتر کے علاقے میں تھے مثلاً کلکتہ آفس کے علاقے کلکتہ اور پٹنہ، بمبئی آفس کے علاقے میں بمبئی، اور اورنگ آباد، مدراس آفس کے علاقے میں حیدرآباد اور بنگلور۔ میں ان سب علاقوں کی کارگزاری کو اردو کے ذیل میں

لے آتا پھر وہ لازماً دہلی آفس کے ذیل میں آجاتیں۔ گویا ہمارا حساب کتاب ملک گیر پیمانے پر ہوتا اور بقیہ ساری زبانوں کا ریاستی پیمانے پر اور اس میں سے بھی اردو کا حصہ نکل کر دہلی میں آجاتا اس لیے کوئی لسانی حلقہ بازی نہیں لے جاسکا اور اس نازک نکتہ پر کسی کی نظر نہیں گئی۔ دہلی کے افسر خوش کہ ان کی کارگزاری اچھی رہی اور مجھ سے خوش کہ میری وجہ سے رہی۔ ہندی پر بھی سبقت کی ایک خاص وجہ یہ تھی کہ سری نگر، حیدرآباد اور بنگلور کے تین اردو مراکز ایسے تھے جہاں ہندی کا عمل دخل نہ تھا نہ ہندی ایڈیٹروں کا کوئی واسطہ۔

ایک دلچسپ مثال — اگر کسی مہینے میں میں نے دس مضامین جاری کیے تو اتنے بڑے ملک اور اتنے بڑے شہروں میں کسی نہ کسی قابلِ ذکر اخبار میں بیشتر مضامین چھپ ہی جاتے تھے، مان لیجیے اسی فیصد لیکن بیچارہ بنگالی یا مراٹھی ایڈیٹر اپنے محدود علاقے میں اتنا فیصد نتیجہ کہاں سے لاتا۔ کمپیوٹر سے جب فیصد نتیجہ دریافت کیا جاتا تو وہ اردو اسی فیصد اور بقیہ زبانوں کا پندرہ تا پچیس فیصد بتا کر خاموش ہوجاتا۔ میں نے اپنی ساری مدتِ کار کے دوران لوگوں کو اس گورکھ دھندے میں ڈالے رکھا۔ جب اردو اخباروں کے قد وقامت کی بات ہوتی تو وہاں الگ اعداد وشمار کا گورکھ دھندا تھا، وہاں میں نے ہمیشہ سرکولیشن کو پیچھے ڈال دیا اور ریڈرشپ کی بات کی۔

۱۹۸۰ء کا عشرہ میرے لیے بڑے چیلنجوں اور آزمائشوں اور اس کے ساتھ ہی انعامات وعنایات کا دور بن کر آیا۔ گھریلو محاذ پر سب ٹھیک ہی چل رہا تھا۔ دسمبر ۱۹۸۰ء میں کرسمس کے دن میرے سب سے چھوٹے بھائی ڈاکٹر فیضان اللہ فاروقی کی شادی ہوئی۔ ان کی بارات بارہ بنکی گئی تاریخوں کے کئی بار التوا اور اسی باعث دفتری پروگراموں سے ٹکراؤ کی وجہ سے میں اس موقع پر شریک نہیں ہوسکا۔ اس کے چھ ماہ بعد جون ۱۹۸۱ء میں میری تیسری بیٹی شگفتہ کی شادی ہوئی۔ اس موقع پر ہمارے بہتیرے اعزہ واقارب ہمارے وطن کوئریا پار میں اکٹھا ہوئے۔ یہ سب اس عشرہ کی خوشگوار شروعات تھی۔

پریس چیف: ۱۹۸۲ء میں ہندی ایڈیٹر اور پریس چیف وی پی سنگھ ریٹائر

ہوگئے۔ انھوں نے آئندہ ہندی ایڈیٹر کے لیے نہ کوئی نام تجویز کیا نہ اس سلسلے میں کوئی سفارش کی۔ ان کے ریٹائرمنٹ سے چند ماہ قبل ہندی ٹائپسٹ دل کے دورے میں مبتلا ہوا تھا اور اس نے ریٹائرمنٹ لے لیا تھا اس کی جگہ ایک شخص کو عارضی طور پر یومیہ اجرت پر کام کرنے کے لیے رکھ لیا گیا۔ غرض یہ کہ جب وی پی رخصت ہوئے تو ہندی یونٹ میں ایک افراتفری کی کیفیت تھی اس وقت یہ مسئلہ بھی درپیش تھا کہ پریس چیف کا تقرر کیسے ہو۔ ایک رائے یہ تھی کہ براہِ راست باہر سے کوئی شخص لیا جائے، دوسری رائے یہ تھی کہ آفس کے اندر ہی سے کسی تجربہ کار شخص کو لیا جائے۔ اس وقت ہمارے ڈائریکٹر بھی نئے تھے انھیں آئے ہوئے تھوڑے ہی دن ہوئے تھے۔ مسٹر چارلس لوریج نوجوان اور ہوشیار آدمی تھے اور بڑے بے تکلف۔ ڈپٹی ڈائریکٹر کی جگہ پر ایک زیر تربیت، نوخیز خاتون افسر تھیں مس ایلن فِش وہ پریس افسر کے طور پر مامور کی گئیں انھیں کام کا کوئی تجربہ نہ تھا ٹریننگ کے لیے دہلی بھیج دی گئی تھیں۔

ہمارے ڈائریکٹر کے مشیر ایک صاحب تھے مسٹر ٹونی جیسو داسن جو دون اسکول کے تعلیم یافتہ کیرالائٹ تھے نوجوان اور بلا کے ذہین تھے۔ وی پی کے بعد پریس چیف کے طور پر تقرر کے سلسلے میں بالعموم نظریں انہیں کی طرف اٹھتی تھیں لیکن غالباً امریکنوں میں سے کسی کی رائے یہ بھی رہی ہوگی کہ سیکشن میں سینئر آدمی کو موقع دیا جائے، اس اعتبار سے باری میری تھی جیسے کول صاحب کے بعد وی پی ہوگئے تھے۔

چنانچہ ایلن فِش نے مجھے بلا کر پوچھا کہ آیا میں اس پوزیشن کو تسلیم کرنے کے لیے تیار ہوں، میں نے اسی وقت صاف کہہ دیا کہ میں خود کو اس کا اہل نہیں سمجھتا۔ پھر ان کا کہنا تھا کہ میں کوئی نام تجویز کروں۔ میں نے کہا کہ اور بھی پرانے لوگ ہیں ان سے مشورہ کریں۔ دراصل میں اس مخمصے میں پڑنا ہی نہیں چاہتا تھا اور سوچ لیا تھا کہ جو آئے گا اس سے نبھانے کی صورت کروں گا۔ قیاس ٹونی کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ خود اپنے بارے میں میرے انکار اور گریز کی بڑی وجہ یہ تھی کہ میں سمجھ رہا تھا کہ دہلی میں جس درجہ کے ایڈیٹر ہیں

اور انھیں برتنے میں جتنی نزاکتیں ہیں وہ میرے بس سے باہر ہیں اور جو مجھ سے خوش نہیں ہوگا وہ پہلی فرصت میں میرے خلاف کوئی بات امریکنوں کے کان میں ڈال دے گا۔ دفتر کے اندر بھی جو لوگ امیدیں لگائے بیٹھے ہوں گے، وہ میری ٹانگ کھینچنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیں گے ایسے میں میرا حشر بھی کول صاحب جیسا ہوگا۔ غرض یہ کہ میری لاتعلقی نے ٹونی کا راستہ صاف کر دیا اور وہ پریس چیف ہو گئے۔

ٹونی صاحب کے لیے سب سے بڑا فوری مسئلہ ہندی پریس کا تھا، انھوں نے مجھ سے کہا کہ اس کی ذمہ داری تم قبول کرو اور جب تک کوئی ہندی ایڈیٹر نہیں ملتا کسی طرح کام چلاؤ، میں نے کہا کہ یہ روز چار مترجموں کا جھمیلا میں نہیں پال سکتا اس لیے کہ مجھے اپنا کام بھی دیکھنا ہے میں تو بھروسے کے کسی ایک آدمی کے ذمہ یہ کام کر کے اسی کی نگرانی کر لیا کروں گا۔ ٹونی نے میرے اس خیال سے اتفاق کیا۔ دراصل روز اول سے میرا اور ٹونی کا رشتہ ایسے خوشگوار طریقے سے راسخ ہوا کہ آگے چل کر بعض معاملوں میں اختلاف رائے کے باوجود ہم لوگوں کے درمیان نہ کوئی تلخی پیدا ہوئی نہ کسی طرح کا کھنچاؤ آیا۔

امبیکا سنگھ جو ایک عرصہ تک اسسٹنٹ ہندی ایڈیٹر رہ چکے تھے اور کوئی دو برس پہلے ریٹائر ہو گئے تھے میں نے ان کا نام تجویز کیا پھر ان کو بلا کر لایا کہ جب تک کسی ہندی ایڈیٹر کا تقرر نہیں ہو جاتا وہ کام سنبھالیں۔ انھیں کچھ بتانا نہیں تھا یوں بھی وہ اپنے زمانے میں ہندی پریس میں وی پی سنگھ سے زیادہ مقبول تھے۔ انھوں نے میری تجویز منظور کر لی اور آ کر کام کرنے لگے۔ دریں اثناء ہندی ایڈیٹر کی تلاش جاری رہی بالآخر دہلی کے ایک نوجوان اخبار نویس سریندر ورما کا انتخاب اور تقرر ہوا۔ ان کے تقرر کے بعد ان کی معاونت کے لیے امبیکا سنگھ کو برقرار رکھا گیا لیکن کوئی چھ مہینے بعد ان پر دل کا دوسرا دورہ پڑا اور وہ کام سے بالکل کنارہ کش ہو گئے۔

ہندی ایڈیٹر: سریندر ورما کی کہانی الگ ہے وہ منچلے قسم کے نوجوان تھے، دہلی کے ایک باحیثیت اور خوشحال گھرانے سے ان کا تعلق تھا۔ روپیہ پیسہ ان کے لیے کوئی

مسئلہ نہ تھا، نوکری انھوں نے شوقیہ یا مشغولیت کے لیے کی تھی۔ دفتر سے ملنے والی تنخواہ تو ان کی دوست داری کے لیے بھی ناکافی تھی۔ وہ سیاست سے بھی خاصی دلچسپی رکھتے تھے۔ شام کو آفس سے اٹھ کر دوستوں کے ساتھ کسی بار میں چوکڑی جماتے رات گئے گھر لوٹتے۔ صبح کو وقت سے دفتر آنا ان کے لیے دنیا کا سب سے مشکل کام تھا۔ بلا کچھ شغل فرمائے دوپہر کا کھانا بھی نہیں کھا سکتے تھے۔ دفتری اوقات کے اندر اس کیفیت کو نبھانا بھی مشکل کام تھا۔ اس شخص میں بلاشبہ بعض خوبیاں تھیں لیکن وہ صاف صاف کہتے تھے کہ بھائی یہ ساڑھے آٹھ سے ساڑھے پانچ تک کی پابندی اپنے بس کا روگ نہیں ہے۔ پتہ نہیں انھوں نے اس روگ کو برداشت کیا کہ دفتر نے ان کو برداشت کیا لیکن یہ گاڑی کوئی تین برس تک چلی ہوگی اس سے آگے نہیں چل سکی۔

ورما جی میرا بڑا لحاظ کرتے تھے اور مجھے رضوان بھائی کہتے تھے۔ چنانچہ جب ترنگ میں ہوتے تو فرماتے رضوان بھائی میں تو تمہاری وجہ سے اس آفس میں ہوں ورنہ میں کب کا چھوڑ چکا ہوتا۔ جب تک تم ہو تب تک رہوں گا لیکن مجھے ان کا رنگ اچھا نہیں نظر آ رہا تھا۔ ایک دن میں نے اپنی ڈائری میں نوٹ کیا کہ اب ورما نہیں ٹکیں گے اور ٹونی کو بھی اپنے اس خیال سے آگاہ کر دیا۔ اس کے ایک ہی مہینے بعد ایک دن لنچ کے وقت کینٹین میں سریندر ورما میری ہی میز پر سامنے بیٹھے شغل فرما رہے تھے اور ترنگ میں یہ بھی فرمائے جا رہے تھے کہ ''رضوان بھائی بس تمہارے ہی رہنے تک میں اس آفس میں ہوں۔'' دو بجنے کو آئے تو میں وہاں سے اٹھا اور اپنے کمرے میں چلا آیا۔ تین بجے یہ خبر سننے میں آئی کہ سریندر ورما اگزیکیوٹیو آفس میں اپنا استعفیٰ دے کر چلے گئے، انھوں نے استعفیٰ پریس چیف یا کسی اور کو بھی دینے سے احتراز کیا مبادا کوئی انھیں روکنے کی کوشش کرتا۔

سریندر ورما کی اس کنارہ کشی کے بعد پھر ایک ہندی ایڈیٹر کی تلاش شروع ہوئی اور مسٹر ستیہ سُمن کا انتخاب ہوا وہ بھی دہلی کے ایک مقامی جرنلسٹ تھے، ان کے بعد ایک مستقل ہندی ٹائپسٹ کا بھی تقرر ہوا۔ آگے چل کر ایک اسسٹنٹ ہندی ایڈیٹر مسز

مدھو جوشی کا بھی تقرر ہوا اس طرح دو کے بجائے تین افراد پر مشتمل ہندی یونٹ مستحکم ہوگئی۔

لیکن آگے بڑھنے سے پہلے سریندر ورما کے بعض کارناموں کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ وہ میرا بڑا لحاظ اور خیال کرتے تھے اس کی وجہ تو وہی جانتے ہوں گے لیکن اتنی بات ضرور تھی کہ ان کے تقرر کے بعد ابتدائی کئی مہینوں کے دوران میرے انتظام کی وجہ سے انھیں کام کو سمجھنے اور سنبھالنے میں کافی مدد ملی تھی۔ ایک بار کسی گفتگو کے دوران میں نے کہا کہ گیس سلنڈر کے لیے درخواست دیے ہوئے کئی برس ہوگئے اب تک نہیں ملا۔ میری بیوی کو اس کی وجہ سے بڑی پریشانیوں کا سامنا ہے۔ یہ سنتے ہی سریندر ورما نے کہا میں پندرہ دن میں آپ کو گیس دلاؤں گا پھر وہ میری درخواست لے کر خود ہی کہیں گئے اور دوسرے دن بتایا کہ گھبرایئے نہیں جلد ہی مل جائے گا۔ دو تین ہفتہ بعد انھوں نے بتایا کہ آپ کے لیے گیس سلنڈر کی منظوری کا کاغذ دفتر میں آ گیا ہے جا کر لایئے۔ میں نے کہا میں نہ جاؤں گا وہ تو ڈاک سے آ ہی جائے گا۔ پھر سریندر ورما روانہ ہوگئے اور وہ کاغذ لا کر میرے حوالے کیا اور کہا کہ جا کر ڈیلر کے ہاں سے سلنڈر لایئے۔ دوسرے ہی دن یہ سب کام ہوگیا۔

پاکستانی ادیب:

کراچی کے ایک ادیب احمد ہمیش جو بلیا، یوپی سے نقل وطن کر کے وہاں پیوند ہوئے تھے ہندی میں بھی لکھتے تھے اور کراچی میں ہندوستانی سفارتخانے سے ان کے اچھے تعلقات تھے۔ ایک بار جامعہ ملیہ کے اردو ڈپارٹمنٹ کے کسی سیمینار میں شرکت کے لیے دہلی آئے تو کراچی میں میرے ایک عزیز ریحان صدیقی نے ان کی معرفت ایک خط مجھے بھیجا اس طرح اسی سیمینار کے دوران احمد ہمیش سے میرا تعارف ہوا۔ اگلے برس دہلی میں ہندی لیکھکوں کی کوئی کانفرنس تھی اس میں پاکستانی ہندی رائٹر کی حیثیت سے شرکت کے لیے وہ تشریف لائے تو پھر ریحان صدیقی کا ایک خط لائے جس میں انھوں نے لکھا تھا کہ ہمیش صاحب چند روز دہلی میں قیام کرنا چاہتے ہیں ان کا کوئی انتظام کر دیجیے گا۔ میں نے سریندر ورما سے کہا کہ بھائی تمہارا پاکستانی ہندی لیکھک دو چار دن دہلی کی سیر کرنا چاہتا ہے

اور اس کے ساتھ ہی احمد ہمیش کو دفتر میں بلا کر ورما سے ان کی ملاقات کرادی۔ ورما انھیں لے کر نکلے اور قریب ہی ریگل بلڈنگ کے عقب میں واقع ایک ہوٹل کی بالائی منزل پر گئے وہاں رسپشن پر جو شخص موجود تھا اس سے کمرے کی کنجی لی اور احمد ہمیش کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ یہ مہمان رہیں گے اور جب تک چاہیں رہیں گے ان کے کھانے پینے کا سارا انتظام پکا ہونا چاہیے، انھیں کوئی تکلیف نہ ہو اور ان کے سارے بل میرے پاس بھیج دینا۔ اس موقع پر میں بھی موجود تھا۔ اس کے بعد کمرے میں گئے جہاں ٹیلیفون اور ایک اٹنڈنٹ کی سہولت موجود تھی۔

جوں جوں دن اور ہفتے گزرتے گئے میری حیرت اور پریشانی بڑھتی گئی اور سریندر ورما بے فکر، الٹے مجھ سے کہتے کہ آپ کیوں پریشان ہو آپ سے کیا مطلب۔ تین ہفتے بعد ہمیش صاحب تشریف لائے اور تمام آسائشوں کو بیان کرنے کے بعد فرمانے لگے کہ ذرا ناگری پرچارنی سبھا، بنارس کے بھی درشن کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے ورما سے کہا کہ بھائی تین ہفتے بعد ان کی یہ فرمائش سن لو۔ وہ کہنے لگے کوئی حرج نہیں سب انتظام ہو جائے گا۔ ویزا میں بنارس کے اندراج کا بھی سوال تھا۔ اگلے دن ورما نے فرسٹ کلاس میں بنارس کے دو طرفہ سفر کا ریزرویشن ٹکٹ اور ویزا کا اجازت نامہ حاضر کیا اور ہوٹل کا نام پتہ بھی دے دیا کہ وہاں تین دن کے لیے آپ کا کمرہ ریزرو کرا دیا گیا ہے۔ چلئے صاحب! احمد ہمیش صاحب مفت میں بنارس کی سیر بھی کر آئے اور پھر اسی ہوٹل میں ٹھہر گئے۔ اس کے چند دنوں بعد ان کی کراچی واپسی تھی لیکن اتفاق سے اس روز مجھے اپنے پروگرام کے مطابق لکھنؤ میں رہنا تھا اور ہمیش صاحب کا اصرار تھا کہ ہوائی اڈے پہنچانے کا بندوبست کر دو۔ یہ کام بھی میں نے سریندر ورما کے سپرد کیا۔

واپسی پر میں نے دریافت کیا کہ بھائی مہمان کو ٹھیک سے رخصت کر دیا تو ہوں ہاں کر کے مسکراتے رہے۔ میں سمجھ گیا کہ کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے۔ جب میں نے بتانے پر اصرار کیا تو ورما نے کہا یہ پوچھئے کہ ان کے ساتھ مال کتنا تھا؟ میں سناٹے میں

آ گیا۔ کہنے لگے کہ انھیں تحفتاً ملی ہوئی بیشتر کتابیں تھیں، ایک مجسمہ پتھر کا اور ایک کانسی کا تھا۔ سب کا مجموعی وزن ۶۳ کلو تھا۔ ایئر پورٹ والوں سے کہہ سن کر بہت رعایت کروائی پھر بھی پانچ سو روپیہ میری جیب سے چلا گیا۔ میں نے پوچھا ''اور ہوٹل خرچ؟'' کہنے لگے اسے بھول جایئے وہ میری جیب سے نہیں گیا۔ میں نے بہت اصرار کیا کہ وہ پانچ سو روپیہ لے لیں لیکن وہ کسی طور راضی نہ ہوئے۔

موصوف کو ''دہلی شہر مفت است'' کا چسکا ایسا لگا کہ اگلے برس معہ فیملی کے، جو بیگم، ایک بیٹا اور ایک بیٹی پر مشتمل تھی، براہِ راست غریب خانے پر وارد ہوئے اور اطمینان کے ساتھ پاؤں پھیلا دیے۔ اس وقت تک سریندر ورما یو ایس آئی ایس سے رخصت ہو چکے تھے۔ ٹیلیفون پر دو ایک بار ان سے ہمیش صاحب کی گفتگو ہوئی انھوں نے ملاقات کی جگہ اور وقت بھی طے کیا لیکن ملے نہیں۔ ان سے ملاقات کی امید میں ہمیش صاحب میرے غریب خانے پر ہی ہفتے پر ہفتے گزارتے رہے۔ شہر میں گھوم پھر کر اردو ہندی ادیبوں سے اپنی میری قرابت بیان کرتے رہے اور اخباروں میں الٹے سیدھے بیانات بھی دیتے رہے جو ہندی اخباروں میں بالخصوص شائع ہوئے۔ اس پر اردو حلقوں میں بڑی برہمی پیدا ہوئی۔ دہلی میں ان کے خلاف چند مراسلے چھپے لیکن ''انقلاب'' بمبئی میں ایک بڑا سخت مضمون مراسلات کے کالم میں آیا۔ ادھر یہ حضرت بمبئی جانے کے لیے ویزا کی کوشش میں بھی تھے۔ میں نے انھیں سمجھایا کہ اپنی خیریت چاہتے ہیں تو بمبئی نہ جایئے۔ شکر ہے انھیں وہاں کا ویزا نہیں ملا۔ اس بار دہلی میں کسی ہندی ادیب نے ان کے آگے گھاس نہیں ڈالی۔

مجھ جیسے بے ادب کے ہاں ہمیش صاحب کا تقریباً دو مہینے قیام ادبی حلقوں میں سخت تجسس کا موجب ہوا۔ مجھ سے جو ملتا وہ کچھ ٹوہ لینے کے انداز میں سوالات کرتا۔ خود میں اپنے گھر کے داخلی حالات سے پریشان تھا کیونکہ میں، میری بیوی اور دو بیٹیاں یعنی چار نفوس پر مشتمل فیملی تھی اور ان کی فیملی بھی چار کی یعنی ڈبل اخراجات، گھر والوں پر ناشتہ

اور کھانے کی تیاری کا بوجھ، پھر یہ کہ میں نے میزبانی کا حق کچھ زیادہ ادا کرتے ہوئے اپنا بیڈ روم ان کے حوالے کر دیا تھا۔ میری بیوی لڑکیوں کے کمرے میں سونے لگیں اور میں خود برآمدے میں۔ ہر روز صبح کو یہ پریشانی کہ مجھے آفس جانے کی تیاری میں سویرے سویرے اپنے کمرے میں بہترے کام اور یہ لوگ ذرا بے فکری سے سو کر اٹھنے والے۔ یہ لوگ غالباً وسط ستمبر میں آئے تھے۔ جب نومبر میں خنکی بڑھنے لگی تو میں نے عرض کیا کہ صاحب اب آپ برآمدے میں تشریف لائیں کیونکہ مجھے ٹھنڈ سے تکلیف ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد ہمیش صاحب نے واپسی کے بارے میں سوچنا شروع کیا اور خدا خدا کر کے ایک دن ٹرین سے روانہ ہوئے اس روز بھی میں دہلی سے باہر کلکتہ میں تھا۔ میرے ایک عزیز نے انھیں اسٹیشن تک پہنچایا۔ دریں اثناء کراچی سے ریحان صدیقی لکھتے رہے کہ ہمیش کو وہاں سے واپس آنے کو کہیے، میں نے ہرگز یہ نہیں کہا تھا کہ وہ آپ کے ہاں قیام کریں۔ یہاں جو لوگ مجھ سے ان کے بارے میں استفسارات کرتے وہ میری اس بات کا یقین ہی نہیں کرتے کہ ان سے میری کوئی قرابت یا تعلق نہیں ہے یہ لوگ مجھے یا تو نرا بیوقوف یا جھوٹا سمجھتے۔ غرض یہ کہ میری پوزیشن ہر طرح خراب تھی۔

سریندر ورما یو ایس آئی ایس سے کنارہ کشی کے کوئی دو سال بعد ایک ٹیلی پریس کانفرنس میں ہندی جرنلسٹوں کے ساتھ آئے۔ اس کانفرنس کا اہتمام ایمبسی کی عمارت میں تھا۔ ورما صاحب آئے کانفرنس روم میں خاطر مدارات کا خاص اہتمام تھا۔ ورما جی نے کسی کے پہل کرنے کا انتظار نہیں کیا اور سیدھے بوتل کی طرف بڑھے، جب تک اور لوگ شریک ہوتے وہ عالم سرخوشی میں پہنچ چکے تھے۔ میری جو شامت آئی میں نے اپنے ڈائریکٹر سے ان کا تعارف کرا دیا۔ بس ان کا ریکارڈ شروع ہو گیا۔ ''میں رضوان صاحب کا بڑا ریگارڈ کرتا ہوں۔ اتنا ریگارڈ میں کسی کا نہیں کرتا۔ آپ کے آفس میں کسی افسر کا بھی میں نے اتنا ریگارڈ کبھی نہیں کیا۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ یہ پیتے نہیں ہیں، بالکل نہیں پیتے، کبھی نہیں پیتے۔'' وغیرہ وغیرہ۔ جیسے گراموفون ریکارڈ کے بجتے بجتے اس کی سوئی پھنس

جائے اور ایک ہی الاپ الاپتا رہے۔ ہمارے ڈائریکٹر صاحب کبھی ان کا منہ تکتے کبھی میرا۔ میں نے موضوع بدلنے کی کوشش کی، لیکن بے سود، بالآخر میں وہاں سے ہٹ گیا۔

کچھ دفتر کے بارے میں:

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اپنے دفتر کی کارکردگی کی طرف واپس آنے سے پہلے اس ادارے کے بارے میں کچھ عرض کروں تا کہ اس کے متعلق بہت سی غلط فہمیوں کا ازالہ ہو سکے، گو سوویٹ یونین اور کمیونسٹ تنظیموں کی طرف سے بے حد و حساب پروپیگنڈے کے طفیل شکوک وشبہات اور غلط فہمیوں کی جڑیں اتنی گہری تھیں کہ اس تحریر کے ذریعہ ان کا ازالہ تو دور کی بات اس کی بالائی سطح کو بھی نہیں چھوا جا سکتا لیکن میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ مجھے جس حد تک واقفیت ہے اس کا اظہار ضرور کروں۔ اس اظہار کی محرک امریکی دفتر اطلاعات سے میری گزشتہ طویل وابستگی نہیں بلکہ یہ احساس اور شدید احساس ہے کہ ہمارے اردو قارئین کو اور صحافیوں کو بھی مذکورہ بالا پروپیگنڈے بازیوں سے بہت نقصان ہوا۔ اس سے فائدہ بہت تھوڑے سے ان لوگوں کو ہوا جن کی مالی منفعتیں اس سے براہِ راست یا بالواسطہ وابستہ تھیں۔ میں بہت قریب سے اندر باہر دونوں طرف دیکھ رہا تھا اور ہمیشہ اس نقصان کو دیکھتے ہوئے مضطرب رہا لیکن امریکن دفتر سے میری وابستگی ایک ایسی کمزوری تھی جس نے مجھے غیر معتبر بنا دیا تھا حتیٰ کہ جن لوگوں نے مجھے قریب سے دیکھا اور سمجھا وہ بھی اس معاملے میں مجھ سے دامن بچاتے ہی رہے۔ آگے جو کچھ لکھنے جا رہا ہوں ممکن ہے اس سے پڑھنے والوں کو خسارے کا کچھ اندازہ ہو سکے۔

حکومت امریکہ کے بعض ادارے ایسے ہیں جو کسی وزارتی شعبہ کے درجہ کے ہوتے ہیں لیکن انھیں وہ حیثیت نہیں حاصل ہوتی اور انھیں ایجنسی کہتے ہیں۔ ان کا سربراہ وزیر کے بجائے ڈائریکٹر کہلاتا ہے، مدارج میں وہ کابینہ کے وزیروں کے برابر ہوتا ہے جو وزیر کے بجائے سکریٹری کہلاتے ہیں۔ صدر امریکہ ان سکریٹریوں کی طرح ایجنسی کے ڈائریکٹر کا بھی تقرر کرتے ہیں جس کے لیے سینیٹ (ایوانِ بالا) کی طرف سے توثیق

ضروری ہوتی ہے۔اسی طرح کا ایک ادارہ یوایس انفارمیشن ایجنسی ہے جس کا مخفف یوایس آئی اے ہے۔ اس کا ڈائریکٹر دیگر سکریٹریوں کی طرح براہِ راست صدر کو جواب دہ ہوتا ہے۔ وائس آف امریکہ بھی اسی کے دائرۂ عمل میں شامل ہے۔اس ایجنسی کے جو دفاتر بیرونی ملکوں میں کام کرتے ہیں وہ یوایس انفارمیشن سروس کہلاتے ہیں جس کا مخفف یوایس آئی ایس ہے۔ بیرونی ملکوں میں اس کی کارگزاریاں امریکی سفارت خانے کے ذیل میں آجاتی ہیں اور پریس اتاشی کی کارگزاریوں سے مربوط ہوتی ہیں۔ یہ دفتر بہرحال حکومت امریکہ کی خارجی پالیسیوں کی ترجمانی کرتا ہے اور ان پر عمل درآمد میں معاون ہوتا ہے۔ان پالیسیوں کے حق میں بیرونی ملکوں کی رائے عامہ کو اور اس کی معرفت متعلقہ حکومتوں کو ہموار کرتا ہے اس لیے اس دفتر کی کارگزاریاں کسی قدر دفتر اطلاعات اور کسی قدر دفتر خارجہ کی کارگزاریوں کا مجموعہ ہوتی ہیں لیکن بالفعل اس دوعملی میں کبھی کوئی دشواری نہیں محسوس کی گئی۔

اس ادارے کا بنیادی کام اطلاعات ومعلومات کی دونوں طرف ترسیل یا تبادلہ ہے۔اسی بنا پر ایک زمانے میں ایجنسی کے ایک ڈائریکٹر نے اس کا نام بدل کر یوایس آئی سی اے (یوایس انٹرنیشنل کمیونیکیشن ایجنسی) یعنی امریکی بین الاقوامی مواصلاتی ایجنسی رکھ دیا تھا۔کوئی چار سال یہ نام چلا لیکن یوایس آئی ایس کو ایسی عالمگیر مقبولیت حاصل ہوچکی تھی کہ لوگ اس دفتر کو اسی نام سے پکارتے رہے بلکہ بعض لوگوں کو اس تبدیلی کی وجہ سے گمان ہونے لگا کہ شاید سی آئی اے سے اس کا کوئی تعلق ہو تو پھر اس نام کو بدل کر پرانا نام اختیار کیا گیا۔ دفتر کے اندرونی نظام اور کارکردگی میں بھی اسی طرح وقتاً فوقتاً ردوبدل ہوتے رہتے ہیں یہی وجہ ہے کہ امریکی ادارے ہمیشہ توانا اور وقت سے ہم آہنگ نظر آتے ہیں۔

اسی وقت یہ بتادینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں امریکی اپنے رویہ میں بڑے غیر روایتی ہوتے ہیں اس لیے وقت اور ضرورت کے مطابق یا فکری تازگی کی وجہ سے کسی تبدیلی میں کوئی قباحت نہیں محسوس کرتے محض روایات یا جذباتیت کی بنا پر کسی پالیسی، پروگرام یا نظریہ سے چمٹے رہنا جو کہ ہم مشرقیوں کا وطیرہ ہے

ان کی نفسیات کا حصہ نہیں معلوم ہوتا۔ غالباً نئے ملک، نئے وطن اور نئے فلسفۂ حیات نے ان کے اندر نئے پن اور تغیر پسندی کی نفسیات پیدا کردی ہے جیسا کہ ان کے کائناتی اور آفاقی عزائم اور بین الاقوامی رویوں سے بھی مترشح ہے۔ بین الاقوامی تعلقات میں کبھی کبھی امریکی رویہ کی غیر متوقع تبدیلی کی کتنی ہی مثالیں ملیں گی جو روایت پسندوں کو گراں گزرتی ہیں اور وہ امریکیوں کو اپنی تنقید کا ہدف بناتے ہیں لیکن امریکی اس میں کوئی قباحت نہیں محسوس کرتے اس لیے تنقید کی کوئی معقول وجہ ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔ ترسیل کا یہی خلا امریکہ اور دیگر اقوام اور عوام کے درمیان غلط فہمیوں اور عدم مفاہمت کا موجب ہوتا ہے۔ اس خلا کو کم سے کم کرنا یو ایس آئی ایس کا خاص کام ہے۔

ہمارے ملک میں پروپگنڈے بازوں نے یو ایس آئی ایس کو سی آئی اے کا مترادف ٹھہرایا اور امریکہ کی ہر پالیسی کی مخالفت کے لیے اسی کو بطورِ علامت استعمال کیا۔ چونکہ یہ ایک طرح سے دفتر رابطۂ عامہ ہے اس لیے لازم تھا کہ اسے شہر کے مرکزی علاقے میں قائم کیا جائے جہاں عوام کی رسائی بہ آسانی ہو سکے خصوصاً لائبریری کی موجودگی کی وجہ سے تاکہ اس سے استفادہ کرنے والے طلبہ اور اسکالروں کو آسانی ہو۔ سفارت خانے تو بالعموم شہر کے کسی دور دراز علاقے میں ہوتے ہیں۔ ایسے میں مظاہرہ کرنے والوں کو یو ایس آئی ایس کو نشانہ بنانے میں دوہرا فائدہ ہوا، ایک تو یہ کہ مظاہرین کا جلوس دور نہیں لے جانا پڑا دوسرے یہ کہ تماشائیوں کی بھیڑ اصل مظاہرین سے کئی گنا زیادہ اکٹھی ہوجاتی جو مظاہرے کی کامیابی ظاہر کرتی ہے۔ اس میں مظاہروں کا اہتمام کرنے والوں کا اصل فائدہ یہ ہوتا ہے کہ وہ تھوڑے سے مظاہرین کو لاکر زیادہ بڑی تعداد ظاہر کر سکتے ہیں جس کی ویڈیو فلمیں اپنے آقاؤں کو بھیج کر مطلوبہ انعام حاصل کر سکتے ہیں۔

عام لوگوں کو کیا معلوم کہ یہ دفتر کیا ہے کیا نہیں وہ تو اسے زیادہ سے زیادہ امریکن لائبریری سمجھتے لیکن انھیں باور کرایا گیا کہ یہ سی آئی اے کا اڈا ہے۔ اس کی وجہ سے بڑے دور رس نقصانات ہوئے۔ ۱۹۶۰ء والے عشرے کے اواخر میں جب ہندوستان اور امریکہ

کے تعلقات میں کشیدگی بہت بڑھ گئی تو ملک کے کئی شہروں میں امریکی کلچرل سینٹر جو کہ دراصل لائبریریاں تھیں اور کچھ فلمیں وغیرہ دکھائی جاتی تھیں، بند کر دیے گئے جیسے کہ پٹنہ، لکھنؤ، حیدرآباد وغیرہ میں۔ طلبہ اور اسکالروں کو اس کا سیدھا نقصان پہنچا جن کے لیے مطالعہ کی بڑی سہولتیں تھیں۔ تحقیق میں کام آنے والی بیش بہا کتابیں ان سینٹروں میں موجود تھیں، بعض قیمتی امریکی تصنیفات کے سستے ایڈیشن ہندوستانی پبلشروں کی معرفت شائع کرا کے بہت کم قیمت پر فراہم کی جارہی تھیں، ہندوستانی زبانوں میں بہتیری کتابوں کے ترجمے بھی شائع ہورہے تھے، سب سلسلے بند ہوئے۔

ہندوستان کے چار شہروں میں جہاں امریکی قونصل خانے ہیں یو ایس آئی ایس کے دفاتر ہیں۔ ان میں سے دہلی کے دفتر کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ پہلے یہ دفتر منڈی ہاؤس کے بالمقابل سکندرا روڈ پر بھاولپور ہاؤس میں تھا۔ ۷۰ء والے عشرہ کے اوائل میں کناٹ پلیس کے علاقے میں کستور با گاندھی مارگ پر واقع اپنی موجودہ عمارت میں منتقل ہوا۔ دہلی میں واقع یہ دفتر بھی دو حصوں میں بٹا ہوا ہے لیکن دونوں ایک دوسرے میں اس طرح مدغم ہیں اور باہم اس طرح کام کرتے ہیں کہ دوئی کا اندازہ نہیں ہوتا۔ ایک دفتر تو علاقائی ہے جیسے کہ کلکتہ، بمبئی اور مدراس کے دفاتر ہیں جن کا دائرۂ عمل متعلقہ قونصل خانوں کا علاقہ ہے۔ ان دفتروں کے اپنے ڈائریکٹر اور دیگر افسران ہیں اور مقامی عملہ ہے۔ دوسرا دفتر، جسے دراصل پہلا دفتر کہنا چاہیے، مرکزی ہے جس کی نگرانی میں چاروں علاقائی دفاتر کام کرتے ہیں۔ اس دفتر کے سربراہ کنٹری ڈائریکٹر اور ان کے ڈپٹی ہوتے ہیں۔

ہمارا آفس یعنی یو ایس آئی ایس دہلی کئی شعبوں پر مشتمل تھا ایک تو اکزیکیوٹیو جو کہ انتظامی شعبہ تھا جس کا باہری عوام سے کوئی تعلق نہ تھا۔ دوسرے لائبریری جو عوامی رابطے کا بڑا اہم اور نادر وسیلہ تھا۔ یہ لائبریری دراصل امریکن کانگریس لائبریری یعنی امریکی پارلیمنٹ کی لائبریری سے وابستہ ہے جو دنیا کی سب سے بڑی لائبریری شمار کی جاتی ہے یہ امریکن کانگریس لائبریری کے لیے مقامی مطبوعات خریدتی ہے۔ ساری

زبانوں کی طرح اردو، فارسی اور عربی زبانوں میں شائع ہونے والی مطبوعات کی بھی خریداری کرتی ہے لیکن اس لائبریری کا سب سے بڑا فائدہ اعلیٰ تعلیم کے طلبہ اور ریسرچ اسکالروں کو ہوتا ہے جنھیں ہر موضوع پر نہایت بیش بہا کتابیں اور دیگر مواد یہاں دستیاب ہوتا ہے اور ضرورت کے مطابق امریکن لائبریری آف کانگریس سے بھی اس لائبریری کی معرفت حاصل کیا جاسکتا ہے۔

ہمارے آفس کا سب سے اہم شعبہ بلکہ اصل آفس تو ہمارا پریس سیکشن تھا جس کا کچھ تذکرہ کر چکا ہوں لیکن ابھی اور باقی ہے۔ مگر پہلے ہمارے سیکشن سے ہی شائع ہونے والے میگزین SPAN کا تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔ یہ رسالہ اپنی ساری ظاہری اور باطنی خوبیوں اور خواص کی وجہ سے واقعی بے مثال ہے۔ ایسا کوئی رسالہ کسی سفارت خانے سے کبھی نہیں جاری ہوا نہ اتنے عرصہ تک شائع ہوتا رہا۔ اس کی اشاعت ایک انگریزی ماہنامے کے طور پر ۱۹۶۰ء میں شروع ہوئی تھی۔ ابتداً ایک مخصوص حلقہ میں مفت تقسیم کیا جاتا تھا جس میں ممتاز صحافی اور قانون ساز اراکین شامل تھے۔ پرچے کی کوئی قیمت نہیں تھی لیکن جلد ہی اس کی گرانی محسوس کی جانے لگی مگر اندیشہ یہ تھا کہ اگر اس کو بند کر دیا جائے تو اس کی اشاعت دوبارہ شروع کرنا ممکن بھی ہو سکے گا یا نہیں؟

میں اس وقت یو ایس آئی ایس کلکتہ میں اردو مترجم کی حیثیت سے یومیہ اجرت پر کام کر رہا تھا لیکن رکھ رکھاؤ سب دوسروں جیسا ہی تھا اس لیے نہ مجھے کوئی احساس کمتری تھا نہ باہر سے دیکھنے والے مجھے مختلف سمجھتے تھے۔ ایسے میں میں نے اپنے پریس چیف کو مشورہ دیا کہ کیوں نہ پرچے کی کوئی قیمت مقرر کر دی جائے۔ یہ بات کسی نہ کسی طور اوپر تک پہنچی۔ نہ معلوم اس مشورہ کا کریڈٹ کس کو ملا لیکن جلد ہی اسپین کی قیمت پانچ روپیہ متعین ہوگئی۔ کلکتہ میں تو شہر کے دس نمایاں مقامات کے انتخاب کا کام مجھ ہی کو سونپا گیا جہاں پیپر اسٹالوں پر یہ پرچہ رکھا جاسکے۔ پھر پریس آفیسر مسٹر سی ایم راس میرے ساتھ دو اسٹالوں پر گئے اور ان سے ضروری گفتگو کی بقیہ اسٹال والوں سے مسٹر گنگولی نے معاملے طے کیے۔

مجھے اس خدمت کا معاوضہ اور ٹیکسی کا کرایہ دیا گیا۔ پرچہ بند کرنے کی بات رک گئی۔

اس کے بعد پرچہ کی مقبولیت بڑھانے کے لیے بھی میں نے جو مشورے دیے ان پر عمل درآمد کیا گیا لیکن وہی بات کہ اس کا کریڈٹ کسے ملا میں نہیں جانتا۔ ان میں سے ایک مشورہ یہ تھا کہ اسپین کے لیے مضامین ہندوستانیوں سے بھی لکھوائے جائیں تا کہ اس کی اشاعت میں شراکت کا احساس پیدا ہو۔ یہ کام بھی شروع ہوا مجھے یاد پڑتا ہے کہ ابتدائی لکھنے والے ہندوستانیوں میں بمبئی کے مسٹر اے جی نورانی شامل تھے۔ اس کے کچھ عرصہ بعد میں نے مشورہ دیا کہ امریکہ میں کامیاب ہندوستانیوں کے تذکرے بھی شامل اشاعت کیے جائیں وہ بھی ہونے لگا۔ ان کارروائیوں سے پرچے کی اشاعت یقیناً بڑھی ہوگی اور پیپر اسٹالوں پر آجانے کی وجہ سے عوامی سطح پر نظر بھی آنے لگا۔ اس کے محاسن کا تذکرہ میں کہاں تک کروں گا۔ اتنا ہی لکھنا کافی ہے کہ ہر سال ہندوستان میں بہترین رسالے کی اشاعت کا ایوارڈ اسپین کو ملتا رہا۔

اسپین نشیب و فراز سے گزرتا ہوا ماہنامے سے دوماہی میں تبدیل ہوگیا لیکن اس کی مقبولیت کا اندازہ اس سے کیا جانا چاہیے کہ نئی صدی کے آنے تک اسے ہندی اور اردو زبانوں میں بھی اسی آب وتاب کے ساتھ شائع کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ شکر ہے گزشتہ صدی کے آخری عشروں میں پرنٹنگ ٹیکنالوجی میں رونما ہونے والے انقلاب نے اردو کو بھی اس قابل بنادیا کہ اسپین کے معیار کا پرچہ اردو میں بھی شائع کیا جاسکا۔ مگر سارے مواد کو ریورس کرنا یعنی بائیں کے بجائے دائیں سے شروع کرنا بھی اس فن کا معمولی کمال نہیں تھا جسے اردو اسپین کے اہل کاروں نے انجام دیا۔

اگر انگریزی مضامین کے اردو ترجمہ کی بات کریں تو وہ بھی کچھ کم محال نہیں تھا۔ ایک تو یہی کہ زمین سے آسمان تک اور کائنات و مابعد الطبیعات تک بشمول فنون لطیفہ اور تفریحات سارے ممکن موضوعات اور مضامین کا اسپین احاطہ کرتا ہے ان میں جدید ترین ایجادات اور معلومات سے متعلق مضامین متعلقہ علوم وفنون کے ماہرین کے لکھے ہوئے

ہوتے ہیں۔ نئے نئے الفاظ اور محاورے مترجموں کے لیے خاصے چیلنج کی حیثیت رکھتے ہیں مزید برآں امریکی لکھنے والے مختلف لسانی پس منظر سے مثلاً اسپینی، فرانسیسی، اطالوی، جرمن یا چینی جاپانی سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے ان کی تحریروں میں کہیں کہیں ان کی زبانوں کے اثرات بھی پائے جاتے ہیں۔ میں نے ۲۰۰۳ء میں اردو اسپین کی اشاعت کے آغاز سے ہی اس کے لیے مضامین کے ترجمہ کا کام شروع کیا جو تقریباً چار سال جاری رہا اس اثناء میں میں نے ۲۷۲ مضامین کے ترجمے کیے۔ اب آگے چلیں اور دوسرے شعبوں کی کارگزاریوں پر ایک نظر ڈالیں۔

ٹریول سیکشن:

ذکر یو ایس آئی ایس کے اجزائے ترکیبی کا ہو رہا تھا۔ سمجھنے سمجھانے کی غرض سے دفتر کو شعبوں یا زمروں میں تقسیم کیا گیا ہے ورنہ یہ سب ایک جسم کے اعضاء کی طرح ضرورت کے مطابق انفرادی یا اجتماعی طور پر کام کرتے ہیں۔ تاہم ان اجزاء کا قدرے الگ الگ تذکرہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

ٹریول سیکشن یعنی سفری شعبہ کو لیجیے جو بظاہر خاموش اور غیر معروف ہے لیکن اس کے تعاون کے بغیر ساری کارگزاریاں مفلوج و معطل ہو کر رہ جائیں گی جیسے کوئی لنگڑا ہو۔ جتنے امریکی یا غیر امریکی ہندوستان کے اندر یا باہر سرکاری خرچہ سے سفر کرتے ہیں ان کے سفر کا سارا انتظام جیسے ٹکٹ ریزرویشن اور ہوٹل ریزرویشن وغیرہ سب یہی شعبہ کرتا ہے۔ یہ سارا کام مقامی ٹریول ایجنسیوں کے ذریعہ انجام دیا جاتا ہے لیکن کبھی کبھی اس سیکشن کے انچارج کو خود بھی بھاگ دوڑ کرنی پڑتی ہے جو کہ کسی ہنگامی ضرورت کے وقت آخری حربہ ہوتا ہے۔ مجھے دو بار اس طرح کے تجربے ہوئے۔

اول تو جب میں امریکہ سے واپس آیا اور میرا سامان دہلی ہوائی اڈے پر کسٹم والوں نے روک لیا۔ وہ کسٹم ڈیوٹی میرے ذاتی سامان پر طلب کر رہے تھے اور میرا اصرار تھا کہ میرے سامان کی اتنی قیمت ہی نہیں ہے کہ اس پر ڈیوٹی لگے۔ بالآخر میں اپنا سامان

وہیں چھوڑ کر گھر چلا آیا اور ٹیلیفون کر کے ٹریول سیکشن کو اس کی اطلاع کر دی۔ ان کی ہدایت پر دوسرے دن پھر ہوائی اڈے گیا لیکن پھر ناکامی ہوئی۔ تیسرے دن شام کو ٹریول سیکشن کے چیف نے گھر پر ٹیلیفون کر کے مجھ سے کہا کہ رات میں ایک بجے کے قریب پان امریکن فلائٹ آنے والی ہے اس وقت تم ہوائی اڈے پر آجاؤ میں بھی موجود رہوں گا۔ میں نے ایسا ہی کیا، وہاں اندر گیا تو دیکھا کہ کسٹم کاؤنٹر پر موصوف موجود ہیں۔ میری دونوں اٹیچیاں لائی گئیں انھیں کھول کر ایک افسر نے سرسری نظر سے دیکھا اور مجھ پر غرایا کہ اس میں ہے کیا جو اس قدر ہنگامہ کر رکھا ہے۔ لے جایئے اسے۔ میں نے اشارہ پایا اور فوراً ٹرالی آگے بڑھائی۔ باہر آفس کی گاڑی موجود تھی اس پر سامان رکھا اور گھر آ گیا۔ اس وقت ٹریول سیکشن کے چیف مسٹر دیوا کرن تھے۔ اب وہ یو ایس آئی ایس کی ملازمت سے کنارہ کش ہونے کے بعد لاس اینجلس چلے گئے ہیں اور اپنے تجربات سے فائدہ اٹھا کر وہاں کوئی ٹریول ایجنسی چلانے لگے۔ بہتیرے لوگوں کو میں نے دیکھا ہے کہ ریٹائرمنٹ کے بعد گرین کارڈ لے کر امریکہ چلے جاتے ہیں اور وہاں کسی کام دھندے میں لگ جاتے ہیں۔

ٹریویل سیکشن کی دوسری کارگزاری میں نے اس وقت دیکھی جب مجھے سرکاری طور پر اسلام آباد اور وہاں سے افغان رفیوجی کیمپ میں پشاور جانا تھا۔ جب میرے سفر کا قطعی فیصلہ ہو گیا تو پاکستانی ویزا کے مطابق روانگی کی آخری تاریخ آ گئی تھی اور اگلے دن ہی مجھے چلے جانا چاہیے تھا، کسی فلائٹ میں گنجائش کی کوئی صورت نہیں نکل رہی تھی۔ ٹریول سیکشن کے چیف نے کہا کہ آپ تیار رہیے ہم ضرور بھیجیں گے چنانچہ اگلے دن دس بجے وہ خود پی آئی اے کے آفس میں گئے اور ٹکٹ لا کر مجھے دیا کہ فوراً چلے جایئے۔ بارہ بجے سے پہلے میں ہوائی اڈے پر تھا۔

سرکولیشن سیکشن ہے جو باہر جانے والا پریس میٹر چھاپ کر روانہ کرتا ہے۔ انگریزی، اردو اور ہندی میں تیار ہونے والا پریس میٹر معلوم نہیں کتنے ہزار لوگوں کو روز بھیجا جاتا ہے۔ یہ میٹر اخبارات کے علاوہ بھی بہت سارے ذمہ دار افراد کو بھیجا جاتا ہے۔ چنانچہ

ایک طرف لفافے پر پتے چھپتے ہیں اور ٹکٹ لگانے کے بجائے اسٹمپنگ ہوتی ہے جسے فرینکنگ کہتے ہیں جس سے ڈاک خانے والوں کے وقت اور محنت کی بچت ہوتی ہے اسی اثناء میں برق رفتاری سے سارا مواد چھپ کر اور اسٹیپل ہوکر تیار ہوجاتا ہے جسے لفافوں میں ڈال کر ڈاک کے تھیلوں میں بھیج دیا جاتا ہے۔ چھپائی کے لیے مختلف طرح کی مشینیں یا پرنٹر استعمال کیے جاتے ہیں۔ جس طرح وقت اور ضرورت کے مطابق طریقہ کار اور نظام کار میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں اسی طرح مشینیں بھی ہمیشہ جدید سے جدید تر آتی رہتی ہیں۔ امریکی اداروں سے وابستگی زندگی کو ہمیشہ وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ رکھنے کا پیغام ہی نہیں دیتی اس کا سلیقہ بھی سکھاتی ہے۔

اسی طرح فوٹو لیب ہے جو مضامین کی مناسبت سے یا کسی پریس کانفرنس وغیرہ سے متعلق فوٹو گراف یا دیگر مواد کے ساتھ ساتھ ہی تیار کردیتا ہے۔ دراصل اب ہر راہ میں ٹیکنالوجی اس قدر ترقی کرچکی ہے کہ وقت اور رفتار جیسے الفاظ اپنے روایتی معنی ومفہوم سے عاری ہوچکے ہیں اور انسان کی ضرورتوں کے تابع ہوتے جارہے ہیں۔

ایک اہم شعبہ کمپیوٹر کا ہے جسے دماغ کا درجہ حاصل ہے۔ یہ تمام شعبوں کو ان کی ضرورت کے مطابق معلومات بشمول افراد اور اداروں کے پتے وغیرہ فراہم کرتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ملک بھر میں جتنے بھی قابلِ ذکر ادارے، افراد وشخصیات ہیں ان سب کے نام، پتے، ٹیلیفون نمبر اور مختصر احوال ان کمپیوٹروں میں محفوظ ہیں اور حسبِ ضرورت فوراً معلوم کیے جاسکتے ہیں، کسی تبدیلی کا علم ہوتے ہی ان محفوظ معلومات میں فوراً ضروری ترمیم کردی جاتی ہے۔

کلچرل سیکشن:

یو ایس آئی ایس میں عوامی رابطے کا دوسرا بڑا ذریعہ پروگرام کا شعبہ ہے۔ فلموں، نمائش یا موسیقی وغیرہ سے متعلق یعنی کلچرل پروگراموں میں ہر طرح کے اور ہر عمر کے شرکاء آجاتے ہیں لیکن ان عمومی پروگراموں کے علاوہ خصوصی پروگرام بھی ہوا کرتے ہیں جیسے

کوئی لکچر یا سمینار جن میں شرکت کے لیے متعلقہ مضمون سے دلچسپی رکھنے والے ماہرین اور خواص کو ہی مدعو کیا جاتا ہے۔ اسی طرح کوئی پریس کانفرنس ہوسکتی ہے۔ اس میں مدعو کیے جانے والوں کا تعلق کانفرنس سے خطاب کرنے والے کی شخصیت پر منحصر ہوتا ہے۔ اگر کوئی بڑی سیاسی شخصیت ہے مثلاً ایوان نمائندگان یا سینیٹ کا کوئی رکن یا صدارتی کابینہ کا کوئی رکن جسے امریکہ میں وزیر کے بجائے سکریٹری کہتے ہیں تو ان لوگوں کی پریس کانفرنس میں شرکت کے لیے بڑی تعداد میں اخبارنویس اور نامہ نگار آتے ہیں۔ اس طرح کی کانفرنسوں کا اہتمام بالعموم پروگرام کا شعبہ نہیں کرتا بلکہ پریس سیکشن یعنی اخبارات سے متعلق شعبہ کرتا ہے یا پریس اتاشی کا دفتر کرتا ہے۔

یہ پروگرام دہلی میں یا دہلی سے باہر کسی اور شہر میں ہوتے ہیں۔ ان پروگراموں کا اہتمام کرنے والے یو ایس آئی ایس کے ارکان پروگرام منیجر کہلاتے ہیں جو بلاشبہ بڑی صلاحیتوں والے لوگ ہوتے ہیں اور ان کے رابطوں کا حلقہ بھی بڑا وسیع ہوتا ہے۔ ایک پریس کانفرنس روایتی کانفرنسوں سے مختلف تھی اور بڑی تیزی سے میڈیا کے ٹیکنکل انقلاب کی منزلیں طے کرتے ہوئی عمومیت کی طرف بڑھتی جارہی تھی۔ اس کو ٹیلی پریس کانفرنس کہتے تھے۔ اب یہ آن لائن کانفرنسیں عام ہوگئی ہیں۔

پہلی ٹیلی پریس کانفرنس:

اس سلسلے کی سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ ہندوستان اور امریکہ کے درمیان پہلی ٹیلی پریس کانفرنس کا محرک میں ہی تھا۔ یہ بات ہے ۱۹۸۳ء کے اوائل کی جب اردو اخباروں میں اس طرح کی خبریں آنے لگیں کہ چاند پر اترنے والا پہلا امریکی نیل آرم اسٹرانگ جب چاند پر چہل قدمی کررہا تھا تو اس نے وہاں اذان سنی تھی۔ بعد میں اس نے اسلام کا مطالعہ شروع کیا جس سے متاثر ہوکر اس نے اسلام قبول کرلیا۔ مزید یہ کہ اس کے قبول اسلام کی وجہ سے ناراض ہوکر حکومت امریکہ نے اس کو خلائی محکمہ (ناسا) سے برطرف کردیا۔ اس مضمون کی خبریں تواتر کے ساتھ اخباروں میں آنے لگیں اور اس کے

ساتھ ہی حکومت امریکہ کی کارروائی پر تنقیدی اداریے وغیرہ بھی۔ امریکیوں کا کہنا تھا کہ ہمیں اس سے کوئی بحث نہیں کہ نیل آرم اسٹرانگ اپنے مسیحی مذہب پر قائم ہے یا مسلمان ہوگیا۔ حکومت نے مذہب کی بنیاد پر کوئی کارروائی نہیں کی اس لیے حکومت پر سارے الزامات بے بنیاد ہیں۔

میں نے جب خبروں کا تجزیہ شروع کیا تو اس نتیجہ پر پہنچا کہ ان خبروں کا ایک ابتدائی یا بنیادی وسیلہ قاہرہ میں ہے، وہاں سے چلی ہوئی خبریں پاکستان اور حیدرآباد ہوتی ہوئی آرہی ہیں اور دوسرا ابتدائی وسیلہ کہیں انڈونیشیا میں ہے جہاں سے چلی ہوئی خبریں ملیشیا اور بنگلہ دیش ہوتی ہوئی آرہی ہیں یعنی ان خبروں کے نقاطِ آغاز اور گزرگاہیں مشرق و مغرب کے مسلم ممالک تھے۔ ہمارے افسروں کو صرف یہ فکر تھی کہ حکومت امریکہ کی پوزیشن کس طرح صاف کی جائے۔ میری اور ٹونی کی رائے یہ ہوئی کہ یہاں کے کسی مسلمان ایڈیٹر سے نیل آرام اسٹرانگ کی براہِ راست گفتگو کرادی جائے تاکہ سارا معاملہ از خود صاف ہوجائے۔ ہمارے ڈائرکٹر کو یہ تجویز پسند آئی۔ انھوں نے واشنگٹن کو لکھا۔ اس سلسلہ جنبانی کے بعد نیل آرم اسٹرانگ سے رابطہ قائم کیا گیا جو اس وقت لاس اینجلس، کیلیفورنیا میں تھے۔ وہاں یونیورسٹی میں پروفیسر ہوگئے تھے۔ غرض یہ کہ ان کی منظوری حاصل کرنے کے بعد مئی ۱۹۸۳ء کے اوائل میں اس ٹیلیفونی انٹرویو یعنی ٹیلی پریس کانفرنس کی تاریخ اور وقت طے کیا گیا۔ اس کے بعد مسئلہ یہ تھا کہ کس معتبر مسلمان ایڈیٹر کو نیل آرام اسٹرانگ سے گفتگو کے لیے آمادہ کیا جائے جو ان سے بلا جھجک ٹیلیفون پر گفتگو کرسکے۔

اس وقت امین الحسن رضوی صاحب ریڈینس ویکلی کے ایڈیٹر تھے۔ اس اخبار نے بھی نیل آرم اسٹرانگ کے متعلق خبر اور ایک تنقیدی اداریہ شائع کیا تھا، چنانچہ میں نے رضوی صاحب سے گزارش کی کہ آپ نیل آرم اسٹرانگ سے خود گفتگو کرکے حقیقت معلوم کرلیں، وہ راضی ہوگئے۔ اس وقت اتفاق سے احمد سعید ملیح آبادی صاحب ایڈیٹر آزاد ہند، کلکتہ اور غلام سرور صاحب ایڈیٹر سنگم، پٹنہ بھی دہلی میں موجود تھے، میں نے ان

حضرات سے انٹرویو کے وقت موجود رہنے کی درخواست کی۔ سرور صاحب تو اسی دن صبح کو پٹنہ واپس ہوگئے اس لیے شریک نہیں ہوسکے لیکن احمد سعید صاحب موجود تھے ان کے علاوہ اسٹیٹمین دہلی کے نمائندہ حسن سرور صاحب، ایک نمائندہ ہندوستان ٹائمز کا اور دونوں خبر ایجنسیوں پی ٹی آئی اور یو این آئی کے ایک ایک نمائندے موجود تھے۔ شام کو چھ بجے وقت معینہ پر ان حضرات کو حکومت ہند کے سمندر پار مواصلاتی مرکز (اوسی ایس) میں لے جایا گیا۔ اسی جگہ نیل آرم اسٹرانگ سے ٹیلیفون پر رابطہ قائم ہوا۔ ابتدائی تعارف کے بعد رضوی صاحب نے سوالات کیے اور نیل آرم اسٹرانگ نے ان کے سوالات کا تفصیل کے ساتھ جواب دیا۔ انھوں نے جو کچھ بیان کیا اس کا خلاصہ یہ ہے:

میں نے چاند پر اذان جیسی کوئی آواز نہیں سنی، ایسی خبریں غلط ہیں، میں پیدائشی مسیحی ہوں اور اپنے مذہب پر قائم ہوں ہاں مذہب اسلام کا احترام کرتا ہوں میرے بعض دوست بھی مسلمان ہیں، مجھے ناسا (امریکی خلائی محکمہ) سے برطرف نہیں کیا گیا بلکہ میں نے خود علیحدگی اختیار کی ہے کیونکہ میں اکیڈمک کیریئر اختیار کرنا چاہتا تھا۔ اس محکمہ میں میری ملازمت کے بیس برس پورے ہوگئے تھے اور اس کے بعد رضا کارانہ طور پر ملازمت ترک کرنے کا اختیار ہوتا ہے، میں نے اپنے اس استحقاق کا استعمال کیا ہے۔

اگلے دن یہ خبر تمام اخباروں میں چھپ گئی اور اس طرح غلط افواہوں کا سدِ باب ہوا لیکن کچھ لوگوں نے یہ پڑیا چھوڑنی شروع کی کہ وہ ٹیلی فون جعلی تھا وغیرہ وغیرہ۔ مجھے حیرت ہے کہ ایسے موقعوں پر لوگ ذرا سنجیدگی سے کیوں نہیں کام لیتے۔ اگر کوئی فرد یا ادارہ اس طرح کا گھپلا کرے، خصوصاً کوئی مستند سرکاری ادارہ، تو پھر کیا کبھی کوئی اس کا اعتبار کرے گا۔ پھر اس معاملے میں اگر کوئی تصدیق کرنا ہی چاہتا تو آسانی سے نیل آرم اسٹرانگ کو خط لکھ کر یا ٹیلی فون کر کے کرسکتا تھا۔

سنجیدہ تنقید کی ضرورت:

اخبارات کو تنقید و تبصرہ کرنے کے استحقاق سے تو کبھی دست بردار نہیں ہونا

چاہیے بلکہ اس پر بلا رو رعایت سختی سے قائم رہنا چاہیے لیکن حقیقت پسندی کا دامن ہرگز نہیں چھوڑنا چاہیے، اعتدال اور سنجیدگی کی حدوں کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیے۔ ''حق گوئی و بیبا کی آئینِ جوانمردی'' ہی نہیں صحافت کا جوہر بھی ہیں۔ سطحی تنقیدوں سے صرف اپنا ہلکا پن ظاہر ہوتا ہے۔ کوئی اعتراض غلط ثابت ہونا اور بھی برا ہوتا ہے۔ کسی حکومت کو ہوائی گالیاں اڑانے سے اس کا کچھ نہیں بگڑتا بلکہ اس کے عمال اور کارندوں میں ایک طرح کی ترش روئی اور درشتی پیدا ہونے کا احتمال ہوتا ہے جبکہ سنجیدہ اعتراض اور تنقید سے اخبار اور ایڈیٹر کے وزن و وقار میں اضافہ ہوتا ہے۔ میں نے اپنے اخباروں کے قارئین کا عجب حال دیکھا، کسی نے کہا کوا کان لے گیا بس کوے کے پیچھے دوڑ پڑے۔ کسی جلسہ میں ایک شخص نے کھڑے ہوکر اعلان کر دیا کہ فلاں مسئلہ پر امریکہ کے خلاف احتجاج کرنے کے لیے اس مضمون کے خطوط لکھ کر بھیجو۔ اخباروں میں اس اعلان کے چھپتے ہی دھڑا دھڑ خطوط اور تار بھیجے جانے لگے۔ ہزاروں روپیہ لوگوں کی جیب سے نکل کر محکمہ ڈاک وتار کے اکاؤنٹ میں چلے گئے۔ یہ سارے ناپختہ اور مہمل طریقے ہمیشہ میرے لیے کوفت کا باعث تھے۔ دل سے دعا کرتا تھا کہ خدا ان لوگوں کو سمجھ عطا فرمائے۔ اس بارے میں کسی سے کچھ کہنا سننا لاحاصل تھا اس لیے کہ میں ٹھہرا امریکی سفارت خانے کا ملازم اور ''غیر معتبر''۔

بیرونی حکومتوں تک کسی اچھی بری اجتماعی اور عوامی رائے کو پہنچانے کا سب سے اچھا طریقہ یہ ہے کہ مطلوبہ امر کو سنجیدہ اور متوازن زبان میں لکھا جائے، سمجھدار لوگوں پر مشتمل ایک وفد تیار کیا جائے اور متعلقہ سفیر سے ملاقات کے لیے وقت لیا جائے۔ سفیر یا اس کا کوئی نمائندہ ضرور ملاقات کرے گا اس کو اپنا احتجاج نامہ یا تحریر پیش کی جائے۔ اس کی رپورٹ متعلقہ حکومت تک پہنچنا یقینی ہے۔ یہ تو ہوا سنجیدہ طریقہ کار لیکن اگر مقصد صرف مظاہرہ اور ہلڑ بازی ہو جیسا کہ عام طور سے ہوا کرتا ہے تو لوگ جو راہ چاہیں اختیار کریں۔ اس کے اثرات مقامی ہی ہوا کرتے ہیں نہ کہ خارجی اور بین الاقوامی۔ ایسے مظاہروں کے منتظمین یقیناً کسی نہ کسی طور فائدے میں رہتے ہیں۔ یہ بات تمام سنجیدہ شہریوں، بالخصوص

صحافیوں اور میڈیا کے نمائندوں کے سمجھنے کی ہے۔

اس زمانے میں امریکہ کے خلاف پروپیگنڈوں کی جو لہریں چل رہی تھیں ان کے بارے میں مختصراً کچھ بیان کرنا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ پروپگنڈا کرنے والوں کا، جن میں سویٹ کارندے اور ان کی پروپگنڈا مشنری پیش پیش ہوا کرتی تھی، عام طریقۂ کار یہ تھا کہ کوئی خبر بنا کر کسی دور افتادہ علاقے کے کسی معمولی اخبار میں شائع کرا دیتے پھر اس اخبار کو بطور وسیلہ اور حوالہ استعمال کر کے اس خبر کی خوب تشہیر کرتے۔ مثال کے طور پر کسی ایشیائی یا افریقی ملک کے کسی معمولی سے اخبار میں وہ خبر چھپ جاتی پھر یورپ کے اخباروں میں اس کے حوالے سے وہی خبر چھپتی اس کے بعد یورپ کے اخباروں کے حوالے سے ایشیائی ملکوں کے بڑے اخباروں میں وہی خبر دی جاتی۔ اس طرح بے خبری کو خبر اور رائی کا پہاڑ بنا دیا جاتا۔ تبصروں اور جوابی تبصروں کا ایک لامتناہی سلسلہ جاری ہو جاتا اور شاطر اپنے کھیل کے مشاہدے اور اثرات کے مطالعے کا مزا لینے کے ساتھ ہی اگلی تحریک کے منصوبے بناتا رہتا۔ اس کی ایک مثال نیل آرم اسٹرانگ والا واقعہ بھی ہے۔

اس کیفیت نے جوابی کارروائی کرنے والی امریکی مشنری کو خاصا چوکس کر دیا تھا۔ یو ایس آئی ایس کا عالمگیر نظام اس مشنری کا بڑا اہم حصہ تھا۔ اس سلسلہ میں ایک مثالی واقعہ کا تذکرہ مناسب معلوم ہوتا ہے جو ۸۰ء والے عشرہ کے اواخر میں پیش آیا تھا۔ اقوامِ متحدہ میں امریکی سفیر کرک پیٹرک سے منسوب ایک مخالف ہند تحریر ہفتہ وار بلٹز، بمبئی میں شائع ہوئی۔ اخبار مذکور نے مبینہ مسودہ کی فوٹو کاپی صفحہ اول پر نمایاں طور پر شائع کی۔ امریکنوں نے اس تحریر کو فرضی اور مسودہ کو جعلی قرار دیا لیکن تردیدی کارروائی کی سرعت قابلِ ذکر ہے۔ بلٹز غالباً بدھ کو چھپ کر جمعرات کو بازار میں آتا تھا۔ چنانچہ اس پرچہ کے چھپتے ہی، اور اس کے بازار میں آنے سے پہلے ہی، یو ایس آئی ایس بمبئی نے دہلی کو اس کی اطلاع دی اور اس کی کاپی بھیج دی۔ یو ایس آئی ایس دہلی نے اسی وقت ایجنسی ہیڈ کوارٹر واشنگٹن کو مطلع کر کے وضاحت چاہی۔ دو گھنٹہ کے اندر وہاں کے ماہرین نے زبان اور

اسٹائل کے وہ سارے سُقم بیان کردیے جن سے اس دستاویز کا جعلی ہونا ثابت تھا۔ دہلی میں ایک ڈیڑھ بجتے بجتے ٹونی جیسوداسن پریس کلب پہنچ گئے جہاں لنچ کے وقت بہتیرے سینئر جرنلسٹ موجود تھے وہاں انھوں نے سب کو مطلع کردیا کہ یو ایس آئی ایس کے ڈائریکٹر کسی اہم مسئلہ پر فوری پریس کانفرنس کرنے والے ہیں۔ یہ خبر پریس کلب کے باہر بھی ٹیلیفون کے ذریعہ پھیل گئی۔ دو ڈھائی بجتے بجتے یو ایس آئی ایس کے کانفرنس روم میں اخبار نویسوں کا جمگھٹا ہوگیا جس میں بلٹز کا وہ پرچہ دکھا کر ڈائریکٹر نے اس کے جعلی ہونے کے شواہد پیش کیے۔ اگلی صبح کو جب بلٹز بازار میں آیا تو اس کے پڑھنے والوں کو خبر مذکور کی تردید موصول ہوچکی تھی۔

میں پروگراموں کی بات کررہا تھا ان پروگراموں کا دوسرا رخ بھی ہے یعنی امریکہ میں اسی طرح کے پروگراموں کے لیے موزوں اور مناسب ہندوستانیوں کا انتخاب، مثلاً امریکی یونیورسٹیوں یا فاؤنڈیشنوں کے زیر اہتمام لکچروں کے لیے اسکالروں کا انتخاب، ہندوستانی اور امریکی معاشروں کے مختلف پہلوؤں سے ایک دوسرے کو روشناس کرانے کے لیے متعلقہ حلقوں سے وابستہ ہندوستانی دانشوروں کا انتخاب جیسے کہ سیاسی لیڈر، اقتصادی ماہرین، سائنسداں یا صحافی وغیرہ۔ ظاہر ہے یہاں مختلف شرکائے پروگرام سے بات چیت کے ذریعہ ہی ان کی صلاحیتوں اور موزونیت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے اس کے بعد مناسب وقت آنے پر انہی میں سے نامزدگان کا انتخاب کیا جاتا ہے۔

کچھ پروگرام افراد کے لیے ہوتے ہیں کچھ گروپ پروگرام ہوتے ہیں مثلاً کوئی پروفیسر لکچر کے لیے جارہا ہے تو وہ وہاں اداروں کے معینہ پروگرام کے مطابق جائے گا، صحافیوں کا کوئی گروپ جارہا ہے تو اس میں ہر طرح کے لکھنے والے ہوں گے۔ سیاسی امور پر، اقتصادی امور پر، آرٹ اور کلچر پر وغیرہ وغیرہ۔ اس پروگرام میں شریک ہونے والے ہر شخص پر حکومت امریکہ کی خطیر رقم صرف ہوتی ہے۔ اس قدر صرفہ کے بعد کوئی حکومت، کوئی ادارہ یا کوئی فرد ہی کیوں نہ ہو اگر یہ امید رکھے کہ اس کے تئیں نرم گوشہ پیدا ہوجائے

گا تو یہ کونسی غیر معمولی بات ہے یا غیر معمولی توقع ہے۔ اپنی اپنی حیثیت اور صوابدید کے مطابق تمام حکومتیں یہ کام کرتی رہتی ہیں لیکن فرق یہ ہے کہ کوئی سلیقے سے کرتا ہے کوئی بھدے پن کے ساتھ۔ جو حکومتیں نہیں کر پاتیں یا جو لوگ کسی وجہ سے اس طرح کے مواقع نہیں پاتے وہ غیر ضروری شور وغوغا مچاتے ہیں۔ اس سے حکومتوں کے لیے کوئی فرق پڑے یا نہ پڑے لیکن ان باصلاحیت لوگوں کا یقیناً خسارہ ہوتا ہے جو اس غوغا کے فریب میں آ کر مواقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کرتے۔ ''یہ بزمِ مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی۔''

میں اپنے حلقہ پر نظر کرتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ کوتاہ دستی اور کوتاہ بینی نے جو ہمارے حلقہ کا مقدر ہے بیشتر لائق افراد کو فائدوں سے محروم ہی رکھا۔ بعض موقع پرستوں نے البتہ فائدے اٹھائے اس کے بعد منہ پھیر کر غوغائے صحرائی میں شریک ہو گئے۔

صحافیوں سے متعلق پروگرام:

اس سلسلے میں اپنے بعض تجربات کا تذکرہ مناسب معلوم ہوتا ہے لیکن پہلے صحافیوں کی نامزدگی کا طریقۂ کار مختصراً بیان کر دوں۔ فرض کیجیے کہ ایک سال کے دوران ۲۵/ ہندوستانی صحافیوں کو امریکہ جانے کے لیے نامزد کیا جانا ہے تو یو ایس آئی ایس کے چار دفاتر دہلی، کلکتہ، بمبئی اور مدراس کے حصہ میں پانچ پانچ امیدوار آ سکتے ہیں اور اتنے ہی امیدوار ایمبسی کے حصہ میں تاکہ پریس اتاشی چاہیں تو وہ بھی نامزدگیاں کر سکیں لیکن اس طرح کی تقسیم کا کوئی سخت ضابطہ نہیں ہے۔ اب خیال کیجیے کہ مدراس آفس کے علاقے میں انگریزی کے علاوہ جنوبی ہند کی چار زبانوں کے اخبارات ہیں ان کے محض ایک ایک صحافی کا انتخاب ہو سکے گا۔ دیگر دفاتر کے علاقوں میں بھی کم وبیش یہی کیفیت ہے۔ ہر دفتر چاہتا ہے کہ اس کے علاقے سے زیادہ سے زیادہ امیدوار لیے جائیں چنانچہ وہ پانچ سے زیادہ نام منتخب کر کے دہلی میں مرکزی دفتر کو جسے کنٹری آفس کہتے ہیں بھیج دیتے ہیں جہاں بہت زیادہ ناموں کی فہرست سامنے آتی ہے تو ردوقدح شروع ہوتی ہے۔ کنٹری آفس سے یہ فہرست ایمبسی بھیج دی جاتی ہے وہاں پر قطعی فہرست تیار کر کے ایجنسی ہیڈکوارٹر پر واشنگٹن

بھیجی جاتی ہے۔ اب اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ہر امیدوار کو نامزد کرنے والے افسر کو خواہ وہ ہندوستانی ہو یا امریکی کس قدر کاوش اور حجت تکرار کے مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے اور اسے تحریری طور پر ثابت کرنا پڑتا ہے کہ اس کا نامزد کردہ امیدوار ہی موزوں ترین ہے۔

اب اردو ایڈیٹر کی حیثیت سے میری مشکلوں کا کسی قدر اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ میں اردو صحافیوں کو دورۂ امریکہ کے لیے نامزد کرنے کا مجاز تھا لیکن میرا کوئی مخصوص علاقہ نہ تھا۔ اصولاً میں کسی علاقے کے اردو صحافی کو نامزد کرسکتا تھا لیکن ہمیشہ دیگر آفسوں میں علاقائی زبانوں کے ایڈیٹروں سے مسابقت کا سامنا رہا۔ خود دہلی آفس کے علاقے میں جو دہلی کے علاوہ یوپی، ہریانہ، پنجاب اور مدھیہ پردیش کے ایک حصہ کا احاطہ کرتا ہے، انگریزی اور ہندی کے اتنے اور اس درجہ کے صحافی تھے کہ ان سے اردو ایڈیٹروں کا موازنہ ناممکن حد تک مشکل تھا کچھ پنجابی اخبار نویس بھی تھے۔ میری کوشش تھی کہ اچھے اردو ایڈیٹر سامنے آئیں کہ میں انھیں نامزد کرسکوں اس لیے کہ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ بہتیرے اردو صحافی اپنی صلاحیتوں کے اعتبار سے نہ صرف دیگر زبانوں کے صحافیوں کے ہم پلہ تھے بلکہ بہتر بھی تھے لیکن وہ سامنے نہیں آتے تھے، کچھ تو احساس کمتری کی بنا پر کچھ پروپگنڈوں کے زیرِ اثر اور کچھ حکومت کی نظریں دیکھتے تھے۔ اچھے صحافیوں کے انتخاب میں ایک بڑی رکاوٹ مالکوں کا رویہ بھی تھا جنھیں بالعموم یہ بات پسند نہ تھی کہ ان کے ادارے کے صحافیوں کا کسی طرح بھلا ہو یا کوئی موقع ان کے ہاتھ آئے ایسے واقعات اور مثالوں کا میں عینی شاہد ہوں۔ جو حضرات امریکہ جانے کے متمنی تھے اور دہلی میں یا دہلی کے باہر ملاقاتوں میں اپنی اس خواہش کی یاد دہانیاں بھی کراتے رہتے تھے ان کے معاملوں میں مجھے کئی طرح کی دشواریاں درپیش تھیں۔ ایک تو وہی علاقائی ایڈیٹروں کی رگڑے بازیاں دوسرے ایجنسی کے ذمہ داروں کی طرف سے بعض حد بندیاں۔

پینتالیس برس سے زیادہ عمر والے امیدواروں کو عموماً واشنگٹن پسند نہیں کرتا تھا اس لیے ایسے امیدواروں کی نامزدگی آخری مرحلہ میں مسترد ہوجانے کا اندیشہ ہوا کرتا تھا

چنانچہ کوئی بھی ایسے امیدواروں کی نامزدگی پر اپنی توانائی ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا جس کے استرداد کا خدشہ ہو۔ ایجنسی میں ان لوگوں کے پروگراموں کا انتظام کرنے والوں کا عمر رسیدہ امیدواروں کے معاملے میں کسی قدر گریز قابل فہم ہے۔ ایک ماہ یا اس سے زیادہ مستقل سفر وہ بھی امریکہ جیسے طویل اور عریض ملک میں خاصا تھکا دینے والا ہوتا ہے اس پر سے طرح طرح کی بے اعتدالیاں اس لیے ضروری ہے کہ جو لوگ اتنے دور دراز کے طویل سفر پر ہوں وہ جسمانی اعتبار سے بھی ٹھیک ٹھاک ہوں۔ وہاں انھیں کسی طرح کی تکلیف کی صورت میں ادارے پر بہت بڑی ذمہ داری آتی ہے اور بدنامی کا بھی اندیشہ ہوتا ہے۔

میں یو ایس آئی ایس دہلی سے وابستگی کے سترہ اٹھارہ برسوں کے دوران ہر سال ایک اردو صحافی کو یقیناً کامیابی کے ساتھ نامزد کرسکتا تھا لیکن مذکورہ بالا مشکلوں کی زنجیر ہمیشہ میرے پاؤں میں پڑی رہی جسے لے کر چلنا تھا نتیجہ کے طور پر میں صرف تین اردو ایڈیٹروں کو امریکہ بھیجنے میں کامیاب ہوسکا۔ ان میں سے دو دہلی میں تھے اور ایک حیدرآباد میں۔ ریٹائرمنٹ کے قریب چلتے چلاتے دو صحافیوں کو میں نے نامزد کیا تھا وہ دونوں حضرات میرے ریٹائر ہوجانے کے بعد امریکہ گئے۔ ان میں سے ایک کا تعلق دہلی سے تھا دوسرے کا بمبئی سے۔ ان کوششوں میں مجھے بعض تلخ تجربات بھی ہوئے۔ کشمیر کے ایک نوجوان صحافی کی نامزدگی منظور ہوچکی تھی۔ ساری دفتری کارروائیاں مکمل ہوگئی تھیں لیکن مقامی پولیس نے بے بنیاد رپورٹ کی بنا پر ان کا پاسپورٹ ضبط کرلیا اور غالباً ایک سال بعد واپس کیا۔ اس طرح وہ جانے سے رہ گئے۔ دہلی کے ایک اردو ایڈیٹر نے ساری کارروائیاں مکمل ہوجانے کے بعد جانے سے انکار کردیا ان کی کچھ سیاسی مصالح رہی ہوں گی اس کو وہ خود جانتے ہوں گے۔ اس طرح جو مواقع ضائع ہوئے انھیں میں انفرادی اور اجتماعی نقصان سمجھتا ہوں۔ میری کوششیں ایسے افراد پر ضائع ہوئیں جو کسی نہ کسی وجہ سے موقع سے فائدہ نہ اٹھا سکے ان کے بجائے کوئی دوسرا اردو صحافی بھی فائدہ نہ اٹھا سکا یہ موقع کسی اور زبان کے صحافی کے حصہ میں گیا ہوگا۔

اردو پریس:

اب تک جو کچھ تحریر کر چکا ہوں اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یو ایس آئی ایس دہلی میں اردو ایڈیٹر کو یعنی مجھے ہندوستان کے اردو اخبارات اور امریکی دفتر اطلاعات کے درمیان ایک رابطہ کی حیثیت حاصل تھی۔ اپنی اس حیثیت میں کام کو اپنی بساط بھر پھیلا سکتا تھا۔ ظاہر ہے اتنے وسیع و عریض ملک میں جہاں ہر گوشہ میں اردو اخبارات و رسائل کسی نہ کسی قدر موجود ہوں، وہ بھی کوئی ڈیڑھ ہزار سے زیادہ، ان سب سے عملی رابطے رکھنا کسی فرد واحد کے لیے ناممکن تھا اس لیے میں نے اپنے رابطوں کو بڑے بڑے شہروں میں قابلِ ذکر اردو اخبارات تک محدود رکھا تھا اور میری ترسیلات کی فہرست کوئی دو سو افراد اور اداروں پر مشتمل تھی۔ ان سے رابطوں کی ایک عمومی صورت تو وہی تھی کہ روزانہ کچھ نہ کچھ پریس میٹر بھیجتے رہنا۔ ان میں ہر طرح کے مضامین اور امریکہ سے متعلق خبریں شامل ہوتیں۔ وقتاً فوقتاً خصوصی مضامین بھی تیار کرتا لیکن اس کے لیے کسی خاص ضابطہ کا پابند نہ تھا۔ کبھی کبھی کوئی خبر یا سرکاری بیان لازمی ہوتا اس کے علاوہ سب کچھ میری صوابدید پر تھا۔ اس سلسلہ میں کبھی میں خود اپنے ڈائریکٹر کو مشورہ دیتا کبھی ان سے ہدایت حاصل کرتا۔ اصولاً مجھ سے یہ توقع رکھی جاتی تھی کہ میں اردو اخبارات کے مزاج کو سمجھتے ہوئے اس کے مطابق مواد انھیں فراہم کرتا رہوں۔

لیکن میں اس فرق کو ملحوظ رکھتا تھا جو دائیں بازو اور بائیں بازو، بہ الفاظ دیگر امریکہ موافق اور امریکہ مخالف پالیسیاں رکھنے والے اخباروں کے درمیان تھا۔ اسی طرح چھوٹے اخبارات اور بڑے اخبارات میں گنجائش کے الگ الگ مسائل کو بھی ہمیشہ مدنظر رکھا۔ ان رعایتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے مواد کے انتخاب اور ترسیل کے معاملے میں کوشش یہ کرتا تھا کہ ہر کسی کو اپنی پسند کا کچھ نہ کچھ مواد ملتا رہے۔ یہ مطالعہ بڑا دلچسپ تھا میں شطرنج کی طرح اس میں دلچسپی لیتا تھا۔ کس اخبار کو طویل مضمون کی ضرورت ہے کس کو مختصر کی، کس شہر کا کون سا اخبار دوسرے کس شہر کے کون سے اخبار یا اخبارات سے مضامین لیا کرتا

ہے، اس مطالعے سے میں اخبارات کی رسائی یا ان کے باہمی تبادلوں کا اندازہ کیا کرتا تھا۔ چنانچہ اگر کسی مضمون کو کسی خطے تک محدود رکھنا چاہتا تو اس لین دین کی گزرگاہوں کا بھی لحاظ رکھتا۔ اس تمام کارروائی کا ایک خوشگوار پہلو یہ تھا کہ میرے مضامین زیادہ سے زیادہ اخباروں میں شائع ہوجاتے جو پیشہ ورانہ اعتبار سے ایک کامیابی تھی۔

ان کارروائیوں کا دوسرا پہلو اس کے برعکس تھا یعنی کسی خاص موضوع پر جس سے حکومت امریکہ کو دلچسپی ہو اردو اخباروں کی ادارتی رائے سے باخبر رکھنا۔ اس کام کے لیے قابلِ ذکر اخبارات پر بھی نظر رکھنا ایک مشکل کام تھا لیکن مشق و مہارت سے مشکلیں آسان ہوجایا کرتی ہیں۔ ہر پیشہ ایک فن چاہتا ہے چنانچہ یہاں بھی فنی مہارت کام آتی تھی۔ پہلی بات تو یہی ہے کہ اخبارات کا رویہ معلوم تھا اس لیے موضوع سامنے آتے ہی یہ اندازہ ہوجاتا تھا کہ اس ہانڈی میں کیا ہوگا۔ مجھے اردو اخبارات کا شکرگزار بھی ہونا چاہیے کہ بین الاقوامی امور پر کہنے کے لیے ان کے پاس کچھ زیادہ نہیں تھا اس لیے کوئی معاملہ یا مسئلہ خواہ کتنا ہی طول کھینچے یہ کم وبیش معلوم رہتا تھا کہ کسی خاص اخبار نے اپنے اداریہ میں یا کسی کالم نگار نے اپنے کالم میں کیا لکھا ہوگا۔ دو دو کالم لمبے اداریے میں نصف سے زیادہ پس منظر بقیہ حصہ میں امریکہ کو کچھ کوسنے اور کچھ ادھر ادھر کی اور کبھی کبھی ایسی دور کی کوڑی کہ شیخ چلی کی باتیں معلوم ہوتیں ان اداریوں پر مجھے زیادہ محنت نہیں کرنی ہوتی تھی۔ کبھی کوئی فکر انگیز بات آجاتی تو یقیناً میں اس پر پوری توجہ اور محنت صرف کرتا۔

دہلی آنے سے پہلے کوئی پانچ چھ سال میں آزاد ہند کلکتہ کے اداریے لکھتا رہا تھا اور سیاسی تبصرے بھی وقت اور ضرورت کے مطابق لکھتا تھا۔ ان تحریروں میں میں نے ایک اصول ہمیشہ برتا وہ یہ کہ کسی بات کو بلا وجہ طول نہ دیتا نہ کالم بھرنے کی ضرورت کو لازمہ بنا کر اپنے اوپر طاری کرتا بس متعلقہ موضوع پر مجھے جو کچھ کہنا ہوتا کہہ کر چھٹی کرتا۔ دوسرے یہ کہ اختلاف رائے کے اظہار کے لیے ادارتی کالم میں کبھی سوقیانہ زبان نہیں استعمال کی۔ میں ادارتی کالم کو قابلِ احترام سمجھتا تھا۔ اب بھی ایسا ہی سمجھتا ہوں۔ یہ کالم

وزن و وقار کا متقاضی ہے۔ بڑے ضبط و تحمل کا طالب ہے۔ زبان و بیان کے ساتھ اظہار کے سلیقہ کا بھی مطالبہ کرتا ہے۔ اگر کسی اخبار کے مالک یا ایڈیٹر کے لیے اس کا التزام اور اہتمام ممکن نہیں ہے تو میرے خیال سے مناسب ہوگا کہ ادارتی کالم کو لازمہ نہ بنایا جائے۔ جب مدیر کو سنجیدگی کے ساتھ کوئی بات کہنی ہو تب ہی اس کالم کو استعمال کرے ورنہ اسے اچھے مضامین سے مزین کرے۔

دلچسپ مشاہدات میں سے ایک یہ بھی تھا کہ بعض اخبارات کسی دوسرے شہر کے کسی اخبار کا اداریہ مِن وعَن نقل کر دیتے اور کوئی حوالہ بھی نہیں دیتے۔ میں اِسے پیشۂ صحافت میں ایک قابلِ نفرت سرقہ سمجھتا ہوں۔ اگر اخبار نکالنے اور اداریہ لکھنے کا شوق ہے تو اس کا اہتمام کیجیے ورنہ اس سے باز رہیے۔ اگر کسی دوسرے اخبار کا اداریہ نقل کیا جائے تو اس کے لیے افکار کا کالم موزوں جگہ ہے جیسا کہ پوری دیانتداری سے بیشتر اخبارات کیا کرتے ہیں۔ اگر دوسروں کا اداریہ اپنے ادارتی کالم میں نقل کرنا ہی ٹھہرا تو اس کا ایک طریقہ جو تھوڑا سا سلیقہ مانگتا ہے یہ ہے کہ اول آخر کچھ عبارات آرائی کی جائے اور درمیان میں حوالہ کے ساتھ طویل اقتباس بھر دیا جائے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ سارا اداریہ نقل کرنے کے بعد آخر میں متعلقہ اخبار کا نام درج کیا جائے۔ خیر۔

اردو ایڈیٹروں اور دیگر صحافیوں سے رابطے کی دوسری شکل ذاتی ملاقاتیں تھیں۔ اس باب میں مجھے اپنی کوتاہی بلکہ سخت کوتاہی کا اعتراف ہے۔ اس کی کئی وجوہ تھیں۔ ایک تو میں طبعاً کم آمیز دوسرے ہر روز دفتر میں کام کا اس قدر دباؤ رہتا کہ اس کے بعد ملنے ملانے کے لیے کہیں آنا جانا امرِ محال تھا۔ دفتری اوقات میں کہیں جانے کے لیے آفس کی کار فراہم کرنے کا اصول تو تھا لیکن ڈرائیوروں کی کمی اور ان کی بہتیری دیگر مصروفیات کی وجہ سے دفتر کی گاڑیاں کم ہی دستیاب ہوتی تھیں۔ ہمیں دفتری گاڑی نہ ملنے کی صورت میں ٹیکسی استعمال کرنے کا اختیار تھا لیکن اس کی عملی مشکلوں کو دہلی والے ہی سمجھ سکتے ہیں۔ بصورتِ دیگر آٹو رکشا یا اسکوٹر استعمال کر سکتے تھے۔ اس حالت میں اگلے دن ہم یا تو غلط

بیانی کر کے ٹیکسی کرائے کے برابر رقم دفتر سے وصول کرتے یا اسکوٹر کے کرائے کی معمولی سی رقم کے لیے کاغذی کارروائیاں کرتے جو کہ ہر دفتر شاہی میں ضروری ہوتا ہے۔ مجھے ان دونوں باتوں سے چڑ کی حد تک نفرت تھی۔ میرے دفتری رابطوں کی راہ میں یہ موانعات تھے۔ غرض یہ کہ میں مختلف وجوہ کی بنا پر کم آمیز رہا۔

ملاقاتوں کی ایک صورت تو وہی تھی کہ پریس کانفرنس اور دیگر پروگراموں کے سلسلے میں جو اخبار نویس آجاتے ان سے مل لیتا۔ یہ ملاقاتیں زیادہ تر بے تکلفانہ ماحول میں ہوتیں لیکن ان موقعوں پر معدودے چند اردو اخبار نویس آتے۔ اس کی وجہ صاف ہے۔ اردو اخباروں میں اسٹاف ضرورت سے بہت کم ہوا کرتا ہے اس لیے ہر کسی پر کام کا خاصا دباؤ ہوتا ہے انھیں ہر روز اپنے حصہ کا کام کرنا ہی ہوتا ہے۔ اب اگر کام کے اوقات میں کہیں جائیں تو کیسے جائیں، کام کے بعد جائیں تو کیسے جائیں، بالعموم دفتر آمدورفت کے اخراجات کا کفیل نہیں ہوتا اس لیے اگر وہ کہیں جائیں تو اس بار کو خود برداشت کریں۔ ایسے میں وہ یقیناً صرف اپنے پسندیدہ پروگراموں ہی میں جانا چاہیں گے، میرے لیے کبھی کبھی یہ بات خفت کا باعث ہوا کرتی تھی کہ پریس کانفرنسوں میں ہر زبان کے نامہ نگار ہوتے ماسوا اردو کے اس لیے میں ایک دو حضرات سے منت سماجت کر کے انھیں بلاتا، میں سمجھتا ہوں کہ یہ مجھ پر ان کی عنایت تھی۔

پریس کانفرنس کے علاوہ دیگر پروگراموں میں پینے پلانے کا سامان بھی ہوتا اس لیے اس کے شوقین کشاں کشاں چلے آتے بلکہ بعض بن بلائے آنے والے ہم لوگوں کے لیے مسئلہ پیدا کر دیتے۔ اردو اخبار نویس بہ استثنائے چند اس شوق سے بھی گریزاں تھے چنانچہ ان کے معاملے میں یہ کشش بھی کارگر نہ ہوتی۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آگے بڑھنے سے پہلے روزانہ کے دفتری معمولات کا مختصراً ذکر کر دوں۔ یہ معمولات بھی دو قسم کے تھے، ایک تو وہ جو کم وبیش ہمیشہ یکساں جاری رہے، دوسرے وہ جن میں ردوبدل ہوتے رہے۔ صبح ساڑھے آٹھ بجے کے بعد اپنے

کمرے میں پہنچنے پر سب سے پہلے مقامی اردو اخباروں کو بنظرِ غائب دیکھنا کہ ان میں ہمارا کوئی مواد شائع ہوا ہے یا نہیں، امریکیوں کی دلچسپی کا کوئی مضمون یا اداریہ ہے یا نہیں، اسی طرح ڈاک سے آئے ہوئے اخبارات پر ایک نظر ڈال لینا۔ اسی اثناء میں وائرلیس فائل آجاتی اسے دیکھنا اور اپنے مطلب کی چیز اس میں تلاش کرنا۔

اس وائرلیس فائل کا تذکرہ کسی قدر تفصیل طلب ہے۔ ایجنسی ہیڈ کوارٹر واشنگٹن میں ہر روز مضامین کا ایک مجموعہ تیار کیا جاتا جس میں امریکی دلچسپی کی خاص خاص عالمی خبروں کا خلاصہ اور منتخب موضوعات پر دنیا کے مختلف حصوں میں قابلِ ذکر اخباروں کے اداراتی تبصرے اور وائس آف امریکہ سے نشر کیا جانے والا اداریہ شامل ہوتے۔ ان کے علاوہ مختلف موضوعات پر مضامین ایجنسی کی عام ہدایات وغیرہ۔ غرض یہ کہ اس دن کے لیے کام کا ایک ایجنڈا اس میں موجود ہوتا۔

اخبارات اور وائرلیس فائل کے مطالعہ کے بعد دن بھر کے متوقع کام کا ہمیں اندازہ ہوجاتا۔ اس کے بعد ڈائریکٹر کے ساتھ میٹنگ میں انگریزی، ہندی اور اردو کے ایڈیٹر اور ڈائریکٹر کے مشیر شریک ہوتے۔ ڈائریکٹر اپنی صوابدید کے مطابق اس کا کوئی وقت مقرر کر لیتے لیکن وہ وقت عموماً ساڑھے نو اور دس بجے کے درمیان ہوتا۔ آدھ گھنٹے پون گھنٹے کی میٹنگ کے دوران ہم انھیں اپنے اپنے اخباروں کا خلاصہ بتا دیتے اور وائرلیس فائل سے لے کر کون سے مواد اخباروں کو بھیجنا ہے اس پر مشاورت کر لیتے اس کے بعد دیگر امور پر بھی عام گفتگو کر لیتے۔ یہ سب نہایت بے تکلفانہ ماحول میں ہوتا۔

میں اسے امریکن سسٹم کی ایک خوبی سمجھتا ہوں کہ سارے کام وقت کی پابندی کے ساتھ ہوتے خالص دفتری کام جو یکسانیت کی وجہ سے بوریت کا سبب بھی ہو سکتے ہیں، بے تکلفی کے ماحول میں بلاتردد انجام پاتے۔ حفظ مراتب تو لازمی ہوتے ہیں، ضرور تھے لیکن ایسی لچک کے ساتھ کہ انھیں برتنے میں کوئی گرانی نہیں محسوس ہوتی، سب سے بڑھ کر اظہارِ خیال کی آزادی، جو کہنا ہے بے تکلف کہیے، دوسرے اس سے اتفاق کریں یا

اختلاف، وہ بھی اتنی ہی آزادی کے ساتھ۔ اس طرح ذہنی تحفظات کی وجہ سے خیالات میں پراگندگی نہیں پیدا ہوتی۔ روزانہ کی اس بے تکلفانہ میٹنگ میں مجھے ایک اور فائدہ نظر آیا۔ امریکی افسران مختلف ملکوں میں تعیناتی کی وجہ سے بڑا وسیع مشاہدہ اور تجربہ رکھتے ہیں اس لیے ان کے ذریعہ بہت سی ایسی معلومات براہِ راست حاصل ہوسکتی تھیں جو بصورت دیگر اتنی آسانی سے نہیں ممکن تھیں۔

اس سارے عمل سے میرا تعلق بالواسطہ بھی تھا اور براہِ راست بھی۔ اخبارات یا ایجنسیوں کو جو مواد بھیجنا ہوتا اس کے متعلق ایک عمومی ہدایت نامہ پریس اتاشی کے دفتر سے موصول ہوا کرتا تھا ہم لوگ اپنے انتخاب میں اسے ملحوظ رکھتے لیکن سنیچر اور اتوار کو دو دن ہمارے دفاتر بند رہتے ان میں سے ایک دن یعنی سنیچر کو وائرلیس فائل آتی تھی، اتوار کو نہیں۔ چنانچہ سنیچر کو ایک ایڈیٹر اور ایک سکریٹری جو کمپیوٹر سے پوری واقفیت رکھتا اور ایک امریکن آفیسر ڈیوٹی پر رہتے۔ وہی افسر پریس اتاشی کے فرائض انجام دیتا اور ڈیوٹی ایڈیٹر کی مشاورت سے کام کرتا۔ ان افسروں اور ایڈیٹروں کی ڈیوٹی باری باری ہوا کرتی تھی۔ ہر چھٹے ساتویں سنیچر کو میری باری بھی آجاتی تھی۔ اس موقع پر سوچ سمجھ کے مطابق ڈیوٹی افسر کو مشورہ دینا ہوتا اس کے بعد یو ایس آئی ایس کے دیگر تین دفاتر یعنی بمبئی، کلکتہ اور مدراس کو ڈیوٹی افسر کی ہدایات سے آگاہ کرنا ہوتا جہاں وہ اس ہدایت نامہ کے منتظر ہوا کرتے تھے۔

ذاتی طور پر ملاقاتوں کے لیے کبھی کبھی کوشش کرکے وقت نکالتا، کبھی کسی موضوع پر ایڈیٹروں کی ذاتی رائے معلوم کرنے کے لیے بھی ان سے ملاقاتیں کرتا۔ یہ کیفیت شہر دہلی کے اندر بھی تھی اور دیگر شہروں میں بھی۔ ایک اعتبار سے ملتے ملاتے رہنا ضروری بھی تھا کیونکہ کمپیوٹر میں ان ملاقاتوں کا بھی اندراج ہوتا تھا۔ چنانچہ وقفہ وقفہ سے یہ معلوم ہوتا رہتا تھا کہ کس نے کتنے اور کن کن لوگوں سے ملاقاتیں کیں، اس کو بھی کارکردگی میں شمار کیا جاتا جس کا سالانہ احتساب بھی ہوتا۔ عام حالات میں میری کوشش یہ ہوتی کہ ہندوستان

کے مختلف علاقوں میں اردو اخبارات کے جو خاص خاص مراکز ہیں ان کا سال میں ایک بار دورہ کرلوں جیسے لکھنؤ، کانپور، پٹنہ، کلکتہ، جالندھر، سری نگر، حیدرآباد، بمبئی، بنگلور وغیرہ۔ کبھی کبھار دیگر شہروں میں بھی چلا گیا جیسے بنارس، الٰہ آباد، بھوپال وغیرہ۔ ان مقامات کے سفری پروگرام تو میں اپنی صوابدید کے مطابق بناتا لیکن وہ بعض دوسرے ملحوظات سے مشروط بھی ہوتے جیسے کہ فنڈ کی دستیابی۔

دفتری دورے کی ابتدا:

میں نے یو ایس آئی ایس دہلی جوائن کرنے کے بعد غالباً جون ۱۹۷۶ء میں دہلی سے باہر پہلا سفر لکھنؤ کا کیا۔ آنکھ کھولانے کے لیے اور دفتری سفر کے آداب سے آشنا کرنے کے لیے میرے دوست اور ہمدرد امبیکا سنگھ کو میرے ساتھ کیا گیا، وہ بھی لکھنؤ کے ہندی ایڈیٹروں سے ملاقات کا پروگرام بنا کر چل پڑے۔ لکھنؤ میں سب سے پہلے وہ مجھے قومی آواز کے دفتر میں لے گئے اور ایڈیٹر جناب عشرت علی صدیقی سے متعارف کرایا۔ ظاہر ہے میں تو ان سے بخوبی واقف تھا ہاں وہ مجھ سے واقف نہ رہے ہوں گے۔ مجھے ان سے اپنی نئی حیثیت میں ملنا تھا۔ اس کے بعد عزائم کے ایڈیٹر جمیل مہدی صاحب سے ملاقات ہوئی، دو روز قیام کے دوران دیگر اردو ہندی صحافیوں سے بھی ملاقاتیں رہیں جن میں اس وقت قومی آواز کے نیوز ایڈیٹر اختر یونس قدوائی صاحب خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ انھیں مخصوص مشرقی تہذیب کا پیکر کہنا بجا ہوگا۔ اب جبکہ میں ریٹائر ہو چکا ہوں اور وہ بھی ریٹائر ہو چکے ہیں کبھی کبھی وہ میری خیر وعافیت دریافت کرتے رہتے ہیں، صحت کے متعلق اور میری قلمی مصروفیات کے متعلق مشوروں سے نوازتے رہتے ہیں، مختصر اور رسمی ملاقاتوں نے ایک مخلصانہ رشتہ قائم کردیا جس کا اس وقت گمان بھی نہ تھا۔ (یہ ریٹائرمنٹ کے کچھ عرصہ بعد کی بات ہے۔ اب تو ایک زمانہ گزر گیا)

قدوائی صاحب کے علاوہ حسن واصف عثمانی صاحب نے بھی اظہارِ تعلق کیا جو ابتداً قومی آواز میں تھے اور کچھ عرصہ قومی آواز کی اشاعت معطل رہنے کے دوران عزائم

میں چلے گئے۔ جمیل مہدی صاحب سے بھی کافی بے تکلفی رہی۔ ان سے آخری ملاقات غالباً ۱۹۸۲ء میں ان کی قیام گاہ پر ہوئی اس وقت وہ کافی علیل تھے۔ ان کی اور عثمانی صاحب کی تحریریں دہلی میں بھی مل جاتیں تو میں شوق اور توجہ کے ساتھ پڑھتا کیونکہ ان کی صحافتی تحریریں بھی موضوع کے اعتبار سے خاصی ادبی اور تاریخی معلومات سے مملو ہوتیں جنھیں پڑھنے سے یہ گمان نہیں گزرتا کہ تصنع کے طور پر یا علمیت کا رعب ڈالنے کے لیے لکھی گئی ہیں بلکہ اپنے سیاق وسباق میں بالکل فطری اور برمحل معلوم ہوتیں۔

اپنی مدت ملازمت کے دوران آٹھ دس بار لکھنؤ جانے کا اتفاق ہوا لیکن ایک دو شب کا قیام رسمی ملاقتوں کے لیے بھی ناکافی ہوا کرتا۔ تاہم ہندوستان کے متعدد بڑے شہروں میں لوگوں سے ملاقاتوں کا بیش بہا موقع تھا۔ لوگوں سے مختصر ملاقاتیں اور ان ملاقاتوں کی تجدید رفتہ رفتہ باہمی تعلقات میں تبدیل ہوتی رہی۔ جہاں کہیں میرے سابق رفقائے کار یا دور نزدیک کے اقارب تھے ان سے ملاقاتوں کا بھی یہ بڑا اچھا موقع ہوا کرتا تھا۔

امبیکا سنگھ کے ساتھ میرا اگلا سفر کانپور کا ہوا۔ یہ وہی شہر تھا جہاں میرے شعور نے آنکھ کھولی۔ وہیں ۱۹۳۷ء میں پہلی بار میں نے شہر کی روشنی دیکھی اور مدرسہ فیض عام کے درجہ اول میں میرا داخلہ ہوا، ۱۹۴۶ء میں اسی شہر کے کانیہ کبج کالج سے ہائی اسکول پاس کیا، تین سال کی غیر حاضری کے بعد ۱۹۴۹ء میں پھر اسی شہر میں واپس آیا اور ۱۹۵۱ء میں کرائسٹ چرچ کالج سے بی اے پاس کیا اس کے بعد میں شہر بدر کر دیا گیا۔

برسوں جس شہر کی دھول کو پلکوں پر لیے پھرا، برساتوں میں بیچ باغ کی سڑکوں پر گھٹنوں گھٹنوں غلیظ پانی سے گزرتا رہا، چمڑا منڈی کی عفونت کو مشامِ جاں سمجھتا رہا، مول گنج کے علاقے کی تنگ گلیوں میں (جو ہماری روز کی گزرگاہیں تھیں) ناموس کی سوداگری کو میری معصومیت کاروبارِ حیات سے زیادہ کچھ بھی نہیں سمجھ سکی، ملوں کی چمنیوں سے بھبکتے دھوئیں میری آمد ورفتِ نفس میں حل ہوکر ممدِ حیات ہوتے رہے، جہاں ہر طرف مزدوروں کی رواں دواں بھیڑ میں ہم بھی گم ہوتے اسی شہر کی بازدید کا اشتیاق بے پایاں

لیے ہوئے ۲۵ برس بعد وہاں پہنچا تو سب کچھ اتنا بدل چکا تھا کہ شہر میں پرانے راستوں کو تلاش کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ ہم لوگ پھول باغ کے قریب وہاں سے نہر کی طرف جانے والی ایک سڑک پر واقع ولیر یو ہوٹل میں ٹھہرے تھے (حیرت ہے کہ کانپور میں مسلمانوں کا کوئی قابلِ ذکر ہوٹل نہیں ہے)۔ ہمارے لڑکپن کے پھول باغ کا تصور خاک بسر تھا، مال روڈ پر ٹریفک کی بھیڑ اس کی کشادگی اور حسن پر غالب آ چکی تھی۔ پریڈ گراؤنڈ جسے ہم اپنے لڑکپن میں دنیا کا (ہماری دنیا بھی تو بڑی محدود تھی) سب سے بڑا میدان سمجھتے تھے جس میں رام لیلا کی بھیڑ ایک محشر سے کم نہیں ہوتی تھی، جہاں شیر محمد خاں کے اسکاؤٹ اور سنٹ جانسن ایمبولینس والنٹیئر ضرورت مندوں کی خدمت کے لیے سرگرم رہتے تھے۔ اب وہ پریڈ گراؤنڈ محض ایک احاطہ تھا جسے چاروں طرف دکانوں نے اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔ ہم پریڈ کے چوراہے کو دنیا کا سب سے بڑا چوراہا سمجھتے تھے جہاں یکوں اور تانگوں کا جمگھٹ ہوا کرتا تھا اب وہ اتنا بوڑھا ہو گیا تھا کہ یقین ہی نہیں آتا تھا کہ یہ وہی چوراہا ہے۔ یادوں کے دھندلکے میں راہیں تلاش کرتے رہے۔ کچھ نظر نہیں آیا، جو کچھ دیکھا اس پر وقت کی اتنی خراشیں لگ چکی تھیں کہ حلیہ بدل گیا تھا۔ اندر سے نہ معلوم کیا کیفیت تھی، کچھ اُمڈا آ رہا تھا جسے تھامے ہوئے اپنی اس مہد میں جانے پہچانے چہروں کو تلاش کر رہا تھا، سارے چہرے مانوس لگتے ہوئے بھی آج نامانوس لگ رہے تھے۔

ہوٹل سے نکل کر مال روڈ پر آنے کے بعد سب سے پہلے کرائسٹ چرچ کالج ملا، وہاں داخل ہوا ہمارے زمانے میں پرنسپل صاحب اور کئی ٹیچر انگریز تھے، اب سب ہندوستانی تھے، چپراسی جو ہمارے زمانے میں نوجوان تھا اس کی ایک آنکھ کا نقص اس کی زندگی کے ساتھ ساتھ نہ چلتا ہوتا تو شاید میں اس کو نہ پہچان پاتا۔ وہ بدستور پرنسپل صاحب کے کمرے کے سامنے ایک اسٹول پر موجود تھا۔ بڑے تپاک سے ملا، پرنسپل صاحب کو خبر کی اور میں ان سے ملاقات کے لیے اندر گیا، وہ ایک ہندوستانی پادری تھے، بہت اخلاق سے پیش آئے، سابقہ استادوں کا کچھ حال احوال بیان کیا۔

کرائسٹ چرچ کالج سے نکل کر مجھے نشورؔ واحدی صاحب کے ہاں حاضری دینی تھی جو بیکن گنج، ناظر باغ میں رہتے تھے۔ میں نے اسی محلے میں اپنے بچپن کے پانچ سال گزارے تھے لیکن راستے میں پہلے پریڈ پر مسلم یتیم خانہ پڑا، وہاں منیجر صاحب کے صاحبزادے محمد فرید کرائسٹ چرچ کالج میں میرے کلاس فیلو رہ چکے تھے اور بڑے اچھے دوست تھے۔ خیال ہوا کہ شاید وہ مل جائیں۔ یتیم خانے کی عمارت کا جغرافیہ بھی بہت کافی بدل چکا تھا، پھاٹک کے اندر چلا گیا، وہاں فرید وغیرہ کے نام سے بھی کوئی آشنا نہ ملا۔ لیکن بالآخر ایک شخص مل گیا جو صرف اتنا بتا سکا کہ بہت عرصہ ہوا وہ لوگ پاکستان چلے گئے پھر میں نے کسی اور کی تلاش کے خیال اور ملاقات کے امکان کو دل سے نکال دیا۔

آزادیِ وطن سے پہلے قریبی دہائیوں میں کانپور یوپی کے ان شہروں میں سے ایک تھا جہاں مسلم لیگ کی سیاست اور اس کی ہم نوا مسلم تنظیموں کا بڑا زور تھا چنانچہ وہاں تقسیم کا اثر بھی بہت ہوا۔ قیاس ہے کہ اس شہر کے بااثر مسلمانوں کی بڑی تعداد ہجرت کر گئی۔ میرے اسکول اور کالج کے ساتھیوں میں شاید و باید کوئی کہیں رہ گیا ہو۔ دوسری طرف آئندہ روندہ سے سنتا رہا کہ کراچی میں کانپوریوں کی باقاعدہ آبادی ہے جہاں ہمارے سابقہ ساتھی بھی ملتے ملاتے ہیں۔ میں اس محرومی کو اپنی بڑی بدقسمتی سمجھتا ہوں۔

کانپور سے ڈاکٹر عبدالصمد جیسے دستِ شفا معالج کا چلا جانا اور شیر محمد خاں جیسے عوامی خدمتگار کا ہجرت کر جانا اس شہر کی بڑی محرومی تھی، میں نے سنا کہ ڈاکٹر عبدالصمد صاحب نے جب ۱۹۵۲ء میں کانپور سے کراچی جانے کا قصد کیا تو سارا شہر گریاں تھا اور ایک جمِ غفیر انھیں الوداع کہنے کے لیے امڈ پڑا تھا۔ غالباً ۱۹۸۴ء میں ایک سو برس کی عمر پاکر کراچی میں ان کا انتقال ہوا۔ شیر محمد خاں صاحب جو گورنمنٹ ہائی اسکول میں ٹیچر تھے، چمن گنج میں رہتے تھے کانپور میں اسکاؤٹ تحریک اور سینٹ جانسن ایمبولینس کے روح و رواں تھے غالباً ۶۰ء کے عشرہ میں کراچی کے لیے روانہ ہوئے اور ۱۹۹۲ء میں ۹۰ برس سے زیادہ عمر میں انتقال کیا۔

مولانا محمد علی میموریل انگلش ہائی اسکول کے بانی شبیر احمد صاحب اس اسکول کو ۱۹۳۷ء میں قائم کرنے کے بعد اسے اپنے پاؤں پر کھڑا کر کے اور اس کی بنیادوں کو راسخ کر کے ۱۹۵۰ء میں پاکستان چلے گئے۔ ان کی انتہائی جفاکشی اور فعال شخصیت نے کبھی حالات سے سمجھوتہ نہیں کیا نہ ہار مانی جدھر سر اٹھایا بڑھتے گئے بالآخر پروفیسر شبیر احمد صاحب سندھ یونیورسٹی حیدرآباد (پاکستان) سے ریٹائر ہوئے۔ ۱۹۸۸ء میں کراچی میں میں نے ان سے نیاز حاصل کیا۔ ستر بہتر کی عمر میں بھی ان کے سرخ چہرے پر سفید دانتوں کی صف بدستور جمی ہوئی تھی، اپنی تصنیفی کاوشوں میں مصروف تھے، ہمیشہ تجرد کی زندگی گزاری۔

ان ساری یادوں کی گرانباری کے ساتھ میں نشورؔ واحدی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور دیر تک ان سے کسبِ فیض کرتا رہا۔ وہ میرے بزرگوں میں سے تھے۔ مشاعروں کے سلسلے میں جب بھی کلکتہ آتے فوراً مجھے طلب کرتے اور میں ان کے قیام کے دوران ان کی خدمت میں حاضر رہتا۔ اپنے دورانِ ملازمت میں چار پانچ بار کانپور جا سکا لیکن ہر بار بہت کم مہلت کے لیے کیونکہ کانپور اردو اخبارات کے اعتبار سے کوئی بہت اہم مقام نہ تھا۔ حیرت کی بات ہے کہ مسلم سیاست کی گہما گہمی کے دور میں بھی کانپور کو اچھے اردو اخبارات نہیں نصیب ہوئے۔ لکھنؤ کے اخبارات اور مدینہ بجنور جیسے ہفت روزہ اخباروں کا غلبہ رہا۔ شاید ایک صنعتی شہر میں مزدوروں کے معیار و مزاج اور مزدور تحریکوں کے غلبہ کی وجہ سے ایسا رہا ہو۔

آزادی کے بعد بھی جہاں دیگر شہروں کے اردو اخباروں کی کیفیت ۱۹۷۰ء کا عشرہ آتے آتے کافی بہتر ہوگئی، کانپور کے اخباروں کا رنگ نہیں بدلا۔ یہ درست ہے کہ لکھنؤ کے قومی آواز کا مقابلہ کرنا کانپور کے اخباروں کے لیے آسان نہ تھا لیکن ظاہری حالات سے اندازہ ہوتا ہے کہ کسی قدر بہتری یقیناً ممکن تھی۔ کانپور کے اخبارات بہت چھوٹے ہوا کرتے تھے جن کی اپنی عمارتیں بھی نہ تھیں لیکن ۱۹۷۰ء کے عشرے تک پہنچتے پہنچتے کانپور کے کم سے کم دو قابلِ ذکر اخبارات یعنی سیاست جدید اور پیغام کی اپنی اچھی

خاصی عمارتیں ہوگئی تھیں۔ اگر وہی اخبارات اپنی خوشحالی میں کسی حد تک قارئین کو بھی شریک کرتے تو ممکن ہے ان کی اپنی حالت اور بھی بہتر ہوجاتی۔ دراصل وہاں اخباروں نے اپنے قاری کو کچھ نہ دیا، صرف بڑی بڑی موٹی موٹی سرخیوں سے صفحات کالے کر کے چھٹی کی، ذہن سازی اور رہنمائی کی بڑی اہم ذمہ داری سے اپنے دامن جھٹک دیے۔

کانپور کی اس ذہنی فضا سے نکل کر اپنی اصل روداد کی طرف مراجعت مناسب معلوم ہوتی ہے۔ ۱۹۸۲ء کے اوائل میں ایک زیرتربیت پریس آفیسر مس ایلن فِش تھیں۔ ہندوستان کے مختلف شہروں میں ان کی رہنمائی کرنا بھی ایک کام تھا۔ اتفاق یہ کہ سب سے پہلے یہ کام میرے ذمہ کیا گیا۔ میں کلکتہ اور پٹنہ جانے والا تھا، وہ بھی تیار ہوگئیں کہ ہم بھی ساتھ چلیں گے۔ میں نے کہا کہ آپ براہِ راست کلکتہ جائیں میں ایک روز پہلے پٹنہ چلا جاتا ہوں وہاں سے کلکتہ آجاؤں گا اور ہم لوگ وہیں مل لیں گے پھر میں وہاں کے اخبار نویسوں سے ملاقات کراؤں گا لیکن انھوں نے پٹنہ جانے پر بھی اصرار کیا۔ میں نے کہا کہ پٹنہ چھوٹا سا شہر ہے آپ وہاں جا کر کیا کریں گی تو فرمایا کہ میں ہندوستان کا ایک چھوٹا شہر بھی دیکھنا چاہتی ہوں۔ مجھے راج ہٹ اور تریاہٹ دونوں کا بیک وقت سامنا تھا، سرِتسلیم خم کرنے کے سوا چارہ نہ تھا۔ مختصر یہ کہ ہم لوگ دہلی سے پٹنہ کے لیے روانہ ہوئے۔ میں اس سے پہلے کئی بار پٹنہ جاچکا تھا اور اس کے بعد بھی جاتا رہا۔

پٹنہ میں مجھے ایک بات پر سخت حیرت ہوتی رہی کہ وہاں مسلمانوں کی اچھی حیثیت کے باوجود کوئی قابلِ ذکر مسلم ہوٹل نہیں ہے جہاں حسبِ خواہ اچھا کھانا مل سکے قیام تو بہت دور کی بات ہے۔ سبزی باغ میں ایک چھوٹا سا ہوٹل تھا اس میں دو بار کھانا کھانے کا اتفاق ہوا اور دونوں بار میں نے خود کو ملامت کی۔ میں پٹنہ میں موریہ ہوٹل میں قیام کرتا تھا لیکن کھانے کے لیے وہاں سے قریب ہی ایک ویجی ٹیرین ہوٹل ''راجستھان'' کا انتخاب کر رکھا تھا وہاں دیسی گھی میں تیار کیے جانے والے کھانے مجھے پسند تھے۔

مادام فش کے ساتھ موریہ ہوٹل میں فروکش ہوا۔ پھر ان سے گزارش کی کہ آپ

ہوٹل ہی میں ٹھہریں اور میں آپ کی ملاقاتوں کا پروگرام طے کرلوں چنانچہ اس سلسلے میں اردو اکاڈیمی میں ش مظفر پوری سے، صدائے عام میں سید رضی حیدر سے، قومی آواز میں شاہین محسن سے اور خدا بخش لائبریری میں ملاقاتوں کے پروگرام طے پائے۔ میں نے ایلن فش سے کہا کہ آپ کھانا موریہ میں ہی کھالیں میں ایک ویجی ٹیرین ہوٹل میں کھاتا ہوں اس پر انھوں نے فرمایا کہ میں بھی وہیں کھاؤں گی۔ غرض یہ کہ پٹنہ میں ہم لوگوں کا قیام ایک ہوٹل میں اور طعام دوسرے ہوٹل میں رہا۔

مجھے پریشانی یہ تھی کہ پٹنہ کے لوگوں سے ملاقات کے دوران معلوم نہیں موصوفہ کا رویہ کیسا ہو کیونکہ ہمارے آفس میں تو وہ ایک نک چڑھی خاتون سمجھی جاتی تھیں اور غالباً یہی وجہ تھی کہ کوئی ان کے ساتھ باہر جانا پسند نہیں کرتا تھا، اس طرح قرعہ فال میرے نام نکلا تھا۔ لیکن وہ تو پٹنہ میں لوگوں سے اس بے تکلفی کے ساتھ ملیں کہ خود مجھے بھی حیرت تھی، انہی پیالیوں میں چائے پی جو عام طور سے اخباری دفتروں میں زیر استعمال رہتی ہیں، جہاں پان پیش کیا گیا وہاں اس سے بھی شوق فرمایا، جس سے ملیں اس کے دل میں سما گئیں، ان کی پوری شخصیت ہی بدل ہوئی معلوم ہورہی تھی۔

دن بھر کی مصروفیات کے بعد شام کو ہم لوگ ہوٹل میں واپس آئے تو میں نے ان سے کہا کہ آپ آرام کریں اور میں نیا پل دیکھ آؤں جسے ہندوستان کا طویل ترین پل کہا جاتا ہے۔ پٹنہ اور مظفر پور کے درمیان نیا پل ابھی زیر تعمیر تھا لیکن ایک طرف کا راستہ مکمل ہوگیا تھا اور اس پر ٹریفک جاری کردی گئی تھی۔ اس وقت بہت زیادہ ٹریفک بھی نہیں تھی۔ اس پل کی وجہ سے پٹنہ اور شمالی بہار کے درمیان آٹھ دس گھنٹے کا سفر صرف دو گھنٹے کا رہ گیا، اسٹیمروں اور کشتیوں کی ادلا بدلی کی ضرورت بھی ختم ہوگئی۔

جب میں نے اس پل کو دیکھنے کا ارادہ ظاہر کیا تو موصوفہ بھی تیار ہوگئیں کہ ہم بھی چلیں گے۔ کیا کرتا میں نے کہا چلئے۔ کار جو ہم نے دن بھر کے لیے کرائے پر لے رکھی تھی موجود تھی۔ مجھے ایک پریشانی یہ تھی کہ بالکل شام ہورہی تھی اور وہ انجانا سنسان مضافاتی

علاقہ اور ایک غیر ملکی خاتون ساتھ نہ معلوم کون سی مصیبت آ پڑے، مگر کرتے کیا، ہم لوگ چل پڑے۔ پل کے سرے پر ہی گاڑی روک دی اور باہر نکل کر ہم لوگ ادھر اُدھر ٹہلنے لگے۔ پہلے تو میں نے سوچا تھا کہ پل پر کچھ دور تک جاؤں گا لیکن ایلن فش کی موجودگی کی وجہ سے یہ خیال ترک کر دیا۔

پل جہاں سے شروع ہوتا ہے وہ مقام قدرے بلند ہے، وہاں سے ہر طرف کارخانوں کی چمنیوں سے نکل کر پھیلتا ہوا دھواں نظر آ رہا تھا۔ اطراف کا منظر دیکھنے کے بعد انھیں گمان ہوا کہ وہ صنعتی علاقہ ہے تو انھوں نے مجھ سے ایک عجب سوال کیا۔ فرمانے لگیں کہ جب اس علاقے میں اتنی صنعتیں ہیں اور یہ معدنیات کا علاقہ بھی ہے تو پھر بہار کو ہندوستان کی غریب ترین ریاست کیوں کہتے ہیں۔ میں نے انھیں سمجھایا کہ یہاں کارخانے یا تو سرکاری ملکیت میں ہیں یا ریاست کے باہر کے بڑے بڑے سرمایہ داروں کی ملکیت میں ہیں۔ دفتری عملہ زیادہ تر بابوؤں پر مشتمل ہے جس میں بنگالیوں کی اکثریت ہے۔ مقامی آبادی کی اکثریت یومیہ اجرت پر کام کرنے والی مزدور ہے۔ انھوں نے یہ ساری باتیں بڑی حیرت سے سنیں۔

اگلے دن صبح ناشتے کے بعد ہم لوگوں نے جناب غلام سرور صاحب سے ان کی قیام گاہ پر ملاقات کی اس کے بعد کلکتہ کے لیے روانہ ہو گئے۔ کلکتہ میں دمدم ہوائی اڈہ پر ہمیں لینے کے لیے حسبِ معمول آفس کی گاڑی آئی تھی۔ میرے لیے کلکتہ آفس والوں کی طرف سے یہ ایک خاص اعزاز اور اظہارِ تعلق تھا۔ دیگر مقامات پر ہم جہاں بھی جاتے ٹیکسی استعمال کرتے۔ شہروں میں دن بھر کے لیے یا گھنٹے کے حساب سے کوئی گاڑی کرائے پر بھی لے لیتے لیکن کلکتہ میں ہمیشہ مجھے لینے کے لیے اور واپس ہوائی اڈہ پر پہنچانے کے لیے دفتر کی گاڑی فراہم کی جاتی۔ جس ہوٹل میں میرے ٹھہرنے کا انتظام ہوتا (وہ بھی کلکتہ آفس والے کرتے) وہاں مجھے پہنچا دیا جاتا پھر واپسی کے پروگرام کے مطابق صبح علی الصباح یا شام کو دفتر کی گاڑی آ کر ہوائی اڈے لے جاتی۔ چنانچہ اس بار بھی ایسا ہی ہوا

لیکن ایک فرق یہ تھا کہ ایلن فش کے ہم سفر ہونے کی وجہ سے ایک زیر تربیت افسر جو انہی کے ساتھ ہندوستان آئے تھے اور یو ایس آئی ایس کلکتہ میں مامور کیے گئے تھے دفتر کی گاڑی میں ہوائی اڈے پر آئے۔ انھوں نے مجھے بھی کلکتہ میں نو وارد سمجھا چنانچہ دمدم سے ہوٹل جاتے ہوئے مجھ سے فرمانے لگے کہ یہاں آپ کو کن لوگوں سے ملاقات کرنی ہے اور متعارف کرانے کے لیے کسی کے ساتھ جانے کی ضرورت ہوگی یا نہیں۔ میں نے عرض کیا کہ اس شہر میں آپ جس سے کہیں میں متعارف کرادوں۔ خیر۔ میں اپنی قیام گاہ پر چلا گیا اور ایلن فش افسر مذکور کی قیام گاہ پر۔

دوپہر کے کھانے کے بعد ہم لوگ یو ایس آئی ایس میں اکٹھا ہوئے تو منظر یہ تھا کہ دفتر میں ہر طرف سے لوگ میری طرف کھنچے آرہے تھے، کوئی ہاتھ ملا رہا تھا، کوئی گلے مل رہا تھا، ہر کوئی خیر وعافیت دریافت کر رہا تھا۔فش اور ان کے ساتھ افسر یہ ماجرا حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ میں نے انگلش ایڈیٹر اور پریس چیف کو یہ بات سمجھا دی کہ کلکتہ میں فش کو انگریزی اخباروں میں لے جاؤ میں کسی ایک اردو اخبار میں لیتا جاؤں گا۔ یہ بات طے ہوگئی۔فش کی مجبوری یہ تھی کہ کلکتہ پہنچنے کے بعد وہ وہاں کی دفتری ہدایات و احکام کی پابند تھیں اس لیے مجھ پر پہلے کی طرح یکطرفہ حکمرانی نہیں کرسکتی تھیں۔انھیں یہ بھی پتہ نہ تھا کہ وہاں ان کا پروگرام میرے مشورہ کے مطابق طے پایا تھا۔

دوسری طرف میں نے احمد سعید صاحب ملیح آبادی ایڈیٹر ''آزاد ہند'' سے مشورہ کیا کہ اگر انھیں فرصت ہو تو ایک لیڈی آفیسر سے ملاقات کا موقع دیں، وہ راضی ہوگئے حالانکہ ان کے لیے ایک مشکل درپیش تھی جس کا مجھے بھی احساس تھا وہ یہ کہ ''آزاد ہند'' کا پرانا دفتر اخبار کی نئی عمارت میں منتقل ہو رہا تھا اس وجہ سے سارا دفتر ایک انتشار کی حالت میں تھا اور پرانے دفتر کی کیفیت تو بڑی ناگفتہ بہ تھی، وہیں ملاقات کی بات ٹھہری تھی۔ بہرحال ہم لوگ پروگرام کے مطابق وہیں گئے۔ دونوں امریکی افسر سعید صاحب سے بڑی بے تکلفی کے ساتھ ملے۔ بطورِ ضیافت جب سعید صاحب نے مشروبات کے بارے میں

دریافت کیا تو انھوں نے ڈابھ یعنی ہرے ناریل کے پانی کو ترجیح دی۔ خوب مزے لے لے کر پیا پھر پان بھی کھایا۔ اس بے تکلفی سے غالباً سعید صاحب بھی کافی محظوظ ہوئے۔ فش کا ایک دلچسپ مذاق یہ ہوا کرتا تھا کہ جب وہ کسی ہندوستانی سے اپنا تعارف کراتیں تو اپنا نام ایلن فش بتانے کے بعد فرماتیں ''مچھی'' اور کھلکھلا کر ہنستیں۔ یہ ان کا ایک خاص انداز تھا اور بے تکلفی کا آغاز۔

کلکتہ میں دو روز قیام کے بعد ہم لوگ دہلی واپس آ گئے۔ لیکن اس کے بعد جلد ہی میرا اور فش کا ایک پروگرام لکھنؤ کا بنا دیا گیا۔ اب مجھے بھی ان کی طرف سے اطمینان ہو گیا تھا۔ ہم لوگ لکھنؤ پہنچے اور حسبِ معمول کلارکس اودھ ہوٹل میں ٹھہرے جہاں اس سے پہلے اور بعد میں بھی قیام کرتا رہا۔ ہوٹل کے پی آر او کمار صاحب بڑے خوش مزاج اور ہمہ صفت موصوف تھے، دبلے پتلے پھرتیلے جوان اور بوقت ضرورت ہر جگہ موجود۔

لکھنؤ کے بعض انگریزی اور ہندی ایڈیٹروں سے ان کے دہلی آتے جاتے فش کی ملاقات تھی اس لیے میں نے ان لوگوں کو فش کی آمد کی اطلاع دے دی اور ان سے ملاقاتوں کا کام ان کی صوابدید پر چھوڑ دیا۔ اردو ایڈیٹروں میں سے عشرت علی صدیقی صاحب ایڈیٹر ''قومی آواز'' اور جمیل مہدی صاحب ایڈیٹر ''عزائم'' سے ملاقاتوں کا پروگرام میں نے طے کیا۔ صدیقی صاحب کو تو امریکہ کے نام ہی سے الرجی تھی تاہم وہ فش کے ساتھ نہایت خوش اخلاقی سے پیش آئے جو میرے لیے اطمینان کا باعث ہوا۔ جمیل مہدی صاحب علیل تھے تاہم اپنی قیام پر اچھی طرح ملے اور مختلف موضوعات پر پوری دلچسپی کے ساتھ گفتگو کی۔ لکھنؤ میں دو روز قیام کے بعد ہم لوگ واپس آئے۔

ان دوروں کے بعد دلچسپ بات دہلی میں ہوئی۔ مجھ سے سینئر افسروں نے یہ دریافت کیا کہ ایڈیٹروں سے ملاقات کے دوران فش کا رویہ کیسا رہا اور انھوں نے کیسا تاثر دیا۔ غالباً یہ ان کی آزمائش تھی اور میری رپورٹ ان کے حق میں گئی ہوگی۔ دوسرے یہ کہ جو لوگ فش کے ساتھ سفر کرنے سے گریزاں تھے شاید ان کو اطمینان ہو گیا کہ گھبرانے کی کوئی

بات نہیں ہے اس لیے کہ اس کے بعد میرے ساتھ فش کے دورے کا کوئی پروگرام نہیں بنا اور تقریباً ایک سال ان کے قیام کے دوران دوسرے لوگ ان کے ساتھ سفر کرتے رہے۔

ایک طرف تو فش کے بارے میں مجھ سے معلومات حاصل کی گئیں اور دوسری طرف قرینہ غالب ہے کہ میرے بارے میں فش سے دریافت کیا گیا ہوگا۔ اس باب میں فش ایک بات سے بہت متاثر معلوم ہوتی تھیں وہ یہ کہ میرے ساتھ وہ جہاں بھی گئیں بالخصوص کلکتہ اور پٹنہ میں انھوں نے دیکھا کہ لوگ میرے ساتھ گہرے تعلق اور گرمجوشی کا اظہار کررہے تھے جو میری مقبولیت کی دلیل تھی مزید یہ کہ میں نے دورانِ سفر ان کی ہر طرح کی آسائش کا اہتمام کیا۔ جہاں گیا قاعدے سے اپنے دورانِ قیام استعمال کے لیے پرائیویٹ کار کرائے پر لے لی۔ لوگوں سے ملاقاتوں کے پروگرام بھی محدود اور مخصوص رکھے تاکہ وہ کوئی غلط تاثر نہ لیں۔ نتیجہ بھی ظاہر ہے۔ فش نے میرے بارے میں موافقانہ رپورٹ دی ہوگی جس کا مجھے براہِ راست تو علم نہیں ہے لیکن بالواسطہ قیاس کرسکتا ہوں۔

اس کے بعد جلد ہی پریس چیف ٹونی جیسوداسن نے مجھے یہ خوشخبری سنائی کہ مجھے امریکہ بھیجے جانے کی تجویز زیرِ غور ہے اس لیے مجھے پاسپورٹ بنوالینا چاہیے۔ ہر سال سینئر اسٹاف میں سے ایک یا دو کو چار ہفتوں کے لیے امریکہ کی سیر کے لیے بھیجا جاتا ہے۔ ۱۹۸۲ء کے اواخر میں مجھے نامزد کیا گیا اس کے بعد کی کارروائیوں کی تکمیل ہوتے ہوتے ۱۹۸۳ء میں مئی کا مہینہ آ گیا۔

لیکن اس نامزدگی کی خوشخبری ملنے سے کچھ پہلے ایک واقعہ اور بھی ہوا تھا۔ وہ یہ کہ ہمارے ڈائریکٹر مسٹر چک لورنج نے ایک دن اتفاقی طور پر کمرے کے باہر لابی میں ساتھ ساتھ چلتے ہوئے مجھ سے اچانک یہ سوال کیا کہ تمہارا کیا خیال ہے افغانستان کی جنگ کا انجام کیا ہوگا۔ اس وقت تک اس جنگ کے تین برس پورے ہوچکے تھے۔ میں نے بے دھڑک کہا کہ روسیوں کو افغانستان سے پسپا ہونے پڑے گا۔ یہ سن کر وہ چونکے اور مجھے اپنے کمرے میں لے گئے اور فرمانے لگے کہ تم نے جو نتیجہ اخذ کیا ہے وہ کیونکر؟ پھر

میں نے ان سے تفصیلی گفتگو کی جو مختصراً یہ تھی۔

افغان ایک جنگجو اور خوددار قوم ہے وہ لفظ ''شکست'' سے نا آشنا ہے۔ وہ مٹ سکتے ہیں لیکن شکست نہیں تسلیم کر سکتے۔ انگریز جب ساری دنیا پر حکمراں تھے اس وقت بھی وہ افغان سرداروں کو خاموش رکھنے کے لیے انھیں رقوم دیا کرتے تھے۔ دوسری طرف روس ایک بڑی طاقت ہے لیکن ایک ایسی قوم ہے جو منگولوں، چینیوں اور جاپانیوں کے ہاتھوں پٹ چکی ہے اور دوسری عالمی جنگ میں امریکہ مدد نہ کرتا تو شاید جرمنی اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دیتا، یوں بھی کافی نقصان پہنچا چکا تھا۔ تو ایسے متضاد خواص رکھنے والی اقوام کا جب ٹکراؤ ہوگا تو پسپائی کس کا حصہ ہوگی ظاہر ہے۔

لوریج صاحب میری گفتگو سے محظوظ ہوئے اور بظاہر مطمئن معلوم ہوتے تھے۔ ۱۹۸۳ء کے اوائل میں مجھے بتایا گیا کہ امریکہ بھیجے جانے کے لیے میرا انتخاب کیا جاچکا ہے اور میرا نام واشنگٹن کی منظوری کے لیے بھیج دیا گیا ہے۔ پھر اس ضمن میں ضابطے کی کارروائیاں ہوتی رہیں یہاں تک کہ مئی کا مہینہ آ گیا۔ اس ماہ کے اواخر میں امریکہ کے لیے میری روانگی سے پہلے ایک اہم واقعہ یہ ہوا کہ چاند پر اترنے والے پہلے امریکی نیل آرم اسٹرانگ کے ساتھ ایک ٹیلی پریس کانفرنس کا میں نے اہتمام کیا جس کا تفصیل کے ساتھ تذکرہ کیا جاچکا ہے۔

امریکہ کے لیے روانگی:

۲۶ر مئی کی شام کو میں براہِ لندن امریکہ کے لیے روانہ ہوا اور ۱۱ر جولائی کو اسی راستے دہلی واپس آیا۔ اس سفر کا تفصیلی تذکرہ آئندہ آئے گا فی الحال میں اس سفر کی ابتدائی مصروفیات کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔

دفتری ہدایت یہ تھی کہ روانگی سے دو روز قبل زیادہ تگ و دو نہ کی جائے کیونکہ آئندہ پانچ چھ ہفتوں کا سفر کافی تھکا دینے والا ہوگا۔ میرے لیے یہ بات خصوصاً بڑی اہم تھی کیونکہ اول تو میں ۵۰ کی منزل پار کر چکا تھا دوسرے زمانۂ دراز سے کام کی زیادتی اور

معدے کی تکلیفوں نے قوت مزاحمت کو بری طرح متاثر کیا تھا تاہم اطمینان کا پہلو یہ تھا کہ روانگی سے کوئی ایک ہفتہ قبل دفتر کی طرف سے مکمل طبی معائنہ کرایا گیا تھا، میڈیکل رپورٹ کے بارے میں کچھ سننے میں نہیں آیا اور جانے کی اجازت مل گئی اس کا مطلب یہی تھا کہ طبی زاویہ نگاہ سے سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہے یہ تاثر بذاتِ خود بڑا حوصلہ افزا تھا۔

لیکن روانگی سے دوروز قبل ہی سے دفتر میں کیفیت یہ تھی کہ پریس چیف ٹونی جیسوداسن اور ہندی ایڈیٹر سریندر ورما دونوں شہر سے باہر تھے اس لیے دفتر میں اپنے کام کے علاوہ جسے سمیٹنے میں میں بری طرح پھنسا ہوا تھا کچھ اور جھمیلے لگے رہے۔ فارین ایکسچینج اس وقت تک نہیں لے سکا تھا اس کے لیے بھی بھاگ دوڑ کرنی پڑی۔ کچھ ڈالر ایمبسی سے ملنے والے تھے اور بقیہ بینک سے۔ غرض یہ کہ اندر باہر دنیا بھر کے کام سے میں بری طرح تھک گیا اور شام کو اپنے معمول کے وقت پر ہی گھر واپس آسکا۔ ابھی سامان بھی ٹھیک کرنا تھا۔ چاہا کہ گھنٹہ دو گھنٹہ سو رہوں ۱۲ر بجے رات کو ہوائی اڈہ کے لیے روانہ ہونا تھا لیکن اسی وقت بعض اقارب ہمیں الوداع کہنے کے لیے بچوں کچوں سمیت آگئے اور گھر میں ایسی ہلچل ہوئی کہ ایک تقریب کی سی فضا بن گئی اب آرام کرنے کا سوال کہاں تھا۔ جوں توں سامان درست کیا اور ہوائی اڈے جانے کے لیے تیار ہوا تو معلوم ہوا کہ پوری پلٹن ساتھ جانے کو تیار ہے۔ ابوالفضل فاروقی صاحب کی ماٹا ڈور ویگن بھی دستیاب تھی اسی میں کوئی درجن بھر افراد روانہ ہوئے۔ گھر میں صرف میری بیوی تنہا رہ گئیں میں بدحواسیوں کے مرحلے سے گزر کر جب مطمئن ہوا تو اس بات پر بڑا رنجیدہ ہوا کہ اسی غریب کو تنہا چھوڑ آیا تھا۔ میری بیٹیاں میرے ساتھ ہوائی اڈے تک آئیں۔ سب سے زیادہ خوشی تو انہی کو تھی۔

میرا سارا سفر پان امریکن ہوائی کمپنی کے ذریعے بک تھا۔ رات میں ایک بجے کے قریب جبکہ ۲۷ر مئی کی تاریخ شروع ہوچکی تھی میں ہوائی جہاز میں جاکر بیٹھا ہی تھا کہ جہاز کے عملہ میں سے ایک نے اعلان کیا کہ مسٹر رضوان اللہ کون ہیں آگے آئیں۔ یہ سن کر تو میرے ہوش کے طوطے اڑ گئے۔ آگے بڑھا تو ایک بڑا سا لفافہ مجھے دیا گیا جو مہر بند تھا

اور ہدایت یہ تھی کہ واشنگٹن پہنچتے ہی اسے ہیڈ آفس میں دے دوں۔ اس لفافے میں میری میڈیکل رپورٹ تھی جو تاخیر سے موصول ہوئی تھی اور اب تک واشنگٹن نہیں جا سکی تھی۔

اس وقت میری پریشانی کی وجہ یہ ہوئی کہ میں نے سنا تھا کہ ایک بار ہمارے آفس کے کوئی صاحب اسی طرح امریکہ جا رہے تھے کہ ہوائی جہاز کی روانگی سے کچھ پہلے ان کو جہاز پر سے واپس بلا لیا گیا۔ معلوم ہوا کہ ان کے خلاف کوئی قابلِ اعتراض معاملہ آفس کے علم میں آ گیا تھا۔ چنانچہ ان کو نہ صرف امریکہ جانے سے روک لیا گیا بلکہ ملازمت سے سبکدوش بھی کر دیا گیا۔

خدا خدا کر کے ہوائی جہاز صبح ساڑھے تین بجے اپنے معینہ وقت پر روانہ ہوا۔ اس وقت تک جاگتے رہنے اور بے حد تھکاوٹ کی وجہ سے میں بے خبر سو گیا۔ کراچی میں کچھ دیر کے لیے ہوائی جہاز ٹھہرا تو بس اس کا اعلان میں نے سنا اس کے بعد پھر بے خبر ہو گیا۔ اگلے دن کوئی نو دس گھنٹے کی پرواز کے بعد فرینک فرٹ پہنچا اور اس طیارے سے اتر کر لندن جانے والے دوسرے طیارے میں سوار ہوا۔ ہم لوگ فرینک فرٹ میں اپنے ہوائی جہاز سے اتر کر گیلری میں آئے جو جہاز سے لگا دی گئی تھی اور اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے اس کے بعد وہ گیلری جہاز سے الگ ہو کر زنا زن فرانے بھرنے لگی اور ذرا دیر بعد دوسرے ہوائی جہاز سے جا لگی اور ہم لوگ اس ہوائی جہاز میں اپنی سابقہ نمبر والی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ کیونکہ جہاز یکساں تھے اور سیٹوں کی ترتیب بھی یکساں تھی۔ میرے لیے ترقی یافتہ دنیا کا یہ پہلا جلوہ تھا۔ کچھ دیر بعد ہوائی جہاز فرینک فرٹ سے لندن کے لیے روانہ ہوا۔ لندن کے مقامی وقت کے مطابق دن میں دو بجے ہم وہاں پہنچے۔

لندن میں ورود:

غالباً اس فضائی سفر کے دوران میں مسلسل سوتا رہا تھا اس لیے روزِ گزشتہ کی تھکاوٹ کسی حد تک دور ہو گئی تھی پھر نئے حالات اور آئندہ سفر کے خیالات میں گم ہونے کی وجہ سے مجھے اپنی کچھ خبر نہیں تھی۔ لندن کے بارے میں مجھے کچھ نہیں معلوم تھا۔ دفتر میں

ایک ساتھی نے پکا ڈیلی ہوٹل کا تذکرہ کیا تھا بس اتنی ہی معلومات کے ساتھ میں ہوائی اڈے پر اترا تھا۔ضابطے کی کارروائیوں سے گزرا۔ کسٹم والوں نے میری اٹیچی کھلوائی تو ضرور لیکن فوراً ہی کہا بند کیجیے جایئے۔ میں نے ان سے ٹیوب ریل کا ٹرمینل پوچھا اور چل پڑا۔فوراً ہی ٹرین مل گئی اور پکا ڈیلی سرکس کے لیے چل پڑی۔ چونکہ ڈبے کے اندر لگے ہوئے نقشے پر اس لائن کے اسٹیشنوں کے نام تھے اور اعلان بھی کیا جاتا رہا اس لیے بیٹھے بیٹھے معلوم رہتا کہ ہم کہاں پہنچے اور منزل ابھی کتنی دور ہے۔

میرے قریب ایک انگریز خاتون بیٹھی تھیں میں نے ان سے پوچھا کہ یہ گاڑی پکاڈیلی سرکس کتنی دیر میں پہنچے گی، انھوں نے بتایا کوئی ۳۵ منٹ میں۔ پھر مجھ سے پوچھنے لگیں آیا آپ ہندوستانی ہیں۔اثبات میں میرے جواب پر فرمایا کہ میرا بچپن بھی کلکتہ میں گزرا ہے، میں نے بھی کلکتہ سے اپنے تعلق کا اظہار کیا تو انھوں نے بتایا کہ ان کے والد ایک فوجی افسر تھے اور کلکتہ میں مامور تھے۔ چنانچہ ان کی تعلیم دارجلنگ میں ہوئی پھر لڑکپن ہی میں وہ لندن آ گئیں۔انھوں نے ایک بار کلکتہ دیکھنے کا اشتیاق بھی ظاہر کیا۔ میں نے کہا کہ اب کلکتہ وہی کلکتہ نہیں رہا۔ اب اس شہر کو دیکھ کر بڑی مایوسی ہوگی اس لیے مناسب ہے کہ ماضی کی خوشگوار یادوں کو ذہن کے گوشے میں سجائے رکھیں۔ وہ پکاڈیلی سرکس سے ایک اسٹیشن پہلے ہی اتر گئیں لیکن مجھے ہدایت کرتی گئیں کہ اترنے کے لیے تیار رہیے مگر اپنے جیب اور کاغذات سے ہوشیار رہیے گا۔

ٹرین کے پکاڈیلی سرکس پہنچنے پر میں باہر نکلا اور ایلی ویٹر کی طرف چلا۔اس وقت ایک تماشہ یہ ہوا کہ ایلی ویٹر پر میرا بریف کیس نہ معلوم کیسے کھل گیا اور اس میں سے کاغذات نیچے گرتے چلے گئے۔اب عجیب منظر تھا۔ میں اوپر چلا جا رہا تھا۔ میرے دائیں ہاتھ میں اٹیچی تھی اور بائیں میں کھلا بریف کیس جسے گھٹنے سے ٹکا کر میں نے بقیہ سامان کو گرنے سے بچالیا تھا۔ میرے پیچھے آنے والے میرے کاغذات ایک ایک کر کے لیتے آ رہے تھے اس طرح میری کوئی چیز ضائع نہیں ہوئی۔ اب سوچتا ہوں کہ کہیں ایسا تو نہ تھا

کہ اس وقت کسی نے میرا بریف کیس کھول دیا ہو جس کا مجھے پتہ نہ چلا ہو جیسا کہ اس خاتون نے انتباہ کیا تھا۔ بہرحال یہ لندن سے میرا پہلا تعارف تھا۔

اسٹیشن سے باہر آ کر سڑک کے نکڑ پر ایک ٹریفک کانسٹبل کو دیکھا تو اسی سے پکاڈیلی ہوٹل کا پتہ پوچھا اس نے بتایا کہ سامنے بالکل قریب ہی ہے، میں اپنا سامان لیے ہوئے اسی طرف چل پڑا۔ اس ہوٹل میں پہنچنے پر معلوم ہوا کہ وہاں کوئی کمرہ خالی نہیں ہے۔ رسپشنسٹ سے میں نے کہا کہ وہ کوئی اور ہوٹل بتائیں۔ انھوں نے قریب ہی ریجنٹ پیلس ہوٹل کا پتا بتایا تو میں نے گزارش کی کہ وہاں معلوم کرلیں کوئی کمرہ خالی ہے بھی یا نہیں۔ انھوں نے میری مدد کی اور ٹیلیفون سے دریافت کرکے بتایا کہ کمرہ مل جائے گا۔ میں پھر اپنا سامان لیے ہوئے وہاں پہنچا۔ دراصل یہ فاصلے اتنے کم تھے کہ ٹیکسی کرنا ممکن نہ تھا اور سامان لیے پھرنا ایک تھکا دینے والا عمل۔

ریجنٹ پیلس ہوٹل پہنچا تو وہاں اور ہی گل کھلے۔ رسپشنسٹ نے ۴۰۶ نمبر کمرہ مجھے دیا اور اس کی چابی میرے حوالے کی۔ میں اپنا سامان لے کر وہاں پہنچا۔ کمرہ کھولا تو اس کے اندر کسی خاتون کا سامان بکھرا نظر آیا۔ میں فوراً رسپشن پر واپس آیا تو انھوں نے معذرت کی اور کمرہ نمبر ۳۰۶ کی چابی دی۔ گویا پھر چوتھی منزل پر جا کر اپنا سامان لے کر تیسری منزل پر اترنا پڑا۔ اب جو چابی لگاتا ہوں تو دروازہ ہی نہیں کھلتا۔ میں اس قدر تھک گیا تھا کہ ہلنا بھی گراں گزر رہا تھا ایسے میں بس بیٹھ کر رونے کو جی چاہتا تھا۔ میں واقعی لابی میں دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا، پھر اپنے آپ پر ہنسی آنے لگی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ دراصل لفٹ بھی تو کچھ فاصلے پر تھا ہر بار لابی میں کافی چلنا پڑتا تھا۔ ذرا دیر میں ایک مسافر کو اپنا کمرہ کھولتے ہوئے دیکھا تو اس سے گزارش کی کہ رسپشن سے کسی کو بلائیں کہ میری مدد کرے چنانچہ ذرا دیر بعد ایک شخص آیا اور اس نے کمرہ کھول دیا میں کمرے میں جا کر لیٹا تو بیہوشی کی نیند آ گئی۔

لندن میں مجھے کچھ نامانوس نہیں معلوم ہوا۔ آزادی سے پہلے والے شہر کلکتہ سے

کافی مشابہت معلوم ہوئی۔ موسم البتہ کہر آلود تھا جس سے صبح شام کی تمیز نہیں ہو رہی تھی۔ میں اس وقت اوقات نوٹ نہیں کر رہا تھا۔ کچھ دیر سونے کے بعد آنکھ کھلی تو تکان کم ہوگئی تھی لیکن بھوک کا غلبہ تھا۔ میں نے بدرالدین صاحب کو ٹیلیفون کیا جن کا تذکرہ کانپور کے ضمن میں آچکا ہے۔ انھوں نے ٹیوب ریلوں کا حساب کتاب بتایا اور کہا کہ فوراً آجاؤ، فلاں اسٹیشن پر میں تمہارا انتظار کروں گا۔ میں ہوٹل سے نکل کر اسٹیشن تک گیا تو لیکن تند وتیز سرد ہوائیں چل رہی تھیں اس لیے واپس آگیا اور ان کو ٹیلیفون کر کے بتادیا کہ آج نہیں آسکتا اگلے دن آؤں گا پھر ہوٹل کے باہر نکل کر کچھ چہل قدمی کی اور قریب ہی لبِ سڑک ایک طعام خانے میں روٹی اور کباب سیر ہوکر کھایا۔ رات ہوچکی تھی یاد نہیں کتنے بجے تھے ہوٹل میں آکر سو رہا۔ اس طرح ۲۶ رمئی کا دن لندن میں تمام ہوا۔

اگلے دن ۲۷ رمئی کو جمعہ تھا صبح ناشتہ سے فراغت کے بعد بدرالدین صاحب سے ملاقات کے لیے چل پڑا۔ حسبِ وعدہ معینہ اسٹیشن پر انھوں نے استقبال کیا اور اپنی گاڑی میں بٹھا کر گھر لے گئے میں نے ۱۹۴۹ء میں ان کو کانپور سے کراچی کے لیے بذریعہ ٹرین رخصت کیا تھا۔ اب ۳۵ برس بعد ان سے لندن میں ملاقات ہوئی تھی، جس بچے کو وہ اپنے کندھے پر لے کر گئے تھے اب وہ برطانوی فوج میں کیپٹن تھا۔ بدرالدین صاحب سے پرانی باتیں ہوتی رہیں۔ دن کے کھانے سے پہلے انھوں نے اپنے بہو بیٹوں سے ملاقات کرائی۔ ان کے چار بیٹے تھے جن میں سے تین کی شادیاں ہوچکی تھیں ایک چھوٹا زیرِ تعلیم تھا۔ خود بدرالدین صاحب نے دوسری عالمی جنگ کے زمانے میں ایک معمولی سپاہی کی حیثیت سے عملی زندگی کا آغاز کیا تھا جنگ کے خاتمہ پر کانپور ہوائی اڈہ میں وائرلیس آپریٹر یا میکانک کی جگہ مل گئی تھی وہاں سے پاکستان گئے اور فلپس کمپنی میں کام پالیا پھر نہ معلوم کیسے فلپس والوں کی معرفت لندن چلے گئے وہاں فورڈ موٹر کمپنی والوں سے ناطہ جوڑ لیا۔ مجھ سے جب ملاقات ہوئی تو ریٹائرمنٹ قریب تھا، دل کے مریض تھے اور رخصت پر چل رہے تھے لیکن کمپنی کی طرف سے ساری سہولتیں حاصل تھیں۔ ان کی علالت

کا سلسلہ پچھلے دو برس سے جاری تھا ہر چھ مہینے پر ڈاکٹری معائنہ ہوتا اور آرام کرنے کا طبی مشورہ دیا جاتا۔ بہت خوش تھے کہنے لگے کہ میرا ایک مکان اور ایک کار ذاتی ہے ایک رہائش اور ایک کار کمپنی کی طرف سے ملی ہوئی ہے۔ بیٹوں کے الگ الگ مکانات ہیں۔ ایک قہقہہ لگا کر انھوں نے فرمایا کہ انگریزوں نے ہندوستان پر بہت حکومت کی لیکن اس وقت آٹھ سو انگریز میری ماتحتی میں کام کر رہے ہیں۔

بدرالدین صاحب نے اپنی رہائش کی بالائی منزل پر گوشہ نشین ایک بیمار بزرگ سے ملاقات کروائی ان کا نام محمد شریف تھا وہ بنگلور کے رہنے والے تھے۔ آزادی سے پہلے ایک سرگرم مسلم لیگی تھے اور پارٹی کے لیے اپنی بڑی دولت لٹائی۔ آزادی کے بعد کراچی چلے گئے۔ لیکن جس پاکستان کا انھوں نے خواب دیکھا تھا اس کا حقیقی چہرہ دیکھنے کے بعد انھیں بڑی مایوسی ہوئی اور اپنا سارا اثاثہ بیٹے کے حوالے کر کے خود لندن چلے آئے اور گمنامی کی زندگی بسر کرنے لگے۔ بدرالدین صاحب نے ایک چھوٹا سا کمرہ انھیں دے رکھا تھا اور ان کے بیٹے شریف صاحب کی دیکھ بھال اور تیمارداری کرتے تھے۔ یہ تھا انجام آزادی کے پروانوں اور سیاست کے دیوانوں کا۔

شام کو چار بجے بی بی سی میں ایک ملاقات کا وقت طے تھا اس لیے دوپہر کے کھانے کے بعد میں نے بدرالدین صاحب سے اجازت چاہی پھر بھی نکلتے نکلتے کافی دیر ہوگئی۔ وہ اسٹیشن تک پہنچانے آئے تو راستے میں انھوں نے بتایا کہ دریائے ٹیمز قریب ہی ہے۔ میرا ذہن فوراً کلکتہ میں ہوگلی کی طرف گیا۔ چنانچہ میں نے ان سے گاڑی روکنے کی درخواست کی اور خود اتر کر دریا کے کنارے تک گیا تاکہ انگریزوں کے ان دو پسندیدہ شہروں کے دریاؤں کا کچھ موازنہ کرسکوں لیکن دونوں دریا ہیں دونوں کے کنارے ایک بڑا شہر آباد ہے بس موازنہ اتنے ہی پر ختم ہوجاتا ہے۔ ایک بالکل صاف شفاف پانی لیے آسودہ خرام، کناروں پر نہ کوئی بھیڑ بھاڑ نہ جھگڑا نہ جھنجھٹ، پانی نے جو کچھ بہا کر کنارے لگایا تھا وہ بھی مشروبات کے ٹن معلوم ہوتے تھے اور بس، نہ پھول مالائیں، نہ راکھ نہ ادھ

جلے مردے، نہ جانوروں کی لاشیں دوسری طرف ہوگلی کا مٹیالا پانی تیزی سے بہتا ہوا اپنے جلو میں دنیا کی آلائشیں اور کالک لیے ہوئے جس کے کناروں پر صبح شام اشنان کرنے والوں کے علاوہ ڈنڈ بیٹھک کرنے والوں، تیل مالشیوں، مدکچیوں اور اسی قبیل کے وحشیوں کی دھکا پیل۔ بہرحال چند منٹ کسی وسیع تر مشاہدے اور موازنے کے لیے کافی نہیں ہوسکتے نہ ہی سند بن سکتے۔

میں بدرالدین صاحب سے رخصت ہوکر ۳۰ منٹ کی تاخیر سے ساڑھے چار بجے بی بی سی پہنچا وہاں آصف جیلانی صاحب بڑے اخلاق سے پیش آئے دراصل ٹیلیفون پر انہی سے گفتگو ہوئی تھی، اس وقت ان کے علاوہ یاور عباس صاحب موجود تھے، دیگر حضرات سے، جن کی آوازیں سنا کرتا تھا ملاقات کا اشتیاق باقی رہ گیا بالخصوص رضا علی عابدی اور وقار احمد صاحبان سے۔ بی بی سی کے اسٹوڈیو میں بیٹھ کر مزید دو تین مہمانوں کے ساتھ ان کے نشریات سنتا اور دیکھتا رہا۔ اس کے اختتام پر آصف جیلانی صاحب نے کینٹین میں لے جا کر چائے سے ضیافت کی اس موقع پر ڈان کے نامہ نگار سعید صاحب اور ایک پاکستانی بشیر صاحب بار ایٹ لا موجود تھے، ان لوگوں سے ہلکی پھلکی ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں اس کے بعد میں ہوٹل واپس آ گیا بس لندن میں اور کچھ نہیں دیکھا۔ ہاں وہاں سے چل کر اپنے ہوٹل تک آنے میں جو مشاہدات ہوئے یا جو تاثرات لیے ان کی بات الگ ہے۔ میں نے اس دن اپنی ڈائری میں لکھا:

''لندن میں لوگوں کا رویہ عموماً شریفانہ ہے۔'' ''آپ لندن میں گم نہیں ہوسکتے، یہاں صرف ABCD جان لینا کافی ہے۔''

اس روز میں نے اپنا ایک قول بھی ڈائری میں درج کیا: ''آپ دنیا کو یقین دلادیں کہ آپ کوئی بار نہیں ہیں تو لوگ بار بھی برداشت کرنے کے لیے تیار ہوجائیں گے۔'' غالباً یہ میرے اس احساس کی ترجمانی ہے کہ جب میں نے بدرالدین صاحب سے کہا کہ میں ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہوں تو انھوں نے بہ اصرار کیا کہ تم یہاں چلے آؤ ہوٹل میں

ٹھہرنے کی کیا ضرورت ہے۔

۲۸ رمئی سنیچر کے دن صبح کو میں لندن سے واشنگٹن کے لیے پان امریکن کی فلائٹ سے روانہ ہوا۔ دونوں مقامات کے درمیان وقت کا جوفرق اور فاصلہ ہے اس کی وجہ سے اسی دن دوپہر میں واشنگٹن پہنچ گیا۔ (امریکہ میں سفر کی تفصیلات سفر کے باب میں مذکور ہیں)۔

امریکہ سے واپسی:

کوئی ۴۲ دنوں تک امریکہ کی سیروسیاحت کے بعد ۹ رجولائی کو سنیچر کے دن میں لندن واپس آیا لیکن یہ واپسی اور دو روز لندن میں قیام عجیب وغریب حالات میں رہا جو کہ لندن میں رہنا اور نہ رہنا دونوں برابر تھا۔ قصہ یوں ہوا کہ پروگرام کے مطابق میں نیویارک سے لندن کے لیے روانہ ہوا تھا اور لندن میں فرینک فرٹ جانے والی فلائٹ پکڑنی تھی۔ وہاں دو دن قیام کا ارادہ رکھتا تھا لیکن ہماری نیویارک والی فلائٹ چار گھنٹے تاخیر سے لندن پہنچی نتیجہ کے طور پر فرینک فرٹ جانے والی فلائٹ چھوٹ گئی، گرمیوں میں یورپ اور ایشیا کے درمیان ساری فلائٹس پر بھیڑ اتنی بڑھ جاتی ہے کہ کئی کئی روز تک کسی فلائٹ میں گنجائش نہیں نکلتی۔ ایسے میں میرے سامنے سوال یہ تھا کہ کیا کروں، بس ذہن نے یاوری کی میں پان امریکن کی کھڑکی پر ڈٹ گیا اور ان سے کہا کہ میری فلائٹ آپ کے جہاز میں تاخیر کی وجہ سے چھوٹی ہے اس لیے آئندہ سارے پروگرام کے آپ ذمہ دار ہیں جیسے بھی ہو مجھے ہندوستان بھیجنے کا بندوبست کریں۔ وہ خاتون بڑے مخمصے میں پڑی۔ کمپیوٹر کی معرفت مختلف ایئر لائنوں کو ٹٹولتی رہی، بالآخر اس نے کہا کہ اگلے دن شام کو برٹش ایئر ویز کی بمبئی جانے والی فلائٹ میں ایک سیٹ ہے اگر وہاں جانا پسند کریں تو ہم بندوبست کردیں، میں نے کہا کہ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے ہاں بمبئی سے دہلی جانے والی فلائٹ میں سیٹ کنفرم کردیں، غرض یہ کہ اس نے ایسا ہی کیا پھر اس دن کا بقیہ اور اگلا دن میں نے پان امریکن کے مہمان کے طور پر شیراٹن ہوٹل میں گزارا لیکن اس اثناء میں کئی بار

مجھے ہوائی اڈے جانا پڑا ایک تو سیٹ کے بارے میں اطمینان کرنے کے لیے دوسرے اپنے اسباب کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے جو براہِ راست دہلی بھیج دیا گیا تھا۔ سفر اور مسلسل سفر کی طوالت سے کافی تھک گیا تھا۔ بدرالدین صاحب کو ٹیلیفون کر کے اپنی واپسی کی اطلاع دی، وہ پھر کہنے لگے کہ اب عید کو دو روز رہ گئے ہیں یہیں ہمارے ہاں آ جاؤ پھر اطمینان سے جانا لیکن میں نے ان کی رائے سے اتفاق نہیں کیا۔ مجھے اپنے سامان کی فکر لاحق تھی اسی لیے لندن میں مزید ٹھہرنا مناسب نہیں معلوم ہوا۔ شام کو میں نے اپنے گھر پر ٹیلیفون کر کے مطلع کر دیا کہ میں لندن آ گیا ہوں اب فلائٹ کا جیسے ہی بندوبست ہوا اگلے دو دونوں میں آ جاؤں گا۔

خدا خدا کر کے ۱۰ر جولائی کو اتوار کے دن ۵ بجے شام کو برٹش ائیرویز کی فلائٹ سے بمبئی کے لیے روانہ ہوا، لندن کے وقت کے مطابق دو بجے رات میں اور ہندوستانی وقت کے مطابق صبح ۷ر بجے کے قریب بمبئی پہنچا۔ دو گھنٹہ بعد دہلی کی فلائٹ روانہ ہوئی، دن میں ایک بجے کے قریب گھر واپس آ گیا۔

لیکن ابھی میرے اسباب کی بازیابی باقی تھی۔ دہلی ہوائی اڈے پر اترا تو پان امریکن کا آفس بند تھا۔ گھر آ کر میں نے یو ایس آئی ایس کے ٹریول سیکشن کو ٹیلیفون کیا تو انھوں نے پان امریکن والوں سے گفتگو کرنے کے بعد مجھے ہدایت کی کہ فوراً ہوائی اڈے جاؤ وہاں سامان رکھا ہوا ہے لے آؤ، میں بے حد تھکا ہوا تھا لیکن مرتا کیا نہ کرتا، پھر ہوائی اڈے گیا وہاں دیکھا تو میری دونوں اٹیچیاں ایک طرف رکھی ہوئی ہیں لیکن کسٹم والوں نے مجھ سے انٹری سرٹیفیکٹ طلب کیا جو مجھے بمبئی میں ملا تھا، لیکن میں اسے کہیں کھو بیٹھا تھا۔ دراصل اس کی اہمیت کو میں سمجھا ہی نہ تھا اسے ریل کے استعمال شدہ ٹکٹ کے طور پر سمجھا ہوگا۔ غرض یہ کہ کسٹم والے ساڑھے تین ہزار روپیہ ڈیوٹی طلب کرنے لگے حالانکہ ان اٹیچیوں میں زیادہ تر میرے استعمال کے کپڑے اور اسی طرح کی دیگر نئی پرانی چیزیں تھیں۔ میں نے کوئی رقم دینے سے انکار کر دیا اور سامان کو وہیں چھوڑ کر گھر چلا آیا اور ٹریویل سیکشن

کو اس واقعہ کی بھی اطلاع دے دی۔ سیکشن چیف مسٹر دیوا کرن نے اطمینان دلایا کہ تمہارا سامان مل جائے گا۔ بالآخر ۱۵ر جولائی کو دیوا کرن کی کوششوں سے میرا سامان مل سکا۔ میرے ڈائریکٹر لوریج صاحب نے مجھے اطمینان دلایا تھا کہ تمہارے سامان کے حصول میں جو خرچ ہوگا وہ آفس دے گا لیکن اس کی نوبت نہیں آئی ہاں میں نے دیوا کرن سے یہ وعدہ ضرور کرلیا تھا کہ ہوائی اڈے پر پان امریکن آفس میں ان کے دوستوں کے لیے ایک بوتل کا انتظام کردوں گا۔ اس کا اشارہ میں نے لوریج صاحب کو کردیا تھا وہ اگلے دن صبح کو میرے کمرے میں ایک تھیلا رکھ کر یہ کہتے ہوئے چلے گئے کہ اس میں تمہارے لیے کچھ ہے۔ دیکھا تو ایک بوتل تھی جسے میں نے دیوا کرن کو بھیج دیا۔

لندن میں میرا قیام بس برائے نام رہا وہ بھی ہوائی اڈے پر ہوائی کمپنیوں کے چکر کاٹتے گزرا لیکن بعض قیمتی مشاہدے اور تجربے ہوئے یعنی ہندوستانیوں کی کارکردگی کا دوسروں کی کارکردگی سے موازنہ کرنے کا موقع ملا۔ واپسی کے سلسلے میں مجھے کئی الجھنوں کا سامنا تھا، ایک تو غیر یقینی کیفیت تھی دوسرے اپنے سامان کے متعلق فکرمند تھا۔ چنانچہ پہلے تو پان امریکن کے اسی کاؤنٹر پر کام کرنے والی خاتون سے سابقہ پڑا جو میرے لیے کوئی سیٹ تلاش کرنے کی کوشش میں مصروف تھی اور اس وجہ سے کئی مسافروں کا کام رکا ہوا تھا جو لائن میں کھڑے تھے، میرے صبر کا بھی بڑا امتحان تھا، طویل سفر میں دو جگہ ہوائی جہاز بدل کر آیا تھا اس لیے بہت تھکا ہوا تھا، میں نے سوچا کہ خود بھی دوسری ایئرلائنوں سے رجوع کروں چنانچہ ایئر انڈیا کے کاؤنٹر پر گیا۔ وہاں تین کاؤنٹروں میں سے دو بند تھے اور ایک پر مسافروں کا اژدہام تھا، اس کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھے ہوئے شخص نے مسافروں کی فہرست کا ایک گچھا ہاتھ میں لے رکھا تھا اور اندر ہی کسی شخص سے باتوں میں مصروف تھا۔ کچھ دیر بعد جب مجھ سے نہ رہا گیا تو میں نے مداخلت کی اس نے فوراً بڑی ترش روئی سے جواب دیا کہ دیکھتے نہیں ہو میں ایک شخص سے باتیں کررہا ہوں، بالکل وہی انداز اور وہی طور طریقہ تھا جو ہندوستان کے سرکاری دفاتر میں بابوؤں کا ہوا کرتا ہے۔ ممکن ہے گوری

چمڑی والوں سے مرعوبیت کی بنا پر اتنی بدتمیزی نہ کرتے ہوں بین الاقوامی کاروبار میں سرکاری ہو یا غیر سرکاری ہندوستانیوں کے مار کھا جانے کے بہتیرے دیگر اسباب میں سے ایک ہمارے کارپردازوں کا احمقانہ احساس کمتری بھی ہے۔ کوئی نہیں پوچھتا کہ بھائی ذرا اخلاق سے بات کر لینے میں کیا خرچ ہوتا ہے۔

میں برٹش ایئرویز کے کاؤنٹر پر گیا وہاں بیٹھے ہوئے شخص نے آدھ منٹ وقت لیا اور مسکرا کر معذرت کر لی لیکن وہاں دوسرا تماشہ بھی ہوا۔ وہ ہندوستانی کا دوسرا روپ تھا۔ جب میں کاؤنٹر پر بات کر رہا تھا تو دیکھا کہ ایک پنجابی خاتون شلوار جمپر میں ملبوس ایک بڑی سی اٹیچی لیے میرے پیچھے کھڑی ہیں، میں جیسے ہی مڑا انھوں نے مجھ سے سیدھا سوال کیا، آپ کے پاس کوئی سامان نہیں ہے؟ میں نے کہا کیوں؟ تو فرمایا کہ میری اٹیچی اپنے سامان کے طور پر انڈیا لیتے چلیں۔ میں نے اس کو اتنی حیران نظروں سے گھورا کہ وہ جواب کا انتظار کیے بغیر آگے بڑھ گئی مگر میں دل ہی دل میں اس کی جسارت اور اعتماد کی داد دیتا رہ گیا اور کاؤنٹر پر بیٹھا انگریز مسکراتا رہا۔

پان امریکن کے کاؤنٹر پر واپس آیا تو خاتون نے بتایا کہ تمہارا انتظام ہو گیا ہے۔ وہی بمبئی جانے والا بندوبست، اس کے بعد میں پان امریکن کے دوسرے کاؤنٹر پر گیا جو اسباب وغیرہ سے متعلق رہا ہوگا وہاں بیٹھے ہوئے ایک نوجوان کو میں نے بتایا کہ میرا سامان واشنگٹن سے براہِ راست دہلی بھیج دیا گیا ہے لیکن میں نیویارک میں فلائٹ بدل کر آ رہا ہوں یہ بھی نہیں معلوم کہ دہلی کب تک پہنچوں گا تو میں اپنے سامان کے متعلق اطمینان کرنا چاہتا ہوں، مہربانی فرما کر آپ دہلی آفس کو ہدایت کر دیں کہ اس کا خیال رکھیں۔ اس نے کہا کہ آپ بالکل اطمینان رکھیے آپ کا سامان آپ کو دہلی پہنچتے ہی مل جائے گا اور ایسا ہی ہوا۔ پھر اس نوجوان سے میں نے کہا کہ آپ امریکن تو نہیں معلوم ہوتے اس نے کہا نہیں۔ میں نے کہا لیکن یوروپین بھی نہیں معلوم ہوتے تو اس نے ہنس کر کہا کہ میں ہندوستانی ہوں اور خاص دہلی کا رہنے والا ہوں۔ یہاں ایسے دو ہندوستانیوں کا فرق واضح ہو گیا جن میں

سے ایک ہندوستانی کمپنی کے لیے کام کررہا تھا اور دوسرا امریکن کمپنی کے لیے۔

واشنگٹن کے ہندوستانی سفارت خانے میں بھی مجھے کچھ اسی قسم کا تجربہ ہوا۔ رسپشن پر ایک پنجابی خاتون بیٹھی ہوئی سوئٹر بننے میں مصروف تھیں اور سامنے کھڑی ایک خاتون سے گل چھرے بازیاں بھی کیے جارہی تھیں اور میں کھڑا تاکتا رہا کہ ان کی گفتگو کی تان کہیں ٹوٹے تو میں مخل ہوں بالآخر کچھ دیر بعد وہ میری طرف متوجہ ہوئیں۔ میں نے عرض کیا کہ میں ایک ہندوستانی اخبارنویس ہوں، آپ کے پریس سیکشن میں جو صاحب بھی ہوں ان سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔ انھوں نے ٹیلیفون پر اندر کسی سے کچھ گفتگو کرکے فرمایا: ہاں دو آدمی پریس سیکشن میں ہیں لیکن اس وقت دونوں باہر ہیں۔

میں لوٹنے لگا تو انھوں نے فرمایا ہماری لائبریری تو دیکھتے جایئے۔ دراصل وہ لائبریری کیا تھی ایک ریڈنگ روم تھا، میں اس طرف چلا گیا۔ وہاں دو اصحاب بڑے اطمینان سے مصروفِ گفتگو تھے گویا لائبریری نہیں کوئی چائے خانہ ہے۔ چند ایک لوگ ادھر ادھر بیٹھے پرچے رسالے الٹ پلٹ رہے تھے۔ میں نے دریافت کیا کتنے ہندوستانی اخبارات یہاں آتے ہیں اور کتابیں کتنی ہیں۔ انھوں نے اخباروں کی جو تعداد بتائی مجھے یاد نہیں رہی لیکن اس سے بہت کم اخبارات وہاں دیکھنے میں آئے یعنی اگر انھوں نے سولہ بتائے تھے تو مشکل سے پانچ سات رہے ہوں گے کتابوں کی تعداد انھوں نے ۲۳ر ہزار بتائی تھی لیکن مجھے اس پر بھی شک تھا۔ پھر میں نے مذہبی سیکشن میں دو تین کتابیں اٹھائیں تو پہلی کتاب بدھ ازم پر تھی اور اس کے بعد دیوانِ غالب بہ خطِ ناگری، تیسری کتاب ہندی میں کہانیوں کا مجموعہ معلوم ہورہی تھی۔ میرا قیاس ہے کہ وہ جو دو حضرات تھے وہ ہندی جانتے ہی نہیں رہے ہوں گے اس لیے ہندی کتابوں کو جہاں تہاں رکھ دیا ہوگا۔

یہ ہے ہماری وہ تصویر جسے ہم اپنے رویہ سے دنیا کو دکھاتے ہیں اور امید رکھتے ہیں کہ ساری دنیا ہمارے سامنے زانوئے ادب تہہ کرے گی۔ واشنگٹن میں ہندوستان ٹائمز کے نامہ نگار خصوصی این سی مینن نے ایک بار اپنے کالم میں ہندوستانی سفارت خانے کے

خلاف بڑی سخت باتیں لکھی تھیں، میرا قیاس ہے کہ وہ بھی اسی قسم کے کسی تجربے سے گزرے ہوں گے جیسے کہ مجھے ہوئے۔

دہلی واپسی:

بہرحال، ۱۲؍جولائی کو منگل کے دن عید پڑی اس وقت میری بیٹیاں اور داماد سب موجود تھے طویل سفر سے میری واپسی اور سب کی موجودگی کی وجہ سے عید کی خوشیاں دوبالا ہوگئیں۔

سوموار ۱۱؍جولائی سے میں نے آفس جانا شروع کردیا تھا، وہاں کے حالات حسبِ معمول تھے میں سمجھ رہا تھا کہ امریکہ کے اس دورے سے واپسی کے بعد کچھ ترقی وغیرہ کی بات ہوگی اس کا انتظار ہی کرتا رہا لیکن ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ دراصل یہ تو میری گزشتہ کارگزاریوں کا انعام تھا۔ مستقبل سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا، وہ میری خام خیالی تھی۔

امریکی طرزِ حیات:

اس سفر کی وجہ سے اگر کچھ فرق آیا تو میری فکر میں۔ یہ بات بالکل فطری بھی تھی۔ میں نے امریکی عوام کو قریب سے دیکھا تھا، میرا مشاہدہ بالعموم عمیق نہیں ہوا کرتا تاہم میں نے امریکہ کی عوامی زندگی کی خوبیوں اور خرابیوں کو کچھ تو دیکھا ہی اور دیکھنے سے زیادہ سمجھنے کی کوشش کی۔ طبعاً میری نظر برائیوں پر کم پڑتی ہے اور اچھائیوں کو زیادہ دیکھتا ہوں اس لیے میں امریکیوں کی مصروف زندگی سے یقیناً متاثر ہوا۔ وہ بے حد مصروف رہتے ہیں، ہر وقت کچھ نہ کچھ کرتے رہنے کی دھن میں رہتے ہیں، کچھ نہیں تو کچھ پڑھتے ہی رہتے ہیں گاڑیوں میں، سواریوں میں، ہر جگہ — خالی ہیں تو سیاحت ہی کررہے ہیں، مختصر یہ کہ خاموش نہیں بیٹھ سکتے۔ یہ ایک اچھی عادت ہے لیکن اس کا ایک مضر پہلو بھی ہے وہ یہ کہ ان کے پاس سوچنے کے لیے وقت نہیں ہے۔ پہلے انھوں نے یہ کام پیشہ ورانہ ماہرین کے ذمہ چھوڑ رکھا تھا جس کے نتیجہ میں Think Tank کی اصطلاح بنی، سوچ بچار

کر کے رائے دینے والے ادارے قائم ہوئے، جوں جوں وقت گزرتا جارہا ہے یہ کام کمپیوٹر کے حوالے کرتے جارہے ہیں۔

لیکن امریکیوں کو گھر سے دفتر تک مصروف دیکھنے اور یہ محسوس کرنے کے بعد کہ ان کے پاس سوچنے کے لیے وقت کم ہے خود میرے اندر سوچنے کا رجحان بڑھ گیا اور میں اس وقت کا تعین کرسکتا ہوں جب میں نے اپنے اندر فکری تبدیلی کو محسوس کیا۔

واقعہ یوں ہوا کہ وسط جون میں امریکہ کی انتہائی جنوبی ریاست فلوریڈا کے تفریحی شہر اورلینڈو سے وسط جنوبی ریاست ٹیکساس کے شہر ہیوسٹن جارہا تھا۔ ایک عجب پرکیف منظر میری آنکھوں کے سامنے پھیلا ہوا تھا، بائیں طرف ناپیدا کنار سمندر اور دائیں طرف خشکی، ساحلی سمندر کے اوپر پرواز کا یہ منظر تادیر جاری رہا اور میں علامہ اقبالؔ کا یہ شعر گنگناتا رہا ؎

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

اسی دوران مجھے وہ مکھی یاد آئی جو میرے کمرے کے ایک گوشے میں مٹی لیپ لیپ کر بل کی طرح بنایا کرتی تھی جب وہ بن جاتی میں اسے کھرچ کر صاف کردیا کرتا لیکن مجھے حیرت اس بات پر ہوا کرتی تھی کہ اتنے بڑے علاقے میں جہاں اتنے مکانات ہیں، پھر میرے مکان میں کئی گوشے ہیں اس مکھی کو کیسے پتہ رہتا ہے کہ میری بل فلاں جگہ ہے۔ معلوم نہیں کہاں سے کتنی دور سے وہ ذرہ بھر نمی اپنے منہ میں لے کر آتی ہے اور سوراخ کی دیواروں پر لگا کر بال سے بھی کم اضافہ کردیتی ہے۔ آخر وہ کونسی حس ہے جو اس کو اتنا صحیح پتہ دیتی ہے۔ اس پرواز کے دوران مجھے یاد آیا کہ میں اپنے مکان سے آدھی دنیا کے فاصلے پر وہ بھی بالکل جنوبی سمندروں پر پرواز کررہا ہوں لیکن اپنے مکان کے متعلق میرے شعور میں کوئی کمی نہیں آئی ہے اور خوب سمجھتا ہوں کہ گھوم گھام کر وہیں واپس پہنچنا ہے۔ چنانچہ کوئی طاقت ہے جو تمام ذی روح کی ان کے معاملات میں رہنمائی کرتی ہے۔

اس واقعہ کے بعد ایسا ہوا کہ جو مجرد خیالات میرے ذہن میں آتے رہے انھیں میں تاریخوار ڈائری میں نوٹ کرنے لگا۔ اگر کوئی خیال اردو میں صادر ہوا تو اس کو ''فکر'' کے عنوان کے تحت قلمبند کیا اور انگریزی میں وارد ہوا تو Thought کے زیر عنوان لکھا۔ اس طرح آنے والے برسوں میں اقوال کے قسم کی کچھ عبارتیں اکٹھا ہوگئیں۔

۱۹۸۴ء میں ہندامریکی تعلقات کے معاملے میں ایک بڑا واقعہ نائب صدر جارج بش کا دورۂ ہندوستان تھا۔ وہ اس سال مئی کے مہینے میں یہاں آئے۔ ۶۰ء کی دہائی کے اواخر بالخصوص بنگلہ دیش کی تحریک وتشکیل کے زمانے میں ہندوستان اور امریکہ کے تعلقات میں کافی تلخی اور کشیدگی آ گئی تھی۔ غالباً صدر ریگن اس صورت حال کو بدلنا چاہتے تھے اس لیے انھوں نے نائب صدر کو ہندوستان کے دورے پر بھیجا۔

تاریخی اور روایتی طور پر امریکہ میں نائب صدر کا کوئی خاص رول نہیں ہوا کرتا تھا لیکن دوسری عالمی جنگ کے دوران صدر روز ویلٹ کی بیماری اور رحلت کے بعد نائب صدر ٹرومین کی اہمیت بڑھ گئی اور عالمی حالات و واقعات نے امریکیوں کو یہ احساس دلا دیا کہ وہ نائب صدارت کے تئیں روایتی غفلت شعاری کا رویہ نہیں اختیار کر سکتے۔ چنانچہ امریکہ میں نائب صدر کا رول بڑھنے لگا اور بین الاقوامی معاملات میں صدور اپنے ذاتی نمائندے کے طور پر ان سے کام لینے لگے۔ کیونکہ امریکہ کے سامنے مسئلہ یہ تھا کہ ایٹمی دور میں امریکہ کی کرسیِ صدارت ایک لمحہ کے لیے بھی خالی نہ رہے اور ملک کی زمامِ اقتدار باشعور اور باخبر قیادت کے ہاتھ میں رہے۔ صدر روز ویلٹ اور پھر صدر کنیڈی کے اچانک منظر سے ہٹ جانے سے اور اس وقت کے عالمی منظر نامے سے امریکیوں نے یہی سبق لیا تھا۔ لیکن نائب صدر بش کے دورۂ ہندوستان کو چند مہینے ہی گزرے تھے کہ ماہ اکتوبر کی آخری تاریخوں میں وزیر اعظم اندرا گاندھی کے محافظوں نے ہی ان کا کام تمام کر دیا اور راجیو گاندھی ان کے جانشین ہوئے۔

دفتری حالات میں ایک نئی بات یہ ہوئی کہ ایک نوجوان اخبار نویس شیکھر نمبیار کا

انگلش ایڈیٹر کے طور پر تقرر ہوا اس سے پہلے کوئی انگلش ایڈیٹر نہیں ہوا کرتا تھا۔ پریس چیف کو ہی انگلش ایڈیٹر تصور کیا جاتا تھا اور وہ دیگر ایڈیٹروں کی مدد سے اس ذمہ داری کو انجام دیا کرتا تھا لیکن میرا مسلسل اصرار تھا کہ ایک انگلش ایڈیٹر ہونا چاہیے کیونکہ اس کی عدم موجودگی میں انگریزی اخباروں سے رابطہ اور وہاں مضامین کی اشاعت وغیرہ کا کام صحیح طور پر نہیں ہو رہا تھا۔ کہتے سنتے ٹونی بھی میری رائے سے متفق ہو گئے اور اس کے لیے امریکی افسروں سے اصرار کرنے لگے۔ بالآخر شیکھر کا انتخاب ہوا۔

لیکن شیکھر کا قیام صرف چار سال کے قریب رہا جو کہ کوئی خوشگوار تجربہ نہ تھا۔ ان کو پینے کی ایسی لت تھی کہ دفتری اوقات میں بھی اس سے باز نہیں رہتے تھے جس کی وجہ سے سب کو کچھ نہ کچھ پریشانی تھی۔ اسی اثناء میں ٹونی کا ٹرانسفر کنٹری آفس میں بطور ایڈوائزر ہو گیا تو شیکھر پریس چیف ہو گئے لیکن اپنی لت سے باز نہیں آئے۔ کچھ عرصہ اور گزرا ہوگا کہ کنٹری آفس میں ڈپٹی ڈائریکٹر مسٹر گرم لینڈ آ گئے۔ ایڈمنسٹریشن انہی کی زیرِ نگرانی تھا۔ وہ شراب نوشی کے سخت مخالف تھے اور سارے دفتر کو سخت تاکید کر دی تھی کہ دفتر میں پینے والوں کے خلاف کارروائی کی جائے۔ چنانچہ دہلی اور بمبئی آفس میں کئی اصحاب اس کارروائی کی زد میں آ گئے۔ اسی اثناء میں ہماری نئی ڈائریکٹر ایک خاتون لنڈا جوٹیل بھی آ گئیں انھیں بھی شیکھر کا رویہ پسند نہ تھا چنانچہ ایک دن سنا گیا کہ شیکھر نے اپنا استعفیٰ پیش کر دیا ہے۔ شیکھر کے پریس چیف ہو جانے کے بعد آرتی اہلووالیہ انگلش ایڈیٹر مقرر ہوئیں جو شادی کے بعد آرتی سنگھ ہو گئیں۔ ۱۹۸۹ء میں شیکھر کے جانے کے بعد وہی پریس چیف ہو گئیں۔

کشمیر یونیورسٹی میں سیمینار:

اگست ۱۹۸۴ء میں کشمیر یونیورسٹی کے اردو ڈیپارٹمنٹ نے جس کے ہیڈ ڈاکٹر شکیل الرحمٰن تھے چار دن کے ایک سیمینار کا اہتمام کیا تھا۔ ان لوگوں نے اس سیمینار میں شرکت کے لیے ایک دعوت نامہ امریکی سفارتخانے کو بھی بھیج دیا تھا کہ وہ اردو کے کسی امریکی اسکالر کو نامزد کریں، وقت بہت کم تھا اس لیے نمائندگی کے لیے مجھے بھیج دیا گیا۔

دراصل یہ بات سمجھنے کی ہے کہ امریکی اسکالروں کی مقامی، ملکی اور بین الاقوامی مصروفیات کے پروگرام بہت پہلے سے طے رہتے ہیں اس لیے انھیں مدعو کرنے کے لیے ضروری ہے کہ انھیں کافی وقت دیا جائے تاکہ وہ اپنے پروگرام درست کرسکیں یا دوسرے پروگراموں میں ردوبدل کرکے وقت نکال سکیں مزید یہ کہ وہ اپنے معاملات میں حکومت یا کسی حکومتی ادارہ مثلاً سفارت خانہ کے اثرات سے بالکل آزاد ہوتے ہیں، خود جو مناسب سمجھتے ہیں کرتے ہیں۔ مذکورہ سمینار میں مجھے کوئی مقالہ نہیں پڑھنا تھا۔ مجھے یوں بھی اپنے سالانہ دورے کے سلسلے میں سری نگر جانا تھا چنانچہ میں یونیورسٹی کے مہمان خانے میں نہیں ٹھہرا بلکہ حسبِ معمول براڈوے ہوٹل میں ٹھہرا تاکہ شہر میں اردو ایڈیٹروں سے ملاقات میں آسانی ہو۔ سیمینار میں اکٹھا ہونے والے کئی ادیبوں اور دانشوروں سے ملاقاتیں ہوئیں۔

ایک اندازہ یہ بھی ہوا کہ ڈاکٹر شکیل الرحمٰن صاحب کافی غیر مقبول تھے، بلکہ قیاس یہ ہے کہ خود ان کے ڈیپارٹمنٹ کے ایک حلقہ نے عدم تعاون کرنے ہی تک بس نہیں کیا بلکہ خلفشار برپا کرنے کی بھی کوشش کی جو کامیاب نہیں ہوسکی۔ آخری اجلاس کے اختتام کے قریب شکیل الرحمٰن صاحب کی آنکھیں سرخ اور نم آلود تھیں۔ میں نے ان سے کہا کہ اب آپ بلاوجہ پریشان ہیں آپ کا سارا کام تو ختم ہوگیا۔ حیرت یہ ہے کہ وہ ایسے مخالفانہ ماحول میں بیس برس تک کیسے اس ڈیپارٹمنٹ میں جمے رہے۔ قیاس یہ ہے کہ وہ کمیونسٹوں اور سوویٹ یونین کے زیر اثر تھے اس لیے ان کے مخالف نظریات رکھنے والے انھیں پسند نہیں کرتے رہے ہوں گے۔ ایک شام گورنر جگموہن صاحب نے تمام شرکائے کانفرنس کو گورنر ہاؤس میں چائے پر مدعو کیا تھا وہاں بھی میں نے یونیورسٹی کے ایک صاحب کو دیکھا کہ وہ فراٹے کے ساتھ گورنر صاحب سے شکیل صاحب کے خلاف باتیں کررہے تھے۔

اردو ایڈیٹروں کی نامزدگی:

۱۹۸۴ء میں مسٹر نوین سوری ایڈیٹر ''ملاپ'' کو میں امریکہ بھیجنے میں کامیاب

ہوگیا۔ یہ کامیابی بھی ٹونی کے تعاون سے حاصل ہوسکی ورنہ اردو اخباروں میں ''ملاپ'' کا کوئی ایسا مقام نہ تھا کہ اس کے ایڈیٹر کو مہمان بنا کر ایک مہینہ کے لیے امریکہ کے دورے پر بھیجا جاتا۔ خود نوین صاحب میں بعض خوبیاں تھیں، وہ امریکیوں سے انگریزی میں بخوبی باتیں کر سکتے تھے، اپنا دفتر سجا کر رکھا تھا جہاں امریکیوں کو بلا سکتے تھے اور ان سے مل سکتے تھے، پبلک ریلشنز میں بھی انھیں اچھی مہارت تھی۔ کون امریکن دیکھتا کہ وہ اردو کیسی لکھتے ہیں اور ان کے اخبار میں مواد کس درجہ کا ہوتا ہے۔ اداریئے عام طور سے امریکی پالیسیوں کی تائید میں ہوتے تھے اس لیے اس طرف سے بھی امریکی بےفکر تھے۔ اگر ''ملاپ'' کے ادارتی کالم میں کوئی بات قابلِ اعتراض ہوتی تو امریکی افسر خود ہی نوین صاحب سے براہِ راست مل کر باتیں کر لیتے۔

مجھے صرف یہ فکر تھی کہ دوسری زبانوں کے ایڈیٹر جاتے ہیں تو اردو زبان کے ایڈیٹروں کو بھی موقع ملنا چاہیے خواہ وہ کوئی ہوں۔ اس راہ میں ایک طرف تو کلکتہ، بمبئی، مدراس کے علاقائی دفاتر کی طرف سے اڑچنیں تھیں کہ وہ اپنی علاقائی زبانوں کے ایڈیٹروں کو آگے بڑھاتے تھے اردو کا نام ہی لینے کو تیار نہ تھے۔ دوسری طرف خود اردو ایڈیٹروں کی بیگانگی یا احساسِ کمتری تھا جس نے انھیں ہمارے دفتر سے بہت دور کر رکھا تھا۔

اگلے برس یعنی ۱۹۸۵ء میں موہن چراغی کو نامزد کرنے اور امریکہ بھیجنے میں کامیاب ہوگیا لیکن یہ کہانی لمبی ہے۔ کسی امیدوار کی نامزدگی اور ردوقدح کے بعد اس کی روانگی تک تقریباً ایک سال کی مدت گزر جاتی ہے۔ میں نے ۱۹۸۴ء میں کسی وقت موہن چراغی کو نامزد کیا ہوگا۔ اس وقت وہ ''قومی آواز'' میں نیوز ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ ''قومی آواز'' دہلی کے اردو اخباروں میں بہر حال ایک نمایاں حیثیت رکھتا تھا اور مجھے اس اخبار میں موہن چراغی کا مستقبل روشن نظر آ رہا تھا۔ دہلی میں اس اخبار کی اشاعت شروع ہونے کے بعد کچھ عرصہ تک اس کے چیف ایڈیٹر عشرت علی صدیقی صاحب دہلی میں قیام پذیر رہے، لکھنؤ واپس جانے کے بعد بھی آتے جاتے رہے۔ ''قومی آواز'' پر ان

کی گرفت کافی سخت اور مضبوط تھی لیکن پتہ نہیں کہ موصوف کو اس بات کا علم تھا یا نہیں کہ دفتر کے اندر کافی بے چینی تھی اور لوگ بالعموم ان کی سخت گیری سے نالاں تھے یہ اور بات ہے کہ پیشے کی شائستگی نے اس حقیقت کو منظرِ عام پر نہیں آنے دیا تاہم اس اخبار کے مختلف ایڈیشنوں میں ہڑتالیں ہوئیں، بمبئی اور پٹنہ ایڈیشن نکلے اور بند ہوئے۔

بہرحال میں نے موہن چراغی کو نامزد کر دیا لیکن اس کے بعد انھیں دہلی سے ہٹا کر نامہ نگار کی حیثیت سے سری نگر بھیج دیا گیا۔ ممکن ہے ''قومی آواز'' کے سری نگر ایڈیشن کی تیاریوں کے سلسلے میں انھیں بھیجا گیا ہو جس کی افواہیں سننے میں آ رہی تھیں۔ ایسے میں میرے لیے مشکلیں پیدا ہو گئیں۔ دفتر کے اندر یہ بحث چھڑ گئی کہ موہن چراغی کا نام رہنے دیا جائے یا خارج کر دیا جائے۔ مجھے اپنے کئی مہینے کی محنت پر پانی پھرتا نظر آ رہا تھا اس لیے کہ اگر وہ نہ جاتے تو وہی فنڈ کسی اور شخص کے لیے استعمال کر لیا جاتا۔ میں اپنی اس بات پر قائم رہا کے موہن چراغی بہرحال ایک ممتاز اخبار نویس ہیں دہلی میں رہیں یا سری نگر میں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا اور اگر قومی آواز کا سری نگر ایڈیشن نکل آیا تو اس کے انچارج وہی ہوں گے مزید یہ کہ قومی آواز دہلی میں بھی ان کے آئندہ امکانات بہتر ہیں۔ میں نے اس بارے میں ٹونی کو ہم خیال بنالیا پھر امریکی بھی میری اس حجت کے قائل ہو گئے۔ اب نئی مشکل یہ درپیش تھی کہ موہن چراغی سے زبانی رضا مندی تو حاصل کی جا چکی تھی لیکن تحریری رضا مندی نہیں مل سکی تھی اور ہم لوگوں کی حجت تکرار میں کافی وقت گزر گیا تھا وقت کم رہ گیا تھا چنانچہ میری تجویز پر میں اور ہمارے ڈپٹی ڈائریکٹر ڈاکٹر جوزف برینگ دونوں سری نگر گئے اور وہاں موہن چراغی سے مل کر ضروری کاغذات پر ان سے دستخط کرائے گئے۔ اس وقت وہ کافی گھبرائے ہوئے لگ رہے تھے، میں بھی تنگ آ گیا تھا۔ بالآخر میں نے ان سے کہا کہ بس آپ ہاں یا نا میں جواب دیں اور ہم لوگ واپس جا رہے ہیں تب انھوں نے اپنی آمادگی کی تحریر دے دی۔

اس کے بعد ضابطوں کے مطابق حکومت ہند کے متعلقہ حکام کو اطلاع دے دی

گئی۔ اس کے بعد وسط اگست موہن چراغی امریکہ کے لیے روانہ ہوئے لیکن اس سے پہلے جولائی کی آخری تاریخوں میں صدیقی صاحب دہلی آئے اور انھوں نے ٹیلیفون پر بڑے درشت لہجے میں مجھ سے گفتگو کی اور کہا کہ وہ امریکی سفیر سے شکایت کرنے والے ہیں۔ میں نے کہا کہ جناب میں نے کوئی غلط کام نہیں کیا ہے سارے کام ضابطوں کے مطابق ہورہے ہیں۔ آپ کو شکایت کرنے کا اختیار ہے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ پہلے مجھ سے اجازت کیوں نہ لی گئی۔ میرا کہنا تھا کہ یہ کام موہن چراغ کا تھا کہ وہ لکھنؤ میں آپ کو مطلع کرتے۔

بات دراصل کچھ اور تھی۔ یا تو صدیقی صاحب کو اس بات کا رنج تھا کہ یہ موقع خود ان کو کیوں نہ دیا گیا جو کہ اردو ایڈیٹروں اور مالکوں کے رویہ کے عین مطابق تھا یا انھیں موہن چراغی کے کمیونسٹ نظریات کا علم تھا اور وہ ہم لوگوں کو لاعلم سمجھ رہے تھے اس لیے برہم تھے اور اس برہمی کے اصل سبب کا اظہار نہیں کررہے تھے۔

موہن چراغی ایک مہینہ امریکہ میں سیر وتفریح کے بعد واپس آئے۔ مجھے تو ان کے سارے پروگراموں کا اور واپسی کا سب پتہ تھا لیکن اس اللہ کے بندے نے دہلی میں اترنے کے بعد اتنا اخلاق بھی نہیں برتا کہ ٹیلیفون پر ہی اپنی آمد کی خبر دے دیتا۔ وہ فوراً سرینگر چلے گئے۔ کچھ عرصہ بعد دہلی آئے تو ایک دن سرِ راہے ملاقات ہوئی تو رسمی علیک سلیک ہوگئی اور بس۔ ادھر صدیقی صاحب خار کھائے بیٹھے تھے۔ اگلے اکتوبر کے مہینے میں میں لکھنؤ گیا تو ان سے ملاقات کے لیے بھی گیا تو انھوں نے مجھ سے سیدھا سوال کیا کہ ''اب آپ میرے کس آدمی کو خریدنے آئے ہیں۔'' میں نے کہا کہ حضرت میں کوئی کمیشن ایجنٹ نہیں ہوں۔ امریکی محکمہ خارجہ کا ملازم ہوں امریکہ اور ہندوستان کی دونوں حکومتوں کے درمیان معاہدوں کے تحت جو کچھ ہوتا ہے وہی کرتا ہوں اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ اس میں کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر صدیقی صاحب کا رویہ مانع نہ ہوتا تو اسی پروگرام کے تحت قومی آواز لکھنؤ کے بعض لائق اور فائق صحافی استفادہ کرسکتے تھے۔ مجھے حیرت ہے کہ

صدیقی صاحب جیسے سینئر صحافی اپنے اندر اتنی وسعتِ نظر کیوں نہیں پیدا کر سکے۔ وہ پروپیگنڈے اور اصلیت، سراب اور حقیقت کے درمیان فرق کو کیوں نہیں محسوس کر سکے۔ انھوں نے یہ کیوں نہیں دیکھا کہ امریکہ سے واپسی کے بعد موہن چراغی نے اپنے اس سفر کے بارے میں ایک لفظ نہیں لکھا نہ ان کے رویہ میں کوئی فرق آیا۔ جبکہ اس کے بعد ہی ماسکو کے چند دنوں کے محدود دورے کے بعد انھوں نے پرسترویکا پر کئی کئی قسطیں لکھ ڈالیں۔

سیاست میں انصاف کی گنجائش نہیں۔ اپنے نظریات ضرور رکھئے۔ ان پر قائم بھی رہیے لیکن صحافتی دیانتداری کو تو ہاتھ سے نہ جانے دیجیے۔ میں آج تک یہ بھی نہیں سمجھ سکا کہ کوئی صحافی بہت کچھ اچھا یا برا خود اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے بعد خاموش کیسے رہ سکتا ہے۔ اگر اس کو برائی ہی نظر آئی تو اس پر اس نے احتجاج کیوں نہ کیا۔ میں اس بات کا شاہد ہوں اور جو لوگ کم سے کم میرے پروگرام کے تحت امریکہ گئے انھیں گواہ بناتا ہوں کہ امریکیوں نے کبھی اپنے ملک کی ستائش میں لکھنے پر اصرار نہیں کیا۔ کئی لوگوں نے خاموشی کو راہ دی اس پر کسی ناپسندیدگی کا اظہار نہیں کیا گیا نہ ان لوگوں سے کوئی مطالبہ کیا گیا۔ اپنے سیکشن میں میں اور ٹونی اس بات پر متفق تھے کے جو اخبار نویس امریکہ پر معترض ہوں صرف اسی بنا پر انھیں دور نہ رکھا جائے بلکہ حالات کو خود اپنی آنکھ سے دیکھ کر کوئی رائے قائم کرنے کا انھیں بھی موقع دیا جائے۔ ہم نے اپنی اس رائے پر حتی المقدور عمل کیا۔

مجھے خوشی ہے کہ موہن چراغی کے متعلق میرے قیاسات درست ثابت ہوئے۔ صدیقی صاحب کی سبکدوشی کے بعد ''قومی آواز'' کی قیادت اور ادارت انہی کے حصہ میں آئی۔ لیکن چراغی صاحب کے معاملے کی وجہ سے طبیعت میں ایک بدمزگی سی پیدا ہوگئی۔ نتیجہ کے طور پر میں نے طے کرلیا کہ اب اس جھنجھٹ میں نہیں پڑوں گا۔ چنانچہ اگلے دو برس کسی کو نامزد نہیں کیا لیکن ۱۹۸۸ء میں سید وقار الدین ایڈیٹر رہنمائے دکن حیدرآباد کو نامزد کردیا اور وہ اسی سال ستمبر کے مہینے میں امریکہ گئے لیکن یہ تجربہ بھی میرے لیے چراغی صاحب کے معاملے سے کم ناخوشگوار نہیں رہا۔ ایک تو ان کے جانے سے پہلے مدراس

آفس نے اڑنگا لگادیا کہ ان کے علاقے کے کسی ایڈیٹر کو نامزد کرنے کا دہلی کو کیا اختیار ہے۔ ایمبسی نے ہمارے دفتر سے جواب طلب کرلیا۔ اس کے جواز میں میری دلیل یہ تھی کہ بحیثیت اردو ایڈیٹر میں ہی ہندوستان بھر کے اردو ایڈیٹروں سے رابطے کا کام انجام دیتا ہوں اس لیے مجھے ان کی نامزدگی کا بھی حق ہے مزید براں ان کے سفر کا سارا خرچ ہمارے آفس کے فنڈ سے ہوگا اس لیے مدراس کے اعتراض کی گنجائش نہیں ہے۔ خدا خدا کر کے یہ مرحلہ طے ہوا تو وقار الدین صاحب کے سفر کے لیے وقت کم رہ گیا تھا سارے ریزرویشنوں میں پریشانی ہوئی۔ واپسی کے بعد وہ سیدھے حیدرآباد چلے گئے اور مکمل خاموشی کو راہ دی۔

دراصل امریکی ایک بات ضرور چاہتے ہیں وہ یہ کہ جو شخص واپس آئے اس سے ملاقات کی جائے یا وہ خود ملاقات کرے اور اس پروگرام کے بارے میں اپنی رائے سے آگاہ کرے، اس کو کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی یا اس کا کوئی خاص مشورہ بھی ہے۔ مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس پروگرام کو بہتر اور مفید تر بنایا جاسکے اگر خامیاں علم میں آئیں تو ان کی اصلاح کی تدبیریں کی جائیں بہرحال میں نے اس تجربہ کے بعد پھر خاموشی اختیار کرلی۔

دراصل میں چاہتا تھا کہ ہمارے اردو ایڈیٹر زیادہ سے زیادہ باہر کی دنیا کو دیکھیں۔ اخبار میں پڑھنا اور ٹی وی میں دیکھنا اور بات ہے خود مشاہدے کی بات اور ہے اس کا یہ اچھا موقع تھا لیکن اس میں مجھے اتنی مشکلیں پیش آئیں کہ میں تنگ آ گیا اور پھر میرا ریٹائرمنٹ بھی آ گیا لیکن اس سے پہلے میں نے دہلی، بمبئی اور کلکتہ میں اردو صحافیوں کو امریکیوں سے متعارف کرادیا تھا تاکہ میرے بعد جو بھی ہو اس کو ان کی نامزدگی میں کچھ آسانی ہو۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور ان تینوں شہروں کے اردو صحافی یکے بعد دیگرے گئے۔

۱۹۸۵ء تا ۱۹۸۷ء تقریباً تین سال کا عرصہ ایک طرح معمولات کے مطابق گزرا۔ جنگ افغانستان اپنے شباب پر تھی اس لیے میری زیادہ تر توجہ اسی محاذ پر رہی۔ روسیوں کی جارحیت اور افغان مجاہدین کی کارگزاریوں کی بہرحال پبلسٹی کی جارہی تھی۔ اس

کارگزاری پر مجھے ۱۹۸۷ء میں ایک ایوارڈ معہ نقد انعام اور توصیفی سند کے ملا۔ دو تین سال پہلے بھی بہتر کارکردگی پر مجھے اسی طرح کا ایک ایوارڈ مل چکا تھا۔ دراصل اس کا کریڈٹ مجھ سے زیادہ اردو اخبارات کو جاتا ہے جو جنگِ افغانستان کی خبروں کو چھاپ رہے تھے۔

اپریل ۱۹۸۶ء میں امریکہ نے اچانک لیبیا پر حملہ کردیا۔ اس واقعہ کی وجہ سے اخباروں میں تھوڑی بہت تحریک ہوئی، کچھ امریکہ مخالف مظاہرے وغیرہ بھی ہوئے لیکن لوگ جلد ہی اس واقعہ کو بھول گئے۔ اسی دو تین سال کے عرصہ کے دوران دفتر میں کچھ داخلی تغیرات ہوتے رہے۔

خانگی محاذ بھی اس اثناء میں تقریباً معمول کے مطابق رہا اور ایک ذاتی مکان کی تعمیر کے سلسلے میں ابتدائی کارروائیاں ہوتی رہیں جیسے کے رقم کی فراہمی اور نقشہ وغیرہ بنوانا ۱۹۸۷ء کے آخری ماہ دسمبر میں ہم لوگ ایک محرومی سے دوچار ہوئے۔ میرے بہنوئی شاہ محمد امین الدین صاحب رحلت کر گئے۔ انھوں نے میری ابتدائی زندگی اور تشکیلی دور میں ہر طرح کی مدد کی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کے عملی تعاون کے بغیر میں برسہا برس شب و روز ڈیوٹی نہیں کرسکتا تھا۔ ان کے انتقال کے بعد بڑی بہن کی کفالت بھی ہم پر فرض ہوگئی۔

افغان رفیوجی کیمپ کا دورہ:

اسی ۱۹۸۷ء کے اواخر کی بات ہے میں نے ایک روز اپنے ڈائریکٹر سے گفتگو کے دوران کہا کہ افغانستان کے محاذ پر جنگ کی خبریں تو بالواسطہ ذرائع سے موصول ہوتی ہیں مثلاً ان رضا کاروں اور ڈاکٹروں کی معرفت جو کسی طرح وہاں تک پہنچنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ یہ خبریں بھی بہت تاخیر سے ملتی ہیں لیکن محاذ جنگ کے پیچھے کیا ہورہا ہے اور جنگ پر اس کا کیا اثر پڑ رہا ہے اس کا ہمیں کوئی علم نہیں اور یہ سب کچھ پاکستان کی حدوں کے اندر ہورہا ہے جہاں ہندوستانی نامہ نگار نہیں ہیں۔ یہ سنتے ہی مسٹر بیری جیکب نے جو اس وقت ڈائریکٹر تھے مجھ سے کہا کہ تم خود ہی کیوں نہیں جاتے۔ جا کر خود دیکھو اور لکھو۔ میں خاموش ہوگیا لیکن وہ اس بات کو نہیں بھولے دو چار دن بعد انھوں نے قطعی حکم صادر

کر دیا کہ تم پیشاور جاؤ اور حالات کا مشاہدہ کرو۔ میں نے دو شرطیں رکھیں ایک تو یہ کہ مجھے پاکستان کے لیے جو ویزا دلوایا جائے وہ ایسا ہو کہ مجھے پولیس رپورٹنگ سے مستثنیٰ رکھا جائے کیونکہ اصولاً اس طرح کی رپورٹنگ کو میں ایک غیر مہذب لازمہ سمجھتا ہوں۔ ایک عام شہری کو مجرم نہیں فرض کیا جاسکتا کہ وہ پولیس کے کھاتے میں اپنی آمد اور روانگی درج کرائے۔ یہ ایک توہین آمیز لازمہ ہے اور سچ یہ ہے کہ اسی اصولی اختلاف کی بنا پر میں کبھی پاکستان نہیں گیا تھا۔ میری دوسری شرط یہ تھی کہ حالات جیسے کے میرے مشاہدہ میں آئیں گے میں ویسا ہی لکھوں گا خواہ کسی پالیسی سے اس کی مناسبت ہو یا نہ ہو اور یہ کہ میں جو کچھ لکھوں گا اپنے نام سے لکھوں گا تاکہ اپنی تحریر کی ذمہ داری کو محسوس اور تسلیم کروں۔ موصوف نے میری باتیں غور سے سنیں اور مکمل اتفاق کیا۔ اس کے بعد میری سفری تیاریاں شروع ہوگئیں۔ میں ۲۱ر جنوری ۱۹۸۸ء کو براہِ لاہور اور اسلام آباد، پشاور کے لیے روانہ ہوا اور وہاں سے کراچی ہوتا ہوا ۴ر فروری کو واپس آیا۔ اس سفر کی تفصیلات آئندہ آئیں گی۔

اپریل کے مہینے میں بیری جیکب صاحب واشنگٹن چلے گئے اور ان کی جگہ مادام لنڈا جوٹیل ڈائریکٹر کی حیثیت سے تشریف لائیں جو فروری ۱۹۹۲ء میں میرے ریٹائرمنٹ تک رہیں اس کے بعد مئی میں وہ بھی واپس چلی گئیں۔ میں نے پیشاور سے واپسی کے بعد کوئی ایک درجن مضامین لکھے جو ہندوستان کے مختلف شہروں کے ممتاز اردو اخباروں میں شائع ہوئے۔ ان مضامین کے ساتھ میں نے وہ تصویریں بھی لگائیں جو وہاں سے ساتھ لایا تھا۔

اُس وقت افغانستان میں جنگ کا نواں سال چل رہا تھا اور کوئی نہیں سمجھتا تھا کہ یہ جنگ جلد ختم ہونے والی ہے۔ تقریباً تیس لاکھ افغان پناہ گزیں پاکستان میں پھیلے ہوئے تھے جن کی بہت بڑی اکثریت پیشاور کے اطراف میں واقع رفیوجی کیمپوں میں قیام پذیر تھی۔ پیشاور اور اطراف میں تقریباً پچاس ہسپتال تھے جو جنگ زدہ علاقوں سے آنے والے زخمیوں اور بیمار پناہ گزینوں کا علاج معالجہ کر رہے تھے۔ عرب ممالک کی امداد سے یہ ہسپتال اور افغان رفیوجیوں کے بچوں کی تعلیم کے لیے تعلیم گاہیں چل رہی تھیں۔ اطلاعات کی فراہمی کے لیے

امریکی امداد سے ایک افغان میڈیا ریسورس سنٹر پیشاور میں قائم کر دیا گیا تھا۔ کابل یونیورسٹی کے ایک پروفیسر اور کابل ریڈیو کے ایک سابق ڈائریکٹر اس مرکز کو چلا رہے تھے ان کی مدد کے لیے امریکی یونیورسٹی کے ماہرین بھی موجود تھے۔ وہاں تعلیم یافتہ افغان نوجوانوں کو فوٹو گرافی، ویڈیو میکنگ، رپورٹنگ اور جملہ صحافتی امور کی تربیت دی جارہی تھی۔ وہ مجاہدین کے ساتھ محاذوں پر جا کر خبریں اور تصویریں لاتے اور دنیا بھر کے وسائل ابلاغ کو فراہم کرتے۔

میں نے اپنے مضامین میں یہ بات واضح کی کہ افغان میڈیا ری سورس سینٹر جنگ میں روسیوں کے خلاف ایک کارگر حربے کے طور پر کام کر رہا ہے کیونکہ وہ جنگ افغانسان کے سنگین حقائق سے دنیا کو آگاہ کرنے کا اہم اور مشکل کام انجام دے رہا ہے۔ میں نے اپنے مضامین میں اس حقیقت کی طرف بھی توجہ دلائی کہ اگر تیس لاکھ افغان رفیوجیوں میں سے ایک لاکھ بھی ایندھن اور رہائشی تعمیرات کے لیے لکڑیاں کاٹنے پر لگے ہوں اور برسوں سے یہ کام کر رہے ہوں تو کس قدر نباتات صاف کر چکے ہوں گے اور اس کی وجہ سے پیدا ہونے والے ماحولیاتی عدم توازن سے ہندوستان کا بھی متاثر ہونا ناگزیر ہے اس لیے حقیقت پسندی کا تقاضا یہ تھا کہ ہندوستان اپنے اثر و رسوخ سے کام لے کر روسیوں کو اس جنگ سے باز رہنے اور افغانستان سے واپس جانے پر راضی کرتا۔

بہرحال جب میں دورۂ پاکستان اور اس کے بعد کی تحریری مصروفیات سے فارغ ہوا تو مسٹر بیری جیکب کی رخصتی کا وقت آ گیا۔ ان کی روانگی کے تین چار ماہ بعد نئی ڈائرکٹر لنڈا جوٹیل نے چارج لیا۔ دریں اثناء ڈپٹی ڈائریکٹر ڈائن سلبری ہماری انچارج رہیں جو انتہائی شریف، نفاست پسند اور نازک طبع خاتون تھیں اور بڑی جہاندیدہ بھی۔ وہ اسکینڈی نیویا اور چین میں بھی رہ چکی تھیں اس لیے مشرق و مغرب کو خوب دیکھے بھالے ہوئی تھیں۔ آگے چل کر ان کی اور لنڈا جوٹیل کی جوڑی کے ساتھ جو تین چار سال کام کے گزرے اسے میں اپنے عہد ملازمت کے سنہرے دور سے تعبیر کرتا ہوں، اتفاق سے یہی میری ملازمت کا آخری دور بھی تھا۔

ڈائن سیلسبری: تین چار مہینے صبح کی ایڈیٹوریل میٹنگ ڈائن کے ساتھ ہوتی رہی۔ اس وقت ہم لوگ دنیا کے کسی موضوع پر بھی گفتگو کر سکتے تھے۔ کبھی کبھی ڈائن اپنے دلچسپ تجربات و مشاہدات سے ہم لوگوں کی معلومات میں اضافہ کرتیں۔ وہ کلچرل پروگراموں کی انچارج تھیں۔ مجھے ان کے کئی پروگراموں میں شرکت کا موقع ملا جن میں سے دو پروگرام سری نگر کے سنتور ہوٹل میں ہوئے تھے۔ ایک تو ہندوستانی قانون دانوں کی کانفرنس تھی دوسرا ایک امریکی موسیقار کا پروگرام تھا جو مغربی موسیقی کے ساتھ اردو غزلیں بھی سناتا تھا۔ اس نے علی گڑھ میں اردو سیکھی تھی، وہیں اس کو اس زبان کا ذوق پیدا ہوا اور پروان چڑھا تھا۔

دسمبر ۱۹۸۹ء میں ایک دن ڈائن نے فرمائش کی کہ میں نے سنا ہے نظام الدین درگاہ میں جمعرات کو کسی خاص موسیقی کا اہتمام ہوتا ہے (ان کی غرض قوالی سے تھی) میں دیکھنا چاہتی ہوں۔ میرے لیے یہ بڑی آزمائش تھی۔ ڈائن خوش قامت سرخ و سفید پرکشش خاتون تھیں، ان کے ڈھیر سارے سنہرے بالوں کا ایک چھپر سا ان کے سر پر بنا رہتا تھا جو ان کی کشش میں اضافے کا موجب تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ وہ جہاں جائیں گی تماشائیوں کے لیے دعوتِ نظارہ لے جائیں گی۔ دوسری طرف مجھے درگاہ تک گزرگاہ کی کیفیت سے پریشانی تھی۔ یوں تو دنیا بھر کے سیاح آتے جاتے رہتے ہیں اور درگاہ کے اطراف کے پراگندہ اور کثیف ماحول کے متعلق جو رائے بھی چاہیں قائم کریں اس سے کسی کو سروکار نہیں مسلمان تو یوں بھی اپنے رہائشی علاقوں اور ماحول کی گندگی کے لیے مشہور ہیں۔ لیکن مجھے ایک خاتون سفارتی افسر کو لے جانے کا مسئلہ درپیش تھا وہ بھی ایسی افسر جس کی ماتحتی میں میں کام کر رہا تھا۔

اس چپقلش سے نبرد آزما ہونے کے لیے میں نے ڈاکٹر نثار احمد فاروقی صاحب سے رجوع کیا، انھوں نے میری یہ مشکل واقعی آسان کر دی۔ انھوں نے پیر ضامن نظامی صاحب سے رابطہ قائم کیا۔ ان سے میرا تعارف کرا دیا اور مقصد بھی بیان کر دیا پھر میں نے

وہاں جا کر محترمہ کی آمد کا دن اور وقت وغیرہ طے کیا اور اس عقبی راستے کو بھی دیکھا جس طرف سے وی آئی پی حضرات کی گاڑیاں درگاہ کے بہت قریب تک جاسکتی ہیں۔ اس پروگرام کے مطابق میں ڈائن کو لے کر گیا۔ وہاں نظامی صاحب کی طرف سے ان کا خیر مقدم کیا گیا، چائے ناشتے سے ضیافت بھی ہوئی اس کے بعد ایک داخلی راستے سے ڈائن کو درگاہ تک لے جایا گیا جہاں وہ بیرونی دیواروں میں سنگ مرمر کی جالیوں کو بڑی پسندیدگی سے دیکھتی رہیں اس کے ڈیزائن کی کچھ نقل اتارنے کی بھی کوشش کی دریں اثناء ان کا ذہن اس قوالی کی طرف بھی رہا ہوگا جو درگاہ کے صحن میں جاری تھا جو ڈائن کی فہم سے یقیناً بالاتر تھی۔ وہ بہت خوش خوش واپس آئیں۔ کچھ عرصہ بعد جب وہ امریکہ واپس جانے لگیں تو مجھ سے کہا کہ رضوان میں تمہیں درگاہ کے حوالے سے یاد رکھوں گی۔ اس زیارت کو وہ ایک اہم واقعہ سمجھتی تھیں۔ وہ ۱۹۹۰ء میں واپس چ لی گئیں۔

تعمیر مکان:

۱۹۸۸ء کا آغاز ہی بڑی مصروفیات کے ساتھ ہوا جو دفتری اور خانگی دونوں محاذوں پر ایک عرصہ تک جاری رہیں۔ اگست میں آرتی اہلووالیہ کا بحیثیت انگلش ایڈیٹر تقرر ہوا جو شادی کے بعد آرتی سنگھ ہوگئیں اور اگلے برس شیکھر کے مستعفی ہوجانے کے بعد وہی پریس چیف ہوئیں۔ ستمبر میں لنڈا جوٹیل نے ہماری ڈائریکٹر کی حیثیت سے ذمہ داریاں سنبھالیں۔

اس سال جولائی میں میں نے اللہ کا نام لے کر اس مکان کی تعمیر کی ابتدا کی جس کی منصوبہ بندی میں میں گزشتہ سال سے مصروف تھا۔ بارش کی کثرت اور شدت کی وجہ سے اس تعمیر کے ابتدائی مراحل میں خاصی دشواری پیش آئی، جوں جوں تعمیری مراحل طے ہوتے گئے مالی مشکلات سامنے آتی گئیں نتیجہ کے طور پر اس مختصر سے مکان کی تعمیر پر تقریباً ڈیڑھ سال کی مدت کھنچ گئی۔ قصہ یوں تھا کہ میرے پاس کوئی بڑی رقم نہیں تھی اور پیسے کے حساب کتاب کے معاملے میں میں ہمیشہ بودا رہا، امریکن ایمبیسی کے ملازمین کی ایک

سوسائٹی تھی وہ بھی رجسٹرڈ نہ تھی اس لیے اس کی حیثیت قانونی نہ تھی، میں اس کا ممبر تھا، اس ادارے سے بیک وقت زیادہ سے زیادہ ساٹھ ہزار روپیہ کا قرضہ مل سکتا تھا جو کہ فوراً ہی تنخواہ سے وضع ہونا شروع ہوجاتا تھا گویا اس قرضے کے بعد تنخواہ بھی کم ہوجاتی تھی۔ اس قرضے کی تین چوتھائی رقم ادا ہوجانے کے بعد دوسرا قرض لیا جاسکتا تھا۔ درمیان میں ایک ماہ کی تنخواہ کے برابر چھوٹے موٹے قرض لینے کی سہولت بھی تھی غرض یہ کہ انہی قرضوں کو جوڑ گھٹا کر مکان کی تعمیر کا کام جاری رکھا۔ ۲؍نومبر ۱۹۸۹ء کو ہم لوگ اس نئے مکان میں منتقل ہوگئے لیکن اس تعمیر کے سلسلے کے قرضے مئی ۱۹۹۱ء تک ادا کرتے رہے۔

مکان کی تعمیر شروع کرنے کے دو تین ماہ بعد ہی اکتوبر ۱۹۸۸ء میں ایک نئی پریشانی سے دوچار ہوا یعنی میری بیوی سخت علیل ہوگئیں اور انھیں ہولی فیملی ہسپتال میں داخل کرنا پڑا۔ وہاں ایک بڑے آپریشن کے بعد ان کی صحت یابی میں کافی عرصہ لگا لیکن شکر ہے کہ ان کی صحت بحال ہوگئی۔ اس آپریشن کے موقع پر خون کی ضرورت ہوئی۔ مشکل یہ ہے کہ ہولی فیملی ہسپتال والے باہر سے لیا ہوا خون تسلیم نہیں کرتے، کسی عزیز کے خون دینے پر اصرار کرتے ہیں۔ اصولاً یہ بڑی اچھی بات ہے لیکن ہنگامی حالات میں کسی مبتلائے آزار کے تیمار داروں کے لیے بہت بڑا مسئلہ پیدا ہوجاتا ہے۔ میں بھی اس صورت حال سے دوچار ہوا لیکن ہمارے عزیزوں نے بروقت مدد کرکے مجھے اس مشکل سے نجات دلائی، جس کے لیے ہم میاں بیوی دونوں ان لوگوں کے بے حد ممنون ہیں۔

ریٹائرمنٹ کا سوال:

۱۹۸۹ء آنے پر یہ سوال بھی سامنے آیا کہ میرا ریٹائرمنٹ ۵۸ سال میں ہوگا یا ۶۰ سال میں۔ اس سال جولائی میں میری عمر ۵۸ برس ہونے والی تھی لیکن اس وقت میری باضابطہ ملازمت کی مدت ۱۸ برس یعنی ۲۰ برس سے کم ہوتی۔ ضابطوں کے مطابق پنشن کے لیے بیس برس کی باضابطہ ملازمت یا اس سے کم ہونے کی صورت میں ۶۲ سال عمر کی شرط تھی یعنی اگر میں ۵۸ سال برس کی عمر میں ریٹائر ہوجاتا تو پنشن کے لیے چار برس انتظار

کرنا پڑتا پھر ۶۲ برس کی عمر کو پہنچے کے بعد پنشن جاری ہوتی۔ یہ صورت حال پریشان کن تھی۔ میں نے اپنی نو وارد ڈائرکٹر لنڈا جوئیل کے سامنے یہ مسئلہ رکھا۔ انھوں نے ایکزیکیوٹیو آفس سے صلاح ومشورہ کیا ہوگا۔ نتیجہ کے طور پر طے پایا کہ مجھے ملازمت کی مدت ۲۰ سال پوری کرنے کا موقع دیا جائے جو کہ فروری ۱۹۹۲ء میں پوری ہوتی اور اس وقت میری عمر ۶۰ برس سے بھی آٹھ مہینے تجاوز کر جاتی۔ اس فیصلے سے مجھے ایک گونہ اطمینان ہوگیا۔ میرے حق میں لنڈا جوئیل کی یہ پہلی ہمدردانہ کارروائی تھی۔ اس کے بعد میرے ریٹائرمنٹ تک جبکہ ان کی امریکی واپسی بھی قریب آ گئی تھی ان کا رویہ نہایت مہربانی اور احترام کا رہا۔

میرا ٹی وی پروگرام:

جیسا کہ بیان کر چکا ہوں اس سال کا بڑا حصہ مکان کی تعمیر کے سلسلے کی پریشانیوں میں گزرا اور کہیں نومبر میں جا کر ہم لوگ نئے مکان میں منتقل ہو سکے۔ اس سال کے چلتے چلاتے وسط دسمبر میں ایک دلچسپ واقعہ یہ پیش آیا کہ دور درشن کے اردو کرتا دھرتا نے اردو صحافت پر ایک گفتگو کا پروگرام رکھا جسے م.افضل صاحب نے کمپئر کیا اور ظفیر الحسن صاحب شریکِ گفتگو تھے۔ اس پروگرام کے آخر میں میں نے ایک انکشاف یہ کیا کہ عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد کا جرنلزم ڈیپارٹمنٹ عنقریب اردو صحافت کا کورس بھی شروع کرنے والا ہے۔ میں نے یہ بات وثوق کے ساتھ کہی تھی کیوں کہ اس شعبہ کے صدر پروفیسر عبدالرحیم صاحب نے چند ماہ قبل حیدرآباد میں ایک ملاقات کے دوران خود مجھے یہ بات بتائی تھی۔

اگلے دن خبر ایجنسیوں نے اس اطلاع کو خبر بنا دیا۔ حیدرآباد میں اس خبر کے چھپتے ہی ہندی طلبہ نے جرنلزم ڈیپارٹمنٹ پر دھاوا بول دیا اور مطالبہ کیا کہ ہندی صحافت کا کورس بھی شروع کیا جائے۔ انھوں نے ڈیپارٹمنٹ میں گھس کر توڑ پھوڑ بھی کی۔ بظاہر تو یہ مظاہرہ ہندی صحافتی کورس کے لیے تھا لیکن دراصل یہ اردو کے ممکنہ کورس کے خلاف برہمی کا اظہار تھا۔ اس خبر سے مجھے بڑا افسوس ہوا اور ندامت بھی کہ ڈاکٹر عبدالرحیم صاحب کیا خیال کریں گے۔ میں پھر حیدرآباد گیا اور موصوف سے ملاقات کر کے معذرت کی کہ

میرے وہم و گمان میں بھی اس طرح کے مظاہرے نہیں آ سکتے تھے لیکن ان کی عالی ظرفی تھی کہ انھوں نے مجھے ہر طرح اطمینان دلایا کہ آپ نے جو کچھ کہا بالکل درست کہا، اس میں آپ کی کوئی غلطی نہیں، ان کی اس بات سے میرا خفت کا احساس کم ہوا۔

جملہ حالات میں ایک خوشگوار اعتدال کے ساتھ ہم ۱۹۸۹ء گزار کر ۱۹۹۰ء میں داخل ہوئے لیکن یہی سال بعض اہم واقعات کے نمودار ہونے کا سال بھی ثابت ہوا۔ اپریل ۱۹۹۰ء میں سری نگر میں پروفیسر مشیر الحق صاحب، وائس چانسلر کشمیر یونیورسٹی کی ہلاکت کا دلخراش واقعہ پیش آیا۔ مارچ کے مہینے میں ان کی سری نگر روانگی سے چند روز قبل دہلی میں ان سے ملاقات ہوئی تھی تو میں نے ان سے پوچھا کہ کشمیر کے جو حالات سننے میں آ رہے ہیں کیا یونیورسٹی سے ان واقعات کا کوئی تعلق نہیں؟ اس پر انھوں نے کہا کہ نہیں، اکاڈیمک سرگرمیاں جاری ہیں۔ اگلے ہی مہینے ان کے اس پر اعتماد بیان کی ناقابل تردید نفی ہوگئی۔

اسی سال مئی میں میری چوتھی بیٹی زبیدہ کی شادی ہوئی۔ ہمارے خاندان اور گھرانے کی یہ پہلی تقریب تھی جو میرے آبائی وطن سے باہر دہلی میں ہوئی۔ دوری کی وجہ سے محض معدودے چند اعزہ اس تقریب میں شریک ہوسکے، ہمارے بچے کھچے بزرگوں میں سے کوئی بھی شریک نہ ہوسکا۔ وقت کی کمی اور دہلی میں کسی تقریب کا مجھے تو تجربہ نہ ہونے کی وجہ سے اور سمجھدار معاونوں کی کمی کی وجہ سے بھی یہ تقریب کچھ اس طرح انجام پائی کہ مسرت افزا نہ ہوسکی۔

جنگ عراق:

اگست کا مہینہ آتے آتے بین الاقوامی محاذ پر ایک بڑا ناخوشگوار واقعہ رونما ہوا جس میں رفتہ رفتہ امریکہ براہِ راست ملوث ہوگیا۔ ماہ اگست کے اوائل میں عراقی افواج نے پڑوسی ملک کویت پر چڑھائی کردی اور اپنے ۱۹ویں صوبہ کی حیثیت سے اس کو ضم کرنے کا اعلان کردیا۔ اس واقعہ کے خلاف عالمی رائے عامہ بیدار ہوئی اور رفتہ رفتہ عراق کے خلاف ایک عالمی محاذ بننے لگا۔ جھگڑا تو سارا کویت کے تیل کی دولت کی وجہ سے تھا

لیکن اس نے ایک مکمل جنگ کی صورت اختیار کر لی جو کہ تاریخ کا حصہ بن چکی ہے اس کی تفصیلات میں جانے کی چنداں ضرورت نہیں۔ امریکہ نے اس واقعہ سے دلچسپی لی یہاں تک کہ سال ۱۹۹۱ء کے آتے آتے وہ براہِ راست ایک حریف بن گیا گو اس کے سامنے اقوامِ متحدہ کی ٹٹی کھڑی تھی۔ فروری ۱۹۹۱ء میں اتحادی افواج نے بہ الفاظ دیگر امریکی افواج نے عراق پر باقاعدہ حملہ کر دیا جس کے بعد چند دنوں کے اندر ہی جنگ کا فیصلہ ہو گیا۔ عراق کو کویت خالی کرنا پڑا اور اختتام جنگ کے بعد بھی اس کو سخت بین الاقوامی پابندیوں کا سامنا کرنا پڑا۔

اس جنگ کی وجہ سے میں ایک عرصہ تک سخت ذہنی دباؤ کی حالت میں کام کرتا رہا۔ وجہ ظاہر ہے۔ سارا اردو پریس عراق اور کویت کی جنگ میں امریکی مداخلت کا سخت مخالف تھا۔ اس کیفیت سے بس دو تین اخبارات مستثنیٰ تھے جو واقعات کو غیر جذباتی طور پر دیکھ رہے تھے۔ اتنی بات صاف ہے کہ میرے سامنے جو مواد خبروں یا تبصروں کی شکل میں آ رہا تھا وہ براہِ راست امریکی وسائل سے آ رہا تھا اور امریکی زاویہ نگاہ کی ترجمانی کرتا تھا۔ میرا پیشہ ورانہ فرض تھا کہ میں اسی نظریہ کو اردو اخبارات تک پہنچاؤں۔ یہ بڑا دشوار کام تھا۔ ہر قدم پر تحریری اور زبانی مزاحمتوں کا سامنا تھا۔ لیکن میری پریشانی کا اصل سبب کچھ اور تھا۔ وہ میرا صحافتی ضمیر تھا جو دونوں طرف کی کشاکش میں مبتلا ہونے کے باوجود صداقت کی تلاش اور تجسس میں سرگرداں تھا۔ اسی لیے کویت یا سعودی عرب یا امارات سے آنے والا جو شخص بھی ملتا میں اس سے بہت سارے سوالات کر کے صرف یہ معلوم کرنا چاہتا کہ کویت پر عراقی حملہ کے جواز کے بارے میں مقامی لوگوں کی کیا رائے ہے اور کیا وہ لوگ واقعی سمجھتے تھے کہ اگر کویت میں عراقی پیش قدمی کو نہ روکا گیا تو کیا وہ سعودی عرب پر بھی فوج کشی کر دے گا۔ کئی اصحاب نے اس خیال سے اتفاق کیا جن میں سے ایک صاحب پرانی دہلی کے رہنے والے تھے اور کویت میں ۲۷ برس قیام کے بعد ہندوستان واپس آنے ہی والے تھے کہ روانگی سے ایک دن پہلے عراق نے حملہ کر دیا، وہ معہ اہل وعیال پھنس گئے،

بدقت تمام سعودی عرب ہوتے ہوئے ہندوستان واپس آئے۔

کویت میں شعلہ بداماں تیل کے کنوؤں سے بلند ہونے والے دھوئیں نے ساری فضا کو تاریک کر دیا تھا اس اندھیرے میں حقیقتیں گم ہوگئی تھیں۔ ہر طرف نعروں کے شور میں کسی صداقت کا کانوں تک پہنچنا محال تھا۔ ایسے میں بند کمروں میں بیٹھ کر صرف منطقی گھوڑے دوڑائے جاسکتے تھے، میں یہی کچھ کر رہا تھا اور حیرانی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آتا تھا۔ ایک چھوٹے سے پڑوسی ملک پر حملہ اور اس کی تاراجی کا صلاح الدین ایوبی کی فتوحات سے موازنہ میری سمجھ سے باہر تھا۔ ایک خوشحال ملک اور اس کے باشندوں کی تباہی، وہاں قدرتی وسائل کی بربادی، تیل کی کنوؤں میں آتشزنی اور نتیجے کے طور پر سارے ماحول کی زہر آلودگی، کویت میں برسرکار ہزاروں ہندوستانیوں کی بیروزگاری اور سراسیمگی، ان تمام باتوں کے اسباب اور دوسری بے مقصد جنگ سمجھ سے باہر تھیں۔

بے مقصد جنگ:

ایران اور عراق کے درمیان ایک بے مقصد جنگ آٹھ برس تک جاری رہی تھی جس میں دونوں طرف لاکھوں مسلمانوں کی جانیں ضائع ہوئیں، قومی دولت تلف ہوئی اور یہ سب ایسے میں ہوا کہ جب دونوں طرف خونریز انقلابات اپنی پوری پوری قیمت وصول کر چکے تھے۔ اگر ان دونوں پڑوسیوں کی جنگ صداقت پر مبنی تھی تو عراق نے یکطرفہ پسپائی کیوں اختیار کی؟ اس نے مفتوحہ علاقے کیوں واپس کیے؟ ایران اور عراق دونوں ماضی میں معاہدہ بغداد کے اراکین کی حیثیت سے بھاری مقدار میں امریکی اسلحہ حاصل کر چکے تھے۔ ان کی باہمی جنگ میں وہ اسلحہ تلف ہوئے، ان دونوں کی تیل کی دولت ضائع ہوئی، ان کی انفرادی اور اجتماعی طاقت ٹوٹی۔ آخر دونوں طرف کے سیاست دانوں اور اربابِ اقتدار نے ان حقیقتوں کو سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کی؟ ان کے سامنے بہرحال دو عالمی لڑائیوں کے نتائج تھے اور اسباب بھی۔ وہ اس حقیقت کو کیوں نہیں سمجھ سکے کہ بڑے پڑوسیوں کے ذریعہ چھوٹے پڑوسیوں کو ہڑپ کرنے یا زبردستی سرحدیں بدل دینے کا زمانہ

چلا گیا خصوصاً ایسے علاقوں میں جہاں بڑی طاقتوں کے مفادات وابستہ ہوں۔ تف ہے اس عقل و دانش پر! صرف انا کی خاطر پوری قوم کو ملیا میٹ کر دینے کی سیاست میری سمجھ سے باہر تھی۔ ہمارے اخبارات اپنی منفعتوں اور مصلحتوں کے پیشِ نظر ایک جذبات انگیز راگ الاپے جا رہے تھے۔ اس غیر مخلصانہ اور خود غرضانہ صحافت کے اسباب تو معلوم تھے جو سخت تکلیف دہ تھے لیکن ان کا اظہار نہ صرف مشکل بلکہ بے معنی بھی تھا۔ ایک مدت اسی ذہنی کوفت اور دباؤ میں گزر گئی۔ اگر میں بھی یکطرفہ ہرزہ سرائیاں کر سکتا تو شاید اس ذہنی عذاب میں نہ مبتلا ہوتا۔

ایران اور عراق کی جنگ میں اور عراق اور کویت کی جنگ میں مسلم اقوام اور بے قصور عوام کے جانی اور مالی اتلافات سے ایک فطری تکلیف تو تھی ہی ایک بہت بڑا روحانی کرب بھی تھا کیونکہ جس سرزمین کا اور جن مقامات کا تقدس بچپن سے ذہن میں راسخ تھا جن کے نام آتے ہی جبینِ عقیدت جھک جاتی تھی ان کی بے حرمتی، ان کے تقدس کی پامالی اور وہاں آتش بازی اور خوں ریزی کی خبریں بڑی جانکاہ تھیں۔ یہ سب کچھ مسلم اقوام نے خود اپنے ہاتھوں کیا۔

سویٹ یونین کا خاتمہ:

حیرت ہے اور سخت حیرت ہے کہ تاریخ ایک بہت بڑے وقوعہ کی طرف بڑھ رہی تھی اور علاقائی آویزشوں کے تماشائیوں کا اس طرف دھیان ہی نہ تھا۔ میری مراد سویٹ یونین کی شکست و ریخت سے ہے۔ وہ ایک عرصہ سے داخلی خلفشار میں مبتلا تھا۔ عالمی محاذ آرائی اور خلائی دوڑ نے اس کی اقتصادیات کی جڑیں کھوکھلی کر دی تھیں، رہی سہی کسر افغانستان میں اس کی مہم جوئی اور نو برس کی جنگ نے پوری کر دی۔ اگر وہ ٹوٹنے کے قریب نہ ہوتا تو ممکن ہے کویت پر عراق کی مسلط کی ہوئی جنگ کا انجام کچھ مختلف ہوتا۔ حیرت ہے کہ عراق کے اربابِ اقتدار نے اپنے منصوبوں میں ان آثار کو کیوں نہ ملحوظ رکھا جو بالکل قریب تھے اور صاف نظر آ رہے تھے۔

دیوار برلن ۱۹۸۹ء میں ٹوٹ کر بکھر چکی تھی، متحدہ جرمنی ایک قابلِ ذکر طاقت کے طور پر یورپ کے افق پر نمودار ہو رہا تھا۔ سویٹ یونین کے حلقہ بگوش مشرقی یورپ کے ممالک داخلی اصلاحات کے مراحل سے گزر رہے تھے اور سویٹ تسلط کا جوا اتار پھینکنے پر تلے ہوئے تھے۔ خود سویٹ یونین میں شامل ریاستیں آزادی کے مطالبے کر رہی تھیں، امریکی ذرائع ۱۹۸۹ء میں ہی معاہدہ وارسا کے خاتمے کے امکانات کی خبریں دینے لگے تھے۔ ان تمام آثار و قرائن سے آنکھ موند لینے کی پوری پوری سزا عراق کو ملی۔

۱۹۹۱ء کے اختتام کے قریب یعنی دسمبر میں سویٹ یونین کے ٹوٹ کے بکھر جانے کا منظر دنیا کی آنکھوں کے سامنے آ گیا، ہر ذی روح نے اس دھماکے کو اپنے کانوں سے سنا۔ یہ تاریخی واقعہ صرف ایک بڑی طاقت کے ٹوٹ کے بکھرنے ہی کا واقعہ نہ تھا بلکہ کمیونزم کے فلسفہ کی ایک بڑی شکست تھی، ۷۵ برس تک ایک اقتصادی نظام کے تجربہ کی ناکامی کا اعلان تھا، عالمی سطح پر سب سے بڑی آویزش کا خاتمہ تھا اور ایک واحد سُپر پاور کا افقِ عالم پر طلوع تھا، خواہی نخواہی یہ منظر سب کو دیکھنا تھا اور اس کے عواقب کا سامنا کرنا تھا۔

ہماری دفتری کارگزاریوں کا رخ تو بہت پہلے ہی سویٹ یونین کی طرف سے ہٹ کر دوسری سمتوں میں ہو گیا تھا۔ امریکہ کی ساری توجہات یورپ میں پیدا شدہ نئی صورت حال پر مرکوز تھیں، وارسا پیکٹ اپنی مدتِ حیات پوری کر چکا تھا، معاہدہ اوقیانوس (نیٹو) کا مستقبل زیرِ غور تھا، مشرقی یورپ کے ممالک اور سویٹ یونین کی نو آزاد ریاستوں سے نئے رشتوں کا قیام پیش نظر تھا ایسے میں کویت پر مسلط کی ہوئی عراقی جنگ ایک ضمنی وقوعہ کے طور پر آ پڑی۔ اس کے انجام سے امریکیوں کی اس امنگ میں اضافہ ہوا جو سویٹ یونین کے تحلیل ہو جانے کے بعد ان کے چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔

میری علالت:

کویت میں جنگ ختم ہو جانے کے بعد مجھے انتظار تھا کہ عام حالات کچھ اور اعتدال پر آ جائیں تو اس خطے کے ملکوں کا ایک سفر کیا جائے لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور

تھا۔ ہماری ڈائریکٹر لنڈا جوئیل تین ماہ کی میٹرنیٹی لیو پر امریکہ چلی گئیں، ابھی وہ اسی طرف تھیں کہ میں شدید علالت کے باعث ہسپتال میں داخل ہوگیا۔ دراصل وہی ذہنی دباؤ جس کا ذکر کر چکا ہوں اور کام کی کثرت دل کے دورے کا موجب ہوئی۔ میرے معالج مہینوں پہلے سے مجھے آرام کا مشورہ دے رہے تھے لیکن میں خود یہ نہیں سمجھتا تھا کہ میری بڑھتی ہوئی تھکاوٹ کا انجام یہ بھی ہوسکتا ہے۔

مکان کی تعمیر کے سلسلے میں قرضوں کی وجہ سے مالی دباؤ ایک عرصے سے جاری تھا، کچھ خانگی معاملات بھی بدمزگی کا موجب تھے انہی حالات سے گزرتے ہوئے ۳۰ مئی ۱۹۹۱ء کو میں خدا کا شکر بجالایا کہ اس روز قرضوں کی آخری قسط ادا کر کے اس عذاب سے چھوٹا لیکن یہ مسرت افزا کیفیت بڑی مختصر ثابت ہوئی۔ جون کی ۵ تاریخ کو نصف شب کے قریب میری طبیعت بہت خراب ہوگئی اور ہولی فیملی ہسپتال کے سخت نگرانی والے وارڈ میں داخل کر دیا گیا۔ دو ہفتہ ہسپتال میں رہنے کے بعد گھر آیا تو کمزوری ایسی تھی کہ چلنا پھرنا محال تھا، ڈاکٹروں نے تین ماہ مکمل آرام کا مشورہ دیا تھا۔

یہ بھی ایک موقع تھا جب میں نے دفتر کے لوگوں کی ہمدردیوں کا مشاہدہ کیا۔ لوگ گلدستے لے کر ہسپتال آتے رہے، گھر آجانے پر ہماری ڈائریکٹر اور کنٹری ڈپٹی ڈائریکٹر مسٹر گرم لینڈ کے ٹیلیفون دریافت خیریت کے لیے آتے رہے، وہ لوگ ہر طرح دلجوئی کرتے رہے۔ چھٹیوں کے دوران ہمارے ساتھی تنخواہ لا کر گھر پہنچاتے رہے۔ علاج معالجہ میں صرف ہونے والی رقم ملازمین کی صحت سے متعلق بیمہ اسکیم سے موصول ہوتی رہی۔ یہ سلسلہ اگلے برس ریٹائرمنٹ تک جاری رہا۔ کوئی چار مہینے بعد میں جزوی طور پر کام کے قابل ہوا اور کبھی آدھے دن کے لیے کبھی پورے دن کے لیے آفس جانے لگا۔ ہمارے عزیزوں میں سے کوئی میرے ساتھ آفس آیا جایا کرتا۔

والدہ کا انتقال: اسی علالت کے زمانے میں ہم لوگ ایک اور حادثہ سے دوچار ہوئے یعنی وسط جولائی میں والدہ کا انتقال ہوگیا۔ اس وقت میں اتنا کمزور تھا کہ جی

بھر رو بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ انتہائی متقی اور عبادت گزار تھیں، مالی اعتبار سے کمزور عزیزوں کی ہمیشہ خاموشی سے مدد کیا کرتی تھیں، ایک بار مجھے نماز کی تاکید کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ ''میں بال بچے دار عورت تھی تب بھی تہجد کی نماز نہیں چھوڑتی تھی اور تم پانچ وقت کی نماز نہیں پڑھ سکتے۔'' اس سے ان کی عبادت گزاری کا اندازہ کیا جاسکتا ہے لیکن نفل نمازوں کی پابندی اور اوراد و وظائف کے باوجود وہ نہایت خوش مزاج اور بذلہ سنج تھیں، میری بچیوں سے ان کی گہری چھنتی تھی ان کے ساتھ وہ سہیلی کی طرح گھلی ملی رہتیں۔ ان کی سب سے بڑی خوبی مثالی انصاف پسندی تھی، ایسی انصاف پسندی جو انسانی فطرت پر غالب تھی۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت خود میرے ساتھ ان کا سلوک تھا۔ وہ میری خالہ تھیں یعنی سوتیلی ماں تھیں لیکن انھوں نے اپنے بچوں اور ہمارے درمیان اس احساس کا شائبہ تک نہیں آنے دیا۔ ان کی نظر میں بڑے بیٹے کے طور پر میری فوقیت برقرار تھی۔ وہ ضعف قلب کی مریض تھیں، عمر بڑھی تو یہی مرض غالب آ گیا اور ایک رات خاموشی سے رخصت ہوگئیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے مدراج بلند فرمائیں، آمین۔ ان کی رحلت سے جیسے ایک لڑی ٹوٹ گئی جس میں ہم سب چھوٹے بڑے پروئے ہوئے تھے۔

ماموں جان کی رحلت: اگلے برس ماموں جان مولوی حفیظ الرحمٰن صاحب ایمنؔ بھی خاموشی کے ساتھ رحلت فرما گئے۔ انہی کے زیرِ سایہ میری پرورش اور تعلیم و تربیت ہوئی تھی۔ زہد و تقویٰ اور بے نفسی اور بے لاگ انصاف کی تمام خوبیوں سے وہ بھی اپنی چھوٹی بہن کی طرح متصف تھے۔ آخر عمر میں اپنے سب سے چھوٹے بیٹے فیض الرحمٰن کے ساتھ الٰہ آباد میں رہنے لگے تھے۔ بے حد کمزور ہو چکے تھے ایک روز ناشتے کے بعد کپڑے تبدیل کر کے چھڑی لے کر ٹہلنے نکلے لیکن دروازے سے ہی واپس آ گئے اور بیٹے کو آواز دے کر کہا ''فیض! دیکھو لوگ مجھے لینے کے لیے آ رہے ہیں بستر وغیرہ ٹھیک کردو۔'' یہ کہہ کر خود بستر پر لیٹ گئے اور روح نے بہشتِ بریں کی راہ لی۔ دنیا سے کوئی لگاؤ نہ تھا کہ ان کی روح کو کچھ دیر کے لیے بھی الجھاوے میں رکھتا۔ اللہ اللہ! کیسے لوگ

تھے اب ایسے لوگ کہاں ملیں گے! ماموں جان نے علم کی روشنی دکھا کر میری زندگی کی راہیں روشن کیں اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ان کی آرام گاہ کو نور سے بھر دے۔ آمین!

دفتر واپسی:

ستمبر ۱۹۹۱ء میں میں نے آفس جانا شروع کیا تو کچھ اس طرح کہ روز شمار کرتا کہ اب کام کے کتنے گھنٹے باقی رہ گئے ہیں۔ بیماری کی جمع شدہ چھٹیوں میں سے جو کچھ بچی کھچی تھی اس سے استفادہ کرتا رہا۔ گویا لنگڑا لنگڑا کر ریٹائرمنٹ کا پالا چھونے کی کوشش کرتا رہا جو فروری ۱۹۹۲ء کے اختتام پر ڈیو تھا۔

ستمبر کے پہلے ہفتے میں یو ایس آئی ایس کے چاروں دفاتر کے پریس چیف کی ایک میٹنگ تھی جو کہ ان علاقائی ساتھیوں سے الوداعی ملاقات کا ایک اچھا موقع تھا۔ اس موقع پر میں نے ان لوگوں کا شکریہ ادا کیا جو اپنے علاقوں میں میرے دورے کے سلسلے میں ہر طرح کی سہولتیں فراہم کرتے تھے۔ میں اس وقت بھی کافی کمزور تھا لنڈا جوئیل نے میرے ساتھ ایک غیر معمولی سلوک کیا۔ میٹنگ میں سب سے پہلے مجھے ہی بولنے کا موقع دیا تا کہ مجھے جو کچھ کہنا ہو کہہ کر میں جانے کے لیے آزاد ہو جاؤں۔ چلتے چلاتے ایک اور خوشگوار مصروفیت یہ ہوئی کہ دسمبر میں وائس آف امریکہ اردو سروس کے ڈائریکٹر سلور برائن واشنگٹن سے آئے تو میں نے ان کے ایک خصوصی انٹرویو کا اہتمام کیا۔ فیچر اینڈ نیوز الائنس (فانا) کے ایڈیٹر مقبول احمد سراج صاحب نے انٹرویو لیا جو کئی اردو اخباروں میں شائع ہوا۔

جنگ کویت ختم ہو جانے کے کچھ دنوں بعد ہندوستانی اخبار نویسوں کے ایک گروپ کو ہمارے دفتر کی طرف سے کویت لے جانے کی اسکیم تھی۔ لیکن پہلے تو کویت کی حکومت حالات کے مزید اعتدال پر آنے تک اس پروگرام کو ملتوی کرتی رہی پھر ہماری ڈائریکٹر میٹرنٹی لیو پر امریکہ چلی گئیں۔ اگر میں بیمار نہ پڑا ہوتا تو ان کی واپسی کے بعد اس پروگرام کی پھر تحریک کرتا اس لیے کہ مجھے خود بھی اس سے دلچسپی تھی، غرض یہ کہ وہ پروگرام منسوخ ہو گیا۔ میں نے چلتے چلاتے صحافیوں کے دورۂ امریکہ کے پروگرام میں دو صحافیوں

کو نامزد کر دیا ایک مقبول احمد سراج صاحب اور دوسرے ''اردو ٹائمز'' بمبئی کے ایک صحافی ساجد رشید، ان دونوں حضرات کے نام تو منظور ہو گئے لیکن میرے ریٹائرمنٹ کے بعد ان کا جانا ہوا۔ میرے بعد عبدالحئی صاحب کے کھاتے میں یہ پہلا کریڈٹ گیا ہوگا۔

جون میں علالت سے پہلے مارچ میں کلکتہ اور مئی میں بمبئی کا دورہ کر چکا تھا۔ اس وقت میرا قیاس تھا کہ احباب سے ملاقات کا ایک موقع اور دورانِ ملازمت مل جائے گا، یہ نہیں معلوم تھا کہ وہی الوداعی ملاقاتیں تھیں۔ نومبر میں میرے ریٹائرمنٹ کی کاغذی کارروائی شروع ہوگئی۔ عام حالات میں تو لوگ ریٹائرمنٹ سے چھ مہینے پہلے ہی بددلی کا شکار ہوجاتے ہیں اور کام سے ان کی دلچسپیاں کم ہوجاتی ہیں لیکن میرے ساتھ اپنی کمزوریوں کے باوجود ایسا نہیں ہوا اور میں نے اپنی کمزور صلاحیتوں کے باوجود بساط بھر کام جاری رکھا۔ اس سلسلے میں مجھے عبدالحئی فلاحی صاحب سے بڑی مدد ملی جو پچھلے ایک برس سے معاونت کر رہے تھے، اس وقت وہ ''قومی آواز'' سے وابستہ تھے، بڑی اچھی صلاحیتوں کے مالک ہیں۔

دراصل باہر سے کچھ فیچر وغیرہ کے ترجمے کرالینا میری ضرورت میں شامل تھا، اس معاملے میں دفتر نے بلاشبہ مجھ سے تعاون کیا یعنی اس سہولت کے لیے ضروری فنڈ فراہم کرتا رہا۔ اس سلسلے میں محمد اعظم صاحب سے میرا رابطہ ہوگیا۔ وہ روزنامہ پرتاپ سے وابستہ تھے۔ انھوں نے دس بارہ سال تک میرا ساتھ دیا۔ ان کی ترجمہ کی زبان ایسی منجھی ہوئی تھی کہ شاید ہی کبھی قلم رکھنے کی ضرورت ہوئی اس باب میں وہ یقیناً مجھ سے بہتر صلاحیتوں کے مالک تھے۔ اتنے طویل عرصے تک وابستگی کے بعد ممکن تھا کہ میرے بعد اس جگہ کے لیے انہی کے بارے میں غور کیا جاتا لیکن نہ معلوم کیا وجہ ہوئی کہ آخری سال ڈیڑھ سال کے دوران ان کا رویہ بہت بدل گیا یعنی مہینے میں مشکل سے ایک دن آتے۔ میں سمجھ نہیں سکا کہ انھیں مجھ سے کوئی ذاتی شکایت ہوگئی تھی یا دفتر سے یا ان کی کوئی اور مجبوری تھی۔ طبعاً زود رنج اور کم گو تھے اس لیے ان کی بیگانگی کی وجہ کچھ نہ معلوم ہوسکی۔

کئی مہینے تک اعظم صاحب کی غیر حاضری کے بعد میں نے کسی اور شخص کی تلاش شروع کی، لیکن مشکل یہ تھی کہ اس دفتر میں صرف ترجمے کا کام تو نہ تھا، عوامی رابطے کی اور دیگر صلاحیتوں کی بھی ضرورت تھی۔ انگریزی میں اچھی صلاحیت کے بغیر ایک قدم چلنا مشکل تھا بلکہ انٹرویو کے مرحلے سے بھی گزرنا ممکن نہ تھا۔ بہرحال، عبدالحئ صاحب سے مڈبھیڑ ہوگئی اور وہ میرے ریٹائرمنٹ سے کوئی ایک سال پہلے وارد ہوگئے تھے۔

۲۹ر فروری ۱۹۹۲ء میری ملازمت کا آخری دن تھا لیکن اس روز سنیچر تھا اس لیے کام کا آخری دن ۲۸ر فروری ٹھہرا۔ فروری کا مہینہ شروع ہوتے ہی میں نے فائلوں پر نظر ثانی، غیر ضروری کاغذات کی صفائی اور اپنے ذاتی کاغذات کی علیحدگی وغیرہ کا کام شروع کردیا اور عبدالحئ صاحب کو بھی کام سمجھانے لگا وہ چند گھنٹوں کے لیے روز آجایا کرتے تھے۔ اس مہینے کا آخری ہفتہ تقریبات میں گزرا۔ ۲۰ر فروری کو لنڈا جوئیل نے اپنی قیام گاہ پر میرے اعزاز میں ایک لنچ کا اہتمام کیا جس میں شرکت کے لیے دس بارہ اردو ایڈیٹروں کو مدعو کیا۔ ۲۵ر فروری کو امریکی سفیر ولیم کلارک نے اپنے دفتر میں عزت افزائی کی اور ملازمت سے ریٹائرمنٹ کی ایک خوبصورت تختی پیش کی۔ ۲۷ر فروری کو ہمارے پریس سیکشن کی طرف سے الوداعی پارٹی دی گئی جس میں پورے سیکشن کے علاوہ دہلی آفس اور کنٹری آفس کے امریکی افسروں نے بھی شرکت کی، کیک کاٹا گیا اور تحائف پیش کیے گئے۔ کام کے آخری دن ۲۸ر فروری کو یو ایس آئی ایس ملازمین کے ایسوسی ایشن کی طرف سے ایک زبردست الوداعی پارٹی دی گئی جس میں سارے امریکیوں اور ہندوستانیوں نے شرکت کی، اس موقع پر بھی ضیافت ہوئی، تقریریں کی گئیں، تصویریں کھینچی گئیں اور اس طرح سرکاری طور پر مجھے رخصت کیا گیا۔ طویل عرصہ تک کسی ادارے سے وابستگی کے بعد علیحدگی یا رخصت عموماً ایک تکلیف دہ مرحلہ ہوتا ہے لیکن امریکی ایسے موقعوں کو بھی ایک خوشنما تقریب کا رنگ دینے کا سلیقہ رکھتے ہیں۔

اس سرکاری سبکدوشی کے بعد بھی دو مہینے تک میں بالفعل موجود رہا۔ بات یہ تھی

کہ اس وقت تک عبدالحئی صاحب کے سارے کاغذات کلیئر نہیں ہوئے تھے، مجھے اندیشہ تھا کہ میری روانگی کے بعد وہ لوگ ان کے معاملے میں گڑ بڑ نہ کریں جو کاغذی کارروائی میں غیر معمولی تاخیر کے ذمہ دار تھے۔ میں نے اپنے اس اندیشے کا اظہار تو نہ کیا لیکن اپنی ڈائریکٹر لندا جوئیل سے کہا کہ ذاتی وجوہ کی بنا پر میری خواہش ہے کہ میری ملازمت میں دو ماہ کی توسیع کردی جائے۔ وہ جس طرح میری ہر بات مانتی آئی تھیں اس گزارش سے بھی انھوں نے اتفاق کرلیا اور اکزیکیوٹیو آفس سے مشورہ کے بعد مجھے بتایا کہ تمہارا باضابطہ ریٹائرمنٹ تو ۲۹/فروری کو ہی تصور کیا جائے گا اس کے بعد غیر رسمی طور پر دو ماہ کام کرنے کی اجازت ہوگی۔ گویا ۳۰/اپریل تک کام جاری رکھنے کا مجھے موقع دیا گیا۔ دریں اثناء ۲۰/اپریل کو عبدالحئی صاحب نے جوائن کرلیا تھا۔

اس طرح یو ایس آئی ایس سے میری وہ وابستگی تمام ہوئی جو ۱۹۵۷ء میں شروع ہوئی تھی اور رسمی اور غیر رسمی راہوں کے نشیب و فراز سے گزرتی ہوئی یہاں تک پہنچی تھی۔ اس موقع پر کلکتہ اور دہلی آفس کے ان تمام ساتھیوں، دوستوں اور بہی خواہوں کی یاد آنا فطری ہے جو اس خالصتاً مادی دفتر میں بھی دشوار گزار راہوں سے میرے سلامت گزر جانے میں مختلف طریقوں سے معاون ہوتے رہے۔ ان میں ہندوستانی اور امریکی دونوں شامل تھے۔ یہ قیاس غلط ہے کہ کوئی شخص صرف امریکی ہونے کی وجہ سے برا ہوتا ہے۔ بڑے خوش اخلاق اور انسان دوست امریکی افسروں کو میں نے دور اور قریب سے دیکھا۔ ان کی سب سے بڑی خوبی جس نے مجھے متاثر کیا ان کی فکری آزادی ہے جسے وہ خود اپنے لیے اور دوسروں کے لیے بھی پسند کرتے ہیں۔ جب امریکی افسروں سے میرے رابطے براہِ راست ہوگئے تو میں نے دیکھا کہ ان کے سامنے کسی سوال پر بلا خوف آزادانہ اظہارِ خیال کیا جاسکتا تھا۔ اگر انھیں اختلاف ہوتا تو وہ سمجھانے کی کوشش کرتے نہ کہ ہم لوگوں کی طرح وجود ہی کے درپے ہوجائیں۔ یوں کچھ اچھے اور کچھ برے لوگ ہر جگہ ہی ہوا کرتے ہیں۔ دراصل بری سرشت کے لوگ کہیں بھی پیدا ہوں برے ہی ہوں گے۔

مٹی، ہوا اور پانی گلاب کی بھی پرورش کرتے ہیں اور ناگ پھنی کی بھی۔ ان کی سرشتیں انھیں ایک دوسرے سے مختلف بناتی ہیں نہ کہ قدرتی حالات۔

ایک دو واقعات کا مختصراً ذکر شاید بے محل نہ ہوگا۔ کلکتہ آفس میں ایک چپراسی نور محمد خاں تھے۔ ان کی مونچھوں کی نوک نہ کبھی نرم اور نہ نیچی دیکھی گئی نہ ان کی پگڑی کا طرہ جھکا ہوا دیکھا گیا۔ ان کی ایک نوعمر بیٹی پھسل کر گئی اور اس کی ران کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ ہسپتال میں تین ماہ بعد پلاسٹر کاٹا گیا تو ٹانگ چھوٹی ہوگئی تھی۔ اگلے دن نور محمد خاں دفتر کے ایک گوشے میں سر جھکائے بیٹھے تھے اور ان کی مونچھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے۔ خاتون امریکی لائبریرین اس طرف سے گزریں تو نور محمد خاں سے ماجرا دریافت کیا۔ اس کے بعد انھوں نے فوراً دفتر کی گاڑی لی اور نور محمد خاں کے ساتھ ان کے گھر گئیں اور ان کی بچی کو لے جا کر اس کلینک میں داخل کر دیا جہاں امریکیوں کا علاج معالجہ ہوتا تھا۔ لڑکی کی ٹانگ کا دوبارہ آپریشن کروایا اور علاج جاری رہنے تک وہیں رکھا۔ ہر ہفتہ جا کر خود اس کے ناخن تراشتیں اور کھانے پینے کی چیزیں لے جاتیں۔ علاج کا سارا خرچ انھوں نے ذاتی طور پر برداشت کیا۔ انھوں نے نور محمد خاں کو تاکید کی کہ بچی کو اچھی تعلیم دلانا اور جب امریکہ واپس جانے لگیں تو اپنا سامان بیچ کر اس لڑکی کی تعلیم کے لیے سکینہ فنڈ قائم کر دیا۔

اسی یو ایس آئی ایس کلکتہ میں ایک پریس آفیسر مسٹر براؤن تھے۔ وہ کسی بڑے کاروباری امریکی کے بیٹے تھے لیکن مزاجاً بالکل گاندھیائی تھے۔ وہ میاں بیوی دونوں نہایت سادہ سوتی کپڑے پہنتے۔ وہ ملازمت سے مستعفی ہو کر امریکہ چلے گئے اور ''نیویارک ٹائمز'' کے شعبہ ادارت سے وابستہ ہوگئے۔ کچھ برسوں بعد انھیں کلکتہ آنے کا اتفاق ہوا تو چونا گلی میں رئیس الدین فریدی صاحب ایڈیٹر ''روزانہ ہند'' سے ملاقات کے لیے ان کا گھر ڈھونڈھتے پھرے۔ چونا گلی جیسا علاقہ ہے مقامی لوگ ہی جانتے ہیں۔

اختتامیہ:

امریکی دفتر اطلاعات (یو ایس آئی ایس) سے میری وابستگی کا آغاز اس وقت ہوا

جب وزیر اعظم جواہر لال نہرو اور صدر آئزن ہاور کا دور تھا، ہندوستان اور امریکہ کے تعلقات میں دوستانہ گرمجوشی کا زمانہ تھا، غیر جانبدار تحریک کے علمبردار کی حیثیت سے ہندوستان کا وزن و وقار اور عالمگیر قدر و منزلت نقطۂ عروج پر تھی، دونوں ملکوں کے باہمی تعلقات کی گرمجوشی صدر کنیڈی اور وزیر اعظم نہرو کے عہد تک جاری رہی اس کے بعد ان ملکوں کی قیادتوں میں تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ عالمی حالات بھی کچھ اس طرح متغیر ہوئے کہ ہندوستان اور امریکہ کے تعلقات بھی گہنا گئے۔ صدر نکسن اور وزیر اعظم اندرا گاندھی کے زمانے میں دونوں سابق دوستوں کے درمیان کشیدگی نقطۂ عروج کو پہنچ گئی۔ ہم اس دور سے بھی گزرے۔ پھر تقریباً ایک دہائی کی مدت ایسی بھی گزری جب دنیا کی ان دونوں عظیم ترین جمہوریتوں کے تعلقات پر جمی ہوئی برف بڑی سست رفتار سے پگھلتی رہی یہاں تک کہ سویٹ یونین کے آفاق پر ایک نیا آفتاب طلوع ہوا جو اس ملک کے لیے کسی ایٹم بم سے بھی زیادہ گرم تاب ثابت ہوا جس نے اس کے وجود ہی کو پگھلا کر ختم کر دیا۔

وہ سویٹ یونین باقی نہ رہا جسے مغرب سے نمو پذیر ہونے کے باوجود سارے مشرق کو بیداری کا پیغام دیا تھا، سوشلزم کی راہ دکھائی تھی، ہندوستان کا سب سے بڑا دوست اور امریکہ کا سب سے بڑا حریف نہ رہا۔ ہم نے عالمی سیاست میں یہ انقلاب بھی دیکھا۔ پھر ہندوستان اور امریکہ کی دو عظیم جمہوریتوں کو ایک دوسرے کی طرف لجائی لجائی نظروں سے دیکھتے ہوئے بھی دیکھا۔ اس طرح وقت کی سوئی نے ایک گردش تقریباً مکمل کر لی۔ اس تمام عرصے میں ہم نے دنیا کے سب سے بڑے اطلاعاتی نظام کو نئے نئے رخ بدلتے دیکھا۔ اس کی کارکردگی کو برسرِ اقتدار نظام سے ہم آہنگ اور بیرونی تغیرات سے نبرد آزما ہوتے دیکھا۔ ہم جیسے کمتر انسانوں کی زندگی میں یہ یقیناً بیش بہا تجربات تھے۔

☆☆☆

چوتھا ورق

سفر و سیاحت

سفر و سیاحت

یادوں کے جھروکے سے

اضمحلال کی شکار اور عمیق تنہائیوں میں محبوس ضعیفی میں ماضی کی یادوں کا سراب نہایت خوش کن ہے۔ بیشمار تصویریں دل کے آئینے میں محفوظ ہیں ''جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی''۔ لیکن خود دیکھ لینا ایک بات ہے، اوروں کو دکھانا اور بات۔ نہ جولانیِ طبع ہے نہ جولانیِ قلم لیکن ''آ بیل مجھے مار'' کے طور پر میں نے جس داستان سرائی کو دعوت دی ہے اس کا تقاضا ہے کہ انجام کار تک پہنچاؤں۔ چنانچہ تماشہ گاہِ عالم میں سفر و سیاحت کے دوران ہونے والے کچھ مشاہدات و تجربات بیان کرنے کی کوشش کروں گا۔

میں نے سفر بہت کیے اور سیاحت بھی لیکن نہ سفر سفر کی طرح اور نہ سیاحت سیاحت کی طرح۔ یہ بات سننے میں عجیب سے لگتی ہے لیکن حقیقت یہی ہے۔ اس کی وجہ بھی تھی۔ مواقع کا حاصل ہونا اور طبیعت کا اتاؤلا پن ان دونوں کا میری ذات میں اکٹھا ہونا۔ جب میں نے عملی زندگی میں قدم رکھا وہ ہندوستانی مسلمانوں کے لیے بڑی آزمائش کی گھڑی تھی جو ماہ و سال نہیں عشروں تک طویل تھی۔ تعلیم یافتہ نوجوانوں کو سیاسی سرحدوں کے پار روشن مستقبل نظر آ رہا تھا اور مسلم سرمایہ کو سیاسی سرحدوں کے پیچھے اپنا سرمایہ محفوظ نظر آ رہا تھا، نادانوں کے جمِ غفیر کو نہ ماضی کا پتہ تھا، نہ حال کا نہ مستقبل کا دوسری طرف برصغیر

کے مسلمانوں کی زبردست طاقت توڑنے کی صدیوں پرانی سازش اپنی کامیابیوں سے ہمکنار ہورہی تھی۔ ایک ایسا طوفان تھا جس نے لاکھوں کی جان لی، کروڑوں کو اجاڑ کر گھر سے بے گھر کردیا ایک مستحکم سماج کی دھجیاں اڑادیں۔ اس طوفان کے سامنے اپنے پاؤں جمائے رہنے کا حوصلہ کوئی معمولی بات نہ تھی۔

ان حالات میں مسلم نوجوانوں کے لیے نوکریاں پانا جوئے شیر لانے سے کم محال نہ تھا اور نوکریاں چھوڑنا صریح ناعاقبت اندیشی یا دیوانگی۔ لیکن قدرت کی ستم ظریفی یہ تھی کہ نوکریاں ملتی رہیں اور چھوٹتی رہیں جس میں مزاج کے اتاؤلے پن کو بڑا دخل تھا جو صحافت جیسے ناپائیدار اور بے مہر پیشے سے ہم آہنگ ہوگیا کیونکہ یہ پیشہ ساری مشقتوں اور آزمائشوں سے بھرپور ہونے کے باوجود اس چوکھٹے سے آزاد تھا جس میں نوکریاں عام طور سے محبوس ہوتی ہیں اور انا بھی اپنے اظہار کی آزادی کی خوش فہمی میں مبتلا رہتی ہے۔ بس اسی صورت حال نے مواقع فراہم کیے لیکن پیشے کی مصروفیتوں نے ان مواقع کو صحیح معنوں میں سیاست یا ایک لطف انگیز مسافرت نہ بننے دیا۔

جس زمانے میں صحافت کا طوق میں نے اپنے گلے میں ڈال لیا اور پھر صحافت کے کمبل نے مجھے لپیٹ لیا اردو اخباروں میں کسی شخص کی کوئی معین حیثیت نہیں ہوتی تھی۔ وہ مالک بھی ہوسکتا تھا اور ایڈیٹر بھی، سب ایڈیٹر، مترجم، رپورٹر اور چپراسی بھی۔ مالک اخبار کا مصاحب اور اس کے بچوں کا اتالیق بھی۔ چنانچہ میں ایک سب ایڈیٹر، مترجم اور نیوز ایڈیٹر کی حیثیتوں میں کام کرتے ہوئے فلموں کے ریلیز ہونے سے پہلے ان کے پری ویو دیکھنے یا کسی واقعہ کی رپورٹنگ کے لیے بھی جاتا رہا بس یہی آوارہ گردی مجھے راس آئی اور میرا مقدر بن گئی۔ برصغیر کے طول وعرض کو ناپتا رہا یہی پھیلتے پھیلتے جہاں گردی بن گئی۔ آئندہ تحریر اسی اجمال کی مختصر تفصیل ہے۔ جس کی جھلکیاں گزشتہ تحریروں میں بھی کہیں کہیں نظر آئی ہوں گی۔

بات یوں ہوئی کہ میں جب امریکن سینٹر (سابق یو ایس آئی ایس) دہلی سے

وابستہ ہوگیا، تو میری چوگان بازی کے لیے پورے برصغیر کا میدان کشادہ ہوگیا۔ یوں تو اردو زبان مردود بارگاہ قرار دے کر دیس بدر کردی گئی تھی لیکن یہ اپنی قلمرو پر اس طرح سایہ فگن تھی کہ ملک کا کوئی گوشہ اس کے اثرات سے محفوظ نہ تھا چنانچہ ہر خطے اور علاقے سے اردو اخبارات و رسائل شائع ہو رہے تھے۔ میں بحیثیت اردو ایڈیٹر ان سے امریکن سینٹر کے رابطے کا واحد ذریعہ تھا اس لیے ایڈیٹر حضرات سے وقتاً فوقتاً ملاقات بھی ضروری تھی۔ یہی ضرورت مجھے سال بھر گردش میں رکھتی تھی۔ تقریباً سارے بڑے شہروں کا پالا سال میں ایک بار چھونے کی کوشش کرتا اور کبھی کبھی ذیلی شہروں کا بھی چنانچہ سردیوں میں اپنے کلکتہ بمبئی وغیرہ کا رخ کرتا۔ گرمیوں میں ''رخت بہ کاشمر کشا'' اور موقع موقع سے شمال و جنوب کے دیگر شہر مثلاً لکھنؤ، کانپور یا پٹنہ، جالندھر یا حیدرآباد، بنگلور وغیرہ۔ یہ بڑا اچھا موقع ہوا کرتا تھا پرانے ساتھیوں اور دوستوں اور عزیزوں سے بھی تجدید ملاقات کا، نئے تعلقات اور دوستیاں بنانے کا۔ ایسے میں سفر تو ہوجاتا تھا اور دفتری تلازمات بھی پورے ہوجاتے تھے اور کسی قدر تفریح بھی لیکن جس کو سیر و سیاحت کہتے ہیں اس کے لیے وقت کی گنجائش کہاں تھی۔ ہوائی سفر اور اعلیٰ ترین ہوٹلوں میں قیام کی وجہ سے ہر سفر پر دفتر کی کثیر رقم صرف ہوتی تھی اس لیے کہیں بھی ضرورت سے زیادہ قیام مناسب نہیں تھا۔

کلکتہ:

بہرحال بات کلکتہ سے ہی شروع کریں تو میرے دیکھتے دیکھتے پندرہ بیس سال کے دوران شہر کی روایتی ہیئت میں تو کوئی خاص فرق نہیں آیا تاہم پرانے کے ساتھ ساتھ بہت کچھ نیا بھی ہوگیا۔ میٹرو ریل کی تعمیر کے سلسلے میں جو سنٹرل ایونیو بیس برس سے ایک لمبے غار کی طرح کھدا پڑا تھا اس کا وہ ناسور بند ہوگیا اور اس کے سینے میں میٹرو کا دل دھڑکنے لگا۔ کلکتہ کی پہچان ہوڑہ پل کی کمان بدستور آسمان کی طرف تنی ہوئی تھی لیکن اس کا بار کچھ ہلکا کرنے کے لیے فورٹ ولیم کے آگے ایک نیا آہنی قوس ابھر آیا تھا۔ شمالی کلکتہ میں سالٹ لیک کے نام سے ایک نیا کلکتہ آباد ہونے لگا تھا لیکن جس علاقے سے مجھے سروکار

تھا وہ جوں کا توں تھا ہاں پرانے لوگ کم ہوتے جارہے تھے نئے لوگوں سے وہ شناسائی نہیں بن پائی۔

کلکتہ سے اپنے الوداعی سفر کے وقت جس بے مہری کا میں تذکرہ کرتا رہا ہوں اس کا کسی قدر ازالہ اس طرح ضرور ہوا کہ جو اصحاب کلکتہ سے دہلی آتے وہ مجھ سے ضرور ملتے، ان کی تعداد بھی اچھی خاصی ہے، ان میں سے کئی مخلص تو میرے ریٹائرمنٹ کے بعد غریب خانے کو بھی عزت بخشتے رہے، ان میں محترم حکیم محمد زماں حسینی کی شخصیت سرفہرست ہے۔ وہ دیوبند جاتے ہوئے جب بھی دہلی سے گزرتے مجھے ضرور نوازتے حتیٰ کہ آخری دو سفر میں جب وہ مفلوج ہوگئے تھے ابوالفضل انکلیو میں قیام فرماتے تو مجھے اطلاع کرادیتے۔ ان کے علاوہ بھی کئی حضرات جیسے کہ قیصر شمیم صاحب جو محتاج تعارف نہیں ہیں، ریٹائرڈ آئی پی ایس افسر طیب خاں، دارالاشاعت اسلامیہ کے بانی مہتمم مولانا عطاء الرحمٰن قدسی اور وسیم الحق صاحب نے تو حد کردی۔ پہلے تو آتے جاتے ملتے رہے اور پھر اپنے اخبار ''اخبار مشرق'' کی اشاعت دہلی سے شروع کر کے ملاقاتوں کو دوام میں تبدیل کردیا۔

بمبئی:

بات اگر بمبئی کی کریں تو وہ بھی بہت دور تک جائے گی۔ وہاں محمود ایوبی اسسٹنٹ ایڈیٹر اردو بلٹز اور نیاز اعظمی نیوز ایڈیٹر 'انقلاب' جیسے پرانے ساتھی اور دوست یا بھائی جیسے دونوں عزیز موجود تھے۔ ایک ایک دن تو انہی کے لیے ناکافی تھے ان کے علاوہ بھی کئی صحافیوں سے اچھی خاصی راہ رسم ہوگئی تھی، مزید براں چند اقارب بھی تھے۔ ظاہر ہے ان لوگوں کی صحبت سے بہتر اور کون سی تفریح ہوسکتی تھی۔ وہاں ٹھہرنے کے لیے میرا پسندیدہ ہوٹل کف پریڈ پر پریسڈنٹ ہوٹل تھا گو ہماری دلچسپیوں کے علاقے سے کافی دور تھا۔ چونکہ ہوٹل ریزرویشن وغیرہ سب آفس کی طرف سے ہوتا تھا اس لیے ایک بار انھوں نے تاج ہوٹل میں کمرہ بک کرادیا تھا لیکن اس کے بعد میں نے تاکید کردی تھی کہ آئندہ وہاں ریزرویشن نہ کرایا جائے۔ یہی معاملہ کلکتہ میں گرانڈ ہوٹل سے متعلق ہوا۔ یہ

ہوٹل عیاش سرمایہ داروں کے لیے ہیں نہ کہ ہم جیسے قلاشوں کے لیے جنھیں اس طرزِ حیات سے ہی الرجی رہی ہے۔

جب تاج ہوٹل پر دہشت گردانہ حملہ ہوا تو وہ سارا منظر آنکھوں میں گھومنے لگا۔ گیٹ وے آف انڈیا کے سامنے سمندر میں تاحد نظر چھوٹی بڑی کشتیوں کی بھیڑ اور دور تک پھیلے ہوئے ساحل پر بے خوف پرندوں کا جمگھٹ۔ بمبئی میں ایک بات مجھے اچھی لگی وہ یہ کہ کوئی ٹیکسی والا سواری لینے یا کہیں جانے سے انکار نہیں کرتا تھا حالانکہ جب پریسڈنٹ ہوٹل سے نکل کر کوئی ٹیکسی لیتا اور اس سے محمد علی روڈ یا مولانا آزاد روڈ چلنے کے لیے کہتا تو ڈرائیور کے چہرے پر ناگواری کے آثار صاف نظر آتے تھے۔ ایک بار محمود ایوبی کے ساتھ میٹرو میں ان کے گھر جانے کا اتفاق ہوا تو سمجھ میں آیا کہ اگر اترنے میں لمحہ بھر بھی توقف ہوا تو لوگ ڈھکیل دیں گے۔ کلکتہ میں بھی میٹرو میں ایک بار چلنے کے لیے وقت نکالا۔ مقصد کلکتہ، بمبئی اور لندن اور امریکہ کے مختلف شہروں میں میٹرو کا موازنہ کرنا تھا۔ ان سب میں تو تقریباً یکسانیت ہے۔ فرق کم یا زیادہ شور کا ہے شاید اس کی وجہ ٹنل سے گزرتے ہوئے شور کی وجہ سے ہے۔ دہلی میٹرو کا مجھے اب تک کوئی تجربہ نہیں ہوا ہے۔ مسافروں کے رویہ میں فرق کا احساس ضرور ہوا۔

بمبئی کی ایک خاص بات یہ بھی تھی کہ ہمارا بمبئی آفس ہمارے اعزاز میں اردو ایڈیٹروں کے ایک لنچ کا اہتمام کرتا تھا۔ دراصل کلکتہ، بمبئی اور مدراس جانے کے پروگرام سے دو ہفتہ قبل اس آفس کو مطلع کر دیا جاتا تھا گویا ریزرویشن وغیرہ کے لیے وہ مہلت دی جاتی تھی۔ اسی وقت بمبئی آفس مجھ سے دریافت کرتا کہ میں لنچ میں کن لوگوں کو مدعو کرنا چاہتا ہوں۔ انہی لوگوں کو بمبئی آفس کسی ہوٹل میں مدعو کرلیا کرتا تھا اس موقع پر بمبئی آفس کے ڈائریکٹر بھی موجود ہوتے۔ کلکتہ میں میرے لیے اعزاز کی ایک دوسری قسم تھی۔ وہاں مجھے لینے کے لیے آفس کی گاڑی ہوائی اڈے پر آتی تھی اور ہوٹل پہنچاتی تھی پھر واپسی میں ہوٹل سے ہوائی اڈے پہنچاتی۔ ڈرائیور تو جو بھی ہو مجھے جانتا پہچانتا تھا۔

حیدرآباد:

اس شہر کو تو دراصل 'دولت آباد' یا 'نظام آباد' کہنا چاہیے لیکن ان ناموں کے شہر موجود ہیں۔ وہاں جن اصحاب سے میری رسم و راہ تھی ان میں قابلِ ذکر شخصیات 'سیاست' کے ایڈیٹر عابد علی خاں، 'رہنمائے دکن' کے ایڈیٹر سید وقار الدین اور 'منصف' کے ایڈیٹر محمود انصاری تھے۔ اول الذکر دونوں حیدرآباد کی ریاست اور وضعداری کے پیکر اور موخر الذکر اس کے برعکس حیدرآباد میں سوشلسٹ اثرات کے مظہر۔ انصاری صاحب نے دنیا کے جھمیلوں سے دامن چھڑانے میں بڑی عجلت کی۔ سید وقار الدین صاحب ماشاء اللہ اب تک مسندِ ادارت پر متمکن ہیں۔ انھوں نے انڈو عرب سوسائٹی بھی قائم کی تھی، امید ہے اب بھی وہ انجمن فعال ہوگی۔ جنوبی ہند کے وہ پہلے اردو ایڈیٹر تھے جنھیں امریکہ کے دورے پر بھیجنے میں مجھے کامیابی حاصل ہوئی۔

حیدرآباد میں جن اصحاب سے میرے ربط وضبط تھے ان میں سے ایک شخصیت مجتبیٰ حسین صاحب کی ہے۔ دراصل ان سے تو دہلی ہی میں سابقے تھے لیکن بالآخر انھوں نے دہلی میں مہاجرت کی زندگی کو الوداع کہا، حالانکہ یہاں ان کی عظمت کے اعتراف میں کوئی کمی نہیں آئی تھی بلکہ اعزازات کے ذریعہ اس کا اعلان کیا جاتا رہا تاہم انھوں نے اکثر و بیشتر مہاجروں کی طرح وطن واپسی کا فیصلہ کیا۔ حیدرآباد میں دوسری بزرگ شخصیت جو مجھ سے گرمجوشی کے ساتھ رابطہ میں ہے، گو وہاں بطور مہاجر مقیم ہے پروفیسر محسن عثمانی کی ہے وہ سی آئی ایف ایل میں شعبہ عربی کے صدر کی حیثیت سے خدمات کی مدت کے اختتام پر وہیں قیام پذیر ہیں۔ان سے میرے روابط ایک پشت پرانے ہیں یعنی ان کے والد محمد عثمانی صاحب کلکتہ میں میرے ہم عصر صحافی تھی۔ صحافت جیسے نیم سیاسی گویا دنیاداری کے پیشے سے وابستگی کے باوجود وہ اپنے ظاہر و باطن میں مکمل صوفی تھے۔ غالباً ۱۹۶۹ء میں وہ مکہ چلے گئے لیکن وقفہ وقفہ سے اپنے بیٹے محسن عثمانی کے یہاں دہلی آتے رہے جو آل انڈیا ریڈیو اور جے این یو میں عربی کے شعبوں سے گزر رہے

تھے۔ عثمانی صاحب دہلی تشریف لاتے تو کچھ عرصہ قیام کرتے اس دوران ان کے یہاں نشستیں ہوتیں اور مقالے پڑھے جاتے۔ ان کے فرزند محسن عثمانی صاحب اب تک اس تعلق کو نبھاتے جارہے ہیں۔ حیدرآباد سے بھی اور دہلی آتے ہیں تو بھی۔

حیدرآباد میں حسین ساگر شہر میں صاف پانی کی فراہمی کے وسیلے کے طور پر شہرت کا حامل ہے تو سالار جنگ میوزیم اپنی لاثانی خصوصیات کی وجہ سے۔ یوں تو میں نے کلکتہ اور دہلی سے لے کر واشنگٹن تک کئی بڑے میوزیم دیکھے ہیں لیکن سالار جنگ میوزیم اپنی الگ شناخت رکھتا ہے۔ یہ صرف ایک فرد واحد کے احساسات لطیف کا مظہر ہے اس میں داخل ہوتے ہی ایک بڑے کشادہ صحن کے دوسرے کنارے پر لگے ہوئے گھڑیال میں وقت کا گھنٹہ بجانے کے لیے ایک حاجب اپنے کیبن سے نکل کر گھنٹہ بجاتا ہے اور پھر واپس جاکر خود کو بند کرلیتا ہے۔ چونکہ گیارہ بارہ بجے اس کو بجانے کا وقف لمبا ہوتا ہے اس لیے اس وقت سارا صحن تماشا بینوں سے کھچا کھچ بھرا ہوتا ہے۔ اس کے بعد حسن کی جلوہ سامانیاں اور فکر کی جولانیاں چار پانچ منزلوں پر محیط ہیں اور چشم تماشا حیراں ہے کہ ''دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں''۔

حیدرآباد والوں کا کہنا ہے کہ جتنی قسم کی روٹیاں وہاں ملتی ہیں کہیں اور نہیں ملتیں۔ شاید انھوں نے طرح طرح کے بسکٹوں کو بھی روٹیوں میں شمار کرلیا ہو، یوں نوابوں کے شہر میں نانہائے قشنگ کا ہونا امکان سے کچھ بعید بھی نہیں۔ میرے مشاہدے میں حیدرآباد جیسے شریفے کہیں اور دیکھنے میں نہیں آتے۔ بہت بڑے بڑے اور نہایت لذیذ۔ وہاں اس کو سیتا پھل کہتے ہیں اور شاید اس کی پیداوار بھی بکثرت ہوتی ہے۔ ایک اسٹیشن ہی کا نام سیتا پھل منڈی تھا۔ شاید یہ پھل زیادہ ٹکاؤ نہیں ہوتا اس لیے دہلی تک نہیں آتا تھا اب گزشتہ دو سال سے یہاں دیکھ رہا ہوں لیکن کافی مہنگا ہے یوں کون سی چیز سستی ہے انسانی جان کے سوا۔ ایک بار مجھے وہاں کے شریفے دہلی والوں کو دکھانے اور چکھانے کا خیال آیا تو واپس روانگی سے پہلے معظم جاہی مارکیٹ جاکر ایک ٹوکری شریفے لیے اور اس

کو بیگج میں رکھوا کر دو گھنٹے میں دہلی لایا۔

حیدرآباد سے متعلق ایک تجربہ بڑا دلچسپ ہوا۔ جب پہلے پہل گیا تو جس آٹو والے کو روک کر کہیں جانے کو کہوں تو وہ نفی میں سر ہلا دیا کرتا تھا۔ مجھے بڑی حیرت تھی کہ آخر یہ کہاں جاتے ہوں گے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ دائیں بائیں گردن گھمانا جسے ہم نفی یا انکار کا اشارہ سمجھتے تھے وہ دراصل وہاں اثبات یعنی ''ہاں'' کا اشارہ تھا۔ وہاں کے سائیکل رکشے بھی بڑے دلچسپ ہیں سیٹ اتنی نیچی ہوتی ہے کہ آپ صرف پالتی مار کر بیٹھ سکتے ہیں۔

میرے سب سے چھوٹے بھائی پروفیسر فیضان اللہ فاروقی حیدرآباد میں مشہور ادارہ سی آئی ایف ایل میں چار سال عربی کے پروفیسر رہے۔ اس دوران حیدرآباد میں انہی کے ہاں میں قیام کرتا تھا۔ وہ وہاں سے دہلی کی جے این یو میں آ گئے تھے۔ کوئی دو سال قبل عربی کے ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ ابھی حال ہی میں مختصر سی علالت کے بعد معبودِ حقیقی سے جا ملے۔

حیدرآباد کے اخبار ''رہنمائے دکن'' کو میں نے امریکہ کے دو شہروں کی لائبریریوں میں دیکھا ایک تو جنوب کے شہر ہیوسٹن کے اسلامک سینٹر کی لائبریری میں اور دوسرے شمالی شہر شکاگو کے مسلم کمیونٹی سینٹر کی لائبریری میں۔ ان دونوں لائبریریوں میں ایک اور اردو اخبار دہلی کا ''دعوت'' دیکھا۔ میں امریکہ کے جس شہر میں بھی گیا وہاں اصحاب حیدرآباد کو موجود پایا۔ اس کا سبب میں نے شکاگو یونیورسٹی میں سیاسیات کے پروفیسر اسد حسین سے دریافت کیا۔ وہ پٹنہ کے رہنے والے تھے۔ ان سے میری ملاقات پٹنہ ہی میں ہو چکی تھی اس وقت وہ غلام سرور کے اخبار 'سنگم' میں کام کرتے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ جب ۱۹۴۸ء میں حیدرآباد میں پولیس ایکشن ہوا تو وہاں کے جو لوگ بھاگ سکتے تھے بھاگ نکلے اور ان کے اسباب و وسائل جہاں تک لے جا سکے چلے گئے، چنانچہ امریکہ بھی بہت لوگ آئے اور یہاں کے شہروں میں پھیلتے گئے۔ ہیوسٹن میں مجھے ایک نوجوان حیدرآبادی ڈاکٹر بھی ملا اس نے بتایا کہ وہ اپنے والدین کو لانے والا ہے۔

بنگلور:

دہلی سے تین گھنٹے کے ہوائی فاصلے پر بنگلور جہاں مسلمانوں کی سوجھ بوجھ اور دانشوری نے آڑے وقتوں میں بھی مثالی کام کیے۔ اس زمانے میں اربابِ ثلاثہ تھے ابراہیم خلیل اللہ صاحب، ڈاکٹر ممتاز حمد خاں اور کے. رحمٰن خاں صاحب۔ اول الذکر کی وفات کو تو بہت عرصہ ہوگیا۔ ڈاکٹر صاحب بہت ضعیف اور کمزور ہو چکے ہیں اور کے رحمٰن خاں صاحب کو بھی راجیہ سبھا کی ممبر شپ سے ریٹائر ہوئے ایک عرصہ ہوگیا۔ امید ہے بخیریت ہوں گے۔ ان حضرات نے ملت کے لیے بڑے تعمیری اور دور رس کام کیے۔ اوقاف کی زمین پر تجارتی اداروں کے مصرف کی تعمیرات کیں اور ان کی آمدنی سے طلبہ اور طالبات کے لیے کالج قائم کیے۔ میں نے ڈاکٹر ممتاز احمد خاں صاحب سے کہا کہ دہلی میں اوقاف کی نہ معلوم کتنی جائدادیں ہیں اور نہ معلوم کتنی جائدادوں پر اغیار کا قبضہ ہوگیا ہے۔ دہلی والوں کو بھی کچھ مشورے دیں۔ انھوں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ کچھ عرصہ بعد مجھے معلوم ہوا کہ وہ دہلی تشریف لائے تھے اور ذاکر نگر میں ہفتہ وار ہجوم کے دفتر میں مقامی لوگوں کے ساتھ ان کی میٹنگ ہوئی تھی لیکن عملاً کچھ نظر نہیں آیا۔ پھر اگلی بار بنگلور گیا اور ڈاکٹر صاحب سے دریافت کیا تو انھوں نے کہا کہ میں نے ایک ابتدا کے طور پر مشورہ دیا تھا کہ دو کمرے کرائے پر لے لیں، ایک میں لڑکوں کو ٹائپ کی ٹریننگ شروع کریں اور دوسرے میں لڑکیوں کو کٹنگ اور سلائی کی ٹریننگ اور اس کے ابتدائی اخراجات فراہم کرنے کا وعدہ کیا تھا لیکن پھر کچھ سننے ہی میں نہیں آیا۔

بنگلور نہایت صاف ستھرا پرسکون شہر تھا لیکن اب تو سنا ہے کہ وہاں بھی ٹریفک جام ہونے لگا۔ فسادات کی خبریں بھی آنے لگیں۔ وہاں کامرس اسٹریٹ پر ایک کیوریوشاپ تھی میں جب جاتا وہاں سے کوئی نہ کوئی آئیٹم خرید کر لاتا جس کے کوئی ایک درجن نمونے میرے گھر میں موجود ہیں۔ وہاں کندہ کاری کی ہوئی نقاشی کے بڑے اچھے نمونے دیکھنے کو ملے۔ ہاتھی دانت کی کندہ کاری کے نمونہ تو بہت قیمتی تھے لیکن مختلف

لکڑیوں کی کندہ کاری کے نمونے نسبتاً کم قیمت کے تھے۔ اب تو بنگلور گئے ہوئے زمانے گزر گئے لیکن آثارِ قدیمہ کے طور پر ایک ملاقاتی بزرگ اب بھی موجود ہیں وہ ہیں ''اسلامک وائس'' کے ایڈیٹر جناب مقبول احمد سراج، وہ پہلے دہلی میں ایک فیچر ایجنسی ''فیچر اینڈ نیوز الائنس'' (فانا) کے ایڈیٹر تھے۔ میں نے ریٹائرمنٹ کے بعد اس ادارے کے لیے کچھ آرٹیکل بھی لکھے تھے۔ اپنی سروس کے اواخر میں انھیں بھی امریکہ جانے والے صحافیوں کے طور پر میں نے نامزد کیا تھا، وہ میرے ریٹائرمنٹ کے بعد گئے۔ اردو روزنامہ 'سالار' کے تذکرے کے بغیر شاید بنگلور کا تذکرہ نامکمل ہوگا۔ اردو زبان کے معروف مراکز سے اتنی دور زبان وادب وصحافت کی خدمات کی جتنی بھی داد دی جائے کم ہے۔

مدراس:

جنوبی ہند کے اسی خطے میں واقع مدراس بھی جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں سے ایک بہت پرانا چھوٹا سا اردو اخبار ''مسلمان'' شائع ہوتا تھا۔ لیکن اس دور افتاد اور بظاہر چھوٹے سے اخبار کے ایڈیٹر فاروقی صاحب کی شخصیت اتنی قدآور تھی کہ آزادی سے پہلے بڑے بڑے مسلم لیگی لیڈروں کے ہم پلہ تھی اور وہ ۱۹۴۶ء میں قائم ہونے والی مخلوط حکومت کے زمانے میں اس وقت کی پارلیمنٹ کے ممبر بھی تھے جو دستور ساز اسمبلی کی حیثیت میں بھی کام کر رہی تھی۔ ان سے نیاز حاصل کرنے کا مجھے بے حد اشتیاق تھا۔ وہ نوے کی سرحدیں پار کر چکے تھے لیکن اخبار کے دفتر کے اوقات کی پابندی کرتے تھے۔ میں نے جب ان کے دفتر سے رابطہ کیا تو منیجر سید فضل اللہ صاحب نے بتایا کہ وہ ٹھیک پانچ بجے اٹھ جاتے ہیں اس سے پہلے آپ آسکتے ہیں۔ چنانچہ میں حاضر ہوا۔ اپنا تعارف کرایا، وہ بڑے اخلاق سے ملے۔ لیکن اس مختصر سی ملاقات میں بھی اپنے تجسس کی وجہ سے ان سے ایک سوال کر ہی بیٹھا کہ آپ یہاں مدراس میں کب اور کیسے تشریف لائے تو انھوں نے بتایا کہ ہم لوگ کٹرا، الٰہ آباد، یوپی کے رہنے والے تھے۔ والد کسی سرکاری ملازمت میں تھے ان کا تقرر مدراس میں ہوگیا بس ہم لوگ یہیں کے ہوکر رہ گئے۔

یہاں ایک طویل کہانی چند جملوں میں بیان کردوں۔ آزاد ہندوستان میں پہلے مسلمان ایف آر سی ایس ڈاکٹر مقبول احمد صاحب نے کلکتہ میں میڈیکل کی تعلیم حاصل کی تھی پھر وہیں کے ہوکر رہ گئے۔ وہ میرے ہم وطن تھے یعنی اعظم گڑھ کے رہنے والے تھے۔ میں نے ان کی دو تصنیفات کا اردو سے انگریزی میں ترجمہ کیا۔ پہلی تو کتابی شکل میں شائع ہوگئی۔ دوسری کتاب ان کی خودنوشت سوانح عمری تھی اس کا ترجمہ مکمل ہونے سے پہلے وہ کناڈا چلے گئے جہاں ان کی بیٹی داماد تھے۔ بہت علیل تھے دل کے مریض تھے کناڈا سے امریکہ چلے گئے جہاں ان کے بیٹے ڈاکٹر تھے۔ وہیں ان کا انتقال ہوگیا۔ ان کے انتقال سے پہلے ان کی کتاب کا ترجمہ تو مکمل ہو چکا تھا جو منوسکرپٹ کی صورت میں اب تک میرے پاس پڑا ہے ان کے لواحقین نے اس کی اشاعت ضروری نہیں سمجھی۔ میری ساری محنت رائیگاں ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھے کناڈا کا جو پتہ دیا تھا وہ ''فرخی'' صاحب کا تھا۔ جن کا پس منظر جو ڈاکٹر صاحب کی تصنیف سے معلوم ہوا یہ تھا کہ وہ حیدرآباد میں کسی پولیس افسر ''فرخی'' صاحب کے بیٹے تھے جو مدراس میں ''فاروقی'' صاحب کے صاحبزادے تھے۔ بس میں ساری بات سمجھ گیا۔ حیدرآباد میں 'ق'' کا تلفظ ''خ'' ہوتا ہے اس لیے فاروقی کا فاروخی یا انگریزی میں 'فرخی' ہوگیا۔

مدراس میں مسلمانوں کی آبادی والا ایک علاقہ والا جاہ روڈ کا تھا۔ وہیں ''مسلمان'' اخبار کا دفتر تھا۔ وہیں دو اور چھوٹے چھوٹے اردو اخبارات کے دفاتر تھے جن میں سے ایک کا نام ''اتحاد'' تھا۔ میرا قیام تو تاج کورومنڈل ہوٹل میں تھا لیکن سید فضل اللہ صاحب رات کے کھانے پر والا جاہ روڈ کے کسی مسلم ہوٹل میں لے گئے وہاں سارا منظر اندر سے باہر تک کلکتہ میں کیلا بگان کا سا تھا۔

وہاں کے آثار قدیمہ میں وہ برطانوی جہاز بھی دیکھا جو ساحل کے قریب ہی کسی زمانے میں غرق ہوا ہوگا لیکن اس کو اسی نیمے دروں نیمے بروں حالت میں نہ معلوم کیوں چھوڑ دیا گیا تھا۔

پنجاب:

دہلی کے اردو اخبارات پرتاپ، ملاپ اور تیج اور پنجابی زبان کا اخبار ''اجیت'' جالندھر سے بھی شائع ہوتے تھے ان کے علاوہ اردو کا سب سے زیادہ شائع ہونے والا اخبار 'ہند سماچار' بھی جالندھر سے شائع ہوتا تھا۔ 'اجیت' کا اردو ایڈیشن بھی جالندھر سے شائع ہوتا تھا جس کے ایڈیٹر سادھو سنگھ ہمدرد بڑے دلچسپ آدمی تھے۔ ان کو شعر و شاعری کا بھی اچھا ذوق تھا۔ میں کبھی کبھی جالندھر کا پروگرام بھی بنالیا کرتا تھا۔ وہاں ان اخباروں کی موجودگی کی وجہ سے سکھ سیاست بڑی گرم تھی اسی کا نتیجہ تھا کہ ہند سماچار کے بانی ایڈیٹر لالہ جگت نرائن کا قتل ہوا پھر ان کے جانشین بڑے صاحبزادے رمیش چندر بھی شہید ہوئے۔ ان کے بعد ان کے چھوٹے بھائی وجے کمار جی نے اس بوجھ کو سنبھالا۔ ان کا دفتر اور گھر جس گلی میں واقع تھا اس کے شروع میں ہی دونوں طرف کھمبے گاڑ کر اور زنجیر لگا کر اس راستے کو مسدود کر دیا گیا تھا۔ وہاں ان کے گیٹ پر ایک مسلح گارڈ رہتا تھا۔ وہاں جانے پر گارڈ اوپر اطلاع دیتا تھا اور اجازت ملنے کے بعد اوپر جانے کی اجازت دیتا تھا۔

جالندھر کے لیے کوئی ہوائی سروس نہ تھی اس لیے ٹرین سے جانا پڑتا تھا اور ہمارے آفس کا ٹریول سیکشن ریلوے سے کوئی واسطہ نہیں رکھتا تھا اس لیے ٹرین سے سفر کے لیے ریزرویشن وغیرہ خود ہی کرانا پڑتا تھا۔ ایک بار جنوری میں جالندھر جانے کا اتفاق ہوا اور وہاں سے چنڈی گڑھ جانا تھا۔ جہاں کسی پروگرام کے سلسلے میں ہمارے انگلش اور ہندی ایڈیٹر پہلے سے موجود تھے۔ اس بار ٹریویل سیکشن نے مشورہ دیا کہ لدھیانہ کے لیے ہوائی سروس ہے تو وہاں چلے جاؤ اور وہاں سے ٹیکسی سے جالندھر چلے جانا۔ دہلی اور لدھیانہ کے درمیان ورایودوت کی سروس تھی۔ یہ بہت چھوٹا ہوائی جہاز تھا جس میں غالباً ۲۰-۲۵ مسافروں کو تہہ کر کے بیٹھا دیا جاتا اور آدھے گھنٹے کے اس سفر کے دوران انھیں ہلنے کی بھی اجازت نہ تھی۔ یہ ایک دلچسپ تجربہ تھا۔ اس وقت تک میں ہندوستان میں زیرِ استعمال تقریباً ہر طرح کے ہوائی جہازوں میں سفر کر چکا تھا۔

واپسی چنڈی گڑھ سے ہونے کو تھی وہاں کا ہوائی اڈہ ہریانہ کی حدود میں واقع تھا، اب نہیں معلوم کیا صورت ہے، جس روز صبح کو ہم تینوں ایڈیٹروں کو واپس آنا تھا اس روز ہریانہ میں عام ہڑتال تھی چنانچہ ہم لوگوں کو صبح چھ بجے ہڑتال شروع ہونے سے پہلے ہوائی اڈے پہنچنا پڑا۔ وہاں پہنچنے پر ہوائی اڈے کے اسٹاف نے بتایا کہ اس فلائٹ میں جگہ نہیں ہے۔ اب بڑی پریشانی ہوئی کہ ہم لوگ کہیں کے نہ ہوئے۔ بس ایک حکمت سوجھی۔ ہندی ایڈیٹر جو اپنے پورے حلیے سے کوئی نیتا معلوم ہوتے تھے۔ منیجر کے کمرے میں گئے اور کہا کہ دہلی کی امریکن ایمبسی میں ایک بہت اہم میٹنگ میں شرکت کے لیے ہم لوگوں کو جانا ہے اس کا کوئی انتظام کیجیے۔ بس ذرا دیر بعد انھوں نے سیٹوں کی فراہمی کا انتظام کر دیا۔ دہلی سے باہر اس طرح کی ہڑتال میں چھوٹے شہروں میں پھنسنے کے، اس کے علاوہ دو اور تجربے مجھے ہوئے، ایک گورکھ پور میں دوسرا رانچی میں۔ پنجاب کے اس سفر میں مجھے یہ بھی تجربہ ہوا کہ دہلی کی سردی شمالی ہند کے دوسرے علاقوں سے کتنی مختلف ہے۔ مجھے یہ تجربہ اسلام آباد اور پیشاور تک اتفاق سے جنوری کے مہینے میں ہی ہوا۔

فردوس بر روئے زمیں:

اب بات کریں اس بیکنٹھ کی جس کو ہم انسانوں نے نرک بنا رکھا ہے۔ جیسا کہ لکھ چکا ہوں گرمیوں میں کشمیر کا رخ کرتا تھا یا ہمارے آفس کا وہاں کوئی پروگرام ہوتا تھا تو میں بھی اس میں شریک ہو جایا کرتا تھا۔ کشمیر سے میری مراد سری نگر ہے اور کہیں جانے کو جی نہیں چاہتا تھا کیونکہ اسی جگہ میری تفریح اور دلبستگی کے اتنے سامان تھے کہ کہیں اور جانے کو جی نہیں چاہتا تھا، پھر وہاں آتے جاتے اتنا مانوس ہو گیا تھا کہ حسن نظارہ میں بھی کوئی نیا پن نہیں رہ گیا تھا۔ چنانچہ جو وقت بھی ملتا وہیں صحبتوں میں گزارتا۔

کشمیر میں اردو اخباروں کی تعداد درجنوں میں رہی ہوگی جن کا اصل مرکز سرینگر تھا۔ اس کے علاوہ جموں سے بھی کچھ اخبارات شائع ہوتے تھے۔ اکا دکا کہیں اور بھی رہے ہوں گے۔ سرینگر میں خاص طور سے قابل ذکر روزنامہ 'آفتاب'، 'سری نگر ٹائمز' اور 'خدمت'

تھے۔ آخر الذکر پنڈت وطل صاحب کا اخبار کانگریس پارٹی کا ترجمان خیال کیا جاتا تھا۔ وطل صاحب بذات خود نہایت خوش مزاج تھے اور بڑے اخلاق سے ملتے تھے۔ ان روزناموں کے علاوہ طاہر محی الدین کا ہفتہ وار ''چٹان'' اور سابق ایم پی شمیم احمد شمیم کا ''آئینہ'' تھا جس کے کرتا دھرتا ان کے بعد ان کے بھانجے ظفر معراج تھے۔ ان اخباروں سے قطع نظر یوسف جمیل، ظفر معراج اور طاہر محی الدین جیسے نوجوان صحافیوں سے بھی مجھے خاص تعلق خاطر تھا۔ آگے چل کر موہن چراغی قومی آواز اور نیشنل ہیرالڈ کے نامہ نگار کی حیثیت سے اپنے وطن سرینگر واپس آ کر 'آئینہ' کے دفتر میں کرسی نشین ہو گئے۔

یوسف جمیل سے پہلی ملاقات 'آفتاب' کے دفتر میں ہوئی تھی اسی وقت میں نے ان کو کشمیر کے باہر کے اخبارات کے لیے لکھنے کا مشورہ دیا جس پر انھوں نے فوراً عمل شروع کر دیا پھر 'بلٹز' بمبئی اور ایک ایک کر کے کئی اخباروں کی نامہ نگاری ان کے نام لکھ گئی۔ ان اخباروں میں غالباً 'خلیج ٹائمز' بھی شامل تھا۔ آگے چل کر وہ بی بی سی کے نامہ نگار ہو گئے اور کچھ عرصہ لندن میں بھی رہے اب تو وہ بھی بزرگ صحافیوں کی صف میں آ گئے ہوں گے۔ ایک بار وہ میری علالت کی خبر پا کر عیادت کے لیے بھی میرے گھر تک آ گئے تھے۔ ان صحافیوں کے علاوہ سرینگر میں ایک بڑی شخصیت مظہر امام صاحب کی تھی جو دور درشن سرینگر کے ڈائریکٹر تھے۔ وہ سرینگر سے میرے تائب ہونے کے بعد ریٹائر ہوئے۔ سرینگر میں قیام کی آخری شام انہی کی رہائش پر دیر تک بیٹھتا اور اکثر رات کے کھانے کے بعد ہی واپس آتا۔ امام صاحب اور میں ۱۹۵۱ء میں چند مہینے آگے پیچھے کلکتہ میں وارد ہوئے تھے۔ ہم دونوں نے اردو اخباروں سے کیریئر کی ابتدا کی لیکن وہ اسکول میں مدرسی کی طرف بڑھ گئے اور وہیں سے مرکزی شعبۂ اطلاعات میں پہنچ گئے۔ اس کے بعد عجیب اتفاق رہا کہ جہاں جہاں ان کی پوسٹنگ ہوئی میں پہنچتا رہا۔ آل انڈیا ریڈیو گوہاٹی، پٹنہ اور آخر میں دور درشن سرینگر اور بالکل آخر میں ریٹائرمنٹ کے بعد دہلی میں۔ ان کے علاوہ عبید صدیقی بھی آل انڈیا ریڈیو دہلی سے ٹرانسفر ہو کر سرینگر پہنچ گئے تھے۔ ایک دن دہلی

میں وہ اچانک میرے گھر پہنچے اور کہنے لگے کہ بی بی سی میں انٹرویو ہے۔ پھر ہم لوگوں نے کوئی ایک گھنٹے اس موضوع پر گفتگو کی اور پھر وہ بی بی سی کے ہوگئے اور سات آٹھ سال لندن میں گزارنے کے بعد دہلی واپسی پر جامعہ ملیہ کی ماس کمیونی کیشن انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ یہاں بھی ان سے ملاقاتیں ہوتی رہیں۔

ابھی سرینگر کے تجربات کا بیان باقی ہے۔ مجھے ہندوستان میں جتنے ہوائی اڈوں سے سابقہ پڑا ان میں سب سے زیادہ پریشان کن سرینگر کا ہوائی اڈہ تھا۔ وہاں میں نے ایک مدراسی مسافر کو بھوں بھوں روتے ہوئے دیکھا۔ وہ اپنی فیملی کے ساتھ تھا، دہلی کے لیے واپسی کا ریزرویشن اس کا کنفرم تھا لیکن ہوائی اڈے کا اسٹاف کہہ رہا تھا کہ ہمارے پاس کنفرمیشن کی اطلاع نہیں ہے وہ چلا رہا تھا کہ دہلی سے مدراس کے لیے فلائٹ میں میرا ریزرویشن ہے وہ فلائٹ چھوٹ جائے گی۔ میں بھی کئی بار ایسی صورت حال سے دوچار ہوا۔ شاید وہاں کے اسٹاف کا یہ کمائی کا دھندا رہا ہو۔

میرے ساتھ ایک بار یہ معاملہ ہوا کہ میرا واپسی کا ٹکٹ دہلی سے ہی کنفرم کیا ہوا تھا لیکن واپسی سے ایک دن پہلے میں انڈین ایئر لائنز کے سٹی آفس میں اس کو ری کنفرم کرانے گیا تو وہاں انھوں نے کہا کہ ہمارے پاس اس کے کنفرمیشن کی اطلاع نہیں ہے اور سیٹ بھی نہیں ہے میں وہاں سے نکل کر شہر کی طرف دوڑا کہ کسی کی مدد لوں وہاں لال چوک پر ایک ہنگامہ برپا تھا پولیس بھیڑ کو دوڑا رہی تھی اور لوگ ہر طرف بھاگتے پھر رہے تھے میں بھی ایک بھیڑ میں گھس کر بھاگا اس میں ظفر معراج کا چہرہ نظر آیا۔ میں نے ان کو پکڑ کر اپنی مشکل بیان کی۔ انھوں نے کہا کہ آپ اپنا ٹکٹ مجھے دے دیجیے اور جایئے۔ میں ہوٹل آ گیا۔ لیکن سوچنے لگا کہ ان حالات میں یہ میرا حد سے زیادہ اعتماد تھا یا عین بیوقوفی مگر دو تین گھنٹے بعد وہ اللہ کا بندہ میرے ہوٹل میں آیا اور ٹکٹ کنفرم کرا کے مجھے دے گیا۔

دوسرا واقعہ بھی اسی طرح کا ہوا۔ سٹی آفس نے کنفرم ٹکٹ کو ری کنفرم کرنے اور سیٹ دینے سے انکار کر دیا۔ میں دور درشن کے آفس میں مظہر امام صاحب کے پاس پہنچا۔

ہر فلائٹ میں دور درشن کی ایک سیٹ ریزرو ہوتی تھی۔ میں نے ان سے گزارش کی کہ مجھے ایک سیٹ دے دیں۔ انھوں نے کہا کہ آج تو وہ سیٹ خالی نہیں ہے، کل دے سکتے ہیں۔ چنانچہ اگلے دن کی فلائٹ میں وہ ریزروسیٹ انھوں نے مجھے دے دی لیکن ہوٹل سے چک آؤٹ کر کے جب ایئر پورٹ پر پہنچا تو وہاں کے اسٹاف نے صاف انکار کر دیا کہ ہمیں اس کی کوئی اطلاع نہیں ملی ہے۔ تب میں اپنی اٹیچی لیے ہوئے منیجر کے کمرے میں چلا گیا اور ان سے کہا کہ یہ دور درشن کی ریزروسیٹ ہے کاؤنٹر کا اسٹاف یہ سیٹ دینے سے انکار کر رہا ہے اب آپ تحریری طور پر اس کی وجہ بتائیے۔ تب وہ سٹ پٹایا لیکن کچھ دور بیٹھا ہوا ایک شخص غور سے یہ سب دیکھ سن رہا تھا، غالباً وہ انٹلی جینس کا آدمی تھا۔ اس نے انگریزی میں مجھ سے پوچھا کہ آپ کون ہیں، یہ بتائیے۔ میں نے اس کو زور سے ڈانٹا کہ آپ خاموش رہیں آپ سے کوئی مطلب نہیں۔ میں منیجر سے صرف اتنا کہہ رہا ہوں کہ وہ دور درشن کی سیٹ نہیں دے رہے ہیں، وہ اس انکار کو تحریر میں دیں اور جب تک وہ تحریر نہیں دیں گے میں یہاں سے کہیں جاؤں گا۔ تب وہ بیچارہ بہت گھبرایا اور کسی کو آواز دے کر بلایا اور اس سے کہا کہ ان کا سامان لے کر کاؤنٹر پر جاؤ۔

سرینگر میں عموماً براڈوے ہوٹل میں ٹھہرتا تھا، ہی نیڈوز ہوٹل تھا جو پرانے بنگلوں کی طرح کھلا ہوا اور پھیلا ہوا تھا اس میں ایک بار ٹھہرنے کا اتفاق ہوا۔ صبح کو ناشتے کے لیے اپنے کمرے سے نکل کر ڈائننگ ہال تک گیا تو چکر آنے لگا شاید ٹھنڈ کی وجہ سے۔ بھاگ کر کمرے میں آیا مفلر لپیٹ کر لیٹ گیا اور پھر کمرے میں ہی ناشتہ کھانا کرتا رہا۔

ایک بار سرینگر میں کوئی پروگرام تھا اس سلسلے میں ہمارے ڈائریکٹر صاحب اور پریس چیف ٹونی جیسوداسن مجھ سے ایک دن پہلے وہاں پہنچ گئے تھے۔ میں جب پہنچا اور ہوائی اڈے سے باہر نکلنے لگا تو ایک شخص لپک کر آیا اور اس نے اپنا کارڈ دکھایا وہ کسی ہاؤس بوٹ کا مالک تھا۔ اس نے بتایا کہ ہمارے ڈائریکٹر صاحب اور پریس چیف ان کے ہاؤس بوٹ میں ٹھہرے ہیں اور آپ کے لیے بھی بک کرالیا ہے چنانچہ اس نے میری اٹیچی لی اور

گاڑی میں رکھ کر چل پڑا اور اپنے ہاؤس بوٹ میں لے جا کر ٹھہرایا۔ یہ ہاؤس بوٹ دراصل ایک مکمل سوٹ ہوتے ہیں جس میں ہر طرح کی آسائش کا معہ ٹیلیفون اہتمام ہوتا ہے۔ بوٹ والا مکمل میزبان کی طرح برتتا ہے۔ کھانا ناشتہ چائے سب وقت وقت پر ملتا رہتا ہے۔اور ایک چھوٹی سی کشتی جس کو شکارا کہتے ہیں اس ہاؤس بوٹ سے لگی ہوتی ہے تا کہ جب اور جہاں آنا جانا چاہیں جاسکیں۔ میں لنچ گھر سے لے کر گیا تھا۔ اطمینان سے کھا پی کر فارغ ہی ہوا تھا کہ ڈائرکٹر صاحب کا فون آیا۔ انھوں نے بلایا تھا۔ وہاں گیا تو وہ اور ٹونی وغیرہ لنچ سے فارغ ہو چکے تھے اور مجھ سے کھانے کے لیے اصرار کرنے لگے۔ میں نے معذرت کی تو ایک قہقہہ لگایا کہ کھاتے نہیں ہو اسی لیے تو اتنے دبلے ہو۔ خیر!

شام کو براڈوے ہوٹل میں ایک پریس کانفرنس تھی۔ وہاں کھانا پینا چل رہا تھا کہ اچانک تیز ہوائیں چلنے لگیں اور بوندا باندی بھی شروع ہوگئی اور ٹھنڈک بھی بڑھ گئی۔ میں پریشان تھا کہ پتہ نہیں ہاؤس بوٹ میں کیا ہوگا۔ مظہر امام صاحب موجود تھے میں نے کہا کہ بھائی آپ مجھے یہاں سے اغوا کر کے اپنے گھر لیے چلئے۔ پھر خیال ہوا کہ یہاں بیٹھے رہنے سے بہتر ہے کہ اپنی بوٹ میں چلیں وہاں لپیٹ سپیٹ کر پڑے رہیں گے۔ چنانچہ ایک آٹو میں چل کر گھاٹ پر پہنچا جہاں سب شکارے موجود تھے۔ دیکھا کہ سب بوٹ کے شکارے ایک لائن سے کھڑے تھے اور سب ایک سلسلے میں بندھے ہوئے تھے۔ میں نے جب اپنی کشتی میں جانے کو کہا تو انھوں نے بتایا کہ ابھی تیز ہوائیں چل رہی ہیں جو شکارا الگ ہوگا الٹ جائے گا اس لیے سب ایک ساتھ چلیں گے اور لوگوں کو بھی آجانے دیجیے۔ پھر تو ہم کہیں کہ نہ ہوئے، وہیں منڈیر پر بیٹھے ہوا کھاتے رہے اور ہلکی بوندا باندی ہوتی رہی۔ کافی دیر کے بعد جب باقی لوگ آگئے تو یہ شکارے روانہ ہوئے اور سب کو اپنے اپنے ہاؤس بوٹ میں چھوڑتے گئے۔ اس کے بعد رات بھر بوٹ چوں چاں کرتی ڈگمگاتی رہی لیکن صبح کا منظر کیا بیان کروں۔ دور دور تک ڈل جھیل کے کنارے اونچے اونچے درختوں کی قطاریں وجد میں اور ہمارے ہاؤس بوٹ کے اطراف میں مختلف سامان بیچنے والے

کشتیوں پر بازار کا منظر لیے ہوئے جن میں پھولوں سے لدی ہوئی دولہن جیسی کشتیاں بھی۔

اگلا تجربہ سنتور ہوٹل میں قیام کا ہوا جو اس جیسا ہی تھا اور اس کے برعکس بھی۔ ایک امریکی گٹارنواز اپنی موسیقی کے ذریعے اردو اشعار بھی پیش کرتے تھے۔ ہمارے آفس نے ان کا ایک پروگرام سرینگر کے سنتور ہوٹل میں رکھا۔ میں تو سرینگر کے ہر پروگرام میں خود کو نتھی کرنے کی کوشش کرتا تھا چنانچہ اس پروگرام کا انتظام کرنے والوں کے ساتھ میں بھی اسی سنتور ہوٹل میں ٹھہرا جس کا بڑا وسیع صحن پھیلتا ہوا ڈل جھیل کے پانیوں میں چلا گیا تھا اس سے زیادہ کچھ کہنا سعی لاحاصل ہے۔ اس صحن میں ایک جگمگاتی ہوئی شام کو وہ پروگرام تھا۔ اس کا تصور ہر کوئی اپنے فکری آفاق کی حدوں تک کرسکتا ہے۔

بس ایک بات بتا کر کشمیر کا تذکرہ ختم کرنا چاہتا ہوں۔ حضرت بل کی زیارت گاہ کے آر کی ٹکٹ ہمارے ہی محلّہ اوکھلا میں رہا کرتے تھے۔ میں نے اس فردوس گم گشتہ کا آخری دیدار ۱۹۸۹ء میں کیا تھا۔

☆☆☆

جنگِ افغانستان

افغانستان کی تاریخ تا حدِ نظر جنگ و جدال کی تاریخ ہے۔ قدرتی وسائل کی فراوانی کے درمیان نوے فیصد سے زیادہ ناخواندہ اور غریب عوام کی تاریخ ہے لیکن فی الحال ہمیں ان سب سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ ۱۹۷۹ء سے ۱۹۸۹ء تک جاری روسیوں، یعنی سابق سوویٹ یونین کی دھما چوکڑی سے بھی صرف ان کے اجاڑے ہوئے افغان رفیوجیوں تک سروکار ہے۔ ان تیس لاکھ افغان رفیوجیوں سے سروکار ہے جو پاکستان میں آ گئے تھے۔ ان کے علاوہ تقریباً دس لاکھ افغان رفیوجی ایران میں بھی چلے گئے تھے۔

اس جنگ کے مختصر پس منظر کے دو پہلو ہیں ایک داخلی اور دوسرا خارجی۔ داخلی یہ کہ ۱۹۷۳ء میں افغان حکمراں ظاہر شاہ کی حکومت کا تختہ پلٹنے اور ان کے جزیرہ سسلی میں جلاوطنی اختیار کرنے کے بعد کئی برس تک ملک میں جاری اقتدار کے لیے اٹھا پٹک اور بالآخر کمیونسٹوں کا غلبہ جن کو سوویٹ یونین کی پشت پناہی حاصل ہونا لازمی تھا اور یہ بات سوویٹ یونین کے دیگر عزائم میں بھی معاون تھی۔ یہ دوسرا پہلو تھا۔ قصہ یوں ہے کہ سوویٹ بحریہ کے لیے بحرِ ہند تک پہنچنے کا راستہ بہت طویل تھا یعنی بحرالکاہل (پیسفک اوشن) سے گزرتے ہوئے سارے مشرقِ بعید اور سنگاپور سے گزرنے کے بعد بحرِ ہند تک پہنچنا۔ چنانچہ اسے ہندوستان کے اطراف کے سمندروں تک رسائی کے لیے کسی متبادل راستے کی

مستقل تلاش تھی۔ وہ افغانستان کی طرف سے ہی ممکن ہوسکتی تھا۔ بشرطیکہ افغانستان پر اس کا غلبہ ہو۔ وہاں کمیونسٹوں کا اقتدار اس کے اس منصوبے کے حسب حال تھا چنانچہ اس نے ۱۹۷۹ء میں سویٹ فوجیوں کو افغانستان میں داخل کر دیا۔

روایت پسند مسلمان افغانوں کو کمیونسٹ حکمرانوں سے نفرت تھی اور ملک میں ترقیاتی کارروائیاں بھی سخت ناپسند تھیں ایسے میں سویٹ فوجوں کی آمد نے آگ پر تیل کا کام کیا۔ مختلف قبائل نے ان کے خلاف جہاد کا اعلان کر دیا جس نے بڑھ کر ایک طرح کی گوریلا جنگ کی شکل اختیار کر لی۔ پہاڑی علاقوں میں روسی فوجیں ٹینک وغیرہ اور بھاری اسلحہ استعمال نہیں کر سکتی تھیں اور چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں افغان ان کو بہت نقصان پہنچاتے رہے۔ ایسے میں روسیوں پر دباؤ بڑھانے کے لیے امریکہ کو ایک اچھا موقع مل گیا۔ اس نے بھی اپنی فوجیں بھیج دیں لیکن اس سے بھی بڑھ کر یہ بات ہوئی کہ انھوں نے افغانوں کو جو مجاہدین کے نام سے برسرِ جنگ تھے اسٹنگ میزائل فراہم کر دیے جو آسانی سے کندھوں پر ہر جگہ لے جائے جا سکتے تھے۔ یہ میزائل روسی ہیلی کوپٹروں کے لیے مہلک ثابت ہوئے۔ ان کو استعمال کرنے کے لیے مجاہدین کو بہت زیادہ ٹریننگ کی ضرورت بھی نہیں تھی۔

مزید برآں امریکیوں نے افغان نوجوانوں کو ویڈیو گرافی کی ٹریننگ دینی شروع کی، چنانچہ جنگ کے محاذوں سے تصویریں آنے لگیں، اس وقت تک دنیا کو جنگ افغانستان کی وجہ سے اصل نقصانات کی کوئی خاص خبر نہیں ملتی تھی۔ یہ ویڈیو دنیا بھر میں روسیوں کے خلاف رائے عامہ کو بیدار کرنے لگے گویا یہ ان کے خلاف ایک نیا اور بڑا حربہ ثابت ہوئے۔ بہرحال یہ جنگ کوئی دس برس تک کھنچ گئی۔ اس کی وجہ سے سویٹ یونین پر مالی دباؤ بہت بڑھ گیا جو یونہی سرد جنگ اور خلا پیمائی کی وجہ سے بہت بڑا بوجھ بن چکا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خود سویٹ یونین ٹوٹ کر بکھر گیا۔ کوئی نصف درجن ملک اس کی گرفت سے آزاد ہوگئے۔ افغانستان میں بھی قبائل اکٹھا ہوکر ملک کے حالات کو سدھارنے کی تدبیروں میں لگ گئے۔ ان میں سب سے بڑی تعداد پشتونوں کی تھی اس کے بعد روز بک

اور دری اور دیگر۔ پشتونوں کی بڑی آبادی سرحد کی دوسری طرف پاکستان میں بھی تھی۔

جنوری ۱۹۸۸ء میں جب جنگ اپنے آخری مرحلے میں تھی میرا پیشاور جانا ہوا جس کے اطراف میں افغان رفیوجیوں کے کیمپ تھے اور پاکستان آنے والے تیس لاکھ افغان رفیوجیوں کی بڑی اکثریت اسی علاقے میں آباد تھی۔ عرب ممالک ان کے لیے بہت بڑی مقدار میں امداد فراہم کر رہے تھے۔ انہی کی مدد سے کیمپوں کے علاوہ ہسپتال اور اسکول وغیرہ تعمیر کیے جا رہے تھے لیکن اس کے باوجود پاکستان کی معیشت اور معاشرے پر بڑا بوجھ تھا۔ وہاں کے سارے ادارے اتنا بڑا بوجھ وہ بھی اتنی مدت تک بالکل نہیں سنبھال سکتے تھے۔ چنانچہ ساری امدادی کوششوں کے باوجود ان رفیوجی کیمپوں کی حالت بڑی خراب تھی۔ سوڈان نے ہسپتال تعمیر کرائے تھے جہاں محاذ جنگ سے آنے والے زخمیوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ یہ زخمی تو جنگ کے بعد بھی بہت زمانے تک آتے رہے کیونکہ ہر طرف راستوں میں بارودی سرنگیں بچھی ہوئی تھیں۔ ان پر پاؤں پڑتے ہی پھٹ جاتی تھیں اور لوگ بری طرح زخمی ہو جاتے تھے۔

میں نے اپنے ڈائریکٹر صاحب سے ایک روز کہا کہ افغان رفیوجی کیمپ کے حالات کے بارے میں کوئی خاص رپورٹ نہیں آ رہی ہے بس انھوں نے فرمایا کہ تم خود ہی جا کر دیکھ آؤ۔ جنوری کے مہینے میں اس علاقے کی سردی کے تصور سے گھبرا رہا تھا مزید یہ کہ رفیوجیوں کے اس علاقے میں نہ جانے کیا پیش آئے۔ لیکن یہ تو آ بیل مجھے مار والی بات تھی۔ اس لیے اس کو جھیلنا ہی تھا۔ میں نے ایک گزارش یہ کی کہ مجھے فری ویزا دلوایا جائے تاکہ ہر جگہ رپورٹنگ کا جھنجھٹ نہ ہو دوسرے یہ کہ میں جو کچھ دیکھوں گا وہی لکھوں گا۔ خیر میں آفس کی گاڑی میں پاکستان ایمبسی گیا، وہاں کسی افسر نے مجھے ریسیو کیا، چائے پیش کی گئی۔ اتنے میں ویزا آ گیا جس پر اکزمپشن کی مہر لگی ہوئی تھی۔

پاکستان میں ورود:

بہرحال، بہت ساری دفتری کارروائیوں اور ذاتی الجھنوں سے گزرنے کے بعد

۲۱؍جنوری ۱۹۸۸ء کو چار بجے کے قریب پی آئی اے کی فلائٹ سے لاہور کے لیے روانہ ہوا، تقریباً ایک گھنٹے میں لاہور پہنچ گیا، وہاں کچھ دیر انتظار کے بعد اسلام آباد کی فلائٹ مل گئی۔ وہ بھی تقریباً ایک گھنٹے میں اسلام آباد پہنچ گئی۔ اس وقت شام کے ساڑھے سات بج رہے تھے کچھ بوندا باندی بھی تھی تاہم موسم خوشگوار تھا۔ ہوائی اڈے سے باہر نکلتے ہی آفس کی گاڑی نظر آئی، بڑی خوشی ہوئی۔ ڈرائیور بڑے اخلاق سے پیش آیا اور مجھے ایمبسڈر ہوٹل پہنچا کر چلا گیا۔ میں کھا پی کر سو گیا۔ اگلے دن جمعہ تھا۔ وہاں جمعہ اور سنیچر کی ہفتہ وار چھٹی ہوا کرتی تھی۔ لیکن جمعہ کی صبح کو ہمارے مہربان کرائٹزر صاحب ہوٹل میں تشریف لائے۔ یہ وہی کرائٹزر صاحب ہیں جنھوں نے دہلی میں میرے لیے باعث رحمت بن کر میری ملازمت کو بچائے رکھنے اور بالآخر اس کو مستقل کرنے کا مجھ پر احسان کیا تھا۔ وہ اس وقت دہلی میں اکزیکیوٹیو آفیسر تھے یہاں اسلام آباد میں کنٹری ڈائریکٹر تھے۔ وہ بڑی محبت سے پیش آئے۔ آفس تو بند تھا مجھے بھی آفس لے گئے اور اندر دفتر کو دکھایا، اس کے بعد اپنے گھر لے گئے اور چائے سے تواضع کی وہاں ان کی اہلیہ موجود تھیں۔ میں نے اپنے گھر والوں کو اطمینان دلانے کے لیے فون کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ انھوں نے اسی وقت فون ملا کر بات کرادی۔ اس کے بعد اپنی گاڑی میں اسلام آباد کا جمعہ بازار دکھانے کے لیے لے گئے۔ وہ بازار عام ہفتہ وار بازار جیسا ہی تھا اور اس سے مختلف بھی۔ مثلاً وہاں مقامی نوادرات اور روسی فوجیوں کی ٹوپیاں وغیرہ جیسی چیزیں بھی تھیں جو سیاحوں کے لیے باعثِ کشش تھیں۔ ایک یوروپین عورت نے لکڑی کی پرانی کھڑاؤں کا ایک جوڑا ۱۸۰/- روپیہ میں خریدا۔

صاحب موصوف نے شام کو آفس کے پریس چیف علوی صاحب سے فون پر میرا تعارف کرایا۔ انھوں نے رات کے کھانے پر اپنے گھر مدعو کیا۔ ان کی اہلیہ بھی موجود تھیں جو ٹیچر تھیں۔ ان لوگوں سے دیر تک باتیں ہوتی رہیں اس کے بعد آفس کی گاڑی نے ہمیں ہوٹل پہنچا دیا۔ اگلے دن سنیچر کو بھی چھٹی کا دن تھا لیکن اس دن کے سارے تفریحی پروگرام کا بھی آفس نے اہتمام کر رکھا تھا۔

۲۳؍جنوری سنیچر کی صبح کو آفس کی گاڑی آ گئی۔ ڈرائیور صاحب پہلے تو پرانا شہر پنڈی دکھانے کے لیے لے گئے۔ وہاں کا عام منظر کچھ دہلی کا سا اور پہاڑی علاقہ ہونے کی وجہ سے کچھ سرینگر کا سا تھا۔ دکانوں کا طرز دہلی کے کھاری باؤلی جیسا تھا، یہی طرز کلکتہ میں پیشاوری برادری کی پھل اور میوے کی دکانوں کا تھا کوئی دو تین گھنٹے بعد ہم لوگ اسلام آباد واپس آئے وہاں پہاڑی کے دامن میں ایک بڑا مسطح علاقہ ہے وہیں نہایت خوبصورت مسجد فیصل تھی جس کی تعمیر کچھ عرصہ سے جاری تھی اب آخری مرحلے کے کچھ کام جاری تھے۔ اس مسجد کے مرکزی گنبد اور مینارے پر طلائی ہلال بنے ہوئے ہیں۔ اس مسجد میں مشرقی اور مغربی فن تعمیر کا امتزاج ہے کچھ اسپین کی مساجد جیسا۔ یہاں ایک بین الاقوامی اسلامی تعلیمات کا مرکز بھی ہے اور کئی مساجد بھی ہیں۔ اسی میدان کے سامنے اونچی پہاڑی پر چڑھائی شروع ہوتی ہے۔ پر پیچ پہاڑی راستوں سے گزرتی ہوئی گاڑی اس کی بلندی تک گئی۔ وہاں سے سارا شہر اسلام آباد شمالی اور جنوبی جانب پھیلا ہوا نظر آتا ہے۔ یہ پہاڑی بذات خود ایک تفریح گاہ ہے۔ غالباً اس کو مرغلہ ہلز کہتے ہیں۔

پنجاب میں چنڈی گڑھ کی طرح اسلام آباد شہر بھی نسبتاً نیا ہے اور ان دونوں شہروں کی تعمیر میں بھی یکسانیت ہے یعنی سڑکیں سیدھی سیدھی عمودی اور افقی ہیں۔ ہمارے بچپن کے گہرے دوست برکات اللہ بھی اسلام آباد میں تھے لیکن میں نے ان کا پتہ نہیں حاصل کیا تھا اور دماغ پر اتنی باتیں سوار تھیں کہ اس کا حواس بھی نہ تھا، چنانچہ خالی وقت اور سواری کی سہولت کے باوجود ان سے ملاقات نہیں کر سکا۔

پشاور میں

اتوار ۲۴؍جنوری کو میرا اصل پروگرام شروع ہوا اور میں پشاور کے لیے روانہ ہوا۔ پشاور کے لیے فلائٹ میں میری سیٹ تو بک تھی لیکن کرائٹز صاحب نے کہا کہ اگر سڑک کے راستے جاؤ تو تمہیں سارا علاقہ دیکھنے کا موقع ملے گا، چنانچہ صبح کو ہوٹل سے نکل کر آفس گیا اور وہاں سے آفس کی گاڑی نے بس اسٹینڈ پہنچا دیا۔ وہاں فلائنگ کوچ کہلانے والی

چھوٹی چھوٹی بسیں دولہن کی طرح سجی ہوئی چھ چھ مسافروں کو لے کر دوڑتی پھرتی تھیں۔ میں بھی ایک کوچ میں بیٹھ لیا اور پشاور کی طرف روانہ ہوگیا۔ اس کے بعد تو میں ماضی کی تاریخ میں گم ہوگیا۔ اسلام آباد سے پشاور تک تقریباً ۱۲۵ کلومیٹر کا فاصلہ اسی خواب کی دنیا میں طے ہوا۔ وہ سارے نام جنھیں تاریخ کے اوراق میں پڑھتا سنتا چلا آیا تھا میری آنکھوں کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ سب سے پہلے جو مقام آیا وہ ٹکسلا تھا جو ہندوستان کی قدیم تاریخ کا حصہ ہے۔ وہاں سڑک کے کنارے بڑے خوبصورت مٹی کے برتن بیچتے ہوئے دیکھا جسے آثارِ قدیمہ کے آثار کے طور پر لوگوں نے باقی رکھا ہے اور سیاحوں کی کشش کا باعث ہیں۔ کچھ اور آگے بڑھے تو قدیم ترین انسانی تاریخ کے آثار دیکھنے میں آئے یعنی جب انسان غاروں میں رہا کرتا تھا۔ دراصل مٹی کے اونچے اونچے پہاڑ جیسے ٹیلے ہیں جن کے اندر لوگوں نے بود و باش اختیار کر رکھی ہے۔ ان ٹیلوں کے اوپر دروازے جیسی علامات بھی نظر آئیں۔ آگے حسن ابدال، نوشہرہ، منونگر وغیرہ آتے گئے لیکن ایک مقام بہت دلچسپ آیا۔ دریائے سندھ اور دریائے کابل کا سنگم۔ اس کے اوپر ایک بہت لمبا پل ہے۔ نیچے بہنے والے سندھ کا پانی روشنائی جیسا نیلا ہے اور دوسرے دریا کا پانی جو کابل کی طرف سے آتا ہے بالکل مٹیالا ہے۔ سرینگر میں جہلم جیسا یا کلکتہ میں ہوگلی جیسا۔ اس پل کے نیچے سے گزرتے ہوئے دونوں دریاؤں کے پانی اپنے رنگوں کی وجہ سے الگ الگ لیکن ساتھ بہتے نظر آتے۔ بہت دور تک یہی منظر ہے۔ بہرحال، اس سحر کے عالم میں گزرتے ہوئے سہ پہر میں پشاور پہنچا۔ میں بس سے اترا اور ایک ٹیکسی کی طرف بڑھا تو ڈرائیور نے مسکراتے ہوئے کہا آیئے مجھے معلوم ہے آپ کو کہاں جانا ہے۔ میں بلا تکلف بیٹھ گیا اور اس نے مجھے امریکی قونصل خانے میں لے جا کر اتارا۔ وہ تو ہوا لیکن بعد میں سوچتا رہا کہ ایک بالکل انجانے اور خلفشار زدہ علاقے میں کچھ بھی ہوسکتا تھا۔

پشاور میں دفتر میں داخل ہوتے ہی ایک نوجوان نے استقبال کیا، بڑے اخلاق سے پیش آئے۔ انھوں نے اپنا نام ناصر بتایا اور کچھ دیر ابتدائی گفتگو میں ہی معلوم

ہوگیا کہ ان کا تعلق اس پشاوری برادری سے تھا جس کا کلکتہ میں پھل اور میوے کا کاروبار تھا۔ جب انھوں نے اپنے نانا کا نام بتایا تو معلوم ہوا کہ میں ان سے واقف تھا۔ وہ کلکتہ کی پھل منڈی میں بالائی منزل پر رہتے تھے۔ ان کی فیملی پشاور چلی گئی تھی، وہ تنہا تھے، ایک رات ان کے خادم نے انھیں قتل کر دیا۔ وہ پکڑا گیا تھا۔

وہاں اگلے دن کا پروگرام طے کرنے کے بعد مجھے ہوٹل پرل کانٹی ننٹل پہنچادیا گیا جو ہندوستان کے کسی فائیو اسٹار ہوٹل جیسا تھا لیکن ہر اعتبار سے بہتر معلوم ہوا۔ کیونکہ پہاڑی علاقہ ہونے کی وجہ سے فضا گردوغبار سے پاک تھی۔ ٹریفک کی بھیڑ بھی نہیں تھی، اور ہوٹل میں مہمان بھی کم ہی تھے۔ اس ہوٹل کے متعلق ایک دلچسپ بات بھی ہے۔ بمبئی میں تاج ہوٹل پر دہشت گردانہ حملے کا جو واقعہ ہوا تھا اس کے کچھ عرصہ بعد پشاور کے پرل کانٹی ننٹل ہوٹل پر بھی دہشت گردوں کا حملہ ہوا۔ یہ عجب اتفاق ہے کہ میں ان دونوں ہوٹلوں میں ٹھہر چکا ہوں۔ حالانکہ ان دونوں ہوٹلوں کے درمیان دو ہزار میل سے کم کا فاصلہ نہ ہوگا۔ چنانچہ ان دہشت ناک واقعات کی خبروں کے وقت ان کا نقشہ میری نظروں میں تھا۔ ایک دلچسپ بات اور بھی۔ جو گرانڈ ٹرک روڈ کلکتہ سے شروع ہوکر پشاور میں ختم ہوتی ہے اس کے بڑے حصے پر جستہ جستہ شروع سے آخر تک سفر کر ڈالا۔ کلکتہ سے بہار کے معدنیاتی علاقوں تک، پھر مغل سرائے، بنارس، دہلی اور یوپی اور پنجاب کے علاقوں اور آخر میں اسلام آباد سے پشاور تک۔ دہلی میں اس سڑک کا نام شیر شاہ سوری روڈ ہے۔ بہت عرصہ پہلے بی بی سی میں رضا علی عابدی نے 'جنریلی سڑک' کے عنوان سے اس شاہراہ پر ایک سیریل نشر کیا تھا۔

اگلے دو دن یعنی ۲۵/اور ۲۶/جنوری پشاور میں گزرے۔ صبح ہوٹل سے نکل کر آفس گیا۔ وہاں ایک گائیڈ اور ترجمان موجود تھا، ترجمان اس لیے کہ کہیں پشتو سے ترجمہ کرنے کی ضرورت پیش آسکتی تھی۔ اس کے علاوہ ایک فوٹو گرافر بھی تھا تاکہ میں ضرورت کے مطابق فوٹو بھی لے سکوں۔ ایک گاڑی کا بھی انتظام تھا۔ ہم سب سے پہلے افغان

میڈیا ریسورس سنٹر گئے وہاں ڈائریکٹر حاجی سید محمد داؤد نے استقبال کیا۔ انھوں نے سارے حالات کی بہت ساری تفصیلات سے آگاہ کیا جسے ریکارڈ کرلیا گیا۔ اس کے بعد جرنلزم کے استاد عبدالاحد سے ملاقات کی۔ وہ افغان نوجوانوں کو جرنلزم کی ٹریننگ دیتے تھے جو محاذ جنگ سے خبریں لاتے تھے۔ اس کے بعد وہاں کے فوٹو گرافر سے ملاقات کی جو جنگ کے محاذوں سے فوٹو لاتے تھے۔ تقریباً تین ہزار فوٹو اور کچھ ویڈیو موجود تھے، میں نے دو ویڈیو دیکھے دراصل ان رپورٹوں اور تصویروں نے افغان جنگ کا پانسہ روسیوں کے خلاف پلٹنے میں اہم کردار ادا کیا۔ وہاں سے نکل کر ہم قریب ہی واقع ایک رفیوجی کیمپ کچا گڑھی دیکھنے گئے اس کے بعد ہوٹل واپس آ گئے۔

دوپہر کے کھانے کے بعد ہم پشاور سے تقریباً بیس پچیس میل کے فاصلے پر واقع افغان رفیوجی کیمپوں کو دیکھنے کے لیے روانہ ہوئے۔ وہاں ایک بہت بڑے علاقے میں مکانوں کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے۔ کہیں کہیں کچھ دکانیں بھی ہیں جو مقامی بازار کی حیثیت رکھتی ہیں وہاں موجود لوگوں کی ضرورتوں کے سامان ملتے ہیں۔ اس دوران جنگی ایکٹی ویٹی شاید تیز تھی اس لیے سیکیوریٹی کا انتظام سخت تھا، اس وجہ سے ہم کیمپوں کے اندرونی علاقوں میں نہیں جاسکے۔ باہر باہر سے گزرتے رہے کہیں کہیں رک کر فوٹو بھی لیتے رہے۔ لیکن ایک علاقے سے گزرتے ہوئے گائیڈ نے ڈرائیور سے کہا کہ تیزی سے نکل چلو۔ مجھے اس کی وجہ یہ بتائی کہ یہ علاقہ ایک افغان لیڈر گلبدین حکمت یار کے قبائلی علاقے سے تعلق رکھنے والے رفیوجیوں کا ہے اور بہت خطرناک علاقہ ہے کسی طرف سے اچانک گولی آسکتی ہے۔

دراصل وہ سارا کیمپ ایریا مختلف افغان لیڈروں کے قبائل سے متعلق رفیوجیوں میں بٹا ہوا تھا۔ ممکن ہے ان کے بہتر انتظام کے لیے ایسا کیا گیا ہو یا ان کی معاشرتوں کے فرق کی وجہ سے۔ لیکن اس خانہ بربادی کے عالم میں بھی ان کے درمیان اتنا اختلاف کہ ایک جگہ مل جل کر نہیں رہ سکتے تھے۔ ظاہر ہے ایسے میں جنگ ختم ہوجانے کے بعد افغانستان میں ان قبائلی لیڈروں کی کسی متحدہ حکومت کی تشکیل کی کیا امید کی جاسکتی تھی۔

ایسا ہی ہوا بھی۔ یوں تو بہتیرے قبائل تھے لیکن چار نسلوں سے تعلق رکھنے والے قبائل خاص تھے۔ ان میں سب سے بڑی اکثریت پشتونوں کی تھی، ان کے بعد راوز بک تھے، اس کے بعد دیگر لیکن جب جنگ ختم ہوئی اور ان قبائلی لیڈروں نے ایک متحدہ حکومت بنائی تو اس کے کچھ عرصہ بعد ہی راوز بک لیڈر کمانڈر احمد مسعود کو قتل کر دیا گیا۔ پشتونوں کی بڑی آبادی پاکستان میں بھی تھی اس لیے ان کیمپوں میں انہی کے رفیوجی زیادہ رہے ہوں گے اور ان کا غلبہ بھی رہا ہوگا۔

اگلے دن یعنی منگل ۲۶ رجنوری کو ہوٹل سے نکل کر ہسپتالوں کو دیکھنے گیا۔ زخمیوں کے علاج کے لیے تقریباً پانچ سو ہسپتال ہیں۔ ہر ہسپتال میں پچاس پچاس بیڈ ہیں۔ جب کسی محاذ پر جنگ میں شدت آتی تو آنے والے زخمیوں کی تعداد بڑھ جاتی۔ چونکہ ہر طرف راستوں میں زیرِ زمین بارودی سرنگیں جابجا بچھی ہوئی تھیں اس لیے راہ چلتے عام لوگوں کا بھی ان پر پاؤں پڑ جاتا تو وہ اڑ جاتیں اور لوگ زخمی ہو جاتے۔ اس طرح ایسے زخمی بھی آتے رہتے تھے وہ کسی کسی عضو سے محروم ہو جاتے تھے۔ اس علاقے میں چالیس یتیم خانے بھی تھے جہاں تقریباً چھ ہزار طلبہ اور طالبات زیرِ تعلیم تھے۔ ان پر کثیر رقم صرف ہو رہی تھی ان کی کفالت سوڈان کر رہا تھا۔

پشاور کے راستے میں اور رفیوجی کیمپوں کے علاقے میں کہیں کہیں بلّیوں کے انبار دیکھے۔ دراصل کچھ لوگ پہاڑوں پر درختوں کو کاٹنے کا کام کر رہے تھے۔ یہ لکڑیاں تعمیرات اور دیگر مصارف میں آ رہی تھیں لیکن فرض کر لیں کہ تیس لاکھ میں سے ایک لاکھ آدمی بھی برسوں سے پہاڑوں پر درختوں کو کاٹنے میں لگے ہوئے تھے تو انھوں نے کتنے جنگل صاف کر دیے ہوں گے۔ موسم پر اس کا اثر پڑنا لازمی تھا۔ درختوں کا سایہ ختم ہو جانے کی وجہ سے پہاڑوں پر جمی برف پگھلنے لگی جس کی وجہ سے ندیوں میں پانی بڑھا اور سیلابی کیفیت ہوئی۔ درختوں کی جڑوں نے چٹانوں کو تھام رکھا تھا ان کے ختم ہو جانے کے بعد چٹانیں کھسکنے کے واقعات بڑھ گئے، ان کے نیچے گرنے کی وجہ سے کئی آبادیاں دب کر نیست و نابود ہو گئیں۔

میں یہ سب دیکھتا ہوا آفس واپس آیا اور وہاں سے رخصت لی۔ لیکن جب آفس سے باہر آنے لگا تو رسپشن پر بیٹھی ہوئی خاتون نے مجھے مخاطب کیا۔ آتے جاتے میں نے ان کی نظروں میں التفات تو دیکھا تھا لیکن مجھے ان سے کوئی سروکار نہ تھا اور ان کی راہ میں دفتری آداب حائل رہے ہوں گے۔ بالآخر ان سے نہیں رہا گیا۔ ان کو یہ تو معلوم ہی تھا کہ میں دہلی سے گیا ہوں۔ انھوں نے بتایا کہ میرا نام ثریا رشید ہے اور ہم لوگوں کا تعلق لکھنؤ کے قریب بارہ بنکی سے ہے، ہمارے اقارب لکھنؤ اور دہلی میں موجود ہیں۔ میں نے انھیں بتایا کہ میں بارہ بنکی جاچکا ہوں، وہاں میرے بھائی کی سسرال ہے۔ ان سے گفتگو کے لیے زیادہ وقت نہیں تھا۔ پہلے سے معلوم ہوگیا ہوتا تو کچھ وقت نکال لیتا۔ اتنے دور افتادہ مقام پر دو واقف کاروں سے ملاقات ہوئی۔ یہ تقسیم کے بعد کے حالات پر ایک افسوسناک تبصرہ ہے۔ دو تین پشتیں گزر چکی ہیں اب افسوس کرنے والے گنے چنے رہ گئے ہوں گے۔ نئی نسلوں کو یہ تکلیف دہ احساس ہی نہیں ہوگا۔

مجھے واپس اسلام آباد پہنچنے کی جلدی تھی۔ پشاور کے اطراف میں بھی کئی قابل دید مقامات تھے اور وہاں قیام کے لیے وقت کا کوئی تعین نہیں تھا لیکن وہ سارا شورش زدہ علاقہ تھا نہ معلوم کب کہاں کیا پیش آئے اس لیے بالکل دفتری ضرورتوں کی حدود میں رہنا مناسب معلوم ہوا۔ اگر کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش آتا تو اس کی ساری ذمہ داری مجھ پر عائد ہوتی۔

یہ بات بھی تھی کہ میں نے اسلام آباد سے روانگی سے پہلے ہی کراچی میں ریحان صاحب کو اپنی پاکستان آمد کی اطلاع دے دی تھی لیکن یہ بھی بتادیا تھا کہ کراچی آنے کا پروگرام نہیں ہے اور واپسی میں دو روز لاہور میں قیام کے بعد وہیں سے واپسی ہوگی تاہم کراچی آنے کی کوئی تدبیر کروں گا۔ میں نے علوی صاحب کو اپنی اس خواہش سے آگاہ کیا تو انھوں نے بڑی مہربانی کی اور کہا کہ اپنا ٹکٹ مجھے دے کر پشاور جاؤ، میں نے ایسا ہی کیا۔ انھوں نے مجھے پشاور میں مطلع کیا کہ تمہیں کراچی کی طرف موڑ دیا گیا ہے اور دہلی کو اس کی اطلاع کردی گئی ہے بس پھر کیا تھا یہاں مجھے اور کراچی میں ریحان صاحب کو مطلع

کرنے کے بعد سب کو بے چینی سے انتظار ہونے لگا۔

بدھ ۲۷ر جنوری کی صبح کو ہوٹل سے نکل کر آفس گیا۔ علوی صاحب کا شکریہ ادا کیا اور وہیں سے ہوائی اڈے کے لیے روانہ ہوگیا۔ وہاں سے کراچی کے لیے روانہ ہوا۔ پی آئی اے کا جمبو جٹ ہوائی جہاز کشادہ اور آرام دہ ہے۔ تقریباً ہمارے یہاں ایئر بس جیسا ہے۔ ہم ٹھیک ۱۲ بجے کراچی پہنچ گئے۔ ہوائی اڈے پر ریحان صاحب سراپا باغ و بہار موجود تھے اور اپنے گھر لائے۔ اس کے ساتھ ہی شہر بھر میں میری آمد کا اعلان کر دیا اور لوگوں کی آمد شروع ہوگئی۔ کئی روز کی مسلسل دوڑ دھوپ کی وجہ سے بہت تھک گیا تھا۔ اب ایک طرح کی راحت کا احساس ہوا لیکن نئی تھکاوٹوں کی ابتدا بھی ہوئی۔ ریحان صدیقی کے بڑے بھائی فیضان صاحب جو میرے ہم زلف بھی تھے، محبوب خزاں اور کئی اقارب آ گئے۔ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد ہم لوگوں کا کارواں شمسہ کے گھر کے لیے روانہ ہوا جو وہاں سے کچھ دور تھا۔ شمسہ میری اہلیہ کی چھوٹی بہن تھیں۔

اسی شب ایک شادی کی تقریب تھی۔ ریحان صاحب کا اصرار تھا کہ وہاں چلیں بہت سارے اقارب سے ایک ہی جگہ ملاقات ہوجائے گی۔ میں بری طرح تھکا ہوا تھا لیکن ان کے اصرار کی وجہ سے جانا پڑا۔ وہاں واقعی بہت سارے پرانے اقارب اکٹھا تھے۔ ان میں سے کچھ ایسے بھی تھے جن سے کہیں نہ کہیں ملاقاتیں تھیں اور کچھ ایسے بھی تھے جو کلکتہ میں ہمارے گھر سے گزرتے ہوئے سابق مشرقی پاکستان گئے تھے پھر وہاں سے مغربی پاکستان میں کراچی آ گئے تھے۔ ان میں قابلِ ذکر شخصیت ہمارے ایک سمدھی قاضی غلام دستگیر صاحب کی بھی تھی وہ ہمارے دوسرے داماد قاضی بدر منیر کے والد تھے۔ انہی کے پوتے طارق آج ہماری سرپرستی کر رہے ہیں۔ وہاں سے کافی دیر میں ہم لوگ گھر واپس آئے۔

اگلے دن صبح کو اپنے کراچی آفس گیا اور وہاں سے دہلی آفس کو اپنے تبدیل شدہ پروگرام کی خبر دی۔ وہاں میں نے ایک بات محسوس کی وہ یہ کہ لوگ امریکی دفاتر کے قریب سے بھی گزرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ خیر، اگلے چار پانچ دن ایک خواب کی طرح بچھڑے

ہوئے اقارب سے ملنے ملانے میں گزر گئے۔ ایک دن شبیر ماموں (پروفیسر شبیر احمد صاحب جن کا تذکرہ کانپور کے باب میں ہو چکا ہے) کی قیام گاہ کو تلاش کرنے اور ان سے ملاقات میں، جو کہ بڑی مختصر تھی صرف ہوا۔ ایک دن ہمارے پرانے یار عزیز کسی ہوٹل میں کھانے پر لے گئے۔ ایک رات شمسہ کے گھر پر قیام کیا۔ کیا کہیں سب یاد کر کے دل خون ہوتا ہے۔ جن عزیزوں سے ملاقات ہوسکی وہ نادر و نایاب اور بڑی بیش قیمت تھی۔ ان کی تعداد بھی بہت کم رہی۔ بہت سارے اقارب سے ملاقات نہیں ہوسکی اس کا صدمہ بھی کچھ کم نہیں۔

واپسی کی فلائٹ کا مسئلہ بھی درپیش تھا۔ فلائٹ میں سیٹیں ہوتے ہوئے بھی ہر جگہ سیٹ ملنا امر محال تھا۔ عزیز وہیں ہوائی اڈے پر کسٹمس آفیسر تھے۔ ان کی مدد سے ۳؍فروری کو پی آئی اے کی دہلی کے لیے فلائٹ میں سیٹ مل سکی۔ بڑے بھاری دل سے سب کو خدا حافظ کہا۔ اس وقت جن اقارب سے ملاقات ہوسکی ظاہر ہے وہ سب کم و بیش ایک عمر کو پہنچ چکے تھے۔ اب تیس بتیس برس بعد ان میں سے شاید ہی کوئی رہ گیا ہوگا۔ جو دس پندرہ برس کے بچے تھے انھیں کچھ یاد ہوگا لیکن تعلقات کی فطری گرمجوشی ان میں کہاں ہوسکتی ہے۔ انھوں نے ایک نئی دنیا میں نئے معاشرتی حالات میں آنکھ کھولی اور پلے بڑھے۔ ان میں شمسہ کی بیٹیاں یقیناً قابلِ ذکر ہیں جو اپنے بزرگوں کی میراث کو ڈھوئے پھر رہی ہیں۔ چار بہنیں صدیقی سسٹرس کے نام سے لکھ رہی ہیں اور چھپ رہی ہیں۔ کچھ عرصہ ہوا ان کی لکھی ہوئی بچوں کی کہانیوں کی پانچ کتابیں مجھے موصول ہوئی تھیں۔ میں نے ان کی رسید کے طور پر ایک مختصر تبصرہ لکھ کر اپنی ویب سائٹ پر دے دیا تھا۔ مجھے خوشی ہے کہ وہ ان بیٹیوں تک پہنچ گیا اور انھوں نے اس پر خوشی کا اظہار کیا۔ اتنا بھی بہت غنیمت سمجھتا ہوں۔ ایک ایسی کسک کے ساتھ جو حرف وصدا کی گرفت سے ماورا ہے اس باب کو بند کرتا ہوں۔

☆☆☆

نئی دنیا سے آشنائی

غالباً مارچ 1983ء کی کوئی تاریخ تھی جب ہمارے پریس چیف ٹونی جیسو داسن نے مجھ سے کہا کہ تم اپنا پاسپورٹ بنوالو ممکن ہے تمہیں امریکہ جانے کے لیے نامی نیٹ کیا جائے۔ میں نے پاسپورٹ بنوالیا۔ کچھ دنوں بعد معلوم ہوا کہ اس نوازش کے لیے میرا انتخاب ہوگیا ہے۔ اس سلسلے میں مجھے تو کچھ کرنا نہیں تھا، جو کچھ کرنا تھا آفس ہی کو کرنا تھا، چنانچہ 26/جون کو پان امریکن کی فلائٹ سے جانا مقرر ہوا۔ اتنی ہدایت ضرور تھی کہ جانے سے پہلے دو روز آرام کر لینا کیونکہ طویل سفر ہوگا لیکن دو دن پہلے ہی ہمارے پریس چیف اور ہندی ایڈیٹروں دونوں غائب ہوگئے۔ ایک نے چھٹی لے لی اور دوسرا کسی پروگرام میں باہر چلا گیا۔ میں اسے اتفاق نہیں سمجھتا، یہ سب چھپی ہوئی شرارتیں ہوتی ہیں۔ ان دونوں دنوں میں دفتر کے کام کے علاوہ ضابطے کی کارروائیوں اور ٹریول چیک وغیرہ کے سلسلے میں بینکوں کے چکر میں میں بالکل بدحواس ہوگیا۔ رات کو بارہ بجے روانگی تھی۔ شام کو گھر پہنچا تو سوچا کہ کمرہ بند کر کے سو رہوں گا۔ لیکن ہمارے گھر میں ایک بڑا واقعہ تھا چنانچہ چند اقارب باجماعت آگئے پھر گھر میں ایں قدر آں قدر سب کی دھما چوکڑی۔ رات بارہ بجے گھر سے ہوائی اڈے کے لیے روانہ ہوا تو ایک میٹاڈور بھر کے پہنچانے والے گئے۔

تقریباً ساڑھے تین بجے فلائٹ روانہ ہوئی تو میں بالکل غائب ہوگیا، اسی عالم کمشدگی میں کچھ کھانا وغیرہ بھی کھالیا جو سرو کیا گیا تھا۔ اسی عالم میں کراچی پہنچے کی خبر سنی۔ فلائٹ جرمنی میں براہ فرینک فرٹ تھی، وہاں پہنچے تو مقامی وقت کے مطابق دن کے

11/بجے تھے، ہندوستانی وقت کے مطابق 27/جون کو دن کے ڈھائی بجے تھے۔ ہوائی جہاز لابی سے لگا اور ہم لوگوں کو باہر لابی میں چلے جانے کی ہدایت ہوئی۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ وقت گزرا ہوگا کہ وہ پوری لابی چل پڑی اور دور کھڑے ایک ہوائی جہاز سے جا لگی جو ہمارے جہاز ہی جیسا تھا سو ہم لوگ اپنی اپنی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ تب سمجھ میں آیا کہ اترتے وقت بھی جہاز لابی تک نہیں گیا تھا بلکہ لابی ہی آ کر جہاز سے لگ گئی تھی۔ میں نے ترقی یافتہ دنیا کی یہ پہلی جھلک دیکھی۔ فرینک فرٹ سے روانہ ہوکر جب لندن پہنچے تو مقامی وقت کے مطابق دن کے ڈھائی بجے تھے۔

لندن میں ورود:

لندن کے بارے میں مجھے کوئی خاص واقفیت نہیں تھی، ہاں کچھ نام ضرور سن رکھے تھے جیسے بی بی سی لندن، بش ہاؤس، پکاڈیلی سرکس، دریائے ٹیمز وغیرہ لیکن بہت کچھ تصور کرسکتا تھا کیونکہ انگریزوں نے لندن ہی کے طرز پر کلکتہ کی تعمیر کی تھی، وہاں بھی پارک سرکس اور پکاڈیلی سرکس ہی جیسا دھرمتلہ میدان اور لندن ہی کی طرز کی عمارتیں، متصل اور مسلسل، سکریٹریٹ، جنرل پوسٹ آفس، ہائی کورٹ وغیرہ کی عمارتیں۔ خیر!

میں ہوائی اڈے کے باہر آیا اور پکاڈیلی سرکس جانے والی میٹرو میں بیٹھ گیا۔ ایک انگریز خاتون میرے پاس آ کر بیٹھ گئیں اور دریافت کیا کہ ہندوستان میں آپ کا تعلق کہاں سے ہے، میرا بچپن کلکتہ میں گزرا ہے، میرے والد ایک فوجی افسر تھے وغیرہ وغیرہ۔ کچھ دیر بعد وہ اپنے اسٹیشن پر اتر گئیں لیکن جاتے وقت یہ انتباہ کرتی گئیں کہ جیب کتروں سے ہوشیار رہنا۔ میں پکاڈیلی سرکس پہنچ کر جب باہر نکلنے کے لیے لفٹ سے اوپر جانے لگا تو میرا بریف کیس جو بائیں ہاتھ میں تھا کھل گیا اور اس میں سے کاغذات وغیرہ گرنے لگے۔ اب کیفیت یہ تھی کہ دائیں ہاتھ میں میری اٹیچی تھی اور میرا جو سامان نیچے گرتا جارہا تھا آنے والے اس کو لیے ہوئے مجھے پکڑاتے جارہے تھے۔ غالباً اس عورت نے مجھے باتوں میں لگا کر میرے بریف کیس کا تالا کھول لیا تھا لیکن ڈھکنا نہیں کھول پائی تھی۔ تھکا ہوا، نیند کا ماتا مسافر یوں بھی بڑی حد تک بے خبر ہوتا ہے۔

ہوائی اڈے سے باہر آیا تو ٹریفک کا ایک سپاہی وہیں کھڑا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا پکاڈیلی ہوٹل کتنی دور ہے، اس نے سامنے بڑے وسیع میدان کی طرف اشارہ کرکے کہا کہ بس اسی کے پار ہے۔ مجھے فاصلے کا کوئی اندازہ نہ تھا، اپنا سامان لیے ہوئے چل پڑا اور ہوٹل تک پہنچ ہی گیا لیکن وہاں رسپشنسٹ نے کہا کہ کوئی کمرہ خالی نہیں ہے۔ میں نے گزارش کی کہ اگر قریب کوئی ہوٹل ہوتو وہاں دریافت کریں۔ انھوں نے قریب ہی ریجنٹ ہوٹل کوفون کیا اور بتایا کہ وہاں کمرہ ہے۔ پھر میں نے سامان اٹھایا اور چل پڑا۔ وہاں کمرہ مل گیا۔ رسپشن نے چوتھی منزل پر ایک کمرے کی چابی پکڑا دی۔ وہاں پہنچ کر کمرہ کھولا تو کسی خاتون کے سامان بکھرے پڑے تھے۔ واپس رسپشن پر آیا تو انھوں نے غلط چابی دینے پر معذرت کی۔ ہمارا کمرہ تیسری منزل پر تھا۔ جب وہاں پہنچے تو کمرہ کھلتا ہی نہیں تھا۔ اب میرے اندر اٹھنے کی بھی سکت نہیں تھی۔ وہیں لابی میں بیٹھ گیا۔ ذرا دیر میں سامنے کمرے والے ایک صاحب آئے تو میں نے ان سے گزارش کی کہ رسپشن کو خبر کردیں۔ خیر! ایک شخص آیا، اس نے کمرہ کھول دیا۔ میں کمرے میں گیا پھر مجھے اپنی خبر نہیں رہی۔ جب اٹھا تو شام ہوگئی تھی۔ باہر نکلا تو ٹھنڈک کافی تھی۔ قریب ہی دیکھا کہ چھوٹا سا ڈھابے جیسا تھا لیکن بہت صاف ستھرا۔ وہاں صرف تندوری بکرے جیسا تھا اور بریڈ۔ بھوک تو لگ ہی رہی تھی اور رات بھی سامنے تھی۔ وہاں کھانے کے بعد ہوٹل میں واپس آیا اور بدرالدین صاحب سے رابطہ کرکے اپنی آمد کی خبر دی۔ پہلے تو انھوں نے پہچانا ہی نہیں پھر میں نے بتایا کہ 1949ء میں آپ کو میں نے کانپور سے کراچی کے لیے رخصت کیا تھا تب وہ اچھل پڑے میں نے کہا کہ کل آؤں گا۔ بدرالدین صاحب کراچی میں فلپس کمپنی میں انجینئر تھے۔ کمپنی نے کسی ٹریننگ کے لیے ان کو لندن بھیجا، وہاں انھیں فورڈ کمپنی میں کوئی بہتر کام مل گیا بس وہ فورڈ کمپنی میں چلے گئے۔ مجھ سے کہنے لگے کہ انگریز ہم لوگوں پر حکومت کرتے تھے۔ یہاں آٹھ سو انگریز میرے انڈر میں کام کرتے ہیں۔ جس بچے کو وہ کندھے پر لے کر کانپور سے گئے تھے وہ برطانوی پولیس میں سارجنٹ تھا۔

اگلے دن صبح کو میں نے بدرالدین صاحب کو اپنی آمد کی اطلاع کردی۔ جب میں میٹرو سے ان کے اسٹیشن پر پہنچا تو وہ گاڑی لے کر موجود تھے۔ اپنے گھر لے گئے۔ دن کا کھانا ان کے گھر کھایا۔ چار بجے مجھے بی بی سی کے آفس میں بش ہاؤس جانا تھا جب وہ مجھے اسٹیشن چھوڑنے کے لیے جانے لگے تو ایک جگہ دریائے ٹیمز کے قریب سے گزرے وہاں رک کر میں دریا کے قریب گیا دراصل میں کلکتہ میں ہوگلی سے اس کا موازنہ کرنا چاہتا تھا۔ گوری ٹیمز اور کالی ہوگلی کے درمیان کوئی مماثلت نہیں تھی۔ بدرالدین صاحب دسمبر 1992ء میں دہلی آئے تھے وہ ہم لوگوں کی آخری ملاقات تھی۔

بدرالدین صاحب سے رخصت ہوکر بش ہاؤس کے لیے روانہ ہوا۔ وہاں پہنچ کر جب میٹرو اسٹیشن سے باہر آیا تو دو نوجوان سامنے سے آتے ہوئے نظر آئے۔ میں نے ان سے انگریزی میں بش ہاؤس کا محل وقوع پوچھا تو وہ ہنسے اور کہنے لگے کہ اگر ہندی میں بتاؤں تو سمجھ لیں گے۔ خیر انھوں نے بتایا اور آگے بڑھ گئے۔ میں بھی آگے بڑھ کر بی بی سی کے آفس میں پہنچا۔ وہاں آصف جیلانی صاحب اور یاور عباس صاحب نے خیر مقدم کیا۔ ان کے علاوہ بھی کئی نام مثلاً وقار احمد، رضا علی عابدی وغیرہ کے نام روز ہی سنا کرتا تھا لیکن اس وقت وہ حضرات موجود نہیں تھے۔ نشریہ کا وقت ختم ہونے کے بعد جیلانی صاحب چائے کے لیے کینٹین میں لے گئے وہاں اور بھی دو ایک حضرات موجود تھے۔ کچھ دیر باتیں ہوتی رہیں اس کے بعد ہم وہاں سے رخصت ہوئے کچھ عرصہ بعد آصف جیلانی صاحب سے دہلی میں ملاقات ہوئی۔ یہاں مولانا آزاد اردو یونیورسٹی کی دہلی شاخ کے ڈائریکٹر ڈاکٹر شمس الاسلام فاروقی صاحب جیلانی صاحب کے ہم زلف تھے۔ انہی کے یہاں وہ آئے تھے تو فاروقی صاحب نے مجھے ان کی آمد کی اطلاع دی تو میں نے جاکر ان سے ملاقات کی۔ ڈاکٹر شمس الاسلام فاروقی صاحب میرے دوستوں میں تھے۔ انہی کے کہنے پر میں نے کمپیوٹر کے کورس کی چار کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا۔ ان کی اہلیہ عبدالرزاق اسکول کی پرنسپل تھیں جہاں میری بچیوں کی ابتدائی تعلیم ہوئی تھی۔

لندن میں قابلِ دید چیزیں دیکھنے کا میرے پاس موقع ہی نہیں تھا۔ بس اتنا سمجھ

سکا کہ وہیں کی تعمیرات کے طرز پر انگریز حکمرانوں نے اپنے پہلے پایۂ تخت میں تعمیرات کی تھیں اور سمندر کے کنارے آباد ان دونوں شہروں کی مرطوب آب و ہوا نے عمارتوں پر کہنگی کے جو آثار پیدا کر دیے تھے وہ بھی گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ تقریباً یکساں تھے۔ ہیتھرو ہوائی اڈہ تو بالکل کوئی مشرقی ہوائی اڈہ معلوم ہوتا تھا کیونکہ ایشیا کے لیے زیادہ تر پروازیں اسی ہوائی اڈے سے ہوتی ہیں اس لیے مسافر بھی زیادہ تر ایشیائی نظر آئے۔

واشنگٹن میں ورود:

سنیچر 28 مئی کو لندن کے وقت کے مطابق صبح 8 بج کر 45 منٹ پر پان امریکن کی فلائٹ سے واشنگٹن کے لیے روانہ ہوا۔ واشنگٹن کے مقامی وقت کے مطابق دن میں ایک بجے وہاں پہنچ گیا۔ ڈلس کے بین الاقوامی ہوائی اڈے پر اترنے کے بعد باہر آنے کے لیے چیکنگ کاؤنٹر پر پہنچا تو دو افسر مجھ سے مخاطب ہی ہوئے تھے کہ کچھ دور کھڑے ایک شخص نے میرے نام کی تختی بلند کی۔ وہ دونوں افسر فوراً پیچھے ہٹ گئے اور اس شخص نے بڑھ کر میری اٹیچی اٹھائی، باہر لے جا کر ایک ٹیکسی میں رکھ دیا اور ڈرائیور کو کچھ ہدایت کر کے غائب ہو گیا۔ وہ ٹیکسی جا کر ایک ہوٹل کے سامنے رکی اور میں اتر کر ہوٹل کے اندر چلا گیا۔ وہاں رسپشن کاؤنٹر پر بیٹھی ہوئی ایک لڑکی اطمینان سے کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ میں نے اس کو اپنا وزیٹنگ کارڈ دکھایا۔ اس نے بلا نظر اٹھائے ڈرائر میں سے کمرے کی ایک چابی نکالی اور مجھے دے دی پھر کتاب پڑھنے لگی۔ میں اپنا سامان لے کر اوپر گیا اور کمرہ کھول کر اپنا سامان رکھ دیا۔ ایک اوسط درجہ کا کمرہ تھا جس میں ایک چھوٹی میز، ایک کرسی اور ٹی وی کے علاوہ غسل خانہ اور چھوٹا سا باورچی خانہ بھی تھا جسے کچٹ کہتے تھے لیکن وہ سارے ضروری سامان سے لیس تھا۔ یعنی آٹومیٹک چولہا، بیسن، فریج، ایک الماری میں قرینے سے برتن معہ چائے کی کیتلی اور پیالیوں کے اور پیپر ٹاول وغیرہ۔ صرف کھانے پینے کی چیزوں کی کمی تھی جو حسب خواہ رکھی جا سکتی تھیں۔

میں پھر نیچے گیا اور دریافت کیا کہ چائے کہاں ملے گی۔ اس نے پھر نظر اٹھائے

بغیر ڈرائر میں سے چائے کے چھوٹے چھوٹے کئی پیکٹ نکال کر میرے طرف بڑھا دیے۔ جب میں شکر اور دودھ کے لیے کہا تو اس نے اسی طرح کے کئی پیکٹ بڑھا دیے۔ میں کمرے میں واپس آیا چائے بنا کر پی پھر آرام کرنے لگا تو حواس بھی درست ہونے لگے۔ یہ امریکہ سے میرا پہلا تعارف تھا۔ یہ ہوٹل نہیں بلکہ ایک طرح کی اقامت گاہ تھی۔ ہم جس پروگرام کے تحت گئے تھے اس میں شریک ہونے والے دیگر افراد بھی اسی جگہ ٹھہرائے گئے تھے۔ ان کی تعداد پندرہ سولہ رہی ہوگی اور وہ مختلف ملکوں میں امریکی سفارتخانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ ان میں میرے علاوہ چار اور مسلمان تھے، ایک مصری، ایک قطری، ایک ترک اور انڈونیشیا کی ایک خاتون۔ یہ اقامت گاہ (انٹریگ ہوٹل) مساچیوسٹس ایونیو پر واقع تھی۔ اس مشہور شاہراہ کے کے دوسرے کنارے پر شہرہ آفاق بلڈنگ واٹر گیٹ تھی جو صدر نکسن کے مقدمہ کے حوالے سے مشہور ہوئی تھی۔ یہ بلڈنگ کیا ہے ایک شہر ہے۔ شام کو میں وہیں گیا اور ایک طعام خانے میں برگر وغیرہ لے کر کھایا اور چلا آیا۔

کمرے میں آ کر حلیم صاحب کو اپنی آمد کی خبر دی۔ وہ کچھ عرصہ قبل ہمارے آفس سے ریٹائر ہونے کے بعد فیملی کے ساتھ ہجرت کر کے واشنگٹن میں مقیم ہو گئے تھے۔ وہ بہت خوش ہوئے اور اگلے دن صبح کو آنے کا وعدہ کیا۔ وہ اگلا دن اتوار تھا۔ میں صبح ناشتے سے فارغ ہوا، کچھ لکھنے لگا، اسی وقت ایک لڑکی آئی اور اس نے بستر درست کیا، چائے کی پیالیاں وغیرہ دھو کر اپنی اپنی جگہ پر رکھ کر چلی گئی، اتنے میں حلیم صاحب آ گئے اور پھر وہ مجھے اپنے گھر لے گئے۔ دن کا زیادہ وقت انہی کے ہاں گزرا۔ شام کو وہ اپنے پڑوسی زبیر احمد صاحب کے گھر لے گئے۔ اتوار کی شام تھی چند اصحاب اور بھی آ گئے۔ میں ہندوستان سے تازہ تازہ وارد ہوا تھا اس لیے لوگوں کو مجھ سے گفتگو سے زیادہ دلچسپی تھی۔ یہ نشست رات دیر تک جاری رہی، کچھ شعر و شاعری بھی ہوئی، وہاں موجود شرما جی نے بھی بڑی دلچسپی لی، ان کا تعلق میرٹھ سے تھا۔ اس رات کو میں نے حلیم صاحب کے گھر پر قیام کیا۔

اندازہ ہوا کہ وہاں جو ہندوستانی ہیں وہ کافی خوشحال ہیں اور یہ لوگ محنتی سمجھے

جاتے ہیں اس لیے ان کی بڑی قدر کی جاتی ہے۔ مسلمان کافی مذہبی ہیں، اس جگہ بھی باجماعت نماز پڑھی۔ لوگوں نے بتایا کہ حلال گوشت کے لیے ہفتہ میں ایک دن عموماً جمعہ کو جا کر جانور خرید کر اسے ذبح کرا کے اس کا گوشت آپس میں تقسیم کر لیتے ہیں۔

واشنگٹن کے شمال مشرق میں واقع میری لینڈ کے علاقے پر کشمیر کی شباہت معلوم ہوئی۔ ایک تو موسم کچھ ابر آلود تھا، دوسرے اس علاقے کی سبزی بھی گہری سبز تھی اور پھول پودوں کی نمو کے معاملے میں بھی قدرت کی وہی مبالغہ کی حد تک فیاضی نظر آئی۔ وہاں چنار کے درخت بھی کشمیری چنار جیسے قد آور اور صحت مند نظر آئے۔ دہلی میں کہیں ایک آدھ چنار دیکھنے میں آئے لیکن ٹیڑھے میڑھے اور غیر صحت مند تھے۔ ایک اور خاص بات دیکھنے میں آئی وہ یہ کہ بجلی کے تار لکڑی کی بلیوں کے کھمبوں میں بندھے ہوئے تھے یعنی لکڑی کی وہ بلیاں آہنی کھمبوں ہی کی طرح قابلِ اعتماد تھیں اور بجلی کے موٹے موٹے تاروں کے بندھے ہونے کی وجہ سے ان میں کوئی لچک نہیں آئی تھی۔

اگلے دن صبح کو میں واپس آیا تو حلیم صاحب نے اپنے بیٹے کو میرے ساتھ کر دیا تھا۔ ان کے ساتھ اسی واٹر گیٹ بلڈنگ میں ناشتے کھانے کا بہت سارا سامان خرید کر لایا جیسے پاؤروٹی، چائے، چینی، مکھن، دودھ وغیرہ کے پیکٹ، میوے اور پھل اور کوک کے ڈبے بھی۔ سب فریج میں بھر دیے۔ روز صبح کو ناشتہ کمرے میں کرتا، دن کا کھانا آفس کے قریب کے ہوٹل میں اور شام کو واٹر گیٹ بلڈنگ کے طعام خانے میں۔ سوموار کا بقیہ دن کمرے ہی میں گزرا۔ حلیم صاحب کے گھر سے ہی یہاں اپنے گھر فون کر کے اپنی خیر وعافیت کی خبر دے دی تھی۔

مصروفیات کا آغاز:

منگل 31/مئی کو ہماری سرکاری مصروفیات کا آغاز ہوا۔ صبح ناشتے کے بعد ہمارے آفس کی ایک خاتون آفیسر ہوٹل میں آئیں، وہیں لابی میں ہم سب کا ایک دوسرے سے تعارف کرایا۔ اس کے بعد ہم لوگوں کو لے کر میٹرو سے اپنے آفس گئیں۔

وہاں پروگرام سے متعلق مختلف افسروں سے تعارفی ملاقاتیں ہوئیں۔ لنچ کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔ ہم لوگوں کو دفتر کی کارکردگی سے روشناس کرایا گیا۔ شام کو ہوٹل میں واپس آ گئے۔ ہمارے دہلی آفس میں کلچرل سیکشن کے مسٹر جین بھی آئے تھے اور اسی جگہ ٹھہرے تھے۔ مختلف اداروں کی کارکردگی سے متعلق لیکچروں میں اگلے تین چار دن گزر گئے۔ جمعہ کو کئی جگہ جانا پڑا اس لیے شام تک تھک گیا تھا اور کچھ بوندا باندی بھی ہو رہی تھی اس لیے حلیم صاحب کے اصرار کے باوجود ان کے ہاں نہیں گیا اپنے ہوٹل میں آرام کیا۔ اگلے دن سنیچر کی صبح کو حلیم صاحب کے ہاں چلا گیا۔ دن میں ان کے ساتھ کچھ شاپنگ کی۔ شام کو حلیم صاحب اور ان کے پڑوسی زبیر صاحب کے ساتھ کسی اور دوست کے ہاں چلے گئے۔ وہاں دیر رات تک رہے، کچھ باتیں اور کچھ شاعری وغیرہ ہوتی رہی۔ رات کو حلیم صاحب کے گھر پر قیام کیا۔ اگلے دن اتوار تھا۔ حلیم صاحب اور زبیر صاحب کے لڑکوں کے ساتھ شاپنگ کے لیے چلا گیا۔ ایک ریڈیو ٹو اِن ون، ایک کیمرہ، کچھ کیسٹ، ایک بریف کیس اور کچھ گفٹ وغیرہ خرید کر واپس آیا۔ دن کے کھانے کے بعد آرام کیا۔ شام کو حلیم صاحب نے مجھے ہوٹل پہنچا دیا۔ دراصل ہمیں سامان بھیجنے کے لیے ایک بہت بڑی سہولت مل گئی تھی۔ دہلی میں ہمارے ڈائریکٹر صاحب نے کہہ دیا تھا کہ تم کو جو سامان وہاں سے بھیجنا ہو میرے نام سے آفس کے پتے پر بھیج دینا۔ چنانچہ میں نے جو سامان خریدے آفس لے جا کر پیک کر کے ڈائریکٹر صاحب کے نام سے دہلی بھیجتا گیا۔ سب چیزیں سفارتی ڈاک کے ذریعہ آتی گئیں اور جب میں واپس آیا تو سب آفس کے میل روم میں رکھی ہوئی تھیں۔

سوموار 6 جون کو ہماری دفتری مصروفیات کا دوسرا ہفتہ شروع ہوا۔ آج سب سے اہم مصروفیت یہ تھی کہ پروگرام منیجر کے ساتھ بیٹھ کر اگلے دو تین ہفتوں کا پروگرام طے کرنا۔ چنانچہ میں نے اپنی ترجیحات کے مطابق ان مقامات کے نام انھیں بتائے جہاں میں جانا چاہتا تھا۔ سفر میں سہولت کے لحاظ سے انھیں ترتیب دینا، سفر اور ہوٹلوں کے ریزرویشن کرانا سب ان کی ذمہ داری تھی۔ اس کام سے فراغت کے بعد چند اداروں کو

دیکھنے کے لیے گئے۔شام تک بہت تھک کر ہوٹل واپس آئے۔

منگل ۷/جون کو کئی نشریاتی اداروں کی کارکردگی دیکھنے کے لیے گیا۔ان میں ABC اور وائس آف امریکہ خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔وائس آف امریکہ کی اردو سروس میں ان حضرات سے ملاقات ہوئی جن کی آوازیں سنا کرتا تھا۔انہی لوگوں کے ساتھ دن میں لنچ کیا۔وائس آف امریکہ کے دفتر میں پہنچنے پر ایک خاتون نے استقبال کیا انھوں نے بتایا کہ ان کے شوہر کلکتہ کے قونصل خانے میں قونصل رہ چکے تھے وہ کلکتہ کا ذکر ایک خاص گرمجوشی کے ساتھ کررہی تھیں۔

وہائٹ ہاؤس میں:

بدھ ۸/جون کا دن بہت اہم تھا۔اس روز ہمیں وہائٹ ہاؤس لے جایا گیا۔اس وقت صدر ریگن کسی اسپورٹس گروپ سے باہر لان پر خطاب کررہے تھے۔میں نے اپنے کیمرے سے ان کے فوٹو بھی لیے۔

اگلے دو دنوں جمعرات اور جمعہ کو کیپٹل بلڈنگ (پارلیمنٹ ہاؤس) میں سنیٹ کی کارروائیوں کا مشاہدہ کیا اور لائبریری آف کانگریس دیکھنے گئے جو دنیا کی سب سے بڑی لائبریری شمار کی جاتی ہے اس طرح جمعہ کی شام کو واشنگٹن میں ہماری مصروفیات کا پروگرام ختم ہوا اور ہم یقیناً بہت سارے مشاہدات، تجربات اور معلومات سے مالا مال ہوئے۔ آخری شام کو واشنگٹن کے مضافات میں میری لینڈ کے ایک ہوٹل میں ہمارے پورے گروپ کا ایک اجتماعی ڈنر تھا اور اس کے ساتھ دھوم دھام کے ساتھ ہم لوگوں کے اجتماعی پروگرام بھی ختم ہوئے، اس کے بعد ہم سب اپنے اپنے پروگراموں کے مطابق سفر پر نکل گئے۔اس دوران کہیں کہیں کسی کسی سے ملاقات ہوتی رہی، خصوصاً نیویارک میں۔اس سے پہلے والے دن میں ہم لوگوں کو اس پروگرام میں شرکت کے لیے ایوارڈ پیش کیا گیا۔ جب میری باری آئی تو ایوارڈ پیش کرنے والے افسر نے بتایا کہ وہ کلکتہ قونصل خانے میں قونصل رہ چکے تھے۔وہ بھی کلکتہ کا ذکر بڑی گرمجوشی سے کررہے تھے۔

واشنگٹن سے رخصت:

واشنگٹن کے دفتری اوقات میں ایک دلچسپ بات یہ بھی تھی کہ قریب ہی ایک ہوٹل تھا جس میں لنچ کی ایک معین قیمت تھی یادنہیں غالباً دس ڈالر بس ڈائنگ ہال میں کھانے کی طرح طرح کی چیزیں ہلالی نیم دائرے میں لگی ہوئی تھیں، آپ جو چاہیں اور جتنا چاہیں کھائیں پئیں۔ دو ایک آدمی مدد کے لیے قریب پاس موجود رہتے۔ میں نے پہلے ہی دن ایک نوجوان کو دیکھا جو ہندوستانی معلوم ہورہا تھا، میرے دریافت کرنے پر اس نے بتایا کہ وہ بنگلہ دیشی طالب علم ہے۔ اس نے اپنا نام اسلام بتایا۔ تب میں نے پوچھا کہ اس میں میرے کھانے کی کیا کیا چیزیں ہیں تو اس نے بتایا کہ یہاں سے وہاں تک آپ کے کھانے کا نہیں ہے، اس کے علاوہ جو چاہیں کھاسکتے ہیں۔ اسی طرح معین قیمت پر لنچ کا نظام بنگلور کے اشوکا ہوٹل میں دیکھا۔ دراصل اس میں سیاحوں یا دیگر مصروفیات کے لوگوں کو بڑی آسانی ہوتی ہے۔ وہ سیدھے جاکر اپنی پسند کی چیزیں کھا پی کر پلیٹیں اپنی میز پر چھوڑ کر اٹھ جاتے ہیں، اس طرح وقت کی بڑی بچت ہوتی ہے۔

ایک مشاہدہ:

آگے بڑھنے سے پہلے ایک مشاہدے کا تذکرہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ابھی ابھی دو امریکی افسروں کے بارے میں بتایا کہ وہ کلکتہ میں رہ چکے تھے اور وہاں کا ذکر کرتے ہوئے ان کے لہجہ اور انداز میں ایک خاص گرمجوشی کا انداز تھا۔ مجھے ایک اندازہ یہ بھی ہوا کہ جن امریکیوں کی پوسٹنگ ہندوستان میں ہوتی تھی وہ بہت خوش ہوتے تھے اور اپنی پوسٹنگ کی میعاد میں توسیع کے بھی خواہشمند ہوتے تھے۔ اس کی کئی وجوہ تھیں۔ ایک تو یہی کہ دوسو برس تک انگریزوں کی حکمرانی کی وجہ سے ہم لوگ گوری رنگت والوں سے متاثر ہوتے ہیں، ورنہ یوروپین ممالک میں کون ان سے متاثر ہونے والا ہے۔ وہ خود آزاد مزاج غلامانہ آداب سے بے نیاز۔ دوسرے یہ کہ ہندوستان اتنا بڑا، وسیع وعریض ملک ہے کہ ایک ایک صوبہ یورپ کے اکثر ممالک سے بڑا، چنانچہ جن غیر ملکیوں کا یہاں تقرر ہوتا

انھیں پاؤں پھیلانے کی بے قیاس گنجائش، جغرافیائی حالات کا ایسا تنوع کہ ٹھنڈا گرم جو علاقہ پسند ہو حسبِ خواہ سیر کر آئے۔ کلچر کا بھی بڑا تنوع، آزاد مزاج، غیر روایت پسند امریکیوں کے لیے اس سے زیادہ خوشگوار ماحول کیا ہوسکتا تھا چنانچہ جو امریکی ہندوستان میں رہ کر جاتے تھے وہ ہندوستان کا نام ایک خاص تعلق کے اظہار کے ساتھ لیتے تھے۔

سنیچر ۱۱؍جون کو میں نے ہوٹل چھوڑ دیا اور اپنے سامان کے ساتھ حلیم صاحب کے گھر آ گیا۔ زبیر صاحب کے بیٹے کے گریجویشن کی تقریب تھی، اس لیے سب لوگ اس میں شرکت کے لیے گئے۔ وہاں بہتیرے لوگوں سے ملاقاتیں رہیں۔ وہاں سے حلیم صاحب کے گھر واپس آئے۔ اگلے دن اتوار کو حلیم صاحب اور زبیر صاحب کے بیٹوں کے ساتھ اسپیس میوزیم دیکھنے گئے۔ کچھ شاپنگ بھی کی۔ دن کا زیادہ حصہ اسی طرح گزر گیا۔ شام کو حلیم صاحب کے یہاں واپس آ گئے اور اگلے دن واشنگٹن سے باہر جانے کی تیاری کرنے لگے۔ گھر پر ٹیلی فون کر کے بتا دیا کہ اب واشنگٹن سے باہر جا رہے ہیں اور مختلف شہروں میں رہیں گے۔

واشنگٹن سے اورلینڈو:

سوموار ۱۳؍جون کو صبح ۹ بجے اورلینڈو کے لیے روانہ ہوئے جو امریکہ کی جنوبی ریاست فلوریڈا میں ساحل سمندر پر واقع ایک تفریح گاہ ہے۔ وہاں مقامی وقت کے مطابق ۱۱؍بجے پہنچے۔ ہوائی اڈے سے جب اس ہوٹل میں پہنچے جہاں ریزرویشن تھا تو معلوم ہوا کہ کوئی اطلاع نہیں پہنچی تھی اور کمرہ بھی خالی نہیں ہے لیکن یہ سنتے ہی ٹیکسی ڈرائیور ٹھہر گیا۔ پھر میری گزارش پر اس ہوٹل والے نے کسی ہوٹل سے رابطہ کیا اور معلوم کیا کہ کمرہ ہے تو ڈرائیور نے فوراً میری اٹیچی اٹھائی اور چل پڑا اور کوالیٹی اِن میں پہنچا دیا جو ہوٹل نہیں ایک طرح کی اقامت گاہ ہے۔ جب میں نے دریافت کیا کہ اب فاضل کتنا دینا ہے تو اس نے کہا کچھ نہیں ہم اسی علاقے کے اندر آئے ہیں۔ یہ میرے لیے حیرت کی بات تھی۔ یہاں دہلی میں تو سڑک پار کرنے کا بھی فاضل چارج کر لیتے ہیں۔ بھوک زوروں کی لگ رہی تھی

قریب ہی ایک طعام خانے میں گیا اور بریڈ اور چکن لانے کو کہا کہ جلدی ہو جائے، وہ کچھ دیر ہی میں آئی لیکن ایک پلیٹ بھر مرغ موٹی سوئیں کی طرح تراشا ہوا۔ اناپ شناپ کھا کر چلنے لگا تو اس نے کہا کہ اسے گھر لیتے جاؤ میں نے کہا کہ میرا گھر ہی نہیں ہے اور ہوٹل میں آ کر سو گیا۔ کافی بارش ہوئی تھی اس لیے شام کو بھی کہیں نکلنے کی صورت نہیں تھی۔ رسپشن پر جو بوڑھی لیڈی تھیں انھوں نے بتایا کہ یہ ہوٹل ایک ہندوستانی مسٹر بھارتی کا ہے تو میں نے ملاقات کا اشتیاق ظاہر کیا۔ مسٹر بھارتی تو نہیں تھے لیکن مسز بھارتی امریکن اسٹائل شرٹ اور نیکر میں تھیں۔ میں نے دریافت کیا کہ امریکہ تو یونہی ہندوستان سے ہزاروں میل دور ہے اور آپ لوگ یہاں بھی ہزار میل جنوب تک کیسے آ گئے تو ہنسنے لگیں، فرمایا ہم لوگ گجراتی بزنس کمیونٹی کے لوگ ہیں ہمیں مواقع جہاں تک لے جاتے ہیں ہم چلے جاتے ہیں۔ ڈزنی لینڈ کی طرح اور لینڈو بھی ایک تفریحی مقام ہے یہاں ڈزنی ورلڈ ہے اس لیے اقامت گاہیں اور طعام خانے سیاحوں کی ضرورت کے مطابق ہیں اور نسبتاً کم خرچ ہیں۔

۱۴/اور ۱۵/ جون یعنی منگل اور بدھ کے دو روز میں نے اورلینڈو کی تفریح گاہوں میں گزارے گو یہ وقت دراصل ناکافی تھا، تاہم جو کچھ اور جتنا کچھ حاصل تھا وہ بھی کیا کم تھا۔ سارا سفر تو مفت تھا ہی اس کی قیمت ہمیں نہیں معلوم ٹیکسی کے کرائے بھی بحقِ سرکار تھے اور تفریحات کے لیے ٹکٹوں کی قیمت بھی بحقِ سرکار تھی۔ کھانے پینے اور ہوٹل میں قیام کے لیے یومیہ الاؤنس تو تھا ہی۔ اور لینڈو چونکہ ساحلی شہر ہے اس لیے مقامی لوگوں میں کشتی رانی کا شوق عام ہونا بالکل فطری ہے، چنانچہ صبح کو جب ہوٹل سے باہر جھانکا تو سڑک پر جاتی ہوئی کتنی ہی گاڑیوں میں پیچھے لگی ہوئی موٹر بوٹ دیکھی۔ بعض گاڑیوں کی چھت پر ربر کی کشتیاں تہہ کر کے لٹکی ہوئی تھیں جن میں ہوا بھر کے سمندر میں اتار دیا جاتا ہوگا۔ چنانچہ پرواز کے دوران نیچے سمندر کی سطح پر تتلیاں اڑتی ہوئی نظر آ رہی تھیں جو دراصل ان کشتیوں پر لگے ہوئے رنگ برنگے بادبان رہے ہوں گے۔

تو میں منگل کی صبح کو ڈزنی ورلڈ دیکھنے چلا گیا۔ چار چھ مسافروں کو لے کر چھوٹی چھوٹی گاڑیاں ہوٹل سے صبح کو لے جاتیں اور شام کو واپس لاتیں۔ اس آمدورفت کے لیے

بیس ڈالر فیس تھی۔ اور بیس ڈالر ڈزنی ورلڈ میں داخلے کا ٹکٹ تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی ایک بڑا سا ریچھ سیدھا کھڑا استقبال کرتا ہے جو ہاتھ ملانا چاہے ہاتھ ملاتا ہے۔ ساتھ فوٹو بھی کھنچواتا ہے لیکن پاؤں میں بوٹ اس کی حقیقت کی غمازی کرتے ہیں۔ اس کے بعد مختلف تماشے ہیں۔ کھلے ڈبوں والی ایک چھوٹی سی ٹرین میں میں بیٹھ گیا جس میں بس کی طرح دو دو آدمی کی سیٹیں لگی ہوئی تھیں۔ وہ ٹرین کھڑکھڑاتی ہوئی بڑا شور کرتی ہوئی ایک اندھیری سرنگ میں داخل ہوگئی ذرا دیر بعد زمین پر تخلیق آدم اور انسانی ارتقا کے سارے مناظر ایک ایک کر کے بالکل اصلی حالت میں سامنے سے گزرنے لگے۔ یعنی آدمی وحشی ہے، پھر کچھ کھودنے کاٹنے لگا، دھات کے اوزار بنانے لگا، پکانے کھانے لگا، مشینیں بنانے لگا۔ تقریباً ایک گھنٹے اس ارتقاء کی کہانی کو اپنی آنکھوں سے دیکھا جسے پڑھتے اور سنتے آئے تھے۔ آخر میں بڑے زور کی کھڑکھڑاہٹ ہوئی لگا کہ گاڑی الٹ گئی ہے اور پیچھے کو چلنے لگی، بالآخر جہاں سے چلی تھی وہیں واپس آ کر رک گئی۔

دوپہر تک تھک گیا تھا، ایک بینچ پر لیٹ گیا، آنکھ لگ گئی، ذرا دیر بعد کھٹ کھٹ کی آہٹ ملی تو دیکھا کہ ایک سن رسیدہ خاتون بید کی بنکوڑی لیے ہوئے کھٹ کھٹ کرتی چلی جارہی تھیں۔ ساری میں لپٹا ہوا قدرے بھاری بدن ان کے گجراتی ہونے کی یقینی دلیل تھی۔ میں نے سوچا یہ بوڑھی نہیں تھکی اور میں تھک کر لیٹ رہا۔ بس اٹھ کر پھر چلنے لگا۔ کیمرہ لے کر گیا تھا بہت ساری تصویریں بھی لیں۔

بدھ کی صبح کو پھر اٹھا اور روز گزشتہ کی طرح سی ورلڈ دیکھنے چلا گیا۔ وہاں کچھ تیراکی، کچھ کشتی رانی اور آبی جانوروں کے سرکس وغیرہ تھے۔ ایک خاص بات بھی ہوئی۔ اس ساحل سے بہت دور مشرق میں جزائر ہوائی واقع ہیں جو قدرتی مناظر کے اعتبار سے بہت پرکشش بتائے جاتے ہیں۔

ہر جا تری قدرت کے ہیں لاکھوں جلوے
حیراں ہوں کہ دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں

ہوائی میں مقامی رقص کی بھی بڑی تعریف سنی تھی لیکن ہمارے پروگرام میں اس کو

نہیں شامل کیا گیا غالباً اس کی وجہ یہ رہی ہوگی کہ اس صورت میں ہمیں الٹے جاپان کی طرف سے واپس آنا پڑتا۔ بہرحال، سی ورلڈ میں ایک گوشہ 'ہوائیں بیچ' کے نام سے بھی تھا۔ وہاں جزائر ہوائی کے قدرتی مناظر بنائے گئے تھے۔ آب و ہوا تو تقریباً یکساں رہی ہوگی۔ ہوائی رقص کا بھی اہتمام تھا۔ بڑے بڑے پتوں کے لچھے کمر میں باندھ کر رقص کرتے ہیں باقی جسم پر کچھ نہیں ہوتا۔ معلوم نہیں وہ پتے جو تقریباً ہمارے یہاں اروی کے پتوں کی طرح چوڑے چکلے ہیں بہت نرم واقعی ہوائی۔ معلوم نہیں وہ پتے اصلی ہوتے ہیں یا نقلی، میں نے کسی سے پوچھا نہیں، وہ تجسس اب تک باقی ہے۔

لیکن ایک بات بہت دلچسپ ہوئی۔ ہومیوپیتھک کی کسی دوا کے بارے میں پڑھا یا سنا تھا کہ وہ ایسڈٹی یعنی تیزابیت کو اس طرح لپک کر ہڑپ کر لیتی ہے جیسے اود بلاؤ مچھلی کو ہڑپ کر لیتا ہے۔ وہ منظر میں نے صرف دیکھا ہی نہیں بلکہ کیمرے میں قید کر لیا۔ ایک بڑے سے تالاب کی منڈیر پر کھڑے ہوئے ایک بچے نے ڈور میں بندھی ہوئی ایک مچھلی کو پانی کی سطح سے ذرا اوپر لٹکا رکھا تھا، اچانک ایک اود بلاؤ نے پانی میں سے جست لگائی اور مچھلی کو جھپٹ کر غائب ہوگیا۔ میں کچھ دیر سے کیمرہ اسی طرف لگائے ہوئے تھا اس لیے فوراً وہ فوٹو بھی آ گئی۔ کہیں کہیں میں نے اپنی فوٹو لینی چاہی تو کیمرہ کسی کو پکڑا دیا۔ اس وقت تک موبائل رائج نہیں ہوئے تھے، اس دن بھی شام کو بہت تھک کر ہوٹل واپس آیا اور کچھ کھا پی کر سو گیا کہ اگلی صبح کو ہوسٹن کے لیے روانہ ہونا تھا۔

اورلینڈو سے ہوسٹن:

۱۶/جون جمعرات کو دن میں گیارہ بجے اورلینڈو سے روانہ ہوکر ڈھائی بجے ہوسٹن پہنچے۔ ساڑھے تین گھنٹے کی فلائٹ سے دونوں مقامات کے فاصلے کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، حالانکہ ہوسٹن بھی امریکہ کی جنوبی ریاست ٹکساس میں واقع ہے۔ ہم یوں سمجھ سکتے ہیں کہ جیسے کنیا کماری اور بنگلور- ہوسٹن اور بنگلور کے درمیان ایک دلچسپ مماثلت ہے۔ امریکہ میں ہوسٹن خلائی سرگرمیوں کا ایک مرکز ہے۔ اسی طرح ہمارے یہاں بنگلور

میں خلائی پروازوں سے متعلق بڑے ادارے ہیں۔ اس روز شام کو صرف ایک مصروفیت تھی۔ ایک خاتون نے گھر پر کھانے کے لیے مدعو کیا تھا وہ شام کو ہمارے ہوٹل میں آ کر لے گئیں۔ دراصل بعض سوشل ادارے غیر ملکیوں سے دلچسپی رکھتے ہیں اور انھیں اپنے یہاں مدعو کرتے ہیں۔ ہمارے یہاں بھی اس طرح کے ادارے موجود ہیں۔

لیکن سب سے پہلے حیات ریجنسی ہوٹل کا بھی ذکر کرنا چاہیے۔ امریکہ کے جن ہوٹلوں میں مجھے ٹھہرنے کا اتفاق ہوا شاید ان میں سب سے شاندار اور خوبصورت یہی ہوٹل تھا۔ اس کی شاخ دہلی میں بھی ہے۔ اگلے دن صبح کو میں جلدی نکلنا چاہتا تھا اس لیے ناشتہ کمرے میں ہی لانے کا آرڈر دے دیا۔ ذرا دیر بعد دیکھا کہ ایک بیرا ایک پوری الماری ڈھکیلتا ہوا لایا۔ میں نے پوچھا یہ کیا تو اس نے کہا آپ کا ناشتہ اور چلا گیا۔ اس میں میرے آرڈر کے مطابق مختصر ناشتہ تہہ در تہہ سجایا ہوا رکھا تھا۔

اگلا دن ۱۷ر جون بڑی مصروفیتوں کا دن تھا۔

۱۷ر جون، صبح ایک نشریاتی ادارے میں گیا۔ یہ ایک چھوٹا نشریاتی ادارہ ہے جو زیادہ تر مقامی اور ملکی خبریں پیش کرتا ہے۔ وہاں گفتگو کے دوران معلوم ہوا کہ ہندوستان سے متعلق نہ انھیں کافی معلومات ہیں نہ اس سے کوئی سروکار۔ ہوٹل سے وہاں تک جس ٹیکسی سے گیا اس کی ڈرائیور ایک لیڈی تھی۔ میں نے اس سے پوچھ ہی لیا کہ آپ نے یہ کام کیوں اختیار کیا اس نے ہنس کر کہا کہ میرے پاس کافی وقت تھا اور میں یہ کام کر سکتی تھی اس لیے میں نے یہ کام اختیار کیا۔

میں وہاں سے نکل کر اسپیس سینٹر (خلائی مرکز) میں چلا گیا۔ اس کو ایک طرح کا فلائی میوزیم کہنا چاہیے۔ یہ دراصل امریکی خلائی ادارہ ناسا NASA کا مرکز ہے۔ جہاں چاند پر اترنے والی پہلی خلائی گاڑی اور نیل آرم اسٹرانگ کا سوٹ بھی رکھا ہوا تھا۔ مزید برآں ایک گوشے میں چاند سے لائے ہوئے کچھ پتھر رکھے ہوئے تھے۔ ایک کاؤنٹر پر اس پتھر کا ایک ٹکڑا جڑا ہوا تھا جسے میں نے چھو کر دیکھا، گویا میں نے واقعی چاند کو چھوا۔ وہاں ایک مسلح گارڈ بھی مامور تھا۔

رمضان المبارک میں جمعہ کا مبارک دن تھا۔ شام کو اسلامک سینٹر میں گیا۔ افطار کا وقت قریب تھا۔ ایک مصری قاری قرأت فرما رہے تھے۔ ہر علاقے کے مسلمانوں کا اچھا اجتماع تھا۔ زیادہ تعداد عربوں کی تھی، کچھ ایرانی اور افریقی بھی تھے، کچھ ایشیائی بھی جن میں حیدرآباد کا ایک نوجوان ڈاکٹر تھا اور ایک نوجوان ضلع غازی پور (یوپی) کے موضع بذرگا کا تھا جہاں میرے بھائی مطیع اللہ کی سسرال ہے۔ وہ کراچی سے یہاں آیا تھا۔ کہاں کہاں کے لوگ کہاں کہاں ملتے ہیں۔ افطار اور نماز کے بعد کھانے کا بھی اہتمام تھا۔ افطار کھانا سب بہت عمدہ اور وافر مقدار میں تھا۔ تراویح کا بھی اہتمام تھا۔ اس سینٹر میں ہندوستان کے دو اردو اخبارات دیکھے ایک روزنامہ رہنمائے دکن، حیدرآباد، دوسرا جماعت اسلامی کا اخبار دعوت، دہلی۔ رات میں دس بجے کے قریب ہوٹل واپس آیا۔

ہوسٹن سے سان فرانسسکو:

۱۸؍جون، سنیچر کو ۱۱؍بجے دن میں ہوسٹن سے روانہ ہوکر ڈھائی بجے سان فرانسسکو پہنچا۔ فلائٹ تاخیر سے روانہ ہوئی تھی اور طویل بھی تھی، لیکن گردوپیش کے مناظر میں جو صرف آفاق میں گم ہونے کے مترادف تھے، میں واقعی عجائبات کائنات میں گم تھا۔ سیسل ہوٹل میں پہنچا تو واقعی بہت تھک چکا تھا۔ شام کو ہوٹل ہی میں آرام کیا۔ یوں بھی یہاں دوپہر بعد چلنے والی تیز وتند سمندری ہوائیں ایسی ہوتی ہیں کہ باہر منہ نکالنا مشکل ہوتا ہے۔ سان فرانسسکو شہر اقبالؔ کے اس شعر کی تفسیر ہے:

بیابان و کہسار و راغ آفریدی
خیابان و گلزار و باغ آفریدم

دست قدرت کی صناعیوں اور فکر انسانی کی مشاطگی کے امتزاج کا ایک بے مثال نمونہ یہ شہر ہے۔ خلیجی ساحل کے قریب واقع شہر پر دوپہر بعد تند وتیز سمندری ہوائیں چلنے لگتی ہیں جن کی رگڑ سے ہر تعمیر چمکتی رہتی ہے، گردوغبار کا کہیں نام ونشان نہیں۔ ہر طرف ٹیلوں پر پھیلی ہوئی تعمیرات ہیں۔ شہر میں چائنا ٹاؤن اور جاپانیز ٹاؤن نام کے محلے

ان ملکوں کے باشندوں کی آبادی کا اعلان کرتے ہیں، یہاں کی عمارتیں اور ان کی آرائش وغیرہ بھی ان کی اصلیت کا اشاریہ ہیں۔ بہت صاف ستھری خوبصورت آبادیاں۔ دراصل ایشیا کے مشرقی ساحلوں پر آباد یہ لوگ بحرالکاہل سے گزر کر امریکہ کے مغربی ساحل پر اترے ہوں گے اور ان کی آبادیاں بڑھتی گئی ہوں گی۔ ہندوستانی نسل کے بھی کچھ لوگ آباد ہیں۔ غالباً یہ وہ ہندوستانی ہوں گے جو ملیشیا، انڈونیشیا اور برما وغیرہ سے گزرتے ہوئے وہاں پہنچے ہوں گے۔ کہیں کہیں ہندوستانی کھانوں کے ریستوران بھی نظر آئے۔ اب سے تقریباً چالیس سال پہلے وہاں مسلمانوں کی آبادی بھی تقریباً بیس ہزار بتائی گئی تھی۔ وہاں بیس اسلامی مراکز ہیں جو اسلامک ٹمپل کہلاتے ہیں، میرا خیال ہے وہ مساجد ہوں گی۔ ایک مرکز کے امام سے ٹیلیفون پر میرا رابطہ ہوسکا، انھوں نے بتایا کہ تقریباً دوسو مسلمان ان مراکز میں آتے ہیں۔

یوں تو شہر میں ہر طرح کی سواریاں ہیں لیکن یہاں ٹرام بھی نظر آئی لیکن یہ کلکتہ کی ٹرام سے ذرا مختلف ہے۔ یہ چوڑی اور کھلی ہوئی ہیں، آزادی سے پہلے کلکتہ کی ٹرامیں بھی ایسی ہی ہوتی تھیں لیکن اب وہ کسی قدر پتلی ہیں۔ یہاں کی ٹرام میں ایک ہی ڈبہ دیکھا جبکہ کلکتہ کی ٹرام میں پہلے بھی دو ڈبے ہوتے تھے اور اب بھی۔ یہاں اس کو کیبل کار کہتے ہیں۔ ٹرالی بسیں بھی دیکھیں جو یوں تو عام بسوں ہی جیسی ہیں لیکن وہ بجلی سے چلتی ہیں۔ اوپر لگے ہوئے تار سے وہ ٹرام کی طرح بجلی حاصل کرتی ہیں۔ اس طرح کی بس چالیس پچاس برس پہلے پرانی دہلی کے بعض علاقوں میں بھی چلتی تھیں۔ یہاں سائیکل رکشا بھی دیکھنے میں آئے۔

جاپانیز ٹی گارڈن کو دیکھنے کی غرض سے میں سویرے ہی ہوٹل سے نکل کر سیاحتی مرکز پہنچ گیا تاکہ وہاں سے سویرے ہی سیاحوں کو لے جانے والی بس مل جائے۔ ابھی سناٹا تھا کہ سامنے سے ایک سردار جی کو آتے دیکھا۔ دریافت کیا کہ آپ کہاں سے آئے ہیں؟ فرمایا: کلکتہ سے۔ میں نے کہا: میں بھی کلکتہ سے آیا ہوں۔ پھر ہاتھ ملانے کے بعد ہم

لوگ اپنی اپنی بسوں کی تلاش میں چل پڑے۔ ایک ٹورسٹ بس میں ہم جاپانیز ٹی گارڈن کی طرف روانہ ہوئے۔ بس میں ایک گائڈ کمنٹری کرتا جارہا تھا لیکن اس گارڈن سے ایک میل پہلے ہی اس کی کمنٹری بے معنی ہوگئی تھی۔ اطراف میں دور دور تک پھیلی ہوئی گارڈن کے پودوں کی خوشبو نے مشامِ جاں کو معطر اور انسان کو مسخر کررکھا تھا۔ یہ گارڈن محولہ بالا شعر کی واقعی تفسیر ہے:

پودوں کی خوردسازی کی جاپانی ٹیکنک کے ذریعہ تیار کیے ہوئے پودوں کی ہر طرف نمائش ہے، چھوٹے چھوٹے ٹیلوں پر سے گزرتی ہوئی ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈیوں کے دونوں طرف خوبصورتی کے ساتھ تراشے ہوئے پودوں کی روش ہے۔ اس کو ایک طرح پودوں کی نمائش کہنا چاہیے۔ کہیں کہیں بدھا کے مجسمے بھی رکھے ہوئے ہیں، لیکن ایک مرکزی مقام پر جو کسی قدر بلند ہے شاید وہ بھی کوئی ٹیلہ ہو، ایک بہت بڑا پگوڈا بنا ہوا ہے جس پر گیروئے رنگ کی چمکدار پالش ہے۔ اس پر ہر طرف سے بہت تیز روشنی پڑتی ہے تو ایسا لگتا ہے کہ ایک بڑا زبردست شعلہ لہکتا ہوا زمین سے آسمان کی طرف بلند ہوتا جارہا ہے۔ خیر! اس سحر سے دامن چھڑا کر دوپہر تک ہوٹل میں واپس آگئے لیکن وہ خوشبو جو روح میں سرایت کرگئی تھی تعاقب کرتی رہی۔ پھر شام ہم نے ہوٹل ہی میں گزاری۔

شہر کی سیر ہم پچھلے روز کرچکے تھے جس کے دوران اس عجوبۂ روزگار کے ایک سرے تک گئے جو گولڈن گیٹ برج کہلاتا ہے۔ جو دنیا کا طویل ترین ہینگنگ برج یعنی معلق پل کہلاتا ہے۔ اس کی طوالت کے بارے میں اتنا کہنا کافی معلوم ہوتا ہے کہ اس کے کسی سرے سے دوسرے سرے کا فوٹو نہیں لیا جاسکتا۔ کم سے کم مجھے تو اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔ اس کی اونچائی کے بارے میں بھی اتنا کہنا کافی ہوگا کہ اس کے نیچے سے جہاز گزر جاتے ہیں۔ میں اس پل کے اوپر سے گزر چکا ہوں۔

اس معجزے کی تعمیر کی تحریک ۱۹۲۱ء میں ہوئی تھی لیکن ایک تو اس تعمیر کو عملاً ناممکن سمجھا جارہا تھا دوسرے یہ کہ اس پر صرفے کا جو تخمینہ تھا وہ بھی ناقابلِ برداشت خیال کیا

جارہا تھا۔ پورے ایک عشرہ یہ بحث جاری رہی بالآخر ۱۹۳۳ء میں اس کی تعمیر شروع ہوئی تو امریکہ میں بدترین کساد بازاری شروع ہوچکی تھی۔ بہرحال سارے نشیب و فراز سے گزرتے ہوئے ۱۹۳۹ء میں اس کی تعمیر مکمل ہوگئی۔ اتنا وقت تو کلکتہ میں سینٹرل ایونیو کے نیچے میٹرو کی تعمیر پر صرف ہوگیا تھا۔

قدرت نے ''پولادناب'' پیدا کیا تھا، انسان سے شکایت یہ تھی کہ اس نے ''نہال چمن'' کے لیے ''تبر'' اور ''طائر نغمہ زن'' کے لیے قفس بنانے پر اس ''پولادناب'' کو استعمال کیا لیکن سان فرانسسکو میں انسان نے ستر ہزار ٹن ''پولادناب'' انڈیل کر خلیج کے دو کناروں کو جوڑنے کے ناممکن عمل کو ممکن بنادیا جو دنیا میں اپنی مثال آپ ہے۔ اسی کی تقلید میں انگریزوں نے کلکتہ میں ہوڑہ برج کی تعمیر شروع کردی اور عالمی جنگ کے باوجود ۱۹۴۳ء میں اس کو بناڈالا۔

خلیج سان فرانسسکو کے ایک کنارے پر شہر سان فرانسسکو ہے اس کے دوسرے کنارے پر سان رفائل واقع ہے۔ وہاں کے ایک گروپ کی دعوت پر ایک شام وہاں بھی جانا ہوا۔ ان لوگوں نے شام کا وقت دیا تھا۔ میں نے کہا کہ وہ تو بہت مشکل ہے ایک تو سہ پہر سے ہی سرد سمندر ہواؤں کے جھکڑ چلنے لگتے ہیں۔ یہاں سے وہاں جانے کے لیے آخری فیری بوٹ (اسٹیمر) چار بجے روانہ ہوتی ہے اور واپسی میں اُدھر سے آخری فیری بوٹ آٹھ بجے روانہ ہوتی ہے۔ اگر دیر ہوئی تو واپسی کس طرح ہوگی۔ اس طرف ایک خاتون تھیں جن سے میری بات ہورہی تھی۔ وہ ہنسیں اور کہا کہ آپ بس فیری بوٹ تک آجائیں اس کے بعد موسم بہت خوشگوار ہوگا اور واپسی کی فکر نہ کریں ہم پہنچادیں گے۔

میں چل پڑا۔ فیری بوٹ نے جیسے ہی رخ بدلا، ہوا بدل گئی۔ تقریباً ایک گھنٹے میں سان رفائل پہنچا۔ بوٹ سے اتر کر جیسے ہی آگے بڑھا ایک خاتون نے جنھوں نے اپنی پہچان کے لیے گلے میں سرخ اسکارف لپیٹ رکھا تھا اور وہ میرے حلیہ سے آگاہ رہی ہوں گی، بڑھ کر ہاتھ ملایا اس کے بعد اپنے گھر لے گئیں اور کہا کہ کچھ دیر آرام کرلیں اس کے

بعد میزبان کے یہاں چلیں گے۔ انھوں نے بلیک گریپ جوس پیش کیا اور کچھ تعارفی گفتگو ہوتی رہی۔ کچھ دیر بعد جب میزبان کے یہاں چلنے لگیں تو فریج میں سے بلیک گریپ جوس کی ایک بوتل بھی لے لی۔ کہنے لگیں کہ معلوم نہیں وہاں جوس ہوگا یا نہیں۔ لگتا ہے ان لوگوں کو میرے بارے میں تفصیلات سے آگاہ کر دیا گیا تھا۔

وہاں میزبان خاتون نے ہم لوگوں کو ریسیو کیا، کچھ اور لوگ بھی وہاں موجود تھے۔ سب سے غیر رسمی طور پر گفتگو ہوتی رہی۔ ان میں ایک وکیل صاحب بھی تھے۔ وہ ہندوستان سے خاصی واقفیت رکھتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے نیلی، آسام میں چند ماہ پہلے ہونے والے مسلمانوں کے قتل عام کے بارے میں بھی دریافت کیا۔ اس وقت ایک مقامی اخبار کے ایک نامہ نگار بھی موجود تھے۔ غور طلب بات یہ ہے کہ امریکہ کی ریاست کیلیفورنیا میں واقع شہر سان فرانسسکو میں لوگوں کو ہندوستان میں ہونے والے فرقہ وارانہ واقعات کا علم تھا یعنی ہماری بدنامی کے چرچے اتنی دور تک تھے وہ بھی تقریباً چالیس سال پہلے۔

ہمارے ہوٹل کا کیشئر مجھ سے کہنے لگا کہ میں نے سنا ہے ہندوستان میں پھولن دیوی نام کی ایک ڈاکو عورت ہے جو ہر رات کسی مرد کے ساتھ بسر کرتی ہے اور صبح کو اس کو قتل کر دیتی ہے۔ مقامی پرچے وغیرہ الف لیلوی داستانوں کی قسم کی کہانیاں لکھتے رہتے ہیں لیکن یہاں وہاں کی ساری گفتگو سے اندازہ ہوا کہ امریکہ کے لوگ زیادہ سے زیادہ جاننا سننا چاہتے ہیں اور ان کے پاس بھی کہنے کے لیے بہت کچھ ہے جسے وہ دوسروں سے کہنا چاہتے ہیں۔ خیر اس نشست میں کافی دیر ہوگئی، واپسی میں فیری بوٹ کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ وہی خاتون ہمیں گولڈن گیٹ برج سے گزرتی ہوئی ہوٹل پہنچانے کے لیے روانہ ہوئیں۔ اس برج کا ذکر کر چکا ہوں لیکن اس کو دور نزدیک سے دیکھنا ایک بات ہے اور رات میں اس پر سے گزرنا جیسے ستاروں کی دنیا سے گزرنا ہے۔ جب ہم پل پر کچھ دور چل چکے تو ہم نے کہا کہ کیا کار کہیں ذرا دیر کے لیے روک سکتی ہیں تاکہ میں باہر نکل کر اس منظر کو دیکھ سکوں جیسے الفاظ میں بیان کرنے سے عاجز ہوں۔ مختصر یہ کہ ایک نیلگوں سیاہ

کائنات میں گم تھا جس میں نیچے سے اوپر تک ہر چہار طرف تارے ٹنکے ہوئے تھے۔ کچھ دیر بعد ہم لوگ روانہ ہوگئے اور وہ مہربان خاتون مجھے ہوٹل میں چھوڑ کر واپس ہوگئیں۔

سان رفائل میں ہوا بالکل نہیں تھی اور موسم نہایت خوشگوار تھا۔ لوگوں نے بتایا کہ یہاں چاروں طرف پہاڑیاں ہیں اس لیے سمندری ہوائیں نہیں آتیں جبکہ سان فرانسسکو کا ساحل کھلا ہوا ہے اس لیے سمندری ہوائیں اس طرف پوری شدت کے ساتھ چلتی ہیں، معلوم ہوا کہ امریکہ میں طویل العمر لوگوں کی فیصد تعداد سب سے زیادہ یہیں ہے۔ سان فرانسسکو کا باب ختم ہوا۔

سان فرانسسکو سے شکاگو کے لیے:

بدھ ۲۲؍جون کو ڈیڑھ بجے دن میں شکاگو کے لیے روانہ ہوا۔ وہاں مقامی وقت کے مطابق جو دو گھنٹہ آگے ہے ساڑھے سات بجے شام کو پہنچا۔

اگلے دن یعنی ۲۳؍جون کو جمعرات کے دن صبح کو ایلی نوائے اسٹیٹ کالج میں ڈاکٹر اسد حسین کو فون کیا۔ وہ پٹنہ کے رہنے والے ہیں اور وہیں غلام سرور کے اخبار سنگم میں ان سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ وہ ہوٹل میں آئے اور شکاگو یونیورسٹی کیمپس دکھانے کے لیے لے گئے۔ انھوں نے بتایا کہ ایٹم بنانے کے لیے ضروری ایٹم شکنی کی جو تجرباتی کوشش خفیہ طور پر کی جارہی تھی وہ اسی یونیورسٹی کے فٹ بال گراؤنڈ کے نیچے کی جارہی تھی۔ وہ مجھے مسلم کمیونٹی سینٹر لے گئے جہاں کئی لوگوں سے ملاقات ہوئی، ان میں ڈاکٹر عبدالسلام انصاری بھی شامل تھے جو شکاگو یونیورسٹی میں ریاضی کے پروفیسر تھے۔ ان کا تعلق میرے گاؤں سے قریب ہی واقع قصبہ کوپا گنج سے تھا۔ وہ اپنے گھر لے جانے پر اصرار کرنے لگے۔ ان کا کہنا تھا کہ اعظم گڑھ کا آدمی یہاں ہوٹل میں کیسے ٹھہر سکتا ہے۔ خیر اس دن تو میں ہوٹل میں واپس آ گیا۔

لیکن ہوٹل پہنچتے ہی ڈاکٹر نعیم صدیقی آ گئے۔ وہ شکاگو یونیورسٹی میں اردو کے پروفیسر ہیں۔ ان سے دن میں فون پر بات ہوئی تھی۔ وہ بہ اصرار اپنے گھر لے گئے، رات

کا کھانا وہیں کھانے کے بعد واپس آیا۔ وہ دہلی آیا کرتے ہیں یہاں بھی جامعہ میں ان سے ملاقات ہوئی۔

اگلے دن ۲۴ر جون کو ایک قریبی آبادی میں جانا تھا اور رات میں وہیں قیام کرنا تھا لیکن پیٹ میں کچھ تکلیف تھی اس لیے وہاں جانے کا ارادہ ترک کردیا اور ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کو مطلع کردیا۔ انھوں نے کہا کہ آپ ہوٹل میں رہیں میں آکر آپ کو اپنے گھر لے آؤں گا۔ چنانچہ وہ آئے اور ان کے ساتھ ہدیٰ بھائی کے صاحبزادے سعیدالرحمٰن بھی تھے۔ وہ ایک قریبی شہر ڈے ون پورٹ کے کالج میں انگلش کے پروفیسر تھے۔ امریکیوں کو انگریزی پڑھاتے تھے۔ وہ انصاری صاحب کے یہاں چھٹیوں میں آتے رہتے تھے ان کی یہ قربت دوطرفہ تھی انھیں انصاری صاحب کی ذات میں اپنی خاندانی شباہت اور دینداری نظر آتی تھی۔ سعید کی شادی آفتاب بھائی کی بیٹی سے ہوئی تھی، ان کے ایک بیٹا بھی تھا۔ وہ پوری فیملی انصاری صاحب کے یہاں آیا کرتی تھی۔

مسلم کمیونٹی سینٹر:

اگلے دو دن انصاری صاحب کے یہاں قیام رہا۔ دونوں روز وہ مسلم کمیونٹی سینٹر میں لے گئے۔ یوں تو شکاگو میں مسلمانوں کے پچیس ادارے ہیں لیکن ایلی نوائے یونیورسٹی کے قریب واقع یہ مسلم کمیونٹی سینٹر کافی بڑا ہے۔ جس میں نماز کے لیے ہال ہے، کانفرنس وغیرہ کے لیے ہال ہے اور لائبریری ہے۔ یہاں کئی حضرات سے ملاقاتیں ہوئیں، لکچر بھی سنے۔ ہندوستان کے ایک وزیر یونس سلیم صاحب اپنی بیٹی کے علاج کے سلسلے میں آئے ہوئے تھے، انھوں نے بھی خطاب کیا۔ معلوم ہوا کہ شکاگو میں مسلمانوں کی آبادی ایک لاکھ سے زیادہ ہے جو امریکی شہروں میں سب سے زیادہ خیال کی جاتی ہے۔ ایک مقامی نیوز لیٹر کے نامہ نگار سے بھی گفتگو ہوئی۔ اردو زبان کی اہمیت اور اس کی مقبولیت بڑھانے کی تدبیریں خاص موضوع گفتگو تھا۔

اتوار ۲۶ر جون کو سعید مجھے سیرس ٹاور دکھانے کے لیے لے گئے جو اس وقت دنیا

کی بلند ترین عمارت شمار کی جاتی تھی۔ ایک سو دس منزل اونچی یہ عمارت نیویارک کی بلند ترین عمارت امپائر اسٹیٹ سے زیادہ بلند تھی ۱۹۷۳ء میں اس کی تعمیر ہوئی تھی۔ سیاحوں کو اوپر لے جانے والی لفٹ غالباً تین منزل نیچے ہی تک لے جاتی تھی لیکن ایک سو سات منزل آن واحد میں پہنچ جاتی تھی اور پتہ تک نہیں چلتا تھا۔ اسی منزل پر دوربینیں لگی ہوئی تھیں جن سے سارا شہر دکھائی دیتا تھا۔ معلوم ہوا کہ اس عمارت کے آرکی ٹکٹ ایک بنگالی انجینئر ضیاء الرحمٰن تھے۔ انھیں خانۂ کعبہ کی توسیع کے کام کے لیے سعودی عرب بلالیا گیا تھا۔

سعید اسی شام واپس چلے گئے۔ اگلی صبح کو میں بھی نیویارک روانہ ہوگیا۔ انصاری صاحب نے اپنی گاڑی میں ہوائی اڈے تک پہنچایا۔ اس وقت کہا جاتا تھا کہ شکاگو امریکہ کا مصروف ترین ہوائی اڈہ ہے۔ وہاں سے اندرون ملک پروازوں کے علاوہ ایشیا، یورپ اور کناڈا کے لیے پروازیں جاتی تھیں۔

شکاگو سے نیویارک:

سوموار ۲۷/جون کو ڈھائی بجے دن میں شکاگو سے نیویارک کے لیے روانہ ہوا۔ مقامی وقت کے مطابق پانچ بجے شام کو وہاں پہنچا۔ ایئرپورٹ سے ایڈیسن ہوٹل پہنچ کر اپنے پرانے دوست ڈاکٹر قیصر بخت کو فون کر کے اپنی آمد کی اطلاع دی۔ اس سے پہلے بھی واشنگٹن اور دیگر مقامات سے انھیں فون کرتا رہا تھا۔ لیکن آج نیویار کے ہوٹل سے ٹیلیفون کرنے پر یہ تکلیف دہ خبر سنی کہ وہ سیڑھی سے گر کر زخمی ہوگئے ہیں اور ان کی ٹانگ کی ہڈی فریکچر ہوگئی ہے۔ ان کی والدہ سے گفتگو ہوئی۔ میں نے بتادیا کہ اگلے دن میرے کچھ پروگرام ہیں اس لیے کل نہیں آسکوں گا۔ پرسوں ان سے ملاقات کے لیے آؤں گا۔ چنانچہ اگلے دو دن میں نے ہوٹل ہی میں قیام کیا اور کئی پروگرام وہیں سے نپٹا دیے۔

ڈاکٹر قیصر بخت:

تیسرے دن صبح کو ناشتے سے فارغ ہوا ہی تھا کہ ڈاکٹر قیصر کی والدہ کا فون آیا کہ قیصر تمھیں لینے کے لیے روانہ ہوگئے ہیں نیچے لابی میں رہنا۔ کچھ دیر بعد دیکھا تو کار آکر رکی

اس میں قیصر صاحب بندھے چھنے پڑے تھے اور ان کی بیوی ڈرائیو کر رہی تھیں۔ اللہ کے بندے نے حد کر دی۔ ان کے گھر کے لیے روانہ ہوئے تو راستے میں ہمارے آفس کی ایک بلڈنگ نظر آئی۔ وہاں رک کر اپنا سیلری چیک لیا اور پھر ڈاکٹر قیصر کے گھر پہنچے۔

واقعہ یہ ہوا تھا کہ ڈاکٹر قیصر کے گھر سے ایک سو بیس مل اور ساحل سمندر کے قریب ان کا سمر ہاؤس تھا جو ایک ایکٹر کے رقبے میں تھا وہ دو مہینے گرمیوں میں وہیں قیام کرتے تھے۔ وہ میرے ساتھ وہیں قیام کرنا چاہتے تھے اسی کی تیاری میں سیڑھی لگا کر وہ کچھ کر رہے تھے کہ سیڑھی پھسل گئی۔ ان کی ایک ٹانگ اور ایک بازو اس کے نیچے دب گیا اور ہڈیاں ٹوٹ گئیں۔ وہ سب پلاسٹر میں لپٹی ہوئی تھیں۔ رمضان کا زمانہ تھا انھیں افسوس یہ تھا کہ شام کو چار بجے یہ حادثہ ہوا اور انھیں روزہ توڑنا پڑا۔ وہ مولانا مودودی سے کافی متاثر تھے اور پابند صوم وصلاۃ تھے۔ ڈاکٹر قیصر بخت بھاگلپور (بہار) کے رہنے والے ہیں بہت ذہین ہیں۔ کلکتہ میڈیکل کالج سے ایم بی بی ایس کرنے کے بعد اپنی ڈسپنسری کر لی تھی لیکن تین گھنٹہ بھی بیٹھنا ان کے لیے مشکل تھا۔ اس زمانے میں ڈاکٹروں کا ایک خاص ٹسٹ ہوتا تھا اس کو پاس کرنے کے بعد کوئی ڈاکٹر امریکہ کے کسی ہسپتال میں درخواست دے سکتا تھا۔ لیکن ہم دوستوں کے اصرار کے باوجود قیصر بخت اس میں شرکت کے لیے تیار نہیں ہوتے تھے۔ ایک دن وہ یو ایس آئی ایس میں آئے جہاں میں کام کرتا تھا۔ وہیں فارم لے کر میں نے ان سے خانہ پُری کرائی اس کے بعد دوستوں نے ان کو دوڑا لیا کہ امتحان کی تیاری کرو مگر وہ ہمیشہ ہنس کر ٹال جاتے لیکن ٹیسٹ کی تاریخ سے ایک دن پہلے وہ غائب ہو گئے اور ٹیسٹ میں جا کر شریک ہو گئے۔ ٹیسٹ صبح ۹ر بجے سے شام ۶ر بجے تک مسلسل جاری رہا۔ اگلے دن وہ ملے تو کہنے لگے کہ پاس ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے کیونکہ سارا ٹیسٹ کل سو نمبر کا تھا جس میں ۷۵ فیصد نمبر لانا ضروری ہے میں نے تو ۹۰ نمبر کا پرچہ ہی کیا ہے تو کامیابی کا کیا امکان ہے۔ مگر کامیاب ہو ہی گئے۔ پھر ہمارے آفس ہی میں بیٹھ کر چار ہسپتالوں کا انتخاب کیا گیا جہاں انھوں نے درخواستیں بھیج دیں۔ تین جگہ سے آفر آ گیا۔ بالآخر ایک آفر جو بوسٹن کی تھی نسبتاً بہتر تھی اس کو انھوں نے منظور کر لیا۔ مختصر

یہ کہ وہ امریکہ چلے گئے۔ یہ واقعہ ۱۹۶۷ء کا ہے۔ اس کے تیرہ چودہ سال بعد میں امریکہ گیا تھا۔ اس وقت ان کی حیثیت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ نیویارک کے ایک پوش علاقے میں ان کا دومنزلہ مکان تھا اور وہ سمر ہاؤس تھا، جس کا ذکر کر چکا ہوں۔

ڈاکٹر قیصر کا اصرار تھا کہ کم سے کم پندرہ دن قیام کروں لیکن میں بمشکل پانچ چھ دن وقت نکال سکا وہ بھی مصروفیتوں کے علاوہ بڑی الجھنوں میں گزرا۔ قصہ یہ ہوا کہ اوریجنل پروگرام کے مطابق مجھے ۴/جولائی کو واشنگٹن سے واپس روانہ ہونا تھا۔ میں نے پروگرام منیجر مسٹر لاری موڈی سے گزارش کی کہ ۴/جولائی کو امریکی یوم آزادی کی تقریبات یہیں دیکھنا چاہتا ہوں اس لیے ممکن ہو تو دو ایک روز آگے بڑھا دیں۔ وہ راضی ہو گئے اور اگلی تاریخ ۸/جولائی مقرر ہوئی۔ میں نے اطمینان کر لیا لیکن نیویارک میں انھوں نے فون کر کے بتایا کہ تمہیں اوریجنل پروگرام کے مطابق ۴/ جولائی کو ہی جانا ہوگا اس لیے ۳/جولائی کو واشنگٹن واپس آجاؤ۔ اتنے لمبے سفر میں بکنگ وغیرہ کے مسائل پیچیدہ ہوتے ہیں وہ بھی ایسے میں کہ جب کئی ملکوں اور ہوائی کمپنیوں کا معاملہ ہو۔ میں نے کہا کہ میں اپنا سامان واشنگٹن میں ایک دوست کے گھر چھوڑ آیا ہوں اور وہ چھٹیاں منانے کے لیے واشنگٹن سے باہر ہوں گے میرا سامان نہیں مل سکے گا۔ تب لاری موڈی نے کہا کہ پھر تم ہی پان امریکن سے رابطہ کر کے اگلے پروگرام کے مطابق بکنگ کراؤ۔ پھر مجھے دوبار پان امریکن دوڑنا پڑا اور ۸/جولائی کو بکنگ ہوسکی لیکن وہ بھی براہِ راست لندن کے لیے نہیں بلکہ واشنگٹن سے نیویارک، وہاں فلائٹ بدل کر لندن کے لیے دوسری فلائٹ لینی تھی۔ اس میں جو مشکلیں پیش آئیں اس کی کہانی الگ ہے لیکن اس وقت تو میں نیویارک میں ٹھہر گیا۔

ڈاکٹر قیصر ہمیں لے کر اپنے سمر ہاؤس چلے گئے جو ایک سو بیس میل کے فاصلے پر ساحل سمندر کے قریب واقع ہے۔ ایک ایکٹر رقبے پر محیط اس مکان اور لان کے گرد جو جھاڑ دار باؤنڈری ہے وہ گلاب کی ہے پودے اور پودوں میں پھول اتنے گھنے ہیں کہ شاید پتیاں گنی جاسکتی ہوں لیکن پھول نہیں۔ میں کہتا تھا کہ قوتِ نمو نے یہاں مبالغے سے بھی زیادہ غلو سے کام لیا ہے۔ ڈاکٹر قیصر کی بیگم جو اصلاً اور نسلاً فلپائنی تھیں وہی ڈرائیو کرتی

رہیں اور اطراف کی بھی سیر کرائی۔ اس روز انھوں نے کافی زحمت کی کم سے کم تین سو میل ڈرائیو کیا ہوگا۔ وہاں میں نے ایک اسکول دیکھا جس کے لان میں لگے ہوئے ایک بورڈ پر لکھا ہوا تھا ''قائم شدہ ۱۷۳۰ء'' یہ ایک دلچسپ مشاہدہ تھا۔ کلکتہ کا قیام ۱۶۹۲ء میں ہوا۔ ظاہر ہے اسی کے آس پاس نیویارک بھی آباد ہوا ہوگا۔ دونوں جگہ آباد کار انگریز تاجر تھے جو دونوں بندرگاہی شہروں کے درمیان تجارت کرتے تھے چنانچہ دونوں شہروں کی تعمیرات کے طرز میں بڑی مماثلت ہے۔ ڈاکٹر قیصر بھی کہتے تھے کہ نیویارک کے بعض علاقوں پر کلکتہ کی شباہت آتی ہے دو باتیں ہیں، ایک تو شاید ان علاقوں میں کالے باشندوں کی آبادی ہو، دوسرے یہ کہ کلکتہ کے بعض علاقوں میں کچھ انگریز اور کچھ اینگلو انڈین آباد تھے۔ یوں بھی نیویارک ایک ایسا شہر ہے کہ دنیا بھر کے لوگ بڑی تعداد میں آباد ہیں۔ اس کی ایک بڑی وجہ وہاں اقوامِ متحدہ کے ہیڈ کوارٹر کا قیام بھی ہے۔

ایک روز مسز قیصر کے ساتھ شاپنگ کے لیے بھی گئے، بچوں کے لیے کچھ کپڑے وغیرہ خریدے۔ وہ کپڑے اس فراخ دلی سے ناپ رہی تھی کہ ہر میٹر پر دو چار سینٹی میٹر زیادہ دیتا تھا۔ ہمارے یہاں تو کپڑے کو اس طرح کھینچ کر ناپتے ہیں کہ ہر میٹر پر چند سینٹی میٹر کم ہی ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر قیصر نے اپنی بیوہ ماں اور چھوٹے بھائی بہن کو بھی بلا لیا تھا جو زیرِ تعلیم تھے۔ بہن بھی اپنے بھائی کی طرح ذہین تھی اس کو کالج سے اسکالرشپ ملنے لگا تھا۔ میں نے والدہ سے پوچھا کہ بچے کیا آپ کی زبان سمجھ لیتے ہیں تو کہنے لگیں، نہیں بابو وہ کیا سمجھیں گے ہم نے ہی ان کی بولی سیکھ لی ہے۔ ڈاکٹر قیصر مجھ سے کہتے تھے کہ ریٹائرمنٹ کے بعد یہیں آ جاؤ، میرے دو گھروں میں سے ایک گھر تو ہمیشہ ہی خالی رہتا ہے۔ خیر یہ تو ان کی محبت کی بات تھی لیکن میری قطعی رائے تھی کہ میں جہاں ہوں وہی جگہ بہترین ہے۔

ایک روز جب ہم لوگ مضافات کی سیر کے لیے گئے تھے تو دریائے ہڈسن کے قریب ملٹری اکادمی کے سامنے سے گزرے۔ میں وہاں ٹھہر گیا۔ ایک بہت بڑا میدان تھا اس کے دوسرے سرے پر کئی منزلہ عمارتوں کا ایک سلسلہ تھا۔ میں ایک جگہ کھڑا ہو کر اس پورے سلسلے کا فوٹو لینے کی کوشش کر رہا تھا۔ ڈر بھی رہا تھا کہ ایک آدمی اس طرف آیا، میں تو

سہم گیا لیکن اس نے میرے قریب آ کر بتایا کہ یہاں سے ٹھیک فوٹو نہیں آئے گا۔ ذرا دور لے جا کر کہا کہ یہاں سے فوٹو لو۔ یہاں تو اگر اس طرح کے کسی ادارے کے سامنے کھڑا ہو جائے تو بھی شاید جاسوسی کے الزام میں گرفتار کر لیا جائے۔

اقوامِ متحدہ میں:

ایک روز اقوام متحدہ کی زیارت کے لیے بھی گئے۔ ڈاکٹر قیصر نے اپنے چھوٹے بھائی کو میرے ساتھ کر دیا تھا۔ اقوامِ متحدہ کی عظیم الشان عمارت پر سامنے ساری ممبر اقوام کے جھنڈے لہرا رہے ہیں۔ اندر اور باہر لان میں بھی مختلف اقوام کے پیش کردہ سامان آرائش کا کہاں تک ذکر کیا جائے گا لیکن لان میں ایک مجسمہ اس کے پائیدان پر کندہ عبارت کا ترجمان تھا۔ ایک قوی الجثہ آدمی نے ایک چوڑی تلوار کی نوک کو زمین میں اس طرح گڑا رکھا ہے جیسے کسان ہل کو گڑا کے رکھتا ہے۔ اس کے زور سے دب کر تلوار خمیدہ ہو گئی ہے۔ نیچے عبارت لکھی ہوئی ہے ''تلوار کو موڑ کر ہل بنا دو۔'' یہ ایک طرح امن کی علامت ہے۔

ابتدائی دو دن ہوٹل میں قیام کے دوران بھی کئی مصروفیات رہیں۔ وہیں اپنے گروپ کے کئی لوگوں سے بھی ملاقات ہوئی۔ ایک جریدہ ''انڈیا ابراڈ'' کے دفتر میں بھی گیا، بس یونہی سی کچھ باتیں رہیں۔ مشہور خبر رساں ادارہ ''اے پی'' کے آفس میں بھی گیا۔ وہاں میں نے دریافت کیا کہ اگر میں کسی اخبار نویس کو بھیجوں تو آپ اس کو ٹریننگ دے سکتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہم مفت ٹریننگ دیں گے لیکن اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتے۔

ہمارے ایڈیسن ہوٹل کے آڈیٹوریم میں ایک ڈرامہ طویل عرصہ سے چل رہا تھا۔ ''اوہ کلکتہ'' اس کا چرچا میں نے بہت پہلے کلکتہ میں ہی سنا تھا۔ ایک شام ہوٹل میں واپس آیا تو دیکھا کہ اس ڈرامے کے دو ٹکٹ میرے باکس میں رکھے ہوئے تھے۔ معلوم نہیں کس نے رکھے، ممکن ہے ہوٹل کی طرف سے ہوں یا شاید پبلسٹی کا یہ بھی کوئی طریقہ ہو۔ خیر! ہمارے گروپ کے ایک ترک ساتھی بھی تھے ہم دونوں چلے گئے۔ اس میں ایک گانا تھا جس میں ٹیپ کا ایک بند تھا ''اوہ کلکتہ''! وہ مختصر ڈرامہ تھا جس میں تین مرد اور تین عورت کردار تھے۔ اس کی خصوصیت صرف اتنی تھی کہ سارے کردار برہنہ تھے۔ لیکن میں سمجھتا

ہوں کہ وہ اصلیت نہیں تھی صرف فریب نظر تھا۔ نیویارک کی ایک سڑک کے گندے فٹ پاتھ پر دیکھا کہ ایک بہت بھاری بھرکم کالا نابینا بھکاری ایک کپڑا اپنی دونوں ٹانگوں کے بیچ پھیلا کر کھڑا تھا اور ایک اتنے ہی بھیانک کتے کو اپنی ٹانگوں کے درمیان دبائے ہوئے تھا اور اپنی زبان میں کچھ کہتا جارہا تھا۔ اسی طرح سان فرانسسکو میں جس طعام خانے میں صبح کو ناشتہ کرلیا کرتا تھا وہاں باہر گیٹ کے قریب دو بوڑھی عورتوں کو دیکھتا کہ ہاتھ پھیلائے خاموش کھڑی رہتی تھیں۔ گویا غریبی ہر جگہ ہے اس کی نوعیت اور مظاہر مختلف ہوا کرتے ہیں۔

ایڈیسن ہوٹل میں ہمارے گروپ کے کئی ساتھی اکٹھا ہوگئے تھے۔ وہیں لابی میں ہم سب کی الوداعی ملاقات ہوئی۔ کتنی دور دور سے آئے ہوئے لوگوں کا اس طرح اکٹھا ہوجانا ایک تجربہ تھا تو ان سے تعلق ایک الگ طرح کا احساس تھا اور ان سے رخصت ہونا ایک بالکل الگ طرح کا ٹیس کی طرح محسوس ہونے والا احساس تھا۔

نیویارک سے واپسی:

۵/جولائی کی سہ پہر کو ۴/بجے کی فلائٹ سے میں واشنگٹن کے لیے روانہ ہوا۔ ڈاکٹر قیصر میاں بیوی مجھے ہوائی اڈے تک پہنچانے آئے۔ اتنی محبت بھری مختصر سی صحبت کو چھوڑنا بھی ایک دلدوز تجربہ تھا۔ ڈاکٹر قیصر تو بندھے چھنے پڑے رہتے تھے ان کے پاس بیٹھتا تو کلکتہ کی پرانی باتیں ہوتیں اور پرانی یادیں تازہ ہوتیں۔ شام کو ۵/بجے کے قریب واشنگٹن پہنچا تو ایک نئی پریشانی سے دوچار ہوگیا۔

نئی پریشانی: میرے پاس دو اٹیچیاں تھیں لیکن جب واشنگٹن ہوائی اڈے پر اترا تو صرف ایک تھی، دوسری غائب تھی۔ اسی میں میرے سارے قیمتی اور ضروری سامان تھے۔ میں تو بدحواس ہوگیا لیکن وہاں جو شخص سامان اتار رہا تھا اس نے کہا کہ شاید وہ دوسرے ہوائی اڈے پر چلی گئی ہو آپ اپنا پتہ دے دیجیے وہاں پہنچا دیا جائے گا۔ دراصل واشنگٹن کے دو ہوائی اڈے ہیں، ڈالس اور جان ایف کینڈی۔ میں نے حلیم صاحب کے گھر کا پتہ دے دیا لیکن حواس قابو میں نہیں تھے۔ باہر نکلا تو سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کہاں جاؤں، ٹیکسی والے کو کچھ بتا نہیں پارہا تھا۔ بالآخر واٹر گیٹ بلڈنگ یاد پڑی میں

نے کہا کہ وہیں لے چلو سامنے انٹریگ ہوٹل ہے وہیں پہنچادو۔ خدا خدا کرکے اس ہوٹل میں آ گیا جہاں ٹھہرا تھا۔ کچھ حواس درست ہوئے تو حلیم صاحب کو فون کرکے سب ماجرا بتایا انھوں نے کہا کہ میں ابھی آتا ہوں۔ کچھ دیر میں وہ آ گئے۔ افطار کا وقت قریب تھا تو میں نے روک لیا وہیں روزہ افطار کرنے کے بعد ہم لوگ ان کے گھر چلے گئے۔ بے چینی کی وجہ سے رات بھر نیند نہیں آئی۔ صبح کو پھر ہوائی اڈے گیا تو بتایا گیا کہ اٹیچی مل گئی ہے اور آپ کے پتے پر بھیج دی گئی ہے۔ کچھ جان میں جان آئی۔ گھر واپس آیا اور کوریئر کا انتظار کرتا رہا۔ بالآخر شام کو ایک شخص آیا اور اٹیچی حوالے کرے چلا گیا۔ اللہ کا شکر ادا کیا۔

ہوائی کمپنیوں میں بالعموم بیگج کے وزن کی ایک حد معین ہوتی ہے اس سے زیادہ ہونے پر محصول دینا پڑتا ہے لیکن پان امریکن میں وزن کی کوئی قید نہیں ہے۔ دو اٹیچی لے جانے کی اجازت ہے ان کا جو بھی وزن ہو لیکن ان کے سائز کا کچھ تعین ہے۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ میں کس عذاب میں پڑوں گا اس لیے نیویارک میں ایک اور اٹیچی لے لی تھی۔ ۷/جولائی جمعرات کی صبح کو اپنے واشنگٹن آفس میں جا کر مسٹر لاری موڈی سے گفتگو کی۔

امریکہ کو الوداع:

۸/جولائی جمعہ کی شام کو ساڑھے تین بجے واشنگٹن سے نیویارک کے لیے روانہ ہوا لیکن اس وقت بھی بڑی پریشانی کا سامنا ہوا۔ ہوائی اڈے پہنچنے پر معلوم ہوا کہ متوقع فلائٹ میں میرا نام نہیں ہے پھر تو میں غصے میں آپے سے باہر ہوگیا۔ لیکن کاؤنٹر پر دوسرے شخص نے مداخلت کی اور معاملے کو سلجھایا۔ قصہ یہ ہوا تھا کہ میری ساری فلائٹ پر میرا نام رضوان اللہ لکھا تھا یہاں اس نے الٹا ''اللہ رضوان'' لکھ دیا تھا۔ اس کو درست کرایا۔ آگے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ لندن سے فرنک فرٹ (جرمنی) والی فلائٹ میں بھی اسی طرح نام درج تھا۔ اس کو بھی درست کرایا۔ خدا خدا کرکے ہوائی جہاز روانہ ہوا اور کوئی گھنٹہ بھر میں نیویارک پہنچ گیا۔ جہاں فلائٹ بدلنا تھا۔ اس ہوائی جہاز میں بیٹھ گیا لیکن فلائٹ کی روانگی میں تاخیر ہوتی گئی بہت دیر بعد بتایا گیا کہ جہاز میں کچھ خرابی ہوگئی ہے اس لیے جہاز بدلا جائے گا۔ چنانچہ ہم لوگ اس میں سے اتار دیے گئے پھر کئی گھنٹے انتظار کرنا پڑا۔

۸؍جولائی جمعہ کے دن ساڑھے تین بجے واشنگٹن سے نیویارک کے لیے روانہ ہوئے۔ ساڑھے چار بجے وہاں پہنچے اور بعد از خرابی بسیار ساڑھے گیارہ بجے رات میں نیویارک سے لندن کے لیے روانہ ہوئے۔ ۹؍جولائی سنیچر کو دن میں گیارہ بجے لندن پہنچے۔ اس کے بعد کی کہانی بھی کچھ کم پریشان کن نہیں ہے۔ چونکہ یہ فلائٹ تقریباً پانچ گھنٹے تاخیر سے پہنچتی تھی اس لیے میری فرنک فرٹ جانے والے فلائٹ چھوٹ گئی۔ یہ معاملہ تو ایک طرف تھا، دوسری طرف یہ معاملہ ہوا کہ واشنگٹن سے روانگی کے وقت میں نے سوچا کہ سارا سامان لیے لیے کہاں کہاں پھروں گا، چنانچہ پان امریکن کو یہ سارا سامان واشنگٹن سے براہِ راست دہلی بھیجنے کی ہدایت کر کے خود ہلکا پھلکا روانہ ہو گیا تھا۔ لیکن فلائٹوں کی گڑبڑی نے سب معاملہ الجھا دیا۔ میں لندن میں پھنس گیا اور معلوم نہیں سامان کا کیا ہوا۔

واشنگٹن سے روانگی والی صبح کو ہی میری طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ شاید وہ واپسی کے سفر کی پریشانی کی وجہ سے تھی اس کے بعد یہ سارا عذاب جھیلنا پڑا۔ صورت حال ایسی تھی کہ جو کچھ سامنے آئے اس کا سامنا کرنے کے سوا کوئی چارۂ کار نہ تھا۔

گھر واپسی:

۸؍جولائی جمعہ کے دن واشنگٹن سے روانہ ہو کر ۹؍جولائی کو لندن پہنچا اور وہاں کی الجھنوں سے گزرتا ہوا ۱۰؍جولائی کو دہلی کے لیے روانہ ہوا اور بمبئی ہوتا ہوا ۱۱؍جولائی کو ایک بجے دن میں گھر واپس پہنچا لیکن میرا دل تو اپنے سامان میں اٹکا تھا جو نہ معلوم کہاں اٹکا تھا۔ اگلے دن ۱۲؍جولائی کو عید تھی لیکن ہمارے گھر میں تو ہمارے پہنچتے ہی عید ہو گئی تھی۔ میرے سامان کا جو معاملہ تھا اس کو تیسرے باب میں (صفحات 384 تا 391) بیان کر چکا ہوں۔ اس کے اسباب کا بھی ''نیویارک'' کے ذیل میں تذکرہ کر چکا ہوں۔

☆☆☆

مشورے

ہمارے سارے سفر طے شدہ پروگرام اور ریزرویشنوں کے مطابق تھے لیکن اس کے باوجود کتنی ہی غیر متوقع مشکلوں اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ہر سفر میں غیر متوقع حالات کا سامنا کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ ہر منزل پر اگر کوئی واقف کار ہو تو اس کا پتہ ٹھکانا ضرور معلوم کر کے رکھنا چاہیے اور اس سے رابطے میں رہنا چاہیے۔ اپنی ضروری دوائیاں ساتھ رکھنی چاہیے۔ سامان حتی الوسع کم سے کم رکھنا چاہیے۔ میری انتہائی خوش قسمتی تھی کہ میرا سامان بالآخر ملتا گیا۔ میں نے اندرون ملک اور بیرون ملک ہمیشہ ایک احتیاط برتی کہ شام کے بعد اپنے ہوٹل سے باہر نہیں نکلتا تھا۔ صرف کلکتہ اس اصول سے مستثنیٰ تھا، اگر کسی بیرونی ملک میں جانا ہو تو وہاں کی بولی کے چند ضروری الفاظ اور جملوں کو سمجھ کر ان کو بولنے کی مشق کر لیں۔ مناسب ہوگا کہ انھیں نوٹ کر کے پاس رکھیں کسی انجان پر ہرگز بھروسہ نہ کریں۔ میں نے ایسی غلطیاں کیں لیکن میری خوش قسمتی تھی کہ وہ بھروسہ صحیح نکلا۔ جانکاروں پر بھی حد سے زیادہ اعتماد کرنے سے گریز کریں۔ فارن ایکسچینج انتہائی احتیاط سے خرچ کریں یہ آکسیجن کی طرح ہوتا ہے۔

بسیار سفر باید تا پختہ شود خامے

☆☆☆